اسلام پر بے جا اعتراضات

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

۲۴۷۵۵۴
کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

اسلام پر
بے جا اعتراضات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات، شرعی قوانین، سیرت طیبہ اور ہندوستان کی مسلم عہد حکومت کی تاریخ کو تنقید و اعتراض کا ہدف بنانے کی جو ناپاک کوششیں کی جارہی ہیں اور برادرانِ وطن کو غلط فہمی میں مبتلا کیا جارہا ہے، بلکہ مسلمانوں کی نوجوان نسل بھی ان پروپیگنڈوں سے متأثر ہورہی ہے، ان اعتراضات کا مدلل اور تفصیلی جواب

مرتّب

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

طبع اول ۱۴۴۳ھ،۲۰۲۱ء

کتاب : اسلام پر بے جا اعتراضات

مرتب : حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

صفحات : ۸۰۰

کمپیوٹر کتابت : مولانا محمد نصیر عالم سبیلی (فون نمبر:9959897621)

سرورق : العالم اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:8919409102

سن طباعت : ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ، دسمبر ۲۰۲۱ء

زیر اہتمام : المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

ملنے کے پتے

- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)
- المعہد العالی الاسلامی، قباء کالونی، حیدرآباد
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد
- دکن ٹریڈرس، مغلپورہ، چارمینار، حیدرآباد

فہرست مضامین

پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق

قانونِ شریعت سے متعلق

ہندوستان اور مسلمان



بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں، ان کے ماننے والوں نے عملاً مذہب سے رشتہ توڑ لیا ہے، وہ صرف کچھ تہواروں کو ایک تہذیبی میلے کے طور پر منا لیتے اور گاہے گاہے مذہب کے مروجہ طریقہ عبادت کو انجام دے لیتے ہیں، جس نے رسم ورواج کا درجہ حاصل کر لیا ہے، مغرب کی طرف سے الحاد، مذہب بیزاری، اخلاقی اقدار کا انکار، خواہشات وشہوات کی غلامی اور مذہب کی قیود سے آزادی کا جو طوفان اُٹھا ہے، اس نے مذاہب کی عمارت کو زمیں بوس کر کے رکھ دیا ہے، اگر اس سے استثناء ہے تو مسلمانوں کا، اور کسی درجہ میں یہودیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کا۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مغرب سے مشرق تک خدا بیزار طبقہ کو اسلام اور مسلمانوں سے شکایت ہے، اگر کسی حمام میں سارے لوگ بے لباس ہوں اور ایک دو افراد لباس میں ہوں تو بے لباس اکثریت کو شرم آنے کے بجائے غصہ آتا ہے کہ جب ہم سب نے لباس اتار رکھے ہیں تو ان چند قدامت پسندوں نے کیوں کپڑے پہن رکھے ہیں؛ اس لئے یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی چند رکعت نمازوں تک اسلام سے اپنا تعلق رکھیں، باقی معاملات، معاشرت، سیاست، حلال وحرام وغیرہ میں یہ مذہب کو بیچ میں نہ لائیں اور مذہب کی مقدس شخصیتوں کے بارے میں بھی بہت حساسیت کا ثبوت نہ دیں، مسلمان اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں؛ اسی لئے اسلام کو خاص طور پر ہدف بنایا جاتا ہے، عجیب بات ہے کہ جو تعلیمات مذاہب کا مشترکہ سرمایہ ہیں، جیسے: شرم وحیا کی اہمیت، زنا اور سود کی حرمت، شراب وکباب کی ممانعت، ان کے بارے میں بھی وہ صرف اسلام کو مطعون کرتے ہیں؛ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ صرف مسلمانوں نے ہی خدائی قانون کو گلے لگا رکھا ہے، دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ خدائی احکام کو پس پشت رکھ کر شہوات کے آگے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔

اس پس منظر میں اسلام کے خلاف لکھنے کا سلسلہ مغرب نے شروع کیا، اس کے لئے یونیورسیٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کئے، بے شمار کتابیں لکھیں، اب سنگھ پریوار کے لوگ مغربی ملکوں سے اس گندگی کو ہندوستان لا رہے ہیں، جس کا مقصد اسلام کو بدنام کرنے کے علاوہ مسلمانوں کے بارے میں دوسری اقوام کو نفرت میں مبتلا کرنا ہے، سیاسی مقاصد کے لئے بھی بڑے پیمانے پر یہ کام کیا جا رہا ہے، اور پرنٹ میڈیا سے زیادہ الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس کی اشاعت کی جا رہی ہے، غیر مسلموں کا ذہن تو خراب ہو ہی رہا ہے، مسلمانوں کی نوجوان نسل بھی اس سے متأثر ہو رہی ہے، دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کے دور کرنے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے، جو لوگ جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی معلومات خود اطمینان بخش نہیں ہوتیں؛ اس لئے صورت حال یہ ہے کہ بعض دفعہ لوگ نا سمجھی کے ساتھ میڈیا کے اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں، خود بھی بے آبرو ہوتے ہیں اور دین وملت کو بھی بے آبرو کرتے ہیں، اسی پس منظر میں یہ کتاب بلکہ مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔

ان مضامین کی تفصیل یہ ہے کہ جن موضوعات پر کوئی مناسب تحریر نہیں ملی، یا از سر نو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ان پر راقم الحروف نے خود قلم اٹھایا، کتاب کے بیشتر مضامین اسی نوع کے ہیں، جن موضوعات پر کوئی مفید تحریر کسی صاحب علم کی مل گئی، جو کافی ووافی تھی، ان کو بعینہ شامل کر لیا گیا، جس موضوع پر کسی صاحب علم کی کوئی مفید تحریر تو ملی، مگر اس کو مختصر کرنے یا حذف واضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کو حذف واضافہ کے ساتھ شامل کیا گیا، تاہم دیگر اہل علم کی جو بھی تحریر شامل کی گئی، اس کے ساتھ ان کے نام کی صراحت کر دی گئی ہے اور اگر کوئی پیراگراف راقم الحروف نے بڑھایا ہے تو اس کا بھی ذکر کر دیا ہے، اس طرح اب یہ مجموعہ قارئین کے سامنے ہے!

یوں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چھوٹے بڑے بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں؛ لیکن اس حقیر نے ان سوالات کا انتخاب کیا ہے، جو میڈیا میں زیادہ زیر بحث رہتے ہیں، اور خاص کر ہندوستان میں جن کو نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلا باب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات

کی نسبت سے اُٹھائے جانے والے سوالات سے متعلق ہے، دوسرا باب رسول اقدس ﷺ کی حیات طیبہ کی نسبت سے اُٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات ہیں، تیسرا باب ان اعتراضات کے جوابات پر ہے، جو شرعی قوانین سے متعلق کئے جاتے ہیں، اور چوتھا باب ہندوستان کے مسلم سلاطین اور مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق ہے، اعتراضات کا جواب دینے میں مناظرانہ لب ولہجہ کے بجائے داعیانہ اُسلوب اختیار کیا گیا ہے اور خاص طور پر کوشش کی گئی ہے کہ خود ان کی مذہبی تعلیمات اور تاریخی حقائق کو بھی سامنے لایا جائے؛ تاکہ وہ اس کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بنیادی طور پر یہ کام کورونا کی دوسری لہر اور اس کی وجہ سے لگنے والے لاک ڈاؤن کے درمیان ہوا، یہ کام اور پہلے مکمل ہو جاتا؛ لیکن اس درمیان راقم الحروف بھی کورونا کی تکلیف دہ بیماری کا شکار ہوا، اور اللہ کے فضل وکرم اور بزرگوں اور دوستوں کی دُعاؤں کا اثر ہے کہ ایک طرح سے نئی زندگی حاصل ہوئی، اس بیماری کا اثر یوں تو ابھی تک موجود ہے؛ لیکن چھ ماہ تک طبیعت پر بہت زیادہ اثر رہا، پہلے تو کام کرنے کی صلاحیت ہی موقوف ہوگئی، پھر جب اس کیفیت سے باہر آیا تو رفتار بہت سست ہوگئی، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد سے جلد سابقہ معمول کی کیفیت پر واپسی عطا کردے، اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور دفاعِ اسلام کی اس چھوٹی سی کوشش کو نجات کا ذریعہ بنادے، اخیر میں علماء سے گزارش ہے کہ دفاعِ مسلک کا کام بہت ہو چکا، اس سلسلہ میں بزرگوں نے جو دلائل دیئے ہیں اور جو وضاحتیں کی ہیں، ہم لوگ اس میں اضافہ نہیں کرسکتے، اب دفاعِ دین کی طرف زیادہ توجہ دیں؛ کیوں کہ دین اصل ہے، جس پر نجات موقوف ہے، مسلک اصل نہیں ہے کہ کسی خاص مسلک سے آخرت کی نجات متعلق ہو۔

و صلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد و علیٰ آلہ
وصحبہ اجمعین و الحمد للہ رب العالمین.

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۱۲/ربیع الاول ۱۴۴۳ھ
۱۹/اکتوبر ۲۰۲۱ء

اسلام پر بے جا اعتراضات

مسلم غیر مسلم تعلقات

اسلام کا تصورِ جہاد قرآن وحدیث کی روشنی میں!

جہاد ایک مقدس اصطلاح ہے، جس کا مقصد انصاف قائم کرنا، اپنی خواہشات پر قابو رکھنا اور ظلم کو روکنا ہے؛ اسی لئے ہر مذہب میں اس کی ترغیب دی گئی ہے؛ لیکن اہل مغرب کی طرف سے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جہاد کے معنی مار کاٹ کے ہیں، اس کا مقصد غیر مسلموں کو یا تو زور زبردستی سے مسلمان بنانا ہے، یا دنیا کو ان کے وجود سے خالی کر دینا ہے، یہی غلط فہمی یوروپ میں اسلاموفوبیا کا سبب بنی ہے، اور ہندوستان کے بہ شمول مشرقی ملکوں میں بھی اسی پروپیگنڈہ کے ذریعہ اسلام اور مسلمان کے خلاف نفرت کی آگ سلگائی گئی ہے؛ اس لئے اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے جہاد کا جو تصور دیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے چار نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے :

اول یہ کہ جہاد کے معنی کیا ہیں؟

دوسرے: جہاد کی قسمیں کیا ہیں؟ جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے۔

تیسرے: جہاد کا مقصد کیا ہے؟ کیا جہاد کفر کو مٹانے کے لئے ہے؟ یا فتنہ وفساد کا خاتمہ کرنے کے لئے ہے۔

چوتھے: اسلام نے کن لوگوں سے جہاد کا حکم دیا ہے؟

ان نکات کو سمجھنے کے لئے ہمیں براہ راست قرآن وحدیث سے رُجوع کرنا چاہئے؛ کیوں کہ قرآن وحدیث ہی دین کا اصل ماخذ ہے، نیز ان چار نکات پر گفتگو کرنے کے بعد ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کیا جہاد کی تعلیم صرف اسلام نے دی ہے، یا دوسرے مذاہب میں بھی دی گئی ہے؟

جہاں تک جہاد کی حقیقت ہے تو یہ عربی زبان کے لفظ ''جہد'' سے ماخوذ ہے، جس کو 'ج' کے زبر اور پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس کے معنی طاقت اور مشقت کے ہیں، (۱) بعض لوگوں نے یہ فرق کیا ہے کہ اگر 'ج' کے زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو طاقت کے اور پیش کے ساتھ پڑھا جائے تو مشقت کے معنی ہیں، (۲) اس مادہ سے عربی زبان میں کئی الفاظ ماخوذ ہیں: مجاہدہ، جہاد اور اجتہاد، وغیرہ، مجاہدہ کے معنی عمل میں ہونے والی مشقت کو برداشت کرنا ہے، جہاد کے معنی ظالم کو ظلم سے روکنے کی طاقت بھر کوشش کرنا ہے، اور اجتہاد کے معنی قرآن وحدیث سے احکام شرعیہ کے استنباط میں آخری درجہ کی محنت کرنا ہے، غور کیا جائے تو ان تمام الفاظ میں دو باتیں ضرور پائی جاتی ہیں، ایک: بھرپور کوشش، دوسرے: مشقت برداشت کرنا؛ کیوں کہ جب کسی چیز کی بھرپور سعی کی جاتی ہے تو اس میں جسمانی، ذہنی یا مالی مشقت سے انسان کو گزرنا ہی پڑتا ہے؛ اسی لئے جہاد کی تعریف کرتے ہوئے اہل لغت نے تلوار اور قوت کے استعمال کو اس کا ضروری حصہ قرار نہیں دیا ہے؛ بلکہ پوری طاقت لگا کر ظالموں اور حق کے دشمنوں کو روکنا، چاہے یہ روکنا زبان کے ذریعہ ہو یا فعل کے ذریعہ، دونوں کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چنانچہ عربی لغت کے مانے ہوئے امام علامہ ابن منظور افریقیؒ فرماتے ہیں:

الجهاد محاربة الأعداء، وهو المبالغة واستفراغ ما في الوسع من الطاقة من قول أو فعل۔ (۳)

جہاد کے معنی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے ہیں، اور وہ اس طرح کہ اپنی وسعت اور طاقت بھر زبان یا عمل کے ذریعہ اس کی کوشش کی جائے۔

عربی لغت کی ایک دوسری بہت ہی معتبر شخصیت علامہ مرتضی زبیدیؒ نے بھی بالکل ان ہی

(۱) مفردات القرآن: ۲۰۸۔

(۲) طلبۃ الطلبۃ: ۵۹/۴، کتاب الصوم، ص: ۲۵، مختار الصحاح: ۶۳۔

(۳) لسان العرب: ۱۱۵/۳۔

الفاظ میں جہاد کی تشریح کی ہے، (۱) معلوم ہوا کہ عربی زبان میں یہ لفظ لڑنے جھگڑنے، قتل وغارت گری مچانے اور مارکاٹ کرنے کے معنی میں نہیں ہے؛ بلکہ اس سے مراد کسی بھی بہتر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طاقت بھر کوشش اور اس سلسلہ میں پیش آنے والی مشقتوں کو برداشت کرنے اور اس پر صبر سے کام لینے کے ہیں۔

مال سے جہاد

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی مختلف قسمیں ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں :

(۱) مال کے ذریعہ جہاد، خود قرآن مجید میں متعدد مواقع پر مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی گئی ہے، اور مال سے جہاد کرنے والوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (التوبہ:۸۸)

رسول اور جو لوگ رسول کے ساتھ ایمان لائے، وہ اپنے مال سے بھی جہاد کرتے ہیں اور جان سے بھی، یہی لوگ ہیں جن کے لئے بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں کامیاب لوگ۔

قرآن مجید میں متعدد مواقع پر جہاد یعنی: مال کے ذریعہ جہاد کا ذکر کیا گیا ہے، (۲) اسی طرح حدیث میں بھی مال سے جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

جاهدوا المشركين بأموالكم وأيديكم وألسنتكم ۔ (۳)

---

(۱) تاج العروس: ۷/ ۵۳۷۔

(۲) دیکھئے: النساء: ۹۵، الانفال: ۷۲، التوبہ: ۲۰، التوبہ: ۸۸۔

(۳) نسائی، حدیث نمبر: ۳۰۹۶، نیز دیکھئے: مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۵۵۵۔

مشرکین سے مال کے ذریعہ ہاتھ کے ذریعہ اور زبان کے ذریعہ جہاد کرو۔

مال کے ذریعہ جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ حق کی اشاعت اور ظلم کو روکنے میں پیسوں کا استعمال کیا جائے، جہاں جنگ کا موقع ہو، وہاں جنگ کے آلات و وسائل میں پیسے خرچ کئے جائیں، اور جہاں جنگ کا موقع نہ ہو، وہاں ظالم کے ظلم کو روکنے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے جو مالی وسائل مطلوب ہیں، وہ فراہم کئے جائیں، جیسے: موجودہ زمانہ میں زیادہ تر وسائلِ ابلاغ پر ظالم قوتوں کا غلبہ ہے، اسرائیل فلسطینیوں کے مکانات زمیں بوس کر دے، مغربی قومیں آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو بغیر کسی سبب کے تہ تیغ کر دیں، تو اس ظلم و بربریت کو وسائلِ ابلاغ (Media Resources) نہیں دکھاتے؛ لیکن اگر فلسطین کے مجبور اور نہتے لوگوں نے دو چار پتھر پھینک دیئے تو اس کو دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے، یہی صورت حال برما کی ہے، اور کچھ فرق کے ساتھ اسی صورت حال سے ہندوستان کے مسلمان گزر رہے ہیں۔

ایسے مواقع پر ذرائع ابلاغ (Media) تک رسائی حاصل کرنے یا غیر جانبدار راست گو اور انصاف پسند ذریعۂ ابلاغ کو وجود میں لانے کے لئے پیسے خرچ کرنا یقینی طور پر ''مال کے ذریعہ جہاد'' کی ایک شکل ہے، اسی طرح ہمارے ملک میں پولیس کے شعبہ میں فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہو گیا ہے، وہ بے قصور مسلمانوں اور دلتوں کو گرفتار کرتے ہیں، ان پر قانون کی خطرناک دفعات عائد کر دیتے ہیں، ایسے مظلوموں کے لئے قانونی چارہ جوئی میں خرچ کرنا بھی مالی جہاد کی ایک شکل ہے، موجودہ دور میں کسی فکر کی اشاعت کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے؛ تاکہ لٹریچر شائع کئے جائیں، غیر مسلموں کے لئے دعوتی پروگرام رکھے جائیں، دعوتی نقطۂ نظر سے خدمتِ خلق کا کام کیا جائے، ان سب کے لئے بہت زیادہ سرمایہ مطلوب ہوتا ہے، یہ سب ''مال کے ذریعہ جہاد'' کی مختلف صورتیں ہیں، اور آج کے دور میں اسلام کی نشر و اشاعت، اسلام کے بارے میں پیدا کی گئی غلط فہمیوں کے ازالہ اور ناانصافیوں کے مقابلہ کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

زبان وقلم سے جہاد

(۲) جہاد کی دوسری قسم ''جہاد باللسان'' یعنی زبان کے ذریعہ جہاد ہے، قرآن مجید میں صراحتاً تو اس کا ذکر نہیں آیا ہے؛ لیکن مسلمانوں کو امر بالمعروف (بھلائی اور انصاف کی دعوت) اور نہی عن المنکر (برائی اور ظلم کو روکنے) کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کو ان کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، یہ دراصل جہاد باللسان ہی ہے؛ البتہ حدیث میں صراحتاً جہاد باللسان (زبان سے جہاد) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

جاهدوا المشركين بألسنتكم ۔ (۱)

شرک کرنے والوں سے زبان کے ذریعہ جہاد کرو۔

حضرت انسؓ سے یہی روایت سنن نسائی میں بھی نقل کی گئی ہے، (۲) زبان سے جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی جائے، غلط پروپیگنڈوں کا مقابلہ کیا جائے، ناروا اعتراضات کا جواب دیا جائے، اور زبان کے ذریعہ اسلام کی دعوت واشاعت کی خدمت انجام دی جائے، حضرت کعب بن مالکؓ جو اس زمانہ کے شعراء میں تھے اور اشعار کے ذریعہ اسلام کا دفاع کرتے تھے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ شعر کہنے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا :

إن المؤمن يجاهد بسيفه ولسانه ، والذي نفسي بيده لكأنما تنضحونهم بالنبل ۔ (۳)

بے شک مؤمن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! (جب تم اسلام کی حمایت میں شعر کہتے ہو) تو گویا تم ان پر تیر برساتے ہو۔

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۵۵۵۔ (۲) دیکھئے: سنن نسائی، حدیث نمبر: ۳۰۹۶۔

(۳) صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۷۰۷۔

یعنی تیر جو اس زمانہ کا سب سے مؤثر اور طاقتور ہتھیار سمجھا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے شعر کے ذریعہ حق کی ترجمانی کرنے اور باطل کے خلاف آواز بلند کرنے کو اسی کے حکم میں رکھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان کے ذریعہ جہاد، جہاد کی کتنی اہم قسم ہے؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر جہاد کی اس صورت کو افضل ترین جہاد قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا جہاد کی سب سے افضل صورت ہے:

أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر ۔ (۱)

قلم بھی زبان کے قائم مقام ہے، جیسے زبان کے ذریعہ کسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا جاتا ہے، اور مخاطب تک اپنی بات پہنچائی جاتی ہے، اسی طرح قلم کے ذریعہ دُور دُور تک اپنی بات پہنچائی جاسکتی ہے، جن لوگوں کو آپ ﷺ بالمشافہ دعوت دے سکتے تھے، ان کو حسبِ موقع آپ ﷺ نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اسلام کی دعوت دی، اور جو لوگ کافی فاصلہ پر تھے، اور جن کو بالمشافہ دعوت نہیں دی جاسکتی تھی، ان کو آپ ﷺ نے خطوط کے ذریعہ دعوت دی؛ اس لئے مضامین، رسائل، پمفلٹس اور کتابوں کے ذریعہ دین کی دعوت دینا یا الکٹرانک ذرائع سے دُور دُور تک اس مقصد کے لئے اپنی آواز اور اپنی تحریر کو پہنچانا بھی موجودہ وسائل کے اعتبار سے زبان سے جہاد میں شامل ہے، اور حدیث کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالت امن میں یہ جہاد کی سب سے افضل صورت ہے، بالخصوص اُس وقت جب کہ سچائی کے اظہار اور دینِ حق کی دعوت پیش کرنے میں لوگوں کی مخالفت کا بھی اندیشہ ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَ جَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ (الحج:۷۸)

اور اللہ کے راستہ میں ایسا جہاد کرو کہ جہاد کا حق ادا ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

لا تخافوا فی الله لومة لائم ، فهو حق الجهاد كما تجاهدون فی سبيل الله ولا تخافون لومة لائم ۔ (۲)

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۸۰۸۱۔ (۲) تفسیر خازن: ۲۶۶/۳۔

اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو،
یہی جہاد کا حق ادا کرنا ہے، جیسا کہ اللہ کے راستہ میں (تلوار سے)
جہاد کرتے ہو اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں
کرتے۔

نفس سے جہاد

(۳) جہاد کی تیسری قسم "جہاد بالنفس" ہے، قرآن مجید کی مختلف آیات میں اس کا ذکر آیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (التوبہ:۴۱)

اس کے علاوہ سورۂ نساء، آیت نمبر: ۹۵، انفال، آیت نمبر: ۷۲، توبہ، آیت نمبر: ۲۰، ۴۴، ۸۸ میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، حدیث میں بھی جہاد بالنفس کا ذکر آیا ہے؛ چنانچہ حضرت انسؓ کی جو روایت اوپر آچکی ہے، اس میں "اَنْفُسِكُمْ" کا لفظ بھی ہے، (۱) جہاد بالنفس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ راہ حق میں انسان اپنی زندگی کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے، ایسی صورت میں یہ تلوار سے جہاد کے معنی میں ہوگا، اور اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں بعض مواقع پر تلوار سے جہاد کے لئے جہاد بالنفس کی تعبیر بھی استعمال کی گئی ہے؛ لیکن جہاد بالنفس کے ایک معنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے میں مشقت برداشت کرنے اور گناہوں سے بچنے میں جو تکلیف ہوتی ہے، اس پر صبر کرنے کے بھی ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "الحج جهاد كل ضعيف" (۲) ہر کمزور آدمی کا جہاد حج ہے، حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا: کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نعم عليهن جهاد، لا قتال فيه : الحج والعمرة" (۳) "ہاں، عورتوں پر

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۵۵۵۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ، عن ام سلمۃ: ۱۲۶۵۶۔

(۳) سنن ابن ماجہ: ۲۹۰۱، نیز دیکھئے: صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۳۷۰۲۔

جہاد ہے ؛ لیکن ایسا جہاد جس میں قتال کی نوبت نہیں آتی ، یعنی : حج اور عمرہ'' ان احادیث کی وضاحت کرتے ہوئے شارحین نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت اہم ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

المراد جهاد النفس لما فيه من إدخال المشقة على البدن والمال ۔ (۱)

حج کو جہاد قرار دینے سے مراد جہاد نفس ہے ؛ اس لئے کہ انسان اس میں بدنی اور مالی مشقت سے دو چار ہوتا ہے۔

بخاری کے ایک دوسرے شارح علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں :

و إنما قيل للحج جهاداً ؛ لأنه يجاهد فى نفسه بالكف عن شهواتها والشيطان ۔ (۲)

حج کو جہاد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی خواہشات سے اور شیطان سے جہاد کرتا ہے۔

حج کے علاوہ جہاد بالنفس کی بعض اور صورتیں بھی حدیث میں آئی ہیں ؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہے :

جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فأستأذنه في الجهاد ، فقال : أحيي والداک ؟ قال : نعم ، قال : ففيهما فجاهد ۔ (۳)

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے ، اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی ، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا : تمہارے والدین زندہ ہیں ؟ انھوں نے کہا : ہاں ! آپ ﷺ نے فرمایا : ان ہی دونوں میں جہاد کرو۔

---

(۱) فتح الباری لابن حجر : ۳/۳۸۱۔ (۲) عمدۃ القاری : ۹/۱۳۴۔

(۳) صحیح البخاری ، حدیث نمبر : ۳۰۰۴ ، نیز دیکھئے : مصنف ابن ابی شیبہ ، حدیث نمبر : ۳۳۴۵۶۔

یعنی والدین کی خدمت کو بھی جہاد قرار دیا گیا؛ کیوں کہ اس میں مشقت بھی ہوتی ہے، اور بوڑھاپے میں والدین کے مزاج میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے تو ان کی ڈانٹ ڈپٹ سننا نفس کو شاق بھی گزرتا ہے۔

جہاد بالنفس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ جہاد کا حق ادا کرو: ''وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ'' (الحج:۷۸) کو بہت سے شارحین نے جہاد بالنفس ہی پر محمول کیا ہے، یا کم سے کم اس کو بھی اس جہاد میں شامل رکھا ہے، حضرت حسنؒ نے حق جہاد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :

أن تؤدي جميع ما أمرک الله عزوجل به ، وتجتنب جميع مانهاک الله عنه ، وأن تترک رغبة الدنيا لرهبة الآخرة ـ (۱)

حقِ جہاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، ان پر عمل کرو، اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے، ان سے باز رہو، اور آخرت سے ڈر کر دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو۔

علامہ ابومنصور ماتریدیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

جاهدوا أنفسكم في شهوتها وأمانيها ، أو جاهدوا أعداء الله في دفع الوسواس والمحاربة معهم ـ (۲)

اپنے نفس کی خواہشات اور آرزوؤں پر غلبہ پانے کے لئے نفس سے جہاد کرو، یا اللہ کے دشمنوں سے ان کے وساوس کو دُور کر کے اور ان کے ساتھ جنگ کر کے جہاد کرو۔

---

(۱) تفسیر السمرقندی: ۲/۴۴۹۔

(۲) تفسیر الماتریدی: ۴۴۶/۶۔

علامہ نیساپوریؒ فرماتے ہیں :

فجهاد النفس بتزكيتها بأداء الحقوق وترك الحظوط ۔ (۱)

نفس سے جہاد یہ ہے کہ حقوق ادا کر کے اور خواہشات سے بچ کر نفس کو صاف ستھرا کیا جائے۔

غرض کہ قرآن وحدیث میں جہاد کی ایک قسم جہاد بالنفس بھی بتلائی گئی ہے، اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ ایک فوجی مہم سے واپس ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے کہا :

قدمتم خير مقدم ، وقدمتم من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر ۔ (۲)

تمہارا آنا مبارک ہو، تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔

قرآن مجید کے ذریعہ جہاد

(۴) جہاد کی چوتھی قسم جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، ''جہاد بالقرآن'' ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ، فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔ (۳)

اگر ہم چاہتے تو ہر آبادی میں ایک اللہ سے ڈرانے والے کو بھیج دیتے؛ لہٰذا آپ کافروں کی بات نہ مانئے اور ان سے قرآن کے ذریعہ بڑا جہاد کیجئے۔

---

(۱) غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنیسابوری: ۵/۱۰۴۔

(۲) کنز العمال، حدیث نمبر: ۱۱۷۷۹۔ (۳) الفرقان: ۵۱-۵۲۔

اس آیت میں "جَاهِدْهُمْ بِهٖ" کے الفاظ ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے قرآن مجید مراد ہے :

قال ابن عباس : قوله (فلا تطع الكافرين وجاهدهم به) قال : بالقرآن ۔ (۱)

علامہ سمرقندیؒ نے بھی یہی تشریح کی ہے :

وجاهدهم به أي بالقرآن جهادا كبيرا ، يعني شديدا ۔ (۲)

مفسرین کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں اسلام اور دین کے ذریعہ جہاد مراد ہے :

وجاهدهم به جهادا كبيرا ، قال : يريد الاسلام والدين ۔ (۳)

بہر حال قرآن مجید مراد ہو، یا اسلام، یا دین، سب کا ماحصل ایک ہی ہے کہ غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت پیش کی جائے ؛ کیوں کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں، ان کو ایمان کی طرف لانا بھی ایک مشکل اور دشوار کام ہے، اور اس میں بھی مجاہدہ کی نوبت آتی ہے ؛ اس لئے یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے ؛ بلکہ اہم قسم ہے ؛ کیوں کہ تلوار سے جہاد کا بھی اصل مقصد اور دعوت اسلام میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کو دُور کرنا ہے، اس آیت میں جہاد سے جہاد بالسیف (تلوار سے جہاد) مراد نہیں ہوسکتا، علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس سے جہاد بالسیف مراد لینا حقیقت سے بعید ہے ؛ کیوں کہ یہ مکہ میں نازل ہونے والی سورت ہے اور اس وقت نازل ہوئی ہے، جب کہ تلوار سے جہاد کا حکم ہی نہیں آیا تھا :

وقيل : بالسيف ، وهذا فيه بعد ؛ لأن السورة مكية نزلت قبل الأمر بالقتال ۔ (۴)

یہی بات الفاظ کے فرق کے ساتھ امام رازیؒ نے لکھی ہے ۔ (۵)

---

(۱) تفسیر الطبری: ۱۹/ ۲۸۰۔ (۲) تفسیر السمرقندی: ۲/ ۵۴۱۔

(۳) تفسیر ابن ابی حاتم: ۸/ ۲۷۰۷۔ (۴) تفسیر القرطبی: ۱۳/ ۵۸۔ (۵) مفاتیح الغیب: ۲۴/ ۴۷۴۔

تلوار سے جہاد

(۵) جہاد کی پانچویں قسم ''جہاد بالسیف'' (تلوار سے جہاد) ہے، اس کے لئے عام طور پر قتال کا لفظ آیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا۔ (۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں، اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

مختلف الفاظ اور مختلف صیغوں کے ساتھ مختلف آیتوں میں قتال کا حکم آیا ہے۔

قرآن کے اس حکم میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں: اول یہ کہ قرآن نے ایک طرفہ قتل کا حکم نہیں دیا ہے، جس میں ایک فریق دوسرے کو قتل کر دیتا ہے، اور دوسرے فریق کی طرف سے کوئی اقدام نہ ہو، قتال کے معنی یہ ہیں کہ دونوں فریق کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف قتل کا اقدام پایا جائے، اور ظاہر ہے کہ جب دوسرے فریق کی طرف سے قتل کا اقدام ہو تو اس کے مقابلہ میں قتل کا اقدام عین تقاضۂ انصاف ہے۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام ایسا دین نہیں ہے، جو اپنے ماننے والوں سے صرف عبادت کا مطالبہ کرتا ہو؛ بلکہ وہ ایک جامع نظام حیات ہے، جو فرد کی اصلاح سے لے کر ایک منصف مزاج اور عدل پرور سلطنت تک کا تصور پیش کرتا ہے؛ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو اس وقت نہ وہاں کوئی حکومت تھی، نہ لا اینڈ آرڈر کا کوئی اور نظام تھا؛ اس لئے آپ ﷺ نے وہاں پہلی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی، جس کے شہری مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی تھے، سبھوں کے ساتھ عدل، مذہبی آزادی، معاشی ترقی کے مساوی مواقع اور بے لاگ انصاف اس سلطنت کے بنیادی اُصول تھے، سلطنتوں کو اپنی حفاظت

---

(۱) البقرۃ: ۱۹۰۔

کے لئے فوج کی اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے حسبِ ضرورت جنگ کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، دنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کوئی ایسا ملک تھا، جس نے بیرونی یلغار سے حفاظت کا انتظام نہیں کیا ہو اور نہ آج کوئی ایسا ملک ہے؛ بلکہ آج تو صورت حال یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور اقوام دوسروں کو کچلنے، ان کے معاشی وسائل پر قبضہ کرنے اور پوری پوری قوم کو غلام بنانے کے لئے جنگ کرتی ہیں؛ اس لئے اپنی حفاظت اور معاندین کی سرکوبی کے لئے جہاد بمعنی قتال ایک ضروری حکم ہے اور یہ ایسی بات نہیں ہے، جسے برا سمجھا جائے۔

حاصل یہ ہے کہ اس وقت جو پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ جہاد مارکاٹ اور غیر مسلموں کے قتل عام کا نام ہے، یہ بات درست نہیں ہے، جہاد کی مختلف قسمیں ہیں، اور ان میں سے بیشتر وہ ہیں، جن میں لوہے کی تلوار نہیں اخلاق اور محبت کی تلوار استعمال کی جاتی ہے۔



جہاد کن لوگوں سے ہے اور اس کا مقصد ظلم کا خاتمہ ہے یا کفر کا؟

عام طور پر اسلام کو بدنام کرنے والوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کا مقصد کافروں کو دنیا سے ختم کر دینا ہے، اس لئے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جہاد کا مقصد اور اس کی علت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا مقصد کسی خطہ سے کافروں کا خاتمہ کر دینا اور کفر کو مٹا دینا نہیں ہے، خود قرآن مجید کی آیات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں چند آیات کا نقل کرنا مناسب ہوگا۔

آیاتِ قرآنی

(۱) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (۱)

دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ ہدایت آشکارا ہو چکی ہے، تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے مضبوط ڈوری تھام لی، جو ٹوٹ نہیں سکتی، اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں۔

اس آیت میں قرآن مجید نے مذہب کے بارے میں ایک بنیادی اُصول پر روشنی ڈالی ہے، اور وہ یہ کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے، اگر کسی شخص کو ایمان کی توفیق نہ ہو تو اس کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، جب مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تو ان سے کفر کی وجہ سے قتال کی اجازت کیسے ہوگی؟

---

(۱) البقرة:۲۵۶۔

(۲) اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ (الحج:۳۹)

جن لوگوں سے جنگ کی جاتی ہے، ان کو بھی قتال کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم ہیں، اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ قتال کی اجازت کے سلسلہ میں نازل ہونے والی یہ پہلی آیت ہے، (۱) یہ آیت واضح کرتی ہے کہ چوں کہ مشرکین مسلمانوں سے جنگ کے درپے تھے اور ان پر حملہ کر رہے تھے، اس بنیاد پر مسلمانوں کو ان سے جہاد کی اجازت دی گئی، گویا جہاد کا مقصد کفر کو، کافروں کو یا ان کے اقتدار کو ختم کرنا نہیں تھا؛ بلکہ اس کا مقصود ظلم کو روکنا تھا۔

(۳) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ، وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ (البقرہ:۱۹۰-۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کرو، جو تم سے قتال کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ ہو، تم ان سے لڑو، اور جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، تم بھی ان کو وہاں سے نکالو (اس لئے کہ قتل اگرچہ برا فعل ہے؛ مگر) فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

---

(۱) سنن نسائی، باب وجوب الجہاد: ۳۰۳۵، ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۹۵۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے لڑائی کرتے ہوں، ان سے جہاد کرنے کا حکم ہے، اور اس آیت میں ہی اس بات کا بھی اشارہ موجود ہے کہ اگر دوسرے فریق کی طرف سے اس طرح کی بات پیش نہیں آئے، تب ان پر حملہ کرنا زیادتی میں شامل ہے، اور زیادتی سے بچنا ضروری ہے، ہاں، اپنے قومی وجود کے تقاضوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو گروہ آمادۂ جنگ ہو، جہاں کہیں بھی ان کا سامنا ہو، ان کا مقابلہ کرو۔

(۴) وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ (البقرہ:۱۹۱)

مسجد حرام کے پاس ان سے جنگ نہ کرو، سوائے اس کے کہ وہ تم سے وہاں جنگ کریں، تو اگر وہ تم سے قتال کریں تو تم بھی ان کو قتل کرو، یہی ہے ایسے کافروں کی سزا۔

حدودِ حرم میں جنگ کی ممانعت تھی، اور عرب بھی اس روایت کے پاسدار تھے؛ چنانچہ اس آیت میں مسلمانوں کو واضح ہدایت دی گئی ہے کہ حدودِ حرم میں جب تک دشمن تم پر حملہ آور نہ ہو اور حملہ نہ کرے تم اپنے ہاتھ کو روکے رکھو۔

حرام مہینوں میں بھی خاص طور پر جنگ کی ممانعت تھی؛ اس لئے قرآن مجید نے ایک دوسرے موقع پر ہدایت دی کہ ان مہینوں میں خاص طور پر اس کا خیال رکھا جائے کہ مسلمان حملہ کرنے میں پہل نہیں کریں؛ البتہ اگر دوسرا فریق حملہ آور ہو تو اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

(۵) اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ (البقرہ:۱۹۴)

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ ہے، اور ادب وحرمت کا پاس رکھنے میں بھی برابری ہے۔

اس ہدایت میں یہی اُصول مقرر کیا گیا ہے کہ قتال کے معاملہ میں مساویانہ طرزِ عمل ہونا

چاہئے ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ دشمن تو ہم پر حملہ آور ہو، وہ وقت اور مقام کی حرمت کا کوئی لحاظ نہ کرے اور ہم یک طرفہ طور پر اس کا لحاظ کریں۔

(٦) وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الانفال:۳۹)

اور مشرکین سے قتال کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

فتنہ سے مراد ہے مسلمانوں کو ان کے دین سے روکنا، حضرت عروہ بن زبیرؓ اور دیگر علماء سے یہی منقول ہے :

... أي حتى لا يفتن مؤمن عن دينه ۔(۱)

مومن کو اس کے دین سے ہٹایا نہ جائے۔

یہی بات صاحب تفسیر خازن نے لکھی ہے :

يعني لا يفتن مؤمن عن دينه ۔ (۲)

علامہ ابن کثیرؒ نے بھی حضرت عروہ بن زبیرؓ اور دیگر اہل علم کا یہی نقطۂ نظر نقل کیا ہے :

... حتىٰ لا يفتن مسلم عن دينه ۔ (۳)

علامہ فخر الدین رازیؒ نے حضرت عروہ بن زبیرؓ ہی کے حوالہ سے اس کی تفصیلی وضاحت کی ہے :

كان المؤمنون في مبدأ الدعوة يفتنون عن دين الله ، فافتتن من المسلمين بعضهم وأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم المسلمين أن يخرجوا الىٰ الحبشة ،

---

(۱) تفسیر القرآن العظیم لابن أبي حاتم، قولہ تعالیٰ: ''وقاتلوهم حتىٰ لا تكون فتنة'': ۱۷۰۱/۵۔

(۲) تفسیر خازن، المسمی: لباب التاویل فی معانی التنزیل، سورۃ الانفال: ۳۲/۳۔

(۳) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر: ۸۳/۴، سورۃ الانفال، آیت نمبر: ۳۸-۴۰۔

وفتنة ثانية وهو أنه لما بايعت الأنصار رسول الله صلى الله عليه سلم بيعة العقبة، توامرت قريش أن يفتنوا المؤمنين بمكة عن دينهم، فأصاب المؤمنين جهد شديد، فهذا هو المراد من الفتنة فأمر الله تعالىٰ بقتالهم حتىٰ تزول هذه الفتنة۔ (۱)

دعوت کے ابتدائی دنوں میں مسلمانوں کو اللہ کے دین سے ہٹانے کے لئے تنگ کیا جاتا تھا، بعض مسلمان اس آزمائش کا شکار ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم فرمایا، دوسرا فتنہ اس وقت پیدا ہوا جب انصار نے آپ ﷺ کے ہاتھوں پر بیعت عقبہ کی، تو قریش نے باہم مشورہ کیا کہ مسلمانوں کو مکہ میں ان کے دین سے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے؛ چنانچہ مسلمانوں کو بڑی تکلیف پہنچائی گئی: لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان سے قتال کا حکم دیا؛ تاکہ مسلمان اس فتنہ سے محفوظ ہو جائیں۔

غرض کہ مقصد یہ نہیں ہے کہ تمام کافروں سے دنیا خالی کر دی جائے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے دین پر عمل کرنے میں جو رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے، اس رکاوٹ کا خاتمہ کر دیا جائے:

(۷) اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا،

(۱) التفسیر الکبیر لفخر الدین الرازی، سورۃ الانفال، آیت نمبر: ۴۱/ ۱۵/ ۴۸۳-۴۸۴۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا۔ (النساء:۹۰-۹۱)

سوائے ان لوگوں کے جو ایسی قوم کے ساتھ جا ملیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ تم سے جنگ کا حوصلہ نہ پاتے ہوں، ان کے دل تم سے یا خود اپنی قوم سے جنگ کرنے سے تنگ ہوں اور اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کر دیتے؛ چنانچہ وہ تم سے جنگ کرتے؛ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی پیشکش کریں تو اللہ نے ان کے خلاف تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے، اب تم کچھ اور لوگوں کو دیکھو گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی؛ (لیکن) جب بھی ان کو فساد کی طرف بلایا جاتا ہے تو اُلٹے منہ اس میں پلٹ پڑتے ہیں، تو اگر وہ تم سے (جنگ کرنے سے) باز نہ رہیں، تم سے صلح کی پیشکش نہ کریں اور اپنے ہاتھ روکے نہ رکھیں تو تم بھی ان کو پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کر دو، اور یہ وہ لوگ ہیں، جن کے خلاف ہم نے تمہارے لئے کھلی ہوئی دلیل فراہم کر دی ہے۔

یہ آیت صاف بتلاتی ہے کہ جو اہل کفر مسلمانوں سے جنگ کے درپے نہ ہوں، صلح کر لیں، یا صلح چاہتے ہوں، یا الگ تھلگ اور غیر جانب دار ہوں، ان سے قتال کا حکم نہیں ہے، ہاں، اگر وہ صلح کے لئے اور پُر امن طور پر رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہیں، تو ان سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہ بات جو اس آیت میں فرمائی گئی ہے کہ مشرکین کو

جہاں پاؤ، گرفتار کرو اور قتل کرو، اس نے اس بات کو بے غبار کر دیا ہے کہ یہ حکم تمام کفار و مشرکین کے لئے نہیں ہے، ان لوگوں کے لئے ہے، جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں۔

(۸) لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (الممتحنہ:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حُسن سلوک اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتے، جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے درپئے قتال نہ ہوں اور ان کو ان کے وطن سے بے وطن نہ کریں، ان سے قتال کا حکم نہیں ہے، قتال کا حکم ان لوگوں سے ہے، جن کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہو، یعنی وہ مسلمانوں سے قتال کرنے کے درپے ہوں۔

(۹) اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ (التوبہ:۱۳)

کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے، جو خود اپنی قسموں کو توڑ چکے ہیں، اور جنھوں نے رسول کو نکال دینے کا ارادہ کر لیا تھا، اور انھوں نے خود تم سے چھیڑ خانی میں پہل کی ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو بے وطن کر دیا، اُن کفار و مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، دوسری جگہوں پر جہاں مطلقاً مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، اس سے بھی وہی لوگ مراد ہیں، جنھوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا، اور مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا، علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ''المراد بالمشرکین فی قولہ سبحانہ فاقتلوا المشرکین : الناکثون''۔(۱)

(۱) روح المعانی: ۷/۱۵۶۔

(۱۰) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۔ (النساء:۷۵)

اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو، جو کمزور پا کر دبا لئے گئے، جو فریاد و دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال دیجئے، جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے!

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ ہجرت فرمائی تو مشرکین مکہ نے بہت سے لوگوں کو زبردستی روک لیا، جن میں جوان تو کم تھے، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد تھی، یہ ان کے ظلم وستم کا شکار تھے، اور اتنے بے بس تھے کہ سوائے دعاء کے ان کے پاس کوئی اور سہارا نہیں تھا، اس موقع پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے ان سے جہاد کریں۔(۱)

ظاہر ہے یہاں بھی مظلوموں کو ظلم سے بچانے کے لئے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔

(۱۱) فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۔ (محمد:۴)

تو جب تمہارا مقابلہ ایمان نہ لانے والوں سے ہوجائے (یعنی وہ تمہارے مقابلہ پر آجائیں) تو ان کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو پھر مضبوطی کے ساتھ قید کرلو، اب اس کے بعد یا تو احسان کرو (یعنی بلا معاوضہ چھوڑ دو) یا معاوضہ لے کر رہا کردو، جب تک لڑنے والے ہتھیار نہ ڈال دیں۔

---

(۱) تفسیر خازن: ۱/ ۳۹۸-۳۹۹۔

اس آیت میں ہدایت دی گئی ہے کہ جب کسی گروہ سے جنگ کی نوبت آہی جائے تو اول توان کی اچھی طرح سرکوبی کی جائے؛ تاکہ پھران کو سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہو، اس کے بعد جب وہ سپر انداز ہوجائیں توان کو قید کرلیا جائے، قید کرنے کے بعد اُصولی طور پر ان کے ساتھ دوطرح کا رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے، ایک یہ کہ انھیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے فدیہ کا مطالبہ کیا جائے اور فدیہ لینے کے بعد رہا کر دیا جائے، اگر قتال کا مقصد کفر کو یا کافروں کو ختم کر دینا ہوتا تو قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جاتا نہ کہ فدیہ لے کر یا فدیہ لئے بغیر رہا کر دینے کا۔

(۱۲) مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (المائدہ:۳۲)

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ بات لکھ دی ہے کہ جس نے کسی کو — کسی شخص کو قتل کرنے یا زمین میں فساد مچانے کے جرم کے بغیر — قتل کر دیا؛ گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا، اور جس نے ایک جان کی زندگی بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کو بچایا۔

یہ آیت اس بات کو بتاتی ہے کہ کسی شخص کا قتل دو ہی صورتوں میں جائز ہوسکتا ہے، یا تو اس نے کسی کو بلا وجہ ظلماً قتل کر دیا ہو، یا اس نے زمین میں فساد مچایا ہو، فساد ایسے فعل کو کہتے ہیں، جس سے دوسرے لوگ متاثر ہوں، جیسے وہ ڈاکہ ڈالتا ہو، بے قصور لوگوں پر حملہ کرتا ہو، معاشرہ کے امن کو پامال کرتا ہو، وہ گناہ جس کا اثر خود اس کی ذات سے متعلق ہو، دوسروں کو اس کا ضرر نہیں پہنچتا ہو، یہ فساد میں شامل نہیں ہے، کفر بھی ایسے ہی گناہوں میں ہے، جس کا تعلق اس کی ذات سے ہے اور جس کی سزا اس کو آخرت میں ملے گی۔

(۱۳) وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً۔ (التوبہ:۳۶)

جس طرح مشرکین تم سبھوں سے جنگ کرتے ہیں، اسی طرح تم بھی
ان تمام مشرکین سے قتال کرو۔

یہ آیت بھی واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دشمنوں کے جنگی اقدام کے جواب میں دیا گیا ہے جس گروہ کا ہر فرد مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، اس کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد آیات ہیں، جن میں آمادۂ جنگ لوگوں (محاربین) اور ظلم کرنے والوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ ان لوگوں سے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شامل نہ ہوں اور غیر جانبدار رہیں، اس کے علاوہ جس غیر مسلم علاقہ پر فتح حاصل کی جائے، ان سے جزیہ پر اکتفاء کرنے کی اجازت دی گئی ہے، (التوبہ: ۲۹) اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اگر اسلام کا مقصد اہل کفر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہوتا تو ظاہر ہے کہ یہ احکام نہیں دیئے جاتے۔

احادیثِ نبوی

قرآن مجید کے بعد احکام شرعیہ کا دوسرا ماخذ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال ہیں، جہاں تک آپ کے ارشادات کی بات ہے تو آپ نے مجاہدین کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا :

انطلقوا باسم الله ، وبالله وعلیٰ ملة رسول الله ولا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا صغيرا ولا امرأة ۔ (۱)

اللہ کے نام سے، اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر (جہاد کے لئے) جاؤ، کسی بوڑھے آدمی کو قتل نہ کرنا، نہ چھوٹے بچہ کو قتل کرنا، اور نہ کسی عورت کو قتل کرنا۔

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا :

لا تجهزن علی جريح ولا يتبعن مدبر ولا يقتلن أسير ومن أغلق بابه فهو آمن ۔ (۲)

(۱) ابوداؤد عن انس، حدیث نمبر: ۲۶۱۴۔ (۲) فتوح البلدان: ۱/ ۴۹۔

کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، نہ بھاگنے والے کا پیچھا کیا جائے اور نہ قیدی کو قتل کیا جائے، نیز جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، وہ مامون ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے مذہبی پیشواؤں کو بھی قتل کرنے سے منع فرمایا؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں :

عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه قال : كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا بعث جيوشه قال : أخرجوا باسم الله ، تقاتلون في سبيل الله من كفر بالله ، لا تغدروا ، ولا تغلوا ، ولا تمثلوا ، ولا تقتلوا الولدان ولا أصحاب الصوامع ۔ (۱)

جب رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کو بھیجتے تو فرماتے : کافروں سے اللہ کے راستہ میں قتال کرو، نہ دھوکہ دو، نہ خیانت کرو، نہ مُثلہ کرو، نہ بچوں کو قتل کرو اور نہ ہی صوامع والوں (مذہبی پیشواؤں) کو قتل کرو۔

یہ اور اسی طرح کے اور بھی فرامین نبوی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مشرک و کافر کو قتل کر دینا اسلام کا منشاء نہیں ہے، قتال کا مقصد کفر یا کافروں کو ختم کرنا نہیں ؛ بلکہ فتنہ و فساد اور ظلم و عناد کو روکنا ہے۔

اگر رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کو دیکھا جائے تو اس میں بھی صاف طور پر اسی اُصول کی جھلک نظر آتی ہے۔

- چنانچہ غزوۂ بدر میں (۷۰) مشرکین قید کئے گئے، آپ ﷺ نے ان کو فدیہ لے کر یا بلا فدیہ رہا فرما دیا۔
- سنہ ۶ ھ میں آپ عمرہ کے لئے اپنے رفقاء کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے،

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۲۸۔

سارے مسلمان احرام کے لباس میں تھے، اور عرب کی روایت تھی کہ کوئی شخص عمرہ کرنے کے لئے آتا تو اسے روکا نہیں جاتا؛ لیکن اہل مکہ نے اس روایت کے برخلاف مسلمانوں کو روک دیا، اس وقت مسلمان ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے موقف میں تھے، صحابہؓ قتال کرنا چاہتے تھے، اور ان کو احساس تھا کہ یہاں تک آکر واپس ہو جانا مسلمانوں کی تذلیل ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے قتال سے بچنے کے لئے اہل مکہ کی شرطوں پر صلح کرلی۔

● جب مکہ فتح ہوا تو تمام مشرکین مکہ جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے، آپ کے سامنے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ان سب کے لئے عفو عام کا اعلان کر دیا، جو انسانی تاریخ کا ایک بے نظیر واقعہ ہے؛ حالاں کہ اگر آپ چاہتے تو ان میں ایک ایک شخص کو مسلمان موت کے گھاٹ اُتار دیتے اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ ان کے قتل کا پورا پورا جواز فراہم کر رہا تھا۔

● مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبائل تھے، آپ نے ان سب سے امن کا معاہدہ کیا تھا۔

● سب سے پہلے بنو قینقاع نے عہد شکنی کی، مسلمانوں نے ان پر قابو حاصل کرلیا، پھر بھی آپ ﷺ نے قتال سے بچتے ہوئے ان کو شام کی طرف جلا وطن فرما دیا۔

● پھر بنو نضیر نے عہد شکنی کی، مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا، آپ چاہتے تو ان پر قتل عام کا حکم جاری کر دیتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا؛ البتہ ان کے شر سے بچنے کے لئے انھیں خیبر کو جلا وطن کر دیا، سب سے بدترین رویہ بنو قریظہ نے اختیار کیا، جنھوں نے عین حالت جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، اور مشرکین کے ساتھ جا ملے، پھر بھی آپ ﷺ نے اپنی طرف سے ان کے قتل کا فیصلہ نہیں فرمایا؛ بلکہ فرمایا کہ وہ کسی کو حَکَم بنالیں، حَکَم جو فیصلہ کرے، اس کو دونوں فریق تسلیم کرلیں، انھوں نے اپنے حلیف حضرت سعد بن معاذؓ کو حَکَم بنایا، ان کے فیصلہ کے مطابق عورتیں اور بچے گرفتار کر لئے گئے، اور فوجی قتل کر دیئے گئے۔

• قبیلۂ بنوحنیفہ کے ایک شخص ثمامہ بن اثال جو مشرک تھے، گرفتار کئے گئے اور قید ہو کر آئے، نہ آپ نے ان کو ایمان لانے پر مجبور کیا، نہ ان کے قتل کا حکم جاری فرمایا؛ بلکہ ان کو رہا کر دیا۔

• صفوان بن اُمیہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان نہیں لائے اور غزوۂ حنین میں آپ کے ساتھ حاضر ہوئے، (۱) آپ ﷺ ان کو مسلمان ہونے پر مجبور کر سکتے تھے؛ لیکن آپ نے انھیں مجبور نہیں کیا، بالآخر وہ خود مسلمان ہو گئے۔

• غیر مسلم عورتوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ یہی رویہ اختیار کیا کہ انھیں قتل نہیں کیا جائے۔

• غرض کہ آپ ﷺ کے اقوال اور آپ ﷺ کا عملی سلوک دونوں اس بات پر شاہد ہیں کہ قتال کا مقصد کفر کو اور کافروں کو ختم کرنا نہیں ہے؛ بلکہ ظلم و جبر کو روکنا ہے۔

اہلِ علم کا نقطۂ نظر

اسی لئے سلف صالحین نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ قتال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہر کافر کو تہ تیغ کر دیا جائے، علامہ طبریؒ فرماتے ہیں:

> و إن مالوا إلى مسالمتک ومتارکتک الحرب ، إما بالدخول في الإسلام ، و إما بإعطاء الجزية ، و إما بموادعة ، ونحو ذالک من أسباب السلام والصلح ، فاجنح لها ، يقول : فمل إليها وابذل لهم ما مالوا إليه من ذالک وسألوک ۔ (۲)
>
> اگر وہ (دشمن) تمہارے ساتھ صلح اور جنگ بندی پر آمادہ ہو جائیں، چاہے اسلام قبول کر کے، یا جزیہ دے کر، یا صلح کر کے، چاہے وہ کسی قسم کی اور کسی انداز کی بھی صلح ہو تو تم بھی صلح پسندی کا ثبوت دینا، اور جو چاہیں وہ کر دینا اور دے دینا۔

---

(۱) مؤطا امام مالک، النکاح، حدیث نمبر:۲۰۰۱۔ (۲) تفسیر طبری: ۱۴/۴۰۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ جب کفار کی طرف سے جنگ وفساد کا ارتکاب ہو تب ان سے جنگ کی جائے :

الکفار إنما یقاتلون بشرط الحراب ، کما ذهب إلیه جمهور العلماء ، وکما دل علیه الکتاب والسنة ۔ (۱)

کفار سے جنگ اسی شرط پر کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں سے جنگ کریں، جیسا کہ جمہور علماء کا مسلک ہے اور اسی پر کتاب وسنت کی دلیل قائم ہے۔

اسی طرح اپنی مشہور تالیف ''الصارم المسلول'' میں لکھتے ہیں :

فأمر بقتال الذین یقاتلون فعلم أن شرط القتال کون المقاتل مقاتلا ۔ (۲)

اللہ نے جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کے لئے یہ شرط ہے کہ جس کے خلاف جنگ چھیڑی جائے، وہ جنگ کر رہا ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے تلمیذ رشید علامہ ابن قیمؒ رسول اللہ ﷺ کا معمول مبارک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

إنما کان (صلی اللہ علیه وسلم) یقاتل من یحاربه ، وأما من سالمه وهادنه فلم یقاتله ۔ (۳)

رسول اللہ ﷺ صرف اسی سے جنگ کرتے تھے، جو خود جنگ کرتا تھا، جو صلح کرتا تھا، آپ ﷺ اس سے جنگ نہیں کرتے تھے۔

---

(۱) النبوات: ۱۴۰۔

(۲) الصارم المسلول: ۲۸۲۔

(۳) ہدیۃ الحیاری: ۲۳۷۔

ان آیات واحادیث، رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ اوران دلائل کی بنیاد پر معتبر اہل علم کی رائے اس بات کو دوپہر کی دھوپ کی طرح واضح کر دیتی ہے کہ جہاد کا مقصد زور زبردستی سے لوگوں کو مسلمان بنانا، کفر اور اہل کفر کا دنیا سے خاتمہ کر دینا اور طاقت کے زور پر سبھوں کو مسلمان بنا لینا ہرگز نہیں ہے، قرآن نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ادیان ومذاہب کا اختلاف مشیت الٰہی کا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہی نہیں ہے کہ اس دنیا میں صرف مسلمان زندہ رہیں :

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

اگر آپ کے پروردگار کو منظور ہوتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں، سب ایمان لے آتے، توکیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں گے؟

اس لئے ظاہر ہے کہ صرف کافر ہونا کسی گروہ سے قتال کا سبب نہیں ہوسکتا؛ اس لئے یہ ایک نفرت انگیز پروپیگنڈہ ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ہر کافر سے جنگ کرنا ہے اور جنگ کے جواز کے لئے کفر کا وجود کافی ہے۔



اسلام میں جنگ کے قوانین ☆

جنگ یقیناً ایک ناپسندیدہ فعل اور ایک برائی ہے؛ لیکن چوں کہ انسان کی سرشت میں ظلم کے عناصر بھی رکھے گئے ہیں، اس لئے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ جنگیں ہوتی رہی ہیں، ظالم بادشاہوں اور ڈکٹیٹر حکمرانوں نے اقتدار کے لئے جنگ کی ہے، منصف مزاج فرماں رواؤں نے ظلم کو دُور کرنے اور اپنا دفاع کرنے کے لئے جنگیں کی ہیں اور تقریباً دنیا کے تمام ہی مذاہب نے شر وفساد کو روکنے اور مظلوموں کا دفاع کرنے کے لئے جنگ کو آخری چارۂ کار کے طور پر جائز قرار دیا ہے؛ لیکن اہم بات یہ ہے کہ جنگ کے آداب کیا ہیں، کیا اس کے لئے کچھ قواعد وضوابط اور حدود بھی مقرر ہیں یا انسان درندوں کی طرح اپنے مخالفین کو چیر پھاڑ دے اسی کا نام جنگ ہے، یہ جنگ کا بہت اہم پہلو ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی ضابطہ قانون نہیں تھا، اسلام نے جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، حدیث میں اس کی بڑی وضاحت آئی ہے اور فقہاء نے ان کو سامنے رکھ کر پورا قانون جنگ مرتب کیا ہے، جس کے اہم نکات یہ ہیں :

غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً آخر شب میں جب کہ لوگ بے خبر سوتے ہوتے اچانک جا پڑتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس عادت کو بند کر دیا اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے، حضرت انس بن مالکؓ غزوۂ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ: "كان اذا جاء قوماً بليل لم يغر عليهم حتى يصبح" (آنحضرت ﷺ جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے)۔

☆ آگے جو تحریر جو نقل کی جارہی ہے، وہ معروف مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے، دیکھئے: الجہاد فی الاسلام: ۱۹۴-۲۰۷۔

آگ میں جلانے کی ممانعت

عرب اور غیر عرب شدتِ انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دیا، حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :

لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار ۔
آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزا وار نہیں ۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ اگر فلاں دو آدمی تم کو ملیں تو ان کو جلا دینا، مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو بلا کر فرمایا :

انی امرتکم ان تحرقوا فلانا وفلانا وان النار فلا یعذب بها الا الله ، فان وجدتموها ، فاقتلوهما ۔
میں نے تم کو حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص کو جلا دینا، مگر آگ کا عذاب سوائے خدا کے کوئی نہیں دے سکتا ، اس لئے اگر تم انھیں پاؤ تو بس قتل کر دینا ۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دیا تھا، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے انھیں روکا اور نبی ﷺ کا یہ حکم بیان کیا کہ: "لا تعذبوا بعذاب الله" (آگ اللہ کا عذاب ہے، اس سے بندوں کو عذاب نہ دو) ۔

قتلِ صبر کی ممانعت

رسول اللہ ﷺ نے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر مارنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے، عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ عبد الرحمٰن بن خالد کے ساتھ جنگ پر گئے تھے ایک موقع پر ان کے لشکر اعدا میں سے چار گبر پکڑے ہوئے آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ انھیں باندھ کر قتل کیا جائے، اس کی اطلاع جب حضرت ایوب انصاریؓ کو ہوئی تو انھوں نے کہا :

سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن قتل الصبر فو الذی نفسی بیده لو کانت الدجاجة ما صبرتها ، فبلغ ذالک عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید فاعتق اربعة رقاب۔

میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر (باندھ کر مارنے) سے منع فرمایا، خدا کی قسم! اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اس کو اس طرح باندھ کر نہ مارتا، اس کی خبر جب عبدالرحمٰن بن خالد کو پہنچی تو انھوں نے چار غلام آزاد کردیے (اپنی غلطی کا کفارہ ادا کیا)۔

لوٹ مار کی ممانعت

جنگ خیبر میں صلح ہوجانے کے بعد جب اسلامی فوج کے بعض نئے رنگروٹ بے قابو ہوگئے اور انھوں نے غارت گری شروع کردی تو یہودیوں کا سردار رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کرخت لہجہ میں آپ ﷺ کو خطاب کر کے بولا: ’’محمد ألکم ان تذبحوا حمرنا وتاکلوا ثمرنا وتضربوا نسائنا؟‘‘ (اے محمد! کیا تم کو زیبا ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کرو، ہمارے پھل کھا جاؤ اور ہماری عورتوں کو مارو؟) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فوراً ابن عوف کو حکم دیا کہ لشکر میں ’’اجتمعوا للصلوٰة‘‘ کی منادی کریں، جب تمام اہل لشکر جمع ہوگئے تو حضور ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

أیحسب أحدکم متکا علیٰ اریکته قد یظن ان الله لم یحرم شیئا الا ما فی هذا القرآن ؟ الا وانی والله قد وعظت وامرت ونهیت عن اشیاء انها لمثل القرآن او اکثر ، وان الله تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اهل الکتاب الا باذن ولا ضرب نساءهم ولا اکل ثمارهم اذا اعطوکم الذی علیهم۔

کیا تم میں کا کوئی شخص تختِ غرور بیٹھا یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ نے سوائے
ان چیزوں کے جو قرآن میں حرام کی گئی ہیں کوئی اور چیز حرام نہیں کی؟
خدا کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جو امر و نہی کے احکام
دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے زیادہ ہیں، اللہ نے
تمہارے لئے یہ جائز نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا
اجازت گھس جاؤ، ان کی عورتوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ؛
حالاں کہ ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے۔

ایک دفعہ سفر جہاد میں اہل لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے آکر دیگچیاں اُلٹ دیں اور فرمایا: ''ان النهبة ليست بأحل من الميتة'' (لوٹ گھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے)۔

عبداللہ بن یزید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے لوٹے ہوئے مال (۱) کو حرام قرار دیا: ''نهى النبي صلى الله عليه وسلم من النهبٰى والمثله''۔

اگر راستہ میں دُودھ دینے والے جانور مل جائیں تو ان کا دُودھ دوہ کر پینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی تاوقتیکہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لی جائے، شدید ضرورت کی حالت میں صرف اتنی اجازت ہے کہ باآواز بلند تین مرتبہ پکار دو؛ تاکہ اگر کوئی مالک ہو تو آجائے اور جب کوئی نہ آئے تو پی لو۔

تباہ کاری کی ممانعت

افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی کرنا جنگ کے معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے، قرآن مجید میں آیا ہے :

---

(۱) لوٹ کے مال سے مراد وہ مال ہے جو دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتے ہوئے عام باشندوں سے چھین لیا جائے، اس کے علاوہ نہبہ اس مالِ غنیمت کو بھی کہتے ہیں جو باقاعدہ تقسیم سے پہلے لیا جائے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرۃ:۲۰۵)

جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے، مگر اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

حضرت ابوبکرؓ نے شام وعراق کی طرف فوجیں بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور فصلوں کو خراب نہ کرنا، اس میں شک نہیں کہ اگر جنگی ضروریات کا تقاضا ہو تو درختوں کو کاٹنے اور جلا کر میدان صاف کر دینے کی اجازت ہے، جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرہ میں کیا گیا؛ لیکن محض تخریب کی نیت سے ایسا کرنا بالاتفاق ممنوع ہے۔

مخالفین نے غزوہ بنی نضیر کے واقعہ کو اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اسلام جنگ میں غارت گری کو جائز رکھتا ہے، خود ہمارے محدثین میں سے بھی بعض نے اس کو حرف الدور والنخیل کے جواز کی دلیل سمجھا ہے، مگر واقعات کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی نضیر کی کھجوروں کو کاٹنا اور جلانا محض جنگی ضروریات پر مبنی تھا، دشمن کو نقصان پہنچانا یا اس سے انتقام لینا ہرگز مقصود نہ تھا، اول تو جو درخت کاٹے گئے تھے وہ قرآنی تصریح کے مطابق ایک خاص قسم کی کھجور کے تھے جس کو لینہ کہتے ہیں: ''مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا'' (الحشر:۵) اور سہیلی کا بیان ہے کہ بنی نضیر اس کھجور کو غذا کے کام میں نہ لاتے تھے؛ بلکہ عجوہ اور برنی کو استعمال کرتے تھے، علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں :

قال السهيلی فی تخصيصها بالذکر ايماءً الی ان الذی يجوز قطعه من شجر العدو مالا يکون معداً للاقتيات لانهم کانوا يقتاتون العجوة والبرنی دون اللينه ـ (۱)

---

(۱) فتوح الباری:۷/۳۳۲۔

سہیلی خاص طور پر لینہ کا ذکر کئے جانے سے یہ اشارہ نکالتا ہے کہ دشمن کے درختوں میں سے صرف انھیں کو کاٹنا جائز ہے، جو غذا کے کام میں نہ آتے ہوں؛ کیوں کہ بنی نضیر عجوہ اور برنی کو کھایا کرتے تھے، لینہ کو نہیں کھاتے تھے۔

پھر واقعہ کی نوعیت بھی وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے، عام راویوں نے یہ دیکھ کر کہ آنحضرت ﷺ خود محاصرہ میں موجود تھے اور آپ ﷺ کی موجودگی میں فوجوں نے درخت کاٹے اور جلائے تھے، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ یہ کام آپ ﷺ ہی کے حکم یا اجازت سے کیا گیا؛ لیکن ابن عباسؓ نے صاف تصریح کی ہے کہ مسلمانوں نے محاصرہ کی ضروریات سے کاٹنا اور جلانا شروع کر دیا تھا، پھر ان کو خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہے: ''هل لنا فيما قطعنا من اجر وهل علينا فيما تركنا من وزر؟'' چنانچہ انھوں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے استفتا کیا اور اس پر یہ آیت اُتری کہ: ''ما قطعتم من لينة او تركتموها قائمة على اصولها فباذن الله'' (لینہ کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑ دیا سب اللہ ہی کے اذن سے تھا)۔

حضرت جابرؓ نے بھی یہی روایت ہے کہ درخت کاٹنے کے بعد لوگ رسول اللہ ﷺ کی [خد]مت میں پوچھتے ہوئے آئے کہ ''يا رسول الله اهل علينا اثم فيما قطعنا او [عل]ينا وزر فيما تركنا؟'' (یارسول! ہم نے جو کچھ کاٹ دیا یا چھوڑ دیا ہے، اس کا کوئی گناہ ہم پر نہیں ہے؟) اس پر یہ آیت اُتری کہ: ''ما قطعتم من لينة''۔

مجاہد نے اس قول کی تائید کرتے ہوئے آیت مذکورہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ بعض مہاجرین درختوں کو کاٹنے لگے تھے اور بعض نے ان کو چھوڑ دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے دونوں کے فعل کو درست قرار دیا، اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم میں سے جنھوں نے محاصرہ کو موثر بنانے کی نیت سے لینہ کے درخت کاٹے وہ بھی حق پر ہیں اور جنھوں نے اس فعل کو فساد سمجھ کر انھیں چھوڑ دیا وہ بھی حق پر ہیں؛ کیوں کہ دونوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی پیروی کی۔

محمد بن اسحاق کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر میں جب اس طرح درختوں کو کاٹا جانے لگا تو بنوقریظہ نے آپ ﷺ کو کہلا بھیجا کہ اے محمد! تم تو فساد کو منع کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں اصلاح کرنے آیا ہوں، پھر یہ درخت کیوں کاٹ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح ہے؟ اس پر آنحضرت ﷺ اور مسلمان متفکر ہوئے اور اللہ نے اُن کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی کہ: ”ما قطعتم من لینة“ (جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑا سب اللہ کے اذن سے تھا)۔

بہرصورت واقعات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے قطع اشجار کا حکم نہیں دیا تھا؛ بلکہ فوج نے محاصرہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر بلا اجازت چند درخت کاٹ لئے تھے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اس بنا پر صحیح قرار دیا تھا کہ درخت کاٹنے والوں کی اصلی نیت تخریب و افساد کی نہ تھی، بعض فقہاء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ جواز صرف اسی موقع کے لئے تھا اور اس خاص حکم سے یہ عام جواز نہیں نکل سکتا کہ جب کبھی جنگی ضروریات پیش آئیں تو دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلا دیا جائے؛ چنانچہ امام اوزاعی، لیث ابو ثور اسی طرف گئے ہیں؛ لیکن جمہور محققین کا مذہب یہ ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے لئے محض حسبِ ضرورت ایسا کرنا جائز ہے، رہا تخریب و غارت گری کی نیت سے کرنا تو اس کے حرام و ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں، علامہ ابن جریرؒ نے اوزاعی اور لیث کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :

> إن النهی محمول علی القصد لذالک بخلاف ماذا اصابوا ذالک فی خلال القتال کما وقع فی نصب المنجنیق علی الطائف۔
>
> ممانعت تو دراصل عمداً تخریب کی گئی ہے، بہ خلاف اس نقصان کے جو دورانِ قتال میں ان کو پہنچ جائے جیسا کہ طائف پر منجنیق سے سنگ باری کرتے وقت ہوا۔

امام احمدؒ بھی یہی کہتے ہیں :

> قد تکون فی مواضع لا یجدون منه بداً فاما بالعبث فلا تحرق۔

یہ ایسے مواقع پر ہوسکتا ہے جب کہ کاٹنا اور جلانا بالکل ناگزیر ہو،
ورنہ بلاضرورت نہیں جلانا چاہئے۔

اس قسم کی ناگزیر تباہ کاری پر کسی طرح اعتراض نہیں کیا جاسکتا، موجودہ زمانے کے قوانین جنگ میں بھی محاصرہ کو مؤثر بنانے اور محصورین کو درختوں اور عمارتوں کی آڑ میں پناہ لینے سے روکنے کے لئے درختوں کو کاٹنا، عمارتوں کو توڑنا حتیٰ کہ بستیوں تک کو جلانا جائز رکھا گیا ہے۔(۱)

مُثلہ کی ممانعت

دشمن کی لاشوں کو بے حرمت کرنے اور ان کے اعضا کی قطع و برید کرنے کو بھی اسلام نے سختی سے منع کیا، عبداللہ بن یزید انصاری روایت کرتے ہیں کہ :

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من النھبٰی والمثلہ۔
نبی ﷺ نے لوٹ کے مال اور مثلہ (قطع اعضا) سے منع فرمایا۔

نبی ﷺ فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایت دیا کرتے تھے ان میں بتاکید فرماتے :

لا تعدروا ولا تغلوا ولا تمثلثوا۔
بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو اور مثلہ نہ کرو۔

قتل اسیر کی ممانعت

فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ جب شہر داخل ہونے لگے تو فوج میں اعلان کرادیا تھا کہ :

لا تجھزن علیٰ جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیر و من اغلق بابہ فھو آمن۔ (۲)
کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ امان میں ہے۔

---

(۱) Lawrence, Principles of Intemational Law. P:441 (۲) فتوح البلدان:۴۷۔

حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ایک اسیر کو قتل کریں، اس پر انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہم کو اس کی تو اجازت نہیں دی؛ بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ جو قیدی گرفتار ہو کر آئیں ان سے یا تو احسان کا برتاؤ کرو یا فدیہ لے کر رہا کردو :

ما امرنا بهذا يقول الله تعالىٰ حتىٰ اذا اثخنتموهم
فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداءً۔ (۱)

قتل سفیر کی ممانعت

سفراء اور قاصدوں کے قتل کو بھی آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا، مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا :

لولا ان الرسل لا تقتل لضربت عنقتک۔
اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔

اسی اصل سے فقہاء نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ جب کوئی شخص اسلام سرحد پر پہنچ کر بیان کرے کہ میں فلاں حکومت کا سفیر ہوں اور حاکم اسلام کے پاس پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں تو اس کو امن کے ساتھ داخلہ کی اجازت دی جائے، اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے، اس کے مال و متاع، خدم و حشم، حتیٰ کہ اسلحہ سے بھی تعرض نہ کیا جائے، الا اس صورت میں کہ وہ اپنا سفیر ہونا ثابت نہ کرسکے، (۲) بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ اسلامی حکومت میں رہ کر زنا اور چوری بھی کرے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی۔

---

(۱) یہ اسیران جنگ کے متعلق اسلام کا عمومی قانون ہے؛ لیکن اسلامی حکومت کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ اگر اسلام شدید دشمن یا وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم کئے ہوں یا وہ ائمہ شر و فساد جو کسی فتنۂ عظیم کے اصل ذمہ دار ہوں، کبھی جنگ میں ہاتھ آجائیں تو وہ ان کے قتل کا فیصلہ صادر کردے، جس طرح مثلاً نبی ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط کو قتل کرایا، اس معاملہ میں اسلامی حکومت جو کچھ بھی کرے گی، بے لاگ طریقہ سے کرے گی، "مجرمین جنگ" پر مقدمہ چلانے کا ڈھونگ وہ کھڑا نہیں کرے گی، جس طرح دوسری جنگ کے بعد اتحادی سلطنتوں نے کیا۔

(۲) کتاب الخراج:۱۰۶۔

بدعہدی کی ممانعت

غدر، نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار احادیث آئی ہیں جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے، عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاماً۔

جو کوئی کسی معاہدہ کو قتل کرے گا، اسے جنت کی بو تک نصیب نہ ہوگی؛ حالاں کہ اس کی خوشبو ۴۰ برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ:

اربع خلال من كن فيه كان منافقاً خالصاً من اذا حدث كذب ، و اذا وعد اخلف ، و اذا عاهد غدر و اذا خاصم فجر۔

چار خصلتیں ہیں کہ جس میں پائی جائیں گی وہ خالص منافق ہوگا، ایک یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے یہ کہ جب معاہدہ کرے تو اس کو توڑ دے، چوتھے یہ کہ جب جھگڑے تو گالیاں دے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

لكل غادر لواء يوم القيامة يرفع له بقدر غدره ، الا ولا غادر اعظم غدراً من امير عامة۔

ہر غدار عہد شکن کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کے غدر کا ہم قدر ہوگا اور یاد رکھو کہ جو سردار قوم غدر کرے اس سے بڑا کوئی غدار نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے؛ حالاں کہ ابھی معاہدۂ صلح کی مدت ختم نہ ہوئی تھی، امیر معاویہؓ کا ارادہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کردیں، مگر ایک صحابی عمرو بن عنبسہ نے زمانۂ صلح میں جنگ کی تیاری اور سرحدوں کی طرف فوج کی روانگی کو بھی بدعہدی سے تعبیر کیا اور امیر کے پاس دوڑتے ہوئے اور یہ پکارتے ہوئے پہنچے کہ: ''اللہ اکبر، وفاء لاغدر'' معاویہ نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ :

من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلن عهداً ولا يشدنه حتى يمضى امده او ينبذ اليهم على سواء ۔

جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے ؛ تاوقتیکہ اس کی مدت گزر نہ جائے یا پھر اگر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کا نوٹس دے دے۔

بدنظمی و انتشار کی ممانعت

اہل عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے اور جب کسی جگہ اُترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے، یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا، داعی اسلام نے آکر اس کی بھی ممانعت کردی، ایک مرتبہ جب آپ ﷺ جہاد کو تشریف لے جا رہے تھے تو آپ ﷺ کے پاس شکایت آئی کہ فوج میں عہد جاہلیت کی سی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور لوگوں نے منزل کو تنگ کر رکھا ہے، اس پر آپ ﷺ نے منادی کرائی کہ: ''من ضيق منزلاً او قطع طريقا فلا جهاد له'' (جو کوئی منزل کو تنگ کرے گا یا راہ گیروں کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہوگا)، ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ: ''ان تفرقكم فى هذه الشعاب والاودية انما ذالكم الشيطان'' (تمہارا اس طرح وادیوں اور گھاٹیوں میں منتشر ہو جانا ایک شیطانی فعل ہے)۔

ابوثعلبہ خشنی کا بیان ہے کہ اس کے بعد یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جب اسلامی فوج کسی جگہ

اُترتی تو اس کا گنجان پڑاؤ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک چادر تان دی جائے تو سب کے سب نیچے آجائیں گے۔

شور و ہنگامہ کی ممانعت

عرب کی جنگ میں اس قدر شور و ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی وغی پڑ گیا تھا، اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ برتنا چاہا، مگر داعیِ اسلام ﷺ نے اس کی اجازت نہ دی، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں :

کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا شرفنا علی واد ھللنا وکبرنا ارتفعت اصواتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یایھا الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائباً ، انہ معکم انہ سمیع قریب۔

ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تھے تو زور وشور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے۔

وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات

فوجوں کی روانگی کے وقت جنگی برتاؤ کے متعلق ہدایات دینے کا طریقہ جس سے انیسویں صدی کے وسط تک مغربی دنیا نابلد تھی ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے اُمی پیغمبر ﷺ نے ایجاد کیا تھا، داعیِ اسلام ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ کسی سردار کو جنگ پر بھیجتے تو اسے اور اس کی فوج کو پہلے تقویٰ اور خوفِ خدا کی نصیحت کرتے پھر فرماتے :

اغزوا بسم اللہ و فی سبیل اللہ ، قاتلوا من کفر باللہ ،

اغزوا ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیداً۔

جاؤ اللہ کا نام لے کر اور اللہ کی راہ میں، لڑو ان لوگوں سے جو اللہ سے کفر کرتے ہیں، مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔

اس کے بعد فوج کو ہدایت کرتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا، اول اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ، اگر جزیہ دے کر اطاعت قبول کر لے تو اس کی جان و مال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو؛ لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ سے مدد مانگ کر جنگ کرو۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایتیں دی تھیں، جن کو تمام مؤرخین ومحدثین نے نقل کیا ہے، وہ ہدایات یہ ہیں :

(۱) عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں۔

(۲) مثلہ نہ کیا جائے۔

(۳) راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے اور نہ ان کے معابد مسمار کئے جائیں۔

(۴) کوئی پھل دار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں۔

(۵) آبادیاں ویران نہ کی جائیں۔

(۶) جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے۔

(۷) بدعہدی سے ہر حال میں احتراز کیا جائے۔

(۸) جو لوگ اطاعت کریں ان کی جان و مال کا وہی احترام کیا جائے جو مسلمانوں کی جان و مال کا ہے۔

(۹) اموالِ غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔

(۱۰) جنگ میں پیٹھ نہ پھیری جائے۔

اصلاح کے نتائج

اِن احکام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جنگ کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کردیا جو اس عہد میں جنگ کا ایک غیر منفک جز بنے ہوئے تھے، اسیران جنگ اور سفرا کا قتل، معاہدین کا قتل، مجروحین جنگ کا قتل، غیر اہل قتال کا قتل، اعضا کی قطع و برید، مردوں کی بے حرمتی، آگ کا عذاب، لوٹ مار اور قطع طریق، فصلوں اور بستیوں کی تخریب، بدعہدی و پیمان شکنی، فوجوں کی پراگندگی و بدنظمی، لڑائی کا شور و ہنگامہ، سب کچھ آئین جنگ کے خلاف قرار دے گیا اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔

اس اصلاحی تعلیم نے ۸ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے اُن کا بہترین نمونہ فتح مکہ ہے، ایک طاقت پر دوسری طاقت کی فتح اور خصوصاً دشمن کے کسی بڑے شہر کی تسخیر کے موقع وحشی عرب ہی میں نہیں بلکہ متمدن روم و ایران میں بھی جو کچھ ہوتا تھا اسے پیش نظر رکھئے، اس کے بعد غور کیجئے کہ وہی عرب جو چند برس پہلے تک جاہلیت کے طریقوں کے عادی تھے، اُس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جس سے آٹھ ہی برس پہلے ان کو بُری طرح تکلیفیں دے دے کر نکالا گیا تھا اور ان ہی دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں، جنھوں نے ان فاتحوں کو گھر سے بے گھر کرنے ہی پر قناعت نہیں کی تھی؛ بلکہ جس جگہ انھوں نے جا کر پناہ لی تھی، وہاں سے بھی ان کو نکال دینے کے لئے کئی مرتبہ چڑھ کر آئے تھے، ایسے شہر اور ایسے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، مگر کوئی قتل عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹے دشمنوں میں سے بھی کسی پر انتقام کا ہاتھ نہیں اُٹھتا، تسخیر شہر کی پوری کارروائی میں صرف ۲۴ رآدمی مارے جاتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ دست درازی میں پیش قدمی خود ان کی طرف سے ہوئی، سالارِ فوج داخلہ سے پہلے اعلان کردیتا ہے کہ جب تک تم پر کوئی ہاتھ نہ اُٹھائے تم بھی ہاتھ نہ اُٹھانا، شہر میں داخل ہوتے ہی منادی کی جاتی ہے کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کرکے بیٹھ جائے گا

اسے امان ہے، جو کوئی ہتھیار ڈال دے گا اسے امان ہے اور جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اُسے بھی امان ہے، پھر تکمیل تسخیر کے بعد فاتح سردار ﷺ کے سامنے وہ دشمن ایک ایک کر کے لائے جاتے ہیں، جنھوں نے اسی شہر میں اس کو تیرہ برس تک انتہائی اذیتیں پہنچانے کے بعد آخر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا اور جو گھر سے نکالنے کے بعد اس کو اور اس کے دین کو دنیا سے مٹانے کے لئے بدر و اُحد اور جنگ احزاب میں بڑی بڑی تیاریاں کر کے گئے تھے، یہ دشمن گردنیں جھکائے ہوئے آ کر کھڑے ہوتے ہیں، فاتح پوچھتا ہے: ''اب تم کیا اُمید کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟'' مفتوح شرم ساری کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ: ''تو فیاض بھائی ہے اور فیاض بھائی کا بیٹا ہے'' (اخ کریم وابن اخ کریم) اس پر فاتح کہتا ہے کہ: ''جاؤ تم آزاد ہو، آج تم سے کوئی باز پُرس نہیں'' (لا تثریب علیکم الیوم ، اذھبوا فانتم الطلقاء!) یہ صرف جان ہی کی بخشش نہ تھی؛ بلکہ اس کے ساتھ فاتح اور اس کی فوج نے ان جائیدادوں کو بھی انھیں کے حق میں معاف کر دیا جو ۸ برس پہلے اِن کی ملک تھیں۔

تاہم ان میں کچھ ایسے شدید دشمن بھی تھے جن کی ایذا رسانی حد برداشت سے بڑھی ہوئی تھی، فاتح نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے حکم دے یا تھا کہ ان میں سے جو کوئی ملے اسے قتل کر دینا، مگر جب اُن پر قابو چل گیا تو وہ بھی اس خلق عظیم و عمیم سے بے فیض نہ رہے، ہبار بن اسود جو فاتح کی جوان بیٹی سیدہ زینبؓ کا قاتل تھا عاجزی کے ساتھ مسلمان ہوا اور معاف کیا گیا وحشی بن حرب جس نے فاتح کے نہایت محبوب چچا کو قتل کیا تھا مسلمان ہوا اور بخشا گیا، ہند بنت عتبہ جو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، اپنی انتہائی شقاوت کے باوجود فاتح کے غضب سے محفوظ رہی اور آخر عفو و درگذر کا دامن اس کے لئے بھی وسیع ہوا، سب سے بڑے دشمن اسلام ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا مسلمان ہو کر آیا اور جلیل القدر صحابہؓ کی صف میں شامل کیا گیا، ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زہیر بھی جو سب کے سب فاتح کے جانی دشمن تھے معاف کئے گئے، صرف حویرث بن نقیہ، عبدالعزیٰ بن خطل اور مقیس بن صبابہ قتل کئے گئے، سو وہ بھی دشمنی کے جرم میں نہیں بلکہ خون کے قصاص میں۔

یہ تھی وہ اصلاح جو صرف ۸ سال کے اندر دنیا کی سب سے زیادہ وحشی قوم میں کی گئی تھی، آج اس تہذیب وتمدن کے زمانہ میں بھی دنیا کی مہذب ترین قومیں جب کسی دشمن کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوتی ہیں تو سب کو معلوم ہے کہ مفتوح شہر پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے ہیں، بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں تہذیب مغرب کے علم برداروں نے ایک دوسرے کے ملک میں گھس کر جو تباہیاں پھیلائیں ان کا نظارہ دیکھنے والی آنکھیں ابھی تک موجود ہیں، اس کے مقابلہ میں غور کرو کہ اب سے ۱۴ برس پہلے کے تاریک زمانہ میں جب کہ دنیا کی تہذیب کا علم خسرو پرویز اور ہرقل جیسے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھا، عرب کی ایک اَن پڑھ اور بادیہ نشین قوم نے اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں داخ ہوکر جو شریفانہ برتاؤ کیا وہ کیسی زبردست اصلاح، کیسی اعلیٰ اخلاقی تربیت اور کیسے صحیح ومضبوط عسکری ضبط ونظم کا نتیجہ ہوسکتا تھا۔



جنگ، ہندو مذہب میں

بعض حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو مذہب عدم تشدد کا مذہب ہے، اس کی تائید نہ ہندو مذہبی مآخذ سے ہوتی ہے اور نہ ہندوؤں کی مذہبی تاریخ سے، ہندو مذہبی مآخذ میں ویدوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اور چار ویدیں ان کے یہاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، مذہبی کتاب کی حیثیت سے آج کل گیتا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، ہندوؤں کی فقہ منوسمرتی ہے، جس میں منوجی کے احکام تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں، اس میں انسان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کی ذمہ داریاں متعین کی گئی ہیں، ان تینوں مآخذ کی روشنی میں جنگ کے بارے میں ہندو مذہب کے تصور کو پیش کیا جارہا ہے۔(۱)

ویدوں کی جنگی تعلیم

لفظ وید چار کتابوں پر بولا جاتا ہے، جو الگ الگ ناموں سے مشہور ہیں، ان میں سب سے قدیم رگ وید ہے، پھر یجر وید، پھر سام وید، پھر اتھر وید، ان کے منتروں کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنا مشکل ہے؛ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایک منتر میں متعدد مضامین آجاتے ہیں ؛ اس لئے ہم مضامین کو نظر انداز کر کے ہر کتاب کے ان منتروں کو الگ الگ نقل کریں گے جو جنگ سے کسی نوع کا تعلق رکھتے ہیں۔(۲)

---

(۱) نیچے جو تحریر نقل کی جارہی ہے، وہ مشہور مصنف اور مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے اور حواشی بھی ان ہی کے ہیں۔(دیکھئے: الجہاد فی الاسلام: ۲۸۸ تا ۳۲۰)

(۲) میرے پیش نظر ویدوں کے وہ انگریزی ترجمے ہیں جو مسٹر گرفتھ (Grifth) کے قلم سے نکلے ہیں، اس کے ساتھ میں نے میکس مولر کے ترجموں کو بھی نگاہ میں رکھا ہے۔

رِگ وید

رِگ وید کے وہ منتر جن میں جنگ کا مضمون پایا جاتا ہے، حسبِ ذیل ہیں:

● اے اندر! وہ دولت لا جو مسرت بخشے، فاتح کی دائمی فاتحانہ دولت جو ہماری خوب مدد کرے، جس کے ذریعے سے ہم دست بدست لڑائی میں اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں۔ (۱:۸:۱، ۲)

● اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلا دے جس کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔ (۱:۱۲:۵)

● (اندر اور وارونا) کی نصرت سے ہم دولت کا بڑا خزانہ جمع کر لیں اور اس کے کھتے بھر لیں، کافی اور بچا رکھنے کے قابل، اے اندر اور وارونا! تم کو میں دولت کے لئے متعدد صورتوں سے پکارتا ہوں، ہم کو تم فتح مند رکھو۔ (۱:۱۷:۶-۷)

● ہر بدگو کو قتل کر دے اور جو کوئی ہم کو خفیہ طریقوں سے (غالباً جادو سے) تکلیف پہنچائے، اسے برباد کر، اے اندر! ہم کو خوبصورت گھوڑے اور گائیں دلوا، ہزاروں کی تعداد میں، اے بڑے دولت مند!۔ (۱:۲۹:۷)

● تو آریوں اور دسیوں (۱) کے درمیان امتیاز کر، جو اُدھری ہیں ان کو سزا دے اور انھیں اس کے حوالہ کر دے جس کی گھاس (دیوتاؤں کے نذرانے کے لئے) کٹی رکھی ہے۔ (۱:۱۵:۸)

---

(۱) ڈاکٹر راجندر لال مترا نے اپنی کتاب (Indo Aryans) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دسیوں سے خود آریوں کے نابکار قبائل مراد ہیں (جلد اول، ص: ۲۱۰)؛ لیکن خود ویدوں کے مطالعہ سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ آریہ حملہ آور اس لفظ سے ہندوستان کے اُن اصلی باشندوں کو یاد کرتے تھے، جن سے ان کی جنگ تھی، یہ صرف میرا اپنا احساس ہی نہیں ہے؛ بلکہ وید کے دوسرے مطالعہ کرنے والوں نے بھی یہی محسوس کیا ہے، گرفتھ لکھتا ہے: ←

● ان خوب صورت شعلوں اور سوم رس کے قطروں سے خوش ہوکر ہمارے گھوڑوں اور گایوں کے افلاس کو دُور کردے، ان قطروں کے باعث اے اندر! دسیوؤں کو منتشر کردے اور ان کی نفرت سے محفوظ ہوکر ہم وافر سامانِ خوراک حاصل کرلیں، اے اندر! ہم کو خوب دولت اور خوراک جمع کر لینے دے، ہم بہادروں کی سی طاقت پیدا کرلیں جو مواشی اور گھوڑے حاصل کرنے کا خاص وسیلہ ہے۔(۱:۵۳:۴،۵)

● پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سردھروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔(۱:۵۴:۱۱)

← ''یہ نام اکثر ان دیسی اقوام کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو آریوں کی مہاجرت میں مزاحم ہوئی تھیں، بعد میں یہ لفظ ان تمام لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جو وید کی عبادت اور مخصوص برہمنی رسوم ادا نہیں کرتے''۔(ترجمہ اتھروید، ص:۹)

پروفیسر بلوم فیلڈ لکھتا ہے:''ایک نامعلوم زمانے میں جو آج کل کے تخمینہ کے مطابق ۱۵۰۰ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا، مگر جو ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ قدیم تاریخ سے شروع ہوا ہو، آریہ قبائل نے ارضِ ایران کی بلندیوں سے جو کوہستانِ ہندوکش کے شمال میں ہیں، شمال مغربی ہندوستان یعنی دریائے سندھ اور اس کے باج گزاروں کی سرزمین ہجرت کرنی شروع کی، ملک کے اصلی غیر آریہ باشندے جو آریوں سے ممیز کرنے کے لئے دسیوؤں کہے جاتے ہیں، آسانی سے مغلوب ہوگئے''۔(Encyclopaedia of Religions, Vol. VIII P:107)

پروفیسر میکڈانل لکھتا ہے:''رگ وید میں داس اور دسیوؤں کی اصطلاحیں عموماً سیاہ رنگ قدیم باشندوں کے لئے استعمال کی گئی ہیں، جنھیں فاتح آریوں نے مغلوب کیا تھا''۔(Encyclopaedia of Religions, Vol. XII P:610)

ولیم کروک لکھتا ہے:''بڑے بڑے دیوتا اپنے پجاریوں کے فیاض مربی ہیں، وہ دسیوؤں یا سیاہ رنگ دیسی باشندوں کے خلاف جنگ کرنے میں ہندو آریہ کی قیادت کرتے ہیں''۔(Encyclopaedia of Religions, Vol. VI P:691)

● اے اگنی! تیرے مال دار پوجاری خوراک حاصل کریں اور امراء بڑی عمریں پائیں ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں، اے اگنی! ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔ (۱:۷۴:۵-۹)

● طاقتور اندرا جانے اپنے حسین رنگ (۱) والے دوستوں کے ساتھ مل کر زمین فتح کی، سورج کی روشنی اور پانیوں کو فتح کیا، اندر ہمارا محافظ ہو اور ہم بے خوف وخطر مال لوٹیں۔ (۱:۱۰۰:۱۸-۱۹)

● اے اندر! تونے پورو کے لئے، اپنے غلام دیوداس کے لئے، اپنے پوجاری کے لئے ۹۰ قلعوں کے پرخچے اُڑا دیئے، اس طاقتور نے اتیتھگو کے لئے شمبر کو پہاڑوں سے اُتارا، اپنی قوت سے زبردست خزانے تقسیم کئے اور تمام خزانوں کو بانٹ دیا، اندر نے جنگ میں اپنے آریہ پوجاریوں کی مدد کی، اس نے جو ہر جنگ میں سینکڑوں نصرتیں مہیا رکھتا ہے۔ (۱:۱۳۰:۷،۸)

● اے اندر مگھون! ہم جنگ میں تجھ سے امداد پا کر ان لوگوں کو مغلوب کریں، جو ہمارا مقابلہ کرتے ہیں، ان کو فتح کریں جو ہم سے لڑتے ہیں، آج کے دن سوم رس اُنڈیلنے والوں کو برکت دے، ہم اپنی اس قربانی میں اپنی قوت دکھا کر مالِ غنیمت تقسیم کریں، لڑائی کا مالِ غنیمت۔ (۱:۱۳۲:۱)

---

(۱) حسین رنگ والوں سے مراد وہ گورے رنگ کے آریہ قبائل ہیں، جنھوں نے ماوراء النہر سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا تھا، ان کے مقابلے میں ہندوستان کے اصلی باشندے کالے رنگ کے تھے۔ (دیکھو گرفتھ کا ترجمہ، رگ وید: ۱/۱۳۰)

● جب اچھے نقشہ کے ساتھ بہادر لوگ فوج کو آگے بڑھاتے ہیں تو وہ باقاعدہ جنگ میں فتح حاصل کرتے ہیں اور شہرت و ناموری کی تلاش میں بڑھتے اور دباتے چلے جاتے ہیں۔(۱:۱۳۲:۵)

● اے اندر! تو ہر موقع پر ہمارا ہے، آدمیوں کا محافظ، نہایت شریف، اول، ہم کو ہمارے تمام حریفوں پر فتح بخشنے والا، ہم نہایت وافر مقدار میں قوت بخش غذا حاصل کریں۔(۱:۱۷۴:۱۰)

● تو اے بہادر! مالِ غنیمت لوٹنے والے! آدمی کی گاڑی تیز چلا، ایک جلتے ہوئے جہاز کی طرح بے دین وسیوں کو جلادے، اے فاتح! (۱:۱۷۵:۳)

● اے مگھون! اے اندر! تیری مدد سے ہم اپنے دشمنوں کو جو اپنے تئیں طاقتور سمجھتے ہیں زیر کریں، تو ہمارا محافظ بن، ہمیں بڑھا، ہمیں قوی بنا، ہم وافر مقدار میں قوت بخش غذائیں حاصل کریں۔(۱:۱۷۹:۵)

● ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن وسیوں کو مغلوب کرکے۔(۲:۱۱:۱۹)

● اے بہادر! تو ہمارے من چلے بہادروں کے ساتھ مل کر وہ شجاعانہ کارنامے دکھا، جنھیں تجھ کو پورا کرنا ہے، وہ (دشمن) اپنی قوت کے زعم باطل سے پھولے ہوئے ہیں، ان کو قتل کرا اور ان کی املاک یہاں ہمارے پاس لے آ۔(۲:۳:۱۰)

● اے اندر! تو جنگ کے میدانوں میں مواشی حاصل کرنے کے لئے لڑتا رہا ہے؛ کیوں کہ بہت لوگ تیری حمد وثنا کرتے ہیں۔(۵:۳۳:۴)

● اندر نے سورج اور گھوڑوں پر قبضہ کر کے اس گائے کو حاصل کیا جو بہت سوں کو سیر کرتی ہے، اس نے سونے کے خزانے فتح کیے، اس نے دسیوؤں کو زیر کیا اور آریہ ورن کو محفوظ کر دیا۔ (۳:۳۴:۹)

● اے آگ کے دیوتا! جو کوئی خفیہ طور سے ہم پر حملہ کرے، جو ہمسایہ ہم کو ضرر پہنچائے اس کو تو مترا کی طاقت سے، ہمیشہ مشتعل رہنے والے شعلہ سے، جلانے والی تیز حرارت سے، جلا دے، ہماری مدد کر؛ تاکہ ہم یہ خواہش پوری کریں! دولت حاصل کریں بہادروں کے ذخیرہ کے ساتھ۔ (۶:۵:۴-۷)

● اے اندر! ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ جو مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے، تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں، اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔ (۶:۱:۸-۱۳)

● تو نے داس (۱) قبائل کے ساتھ گرمائی قلعے توڑ دیئے جو اُن کی جائے پناہ تھے، تو نے ان کو تہہ تیغ کر دیا اور پورد کنا کی مدد کی۔ (۶:۲۰:۱۰)

---

(۱) دسیوؤں کی طرح لفظ ''داس'' بھی اُن دیسی قوموں کے لئے بولا جاتا تھا جو آریہ حملہ آوروں سے برسرِ پیکار تھیں، بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داس اور دسیوؤں سے مراد ارواحِ خبیثہ ہیں، مگر یہ تاویل محتاجِ دلیل ہے، گرفتھ کہتا ہے: ''یہ اصطلاح اصلاً ان خاص بدروحوں کے لئے وضع کی گئی تھی، جو اندرا اور انسانوں کی دشمن سمجھی جاتی تھیں، مگر بالعموم اس سے وہ وحشی لوگ مراد لئے جاتے تھے جو اس ملک کے اصلی باشندے تھے اور جن سے ابتدائی آریہ مہاجرین کی جنگ تھی''۔

←

● اے اندر! ہم کو وہ دولت دے جو دشمن کو جنگ میں اس طرح مغلوب کر دے، جیسے آسمان زمین پر چھایا ہوا ہے، دولت جو ہزاروں مال لاتی ہے، جو غلہ پیدا کرنے والی زمینیں فتح کرتی ہے وہ دولت جو دشمن کو شکست دیتی ہے۔(۱:۲۰:۶)

← دوسری جگہ یہی مصنف ''داسم دوئم'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ''اس سے مراد وہ وحشی بدشکل باشندے ہیں جنھیں آریہ مہاجرین نے بھوت پریت کی جماعت میں شامل کر دیا تھا''۔ (گرفتھ کا ترجمہ اتھروید: ۱۷۴/۱)

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم شیطان کا لفظ اصلاً ''جن'' کے لئے استعمال کرتے ہیں؛ لیکن جب کبھی شیاطین کا لفظ ان انسانوں کے لئے بولا جائے گا، جن کے متعلق ہم بری رائے رکھتے ہیں تو سیاق وسباق سے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں نہ کہ جن، ایسے مواقع پر یہ کہنا کہ شیاطین کے اصل معنی شیاطین جن کے ہیں، ایک بے جا تاویل ہوگی۔

داس اور دسیوؤں کے مسمیٰ کی تعیین میں اس وقت کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی، جب ہم خود رگ وید میں ان کے انسان ہونے کے متعلق واضح شہادتیں دیکھتے ہیں، ان کو جگہ جگہ بے دین اور ادھرمی کہا گیا ہے، وہ دیوتاؤں کو نہ ماننے والے اجنبی قوانین کی پابندی کرنے والے اور عقل سے محروم قرار دیئے گئے ہیں، ان کے پاس گائے، بیل اور مواشی (جانوروں) کی کثرت ہے، ان کے پاس قلعے ہیں، جن کو آریہ فتح کرتے ہیں، ان سب سے زیادہ روشن دلیل یہ ہے کہ ان کی ناکیں چپٹی، ان کی جبڑے چوڑے اور رنگ کالے بتائے گئے ہیں، جو بعینہٖ قدیم ڈرویڈین نسل کے لوگوں میں ہم کو آج بھی نظر آتے ہیں، رگ وید میں ایک جگہ لکھا ہے: ''اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادوٹو نے تک کو مغلوب کر لیا'' (۴:۴۹:۷)۔

دوسرے دسیوؤں کا حلیہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: ''تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوؤں کو قتل کرتا ہے''۔ (۱:۲۹:۵)

ایک اور جگہ داسوں کے غلامی میں دیئے جانے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے: ''یادو اور تورو انے بھی ہم کو خدمت کے لئے دو داس دیئے ہیں اور بہت سی گائیں''۔ (۱۰:۲۶:۱۰)

پھر ایک جگہ داس عورتوں کے بھی غلامی میں دیئے جانے کا ذکر ہے؛ چنانچہ ایک شخص تراسادسیوؤں کو ہم پچاس لونڈیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ (۳۶:۱:۹:۸)

ان شہادتوں کی موجودگی میں خواہ مخواہ تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ لوگ آدمی نہ تھے؛ بلکہ بھوت پریت تھے۔

● اے دیوتاؤ ! ہم ایک ایسے ملک میں آپہنچے ہیں جو چراگاہوں سے خالی ہے، ایسی سرزمین جو وسیع ہونے کے باوجود ہمیں پرورش کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اے برہسپتی ! مویشی حاصل کرنے کے لئے جنگ میں مدد کر، اے اندر! اس بھجن گانے والے کے لئے ایک راہ نکال، روز بہ روز وہ ان کی (آریوں کی) جائے سکونت سے اس سیہ رُو مخلوق کو دُور بھگا رہا ہے، اس بہادر نے ان کمینے پھیری پھرنے والے داسوں یعنی ورچین اور شامبر کو دریاؤں کے سنگم پر قتل کرڈالا۔ (۶:۷:۴:۲۰-۲۱)

● تیر کمان کی مدد سے ہم مویشی حاصل کریں، تیر کمان کی مدد سے ہم لڑائی جیتیں، تیر کمان کی مدد سے اپنی گھمسان کی لڑائیوں میں فتح مند ہوں، تیر کمان دشمنوں کو غمگین کرتی ہے، اس سے مسلح ہو کر ہم تمام ممالک فتح کریں۔ (۶:۷۵:۱-۴، نیز یجر وید ابیض، ادھیائے ۲۹، منتر ۳۹)

● اے اندر! جب میدانِ جنگ گرم ہو تو تو ہمارے دشمنوں کو اُن فانی لوگوں کو جو ہماری ہجو کرتے ہیں ہلاک کر دے، بدگوؤں کی بددُعائیں ہم سے دُور رکھ، ہمارے پاس مال و دولت کے جمع کئے ہوئے خزانے لا، ہمارے فانی حریفوں کے ہتھیار توڑ دے، ہمیں عظیم الشان شہرت اور مال و دولت عطا کر، ہمارے حریفوں کو آسانی کے ساتھ مغلوب ہو جانے والا بنا دے، اے بہادر! ہم فتح مند ہوں، مالِ غنیمت حاصل کریں، اس طرح اے اندر ! قیمتی چیزوں سے ہم کو مطمئن کر، ہم تیری بلند پایہ مہربانی حاصل کریں، ہمارے بہادروں کو بہ کثرت سامانِ خوراک اور بہادر اولاد حاصل ہو۔ (۷:۲۵:۲، ۳، ۵، ۶)

● اے مگھون! ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، مال و دولت کی فتح کو آسان کر، تو مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں ہمارا اچھا محافظ بن۔ (۲۵:۳۲:۷)

● اے بہادر! ہم تیری دوستانہ معیت میں اس شخص کا مقابلہ کریں جو ہمارے خلاف غصہ سے بھڑک رہا ہے اور اس قوم کے ساتھ لڑائی میں ثابت قدم رہیں جو کثرت سے گائیں رکھتی ہے۔ (۱۱:۲۱:۸)

● تو گھن کھائے درخت ریزہ کردے، داسوں کی قوت کا قلع قمع کردے، ہم اندر کی مدد سے وہ سب خزانے بانٹ لیں جو انھوں نے جمع کئے ہیں۔ (۶:۴۰:۸)

● اے اگنی! اے دیوتا! لوگ قوت حاصل کرنے کے لئے تیری حمد کے ترانے گاتے ہیں، تو دشمن کو ڈرا دے دے کر پریشان کردے، اے اگنی! کیا تو مویشی حاصل کرنے اور دولت فتح کرنے میں ہماری مدد نہیں کرے گی؟ (۱۱-۱۰:۶۴:۸)

● ہم جنگ میں ایسے ہو جائیں کہ تیری کرپا کے (مہربانی) یقینی مستحق ہوں، دیوتاؤں کے لئے متبرک نذرانوں اور مناجاتوں سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم مالِ غنیمت حاصل کرسکیں۔ (دال کھیلہ: ۵:۷)

● اے اندر! خزانوں کے خزانچی! ہم نے خزانوں کی خواہش سے تیرا سیدھا ہاتھ تھام لیا ہے؛ کیوں کہ ہم تجھ کو جانتے ہیں، اے بہادر! مویشیوں کے ساتھ مضبوط ہو کر ہمارے دشمنوں کو مغلوب کرکے ہمیں زبردست درخشاں زر و مال عطا کر۔ (۱۰:۴۷:۳-۴)

● لڑ، اے صداقت سے مضبوط ہو کر لڑنے والے، تو لڑائی

لڑ اور ہم کو اس دولت سے حصہ دلوا جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی ہے۔(۱۰:۱۱۲:۱۰)

● اے اندر! تو سوریہ کے ساتھ داس قوموں پر غالب آ۔(۱۰:۱۱۲:۱۰)

● مجھ کو اپنے ہمسروں میں سانڈ بنا، مجھ کو اپنے حریفوں کا فتح کرنے والا بنا، مجھ کو اپنے دشمنوں کا قتل کرنے والا، با اختیار حکمراں، مویشیوں کا مالک بنا۔(۱۰:۱۶۵:۱)

یجروید

یجروید (ابیض) میں ہم کو جنگ کے متعلق حسبِ ذیل منتر ملتے ہیں :

● یہ اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام و آسائش بخشنے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتی بھگاتی چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے۔(۸:۴۷)

● اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگادے، اے اجیت! دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پوجاری کو عظمت و شوکت نصیب کر۔(۹:۳۷)

● اے وسیوں کے حق میں سب سے زیادہ تباہ کن! تجھ کو پاتھیا نے روشن کیا ہے، تو ہر لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے۔(۱۱:۳۴)

● جو شخص ہم پر تہمت لگائے اور ہمیں ایذا دے، اسے تو جلا کر راکھ کردے۔(۱۱:۸۰)

● اے آگ! تو جس کے شعلے تیری طرح تیز ہو رہے ہیں،

ہمارے آگے آگے پھیل، ہمارے دشمنوں کو جلا دے، اے بھڑکتی ہوئی آگ! جس نے ہمارے ساتھ بدی کی ہے تو اس کو سوکھی لکڑی کی طرح بالکل بھسم کردے، اے اگنی! اُٹھ، ان لوگوں کو بھگا دے جو ہمارے خلاف لڑتے ہیں، اپنی آسمانی طاقت کا مظاہرہ کر۔ (۱۳:۱۲-۱۴)

● درندہ جانور اس کے ہتھیار ہیں، مردم خور (جانور) اس کا پھینکتی ہتھیار ہے، اُن (درندوں) کو سلام ہو، وہ ہماری حفاظت کریں، وہ ہم پر رحم کھائیں، ہم اس آدمی کو ان کے منہ میں ڈال دیں جس سے ہم نفرت کرتے ہیں اور جو ہم سے نفرت کرتا ہے۔ (۱۵:۱۵)

● اے اندر! تو کہ اپنی طاقت کے لئے مشہور ہے، مضبوط ہے، زبردست لڑنے والا ہے، شہزور وخوں خوار ہے، فتح مند اور ہر ایک کو زیر کرنے والا ہے، فتح وکامرانی کا بیٹا ہے، گائیں لوٹنے والا ہے، تو آدمیوں اور بہادروں سے نکل کر اپنی فتح کی گاڑی پر سوار ہو، اصطبلوں کا کھولنے والا، گائیں لوٹنے والا، اس صاعقہ (بجلی) سے مسلح ہے جو ایک پوری فوج کو شکست دیتا ہے اور طاقت سے اس کو تباہ کردیتا ہے، بھائیو! اس کے پیچھے پیچھے آؤ، اپنے تئیں بہادروں کی طرح آزاد چھوڑ دو اور اس اندر کی طرح اپنی شجاعت اور جسارت کا اظہار کرو، ہمارے دشمنوں کے حواس باختہ کردے، اے اپوا (۱)! تو ان کو پکڑ لے جا، ان پر حملہ کر، ان کے دلوں کو آگ پر رکھ، انھیں جلا دے، اس طرح ہمارے دشمن ہمیشہ تاریکی میں رہیں گے۔ (۷:۳۷،۳۸،۴۴)

---

(۱) وبائی امراض کی دیوی کا نام ویدک دیومالا میں ''اپوا'' ہے، یہاں غالباً وہ بیماریاں مراد لی گئی ہیں جو لڑائی کے وقت فوجوں میں پھیلتی ہیں۔ (گرفتھ کا ترجمہ یجروید: ۱۵۴)

سام وید

سام وید کے جن منتروں میں جنگ کا مضمون آیا ہے، وہ یہ ہیں :

● اندر! ہماری مدد کے لئے ایسی کارآمد دولت دے جو ہنر مند ہوشیار لوگوں پر حکومت کرنے والی ہو، ہاں وہ قوت والا ہم کو اقتدار کی دولت دے، اندر اور پوشن کو ہم دوستی اور خوش حالی کے لئے پکاریں اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے۔ (حصہ اول ۳:۱:۶۱-۹)

● ہم شعرا تجھے پکارتے ہیں؛ تاکہ ہم اپنے لئے دولت اور اقتدار حاصل کریں، اے اندر! اے بہادروں کے سردار! لوگ جنگ میں تجھ کو پکارتے ہیں، گھوڑ دوڑ میں تجھ کو پکارتے ہیں، عملی آدمی اپنے سچے حلیف پورندھی کے ساتھ مالِ غنیمت حاصل کرے گا۔ (۳:۱:۵:۲-۶)

● جب ہم رس نکالتے ہیں تو اے اندر! بڑے بہادر! ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں، حتیٰ کہ مالِ غنیمت لوٹتے وقت بھی، ہمیں خوش حال بنا، بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہم خاص تیری حفاظت میں فتح حاصل کریں، اے اندر! ہم تیرا سیدھا ہاتھ پکڑتے ہیں، تو کہ دولت کا مالک تو ہی ہے، ہم تجھ سے خزانوں کی خواہش کرتے ہیں، چوں کہ ہم تجھ کو بہادر، مویشیوں کا مالک جانتے ہیں، ہم کو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر، لڑائی اور عظمت و شان کے ہیرو! ہم کو مویشیوں کے تھان کا ایک حصہ بخش دے۔ (۴:۱:۴:۴-۶)

● نذر و نیاز کے ساتھ گا، اس کی حمد و ثنا کر جو خوش کرتا ہے، جس نے رجسوان کے ساتھ مل کر کالے غولوں (۱) کو بھگا دیا۔ (۴:۲:۴:۱۱)

---

(۱) یہ اور اس کے بعد والا منتر جن کالے رنگ کے لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، اُن سے وہی ملک کے اصلی باشندے مراد ہیں، جن کو داس اور دسیوؤں کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

● اے بہادر! افراط کے ساتھ گائیں رکھنے والی قوم کے خلاف جنگ میں تو ہمارا دوست ہو اور ہم اس شخص کا مقابلہ کریں جو اپنے غصے میں ہم پر بھڑکتا ہے۔(۵:۲:۵)

● غضب ناک، چمکتے ہوئے، اپنی چال میں تھکے بغیر، وہ کالے رنگ والوں کو بھگاتے ہوئے سانڈوں کی طرح آگے بڑھے، اے سوم رس! تو دشمنوں کو شکار کرتا ہوا اُبلتا ہے، اے عقل اور مسرت بخشنے والے! تو دیوتاؤں کو نہ ماننے والے لوگوں کو بھگا دے۔(۶:۱:۱:۵-۶)

● گاڑیوں کے آگے آگے بہادر سپہ سالار مالِ غنیمت تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اس کی فوج خوشیاں مناتی ہے۔(۶:۱:۵:۱)

● مالِ غنیمت لوٹتے وقت ہم پر اُس بہترین زر و مال کے دریا بہادے جس کی سینکڑوں تمنا کرتے ہیں۔(۶:۲:۱:۵)

● اس کے ساتھ فتح حاصل کرنے کی کوشش میں ہم دشمن سے تمام مال و دولت لے لیں، ہاں، آدم زاد کی تمام عظمت و شان حاصل کرلیں۔(حصہ دوم ۱:۱:۱۸:۳)

● اس سے ہم ایسے مالِ غنیمت کے طالب ہیں جو سامانِ خوراک سے مالا مال ہو، جس میں سینکڑوں ہزاروں گائیں ہوں۔(۱:۱:۱۳:۲)

● اے دیوتاؤں کے محبوب! اپنے اچھے مسرت بخش رس کے ساتھ اُبل، بدذات پاپیوں کو قتل کرتے ہوئے، دشمنوں کو ان کی نفرت روز بہ روز زور پکڑتے اور مالِ غنیمت حاصل کرتے ہوئے اُبل، تو گھوڑوں اور گایوں کو حاصل کرنے والا ہے۔(۲:۱:۱۵:۱:۱-۲)

● اندر کی عنایات قدیم ہیں، اس کی حمایت و حفاظت کبھی بند نہیں ہوتی، جب وہ اپنے پوجاریوں کو گایوں سے بھرا ہوا مالِ غنیمت عطا کرتا ہے۔(۲:۱:۳)

● اے مگھون ! اے کڑ کنے والے ! اپنی حیرت انگیز اعانتوں کے ساتھ ہم کو گایوں سے بھرے ہوئے کسی باڑے پر لے چل۔(۲:۲:۲:۱۱)

● اے چابک دست بہادر و! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہوکر ہزار در ہزار مالِ غنیمت لوٹ، اے سرگرم کار مگھون! پُرشوق دُعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال (۱) اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں۔(۲:۲:۱۲:۱۳)

● سچے دیوتاؤ! ہم تم سے وافر سامانِ خوراک حاصل کریں اور ایک سکونت کی جگہ، اے مترو! ہم تمہارے اپنے ہوجائیں، اے مترو! ہماری حفاظت کرو، اپنی حفاظتوں کے ساتھ ہمیں بچاؤ، اے مشتاق محافظو! ہم دسیوؤں کو اپنے ہاتھ سے زیر کرلیں۔(۳:۲:۸:۲-۳)

● اے بہادر! اے مالِ غنیمت لوٹنے والے! تو آدمی کی گاڑی کو تیز چلا، اے فاتح! ایک مشتعل جہاز کی طرح بے دین دسیوؤں کو جلادے۔(۶:۳:۲۰:۳)

● وہ سندر جب ہمارے گیت سنتا ہے تو اپنی گایوں کی کثیر دولت کو ہم سے بچا کر نہیں رکھتا، وہ اپنی قوت سے ہمارے لئے گایوں کا باڑہ کھول دے، خواہ وہ کسی کا ہو، جس کی طرف دسیوؤں کو قتل کرنے والا جاتا ہے۔(۸:۲:۴:۲-۳)

● اندر اور اگنی تم دونوں نے ایک زوردار کارروائی سے ۹۰ قلعوں کو سر کرلیا جو داسوں کے قبضہ میں تھے۔(۸:۲:۱۷:۳)

(۱) زرد رنگ کے مال سے مراد سونا ہے، عربی میں بھی اکثر سونے اور چاندی کا نام لینے کے بجائے صفراء اور بیضاء بولتے ہیں۔

اتھروید

اتھروید میں جنگ کا مضمون بہ کثرت آیا ہے، اس میں سے چند منتروں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

- اے اگنی! تو یا تو دھانوں (۱) کو یہاں باندھ کر لا اور پھر اپنی کڑک سے ان کے سروں کو پاش پاش کر دے۔ (۱:۷:۷)
- اے سوم رس پینے والے! یا تو دھانوں کی آل اولاد کو کھینچ لا اور ہلاک کر دے، اقراری گناہ گاروں کی دونوں آنکھیں سر سے باہر نکال لے۔ (۱:۸:۳)
- اے مینو! (۲) طاقتور ہو کر اِدھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے، دشمنوں اور تیروں اور وسیوں کو قتل کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا۔ (۲:۳۲:۱:۳)
- سچی طاقت بخشے ہوئے راجا! اس کو جلا دے جو ہم کو دُکھ اور تکلیف دے اور جو ہم سے دشمنوں کا سلوک کرے، جو کوئی دُکھ پائے بغیر ہمیں تکلیف دیئے یا دُکھ پا کر ہم کو ستائے اس کو میں آگ اور ویس دنار کے دوطرفہ عذاب میں رکھ دوں۔ (۴:۲۶:۱-۳)
- میں پشاچوں (۳) کو اپنی قوت سے فتح کروں اور ان کی دولت چھین لوں، جو کوئی ہم کو ایذا دے، اسے میں قتل کر دوں اور میرے ارادے کو کامیابی ہو۔ (۴:۳۶:۴)

---

(۱) یہ لفظ کبھی ارواحِ خبیثہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی غیر آریہ دشمنوں کے لئے، جیسا کہ ڈاکٹر بریڈیل کیتھ کہتا ہے، یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ یہ القاب کس جگہ غیر آریہ دشمنوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور کس جگہ ارواحِ خبیثہ کے لئے، تاہم اندازِ بیان سے کہیں کہیں اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ (۲) غضب کا دیوتا۔ (۳) پشاچ عموماً کچا گوشت کھانے والے بھوتوں کو کہتے ہیں، مگر یہاں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ سے انسانی دشمن مراد ہے۔

● رودرا تمہاری گردنیں توڑ دے اے پشاچو! اور تمہاری پسلیاں چور چور کردے، اے یاتو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ رہیں، اے متر اور ورنا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے؛ بلکہ وہ سب چر پھٹ کر اکٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں۔(۲:۳۲:۶)

● ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہوجائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بے کار کردیں اور اس طرح اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔(۳:۶۶:۶)

● ان کو بیل کی کھال میں سی دو، ان کو ہرن کی طرح بزدل بنادو، دشمن بھاگ جائیں اور ان کے مویشی ہمارے پاس آجائیں۔(۳:۶۷:۶)

● ہم اندر کی مدد سے دشمن کے تمام جمع کئے ہوئے خزانہ کو بانٹ لیں اور میں وارونا کے قانون کے مطابق تیرے غرور اور تیری شرارت کا سر نیچا کروں۔(۲:۹۰:۷)

● اے آگ کے دیوتا! تو یاتو دھانوں کی کھال میں گھس جا، تیرا تباہ کن تیر (شعلہ) ان کو بھسم کر ڈالے، اے یات ویدا! ان کے جوڑوں کو کچل ڈال، کچا گوشت کھانے والا اور گوشت کی تلاش کرنے والا اس کو ہلاک کردے۔(۴:۳:۸)

● اے آگ کے راجا! جہاں کہیں تو کسی یا تو دھان کو کھڑے ہوئے یا پھرتے ہوئے دیکھے یا اس کو جو ہوا میں اُڑتا ہے تو غصہ سے مشتعل ہو کر اسے تیر سے چھید ڈال۔(۵:۳:۸)

● یاتو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حمل کرے، انھیں توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے

بھڑک کر اے اگنی! انھیں مار گرا، مردار خوار چنکبرے گدھ اُسے کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح ناک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضا کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے اعضا کو تین ٹکڑے کر دے۔ (۸:۳:۶:۷-۱۰)

● اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے، اے دیوتا! جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں انھیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے، ہمارے پاس سے دفع کر اور ان بندۂ شکم راکشسوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ (۳:۴:۱، رگ وید:۱:۸۷:۵:۱۰)

● پس اے دیوی گائے! برہمن پر ظلم کرنے والے، مجرم بخیل، دیوتاؤں کی مذمت کرنے والے کو اپنی سو گرہوں والی بان سے، جو استرے کے پھل کی طرح تیز ہے ہلاک کر، اس کے سر کو کندھوں سے الگ کر دے، اس کے سر کے بال نوچ ڈال، اس کے بدن کی کھال کھینچ لے، اس کے پٹھے کھینچ لے، اس کے ڈھانچے پر سے گوشت کی بوٹی بوٹی اُتار لے، اس کی ہڈیوں کو کچل دے، اس کے سر سے بھیجا نکال لے اور اس کے سب اعضا اور جوڑوں کو الگ کر دے۔ (۱۲:۵:۶۵:۷۱)

● قلعہ شکن، دولت کے مالک اندر نے دشمنوں کا ناس کر دیا اور بجلی کی سی کڑک کے ساتھ داسوں کو مغلوب کر لیا، اس نے اپنی قوت، اپنی ہر ایک پر غالب آنے والی جرأت، اپنی حیرت انگیز مہارتِ فن سے بد باطن وسیوؤں کو کچل ڈالا، اس نے سونے کے خزانے فتح کیے، اس نے وسیوؤں کو تہس نہس کر دیا اور آریہ نسل کے لوگوں کو محفوظ کر دیا۔ (۲۰:۱۱:۱:۶-۹)

گیتا کا فلسفۂ جنگ

ہندو مذہب میں گیتا (۱) کو جو عظمت حاصل ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ سری کرشن جیسے ممتاز مذہبی پیشوا کی طرف منسوب ہے، مسٹر تلک کے بقول وہ ''بھاگوت دھرم کا سب سے بڑا گرنتھ ہے'' اس میں ہندو مذہب کے فلسفہ کو جس وضاحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کی مثال پورے سنسکرت لٹریچر میں نہیں ملتی، گو اس میں ہندو تصوف کے بیسیوں مسائل زیر بحث آئے ہیں؛ لیکن اس کا اصل مرکزی نقطہ جنگ ہی ہے؛ کیوں کہ وہ ایک پست ہمت سپاہی کو جنگ پر اُبھارنے اور اس کے خوں ریزی سے بیزار دل میں رزم آرائی کا شوق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

تاریخ ہند کا مشہور واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں قدیم آریہ تہذیب پورے عروج پر تھی تو ہستناپور کے شاہی خاندان میں دولت و اقتدار کی خواہش نے پھوٹ ڈال دی، کورو اور پانڈو دو مقابل فریق بن گئے اور دونوں کی تائید میں ہندوستان کے بڑے بڑے امراء واعیان کھڑے ہوگئے، اول اول سمجھوتے کی کوششیں کی گئیں، مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر دونوں نے قاضی شمشیر کو حَکَم بنایا اور میدانِ جنگ کی عدالت میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوگئے، کرشن جی اس جنگ میں پانڈوؤں کے حامی تھے، پانڈوؤں کا سردار ارجن اُن کا چیلا تھا، اُس کی فوج کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے کرشن جی نے خود اس کے رتھ کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں، جب میدانِ کارزار میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں اور ارجن نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بھائیوں کو آمادۂ قتال دیکھا تو اس کا دل ٹوٹنے لگا، اس نے محبت کے لطیف جذبات سے متاثر ہوکر ارادہ کیا کہ جنگ سے پھر جائے

---

(۱) میرے پیش نظر متن کی حاملہ گیتا کی دو مستند شرحیں ہیں، ایک: مسٹر بال گنگا دھر تلک کی مشہور شرح، جس کا ترجمہ مسٹر شانتی نرائن لاہوری نے کیا ہے، دوسری مسٹر کے ٹی تیلنگ کی شرح، جو سلسلۂ کتب مقدسہ شرق (Sacred Books of the East Series) میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی ہے۔

اس پر کرشن جی نے اس کو ایک طویل اپدیش دیا جو جنگ کے فلسفے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حاوی تھا، یہی اپدیش بھاگوت گیتا ہے۔(۱)

اس اپدیش کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب ارجن کا دل اپنے عزیزوں کو دیکھ کر جنگ سے بیزار ہونے لگا تو اس نے غمزدہ ہو کر کرشن جی سے کہا :

> ہے کرشن! جنگ کرنے کی خواہش سے جو لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں ان رشتہ داروں کو دیکھ کر میرے اعضا بے حس و حرکت ہوئے جارہے ہیں، منھ خشک ہو رہا ہے، جسم پر لرزہ چڑھ کر میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا ہے، کمان میرے ہاتھ سے گری پڑتی ہے، ہے کیشو! مجھے تمام لچھن اُلٹے نظر آرہے ہیں، اپنے عزیزوں کو مار کر مجھے کوئی بھلائی حاصل ہوتی نظر نہیں آتی، ہے کرشن! مجھے فتح کی خواہش نہیں، نہ راج چاہئے اور نہ سکھ، ہے گوند! راج، بھوگ اور زندگی ہی سے ہمیں کیا لطف مل جائے گا؟ جن کے لئے راج کی، عیش وعشرت کے ساز وسامان کی اور سُکھ کی خواہش کی جاتی ہے، وہی لوگ زندگی اور خوش حالی کی اُمید چھوڑ کر یہاں جنگ کے لئے

(۱) یہ اپدیش دراصل زبانی دیا گیا تھا، مہابھارت کے مصنف نے اس کے معرضِ تحریر میں آنے اور عام طور پر شائع ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب کوروؤں کے بزرگ دھرت راشٹر نے اپنی آنکھوں سے اپنے خاندان کی تباہی کا منظر دیکھنا پسند نہ کیا تو ویاس جی نے ایک رتھ بان کو جس کا نام سنجے تھا، اس کے پاس مقرر کر دیا؛ تاکہ وہ جنگ کی مفصل کیفیت من وعن بیان کرتا جائے، اس رپورٹر نے کیفیت جنگ کے سلسلہ میں اُس گفتگو کا بھی پورا حال دھرت راشٹر کو سنا دیا جو پانڈوؤں کے لشکر میں کرشن جی اور ارجن کے درمیان ہوئی تھی، اور وہ اپدیش بھی نقل کر دیا جو ارجن کی ہمت افزائی کے لئے کرشن جی نے ارشاد فرمایا تھا، بعد میں یہی سنجے کی روایت مہابھارت کی پوتھی ''بھیشم پرب'' میں نقل کر دی گئی اور اس کا نام ''بھاگوت گیتا'' رکھا گیا، (دیکھو تیلنگ کا مقدمہ بھاگوت گیتا: ۳، اور تلک کی شرح گیتا: ۱/۴) اس سے معلوم ہوا کہ کرشن جی کا یہ اپدیش براہِ راست اُن سے یا ان کے حامیوں کے کیمپ سے نقل ہو کر نہیں آیا ہے؛ بلکہ مخالف کیمپ کے ایک راوی نے اسے (غالباً بطریقِ الہام) سن کر ان کی طرف سے روایت کیا ہے۔

کھڑے ہوئے ہیں، اگرچہ یہ ہمیں مارنے کے لئے کھڑے ہیں، مگر
پھر بھی اے مدھوسودن! میں لوک کے راج کے لئے بھی انھیں مارنا
پسند نہیں کرتا، پھر اس دنیا کی تو ہستی ہی کیا ہے، خود اپنے رشتہ دار کو
روؤں کو مارنا ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ اے
مادھو! اپنے عزیزوں کو مار کر ہم کس طرح سکھی ہو سکیں گے؟ ہمیں وہ
خرابیاں صاف نظر آ رہی ہیں جو خاندان کی تباہی سے پیدا ہوتی ہیں،
اس لئے کیوں کر ممکن ہے کہ ہمارے دل میں اس پاپ سے بچنے کا
خیال نہ آئے؟ خاندان کی تباہی سے تمام پرانے خاندانی دھرم تباہ
ہو جاتے ہیں اور خاندان کے ان دھرموں کے مٹ جانے سے
خاندان پر اَدھرم کی دھاک جم جاتی ہے، ہے جنادرن! ہم ایسا سنتے
آئے ہیں کہ جن انسانوں کے خاندان دھرم غائب ہو جاتے ہیں، وہ
یقینی طور پر نرک ہو جاتے ہیں، دیکھو تو سہی، ہم شاہانہ عیش کے لالچ
سے اپنے عزیزوں کو مارنے کھڑے ہوئے ہیں، یہ ہم نے بڑا پاپ
کرم کرنے کی تیاری کی ہے، اس سے تو میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ
اپنے ہتھیار پھینک دوں، انھیں کچھ روک ٹوک نہ کروں اور ہتھیار
بند کورو مجھے میدانِ جنگ میں مار ڈالیں۔ (اشلوک: ۱: ۲۸-۴۶)

ارجن کے ان پاکیزہ اور لطیف خیالات کو سن کر کرشن جی نے تعجب کے ساتھ پوچھا:

ہے ارجن! اس نازک موقع پر تیرے من میں یہ غلط خیال کہاں سے
آ گیا، جس کی طرف اعلیٰ انسانوں نے کبھی توجہ نہیں کی اور جو ذلیل
حالت کو پہنچانے والا اور بدنامی کا باعث ہے؟ ہے پاتھ! ایسا نامرد
نہ بن، یہ تیری شان کے شایان نہیں، دل کی کمزوری کو چھوڑ اور کھڑا
ہو جا۔ (۲: ۲-۳)

اس پر ارجن نے کہا :

ان مہاتما کوروؤں کو مارنے سے اس دنیا میں بھیک مانگ کر پیٹ بھر لینا اچھا ہے ؛ کیوں کہ اگر ان مال و دولت کے لوبھی بزرگوں کو میں نے مارلیا تو مجھے ان کے خون سے رنگے ہوئے سامان عیش وعشرت کو اس دنیا میں استعمال کرنا پڑے گا ، جن کو مار کر پھر ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہوسکتی ، وہی کورو ہمارے سامنے صف آرا ہیں ۔(۲:۵-۶)

ارجن کی اس تقریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خانہ جنگی تھی ، جس میں ایک خاندان کے دو فریق حکومت و پادشاہی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو مٹادینا چاہتے تھے ، ارجن کے دل نے اس برادر کُشی اور حرصِ جاہ کے خلاف اسے ملامت کی اور ضمیر کی اس سرزنش سے متاثر ہو کر وہ شریف سپاہی جنگ سے متنفر ہونے لگا ، مگر کرشن جی نے اس کے ان خیالات کی تردید کی اور اس کے سامنے ایک جدید فلسفہ پیش کیا جسے گیتا کے راوی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

- جن کا شوک نہیں کرنا چاہئے تو انھیں کا شوک کر رہا ہے اور پھر گیان کی باتیں بھی بگھارتا ہے ، حالاں کہ چاہے کسی کی جان جائے یا رہے ، گیانی اس کا کچھ افسوس نہیں کرتے ، جس طرح جسم میں رہنے والے کو اسی جسم میں بچپن ، جوانی ، بڑھاپا حاصل ہوتا ہے ، اسی طرح آئندہ دوسرا جسم بھی ملا کرتا ہے ، اس لئے گیانی لوگ اس بارے میں کچھ موہ نہیں کرتے ۔(۲:۱۱-۱۳)
- جسم مالک آتما غیر فانی اور نا قابلِ ادراک ہے اور اس کو حاصل ہونے والے اجسام فانی ہیں ، اس لئے اے ارجن ! تو جنگ کر ، جو شخص سمجھتا ہے کہ آتما مارتی ہے یا آتما ماری جاتی ہے ، اس کو سچا گیان حاصل نہیں ہے ؛ کیوں کہ یہ آتما نہ تو مارتی ہے اور نہ ماری جاتی ہے ،

یہ آتما نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے اور ایسا بھی نہیں کہ یہ ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد کبھی پھر نہ ہوتی ہو، یہ کبھی بوڑھی نہ ہونے والی، دائم، مسلسل اور قدیم ہے، اس لئے جسم کے مارے جانے سے یہ نہیں ماری جاتی ہے، پارتھ! جس نے یہ جان لیا کہ یہ آتما غیر فانی، دائم، کبھی نہ بوڑھی ہونے والی اور کبھی نہ مٹنے والی ہے، وہ ایک انسان کو کیسے مار ڈالے گا یا مروادے گا؟ جس طرح کوئی شخص پرانے کپڑوں کو اُتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے، اسی طرح جسم کی مالک آتما بھی پرانے جسم کو چھوڑ کر نیا جسم اختیار کر لیتی ہے، اس آتما کو ہتھیار نہیں کاٹ سکتے، آگ نہیں جلا سکتی، نہ اسے پانی تر کر سکتا ہے اور نہ ہوا خشک کر سکتی ہے، اس لئے اس آتما کو اس طرح کا سمجھ کر اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں ہے۔ (۲:۱۸-۲۵)

● اگر تو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما دائمی نہیں ہے، جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی اور اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے، تب بھی، اے مہاباہو! اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں؛ کیوں کہ جو پیدا ہوا ہے اس کی موت یقینی ہے اور جو مرتا ہے اس کا پیدا ہونا لابدی ہے، اس لئے اس اٹل بات پر افسوس کرنا تیرے شایانِ شان نہیں ہے۔ (۲:۲۶-۲۷)

● سب کے جسموں میں رہنے والی جسم کی مالک آتما کو کبھی کوئی نہیں مار سکتا، اس لئے اے بھارت! کسی جاندار کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں۔ (۲:۳۰)

آگے چل کر کرشن جی نے ایک اور فلسفہ بیان کیا، جس کی تقریر خود ان کے الفاظ نقل کی جاتی ہے:

● اگر سب پاپیوں سے بھی زیادہ پاپ کرنے والا ہو تب بھی اس

گیان کی کشتی سے ہی تو پاپوں کو پار کر جائے گا، جس طرح روشن کی ہوئی آگ تمام ایندھن کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اسی طرح اے ارجن! یہ گیان روپ کی آگ بھی سب کاموں کی نیکی و بدی کی قیود کو جلا ڈالتی ہے۔ (۴:۳۶-۳۷)

- اے دھنجے! اس آتم گیانی شخص کو کرم اپنی قیود میں نہیں پھنسا سکتے جس نے کرم یوگ کے سہارے سے کرموں کی قیود کو ترک کر دیا ہے اور جس کے سب شکوک وشبہات گیان سے دُور ہو گئے ہیں، اس لئے تیرے دل میں اگیان (عدم عرفان) سے جو شبہ پیدا ہو گیا ہے، اسے تو گیان روپ کی تلوار سے کاٹ دے اور کرم یوگ کا سہارا لے کر جنگ کے لئے کھڑا ہو جا۔ (۴:۴۱-۴۲)
- جو کرم یوگ میں لوک گیا، جس کا دل پاک ہو گیا، جس نے اپنے من اور اپنے حواس پر قابو پالیا اور سب جانداروں کی آتما ہی جس کی آتما ہو گئی وہ سب کام کرنے کے باوجود کرموں کے عذاب وثواب سے غیر متاثر رہتا ہے۔ (۵:۷)
- جو برہم کے ارپن کر کے اور کرم کے تعلق سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے، اس کو اسی طرح پاپ نہیں لگتا جس طرح کمل کے پتے کو پانی نہیں لگتا۔ (۵:۱۰)

گیتا کے فلسفہ پر ایک نظر

کرشن جی کی اس تعلیم کا ماحصل صاف الفاظ میں یہ ہے کہ :

(۱) چوں کہ عقیدۂ تناسخ کی رو سے انسان ایک دفعہ مر کر پھر دوسرے جنم میں آجاتا ہے، اس لئے اسے قتل کر دینا کوئی بُری بات نہیں ہے، مرنے کے بعد وہ پھر جنم لے لے گا اور اس کی غیر فانی روح پر قتل کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

(۲) رُوح کے لئے جسم کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لئے کپڑوں کی ہے؛ لہٰذا کسی کے جسم ورُوح کا تعلق کاٹ دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے پُرانے کپڑے پھاڑ دینا، اس فعل کو قتل سے اور اس کے نتیجے کو موت سے تعبیر کرنا پھر اُسے گناہ اور جرم سمجھنا اور اس پر رنج کرنا محض جہالت ہے، علم وعرفان کی نگاہ میں تو جو شخص کسی انسان کو بہ ظاہر قتل کرتا ہے وہ دراصل اسے قتل نہیں کرتا؛ بلکہ صرف اس کی رُوح پر سے جسم کا لبادہ اُتار دیتا ہے اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے، افسوس کی بات تو اس وقت ہوتی ہے جب قتل سے روح پر بھی موت واقع ہوتی۔

(۳) جو چیز حادث ہے اس کا فنا ہوجانا یقینی ہے، پھر جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو اسے مار ڈالنے میں کیا بُرائی ہے؟ جو اٹل بات ہے وہ ہو کر رہے گی، خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا قدرت کے ہاتھ سے، کل قدرت تو اسے مارنے والی ہے ہی، پھر آج اگر ہم نے اسے مار ڈالا تو آخر مضائقہ کیا ہے؟

(۴) جس شخص کو گیان حاصل ہو، اس کے لئے نیکی اور بدی کی کوئی قید باقی نہیں رہتی، اس کے لئے تمام اعمال مباح ہوجاتے ہیں، اعمال میں نیک وبد کا امتیاز صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو گیانی نہیں ہیں، بس گیان حاصل کرلو، پھر کوئی بدتر سے بدتر فعل بھی تمہارے لئے گناہ نہیں ہے۔

اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان کے دل میں انسانی جان کی کوئی قدر وقیمت ہی باقی نہ رہے، جس کا جی چاہے اپنے دوسرے بھائی کے جسم کو پرانا کپڑا سمجھ کر پھاڑ دے اور جب باز پُرس ہو تو جسم کی فنا پذیری اور روح کی دائمی زندگی کا فلسفہ پیش کر کے قتل کی ذمہ داری سے بری ہوجائے، پھر جو شخص گیانی ہونے کا مدعی ہو، اس کے لئے تو قتل کیا معنی، کوئی جرم جرم اور کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہتا، وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کر کے بھی بے جرم وبے قصور رہ جاتا ہے۔

ایک طرف گیتا نے اس قدر آزادی کے ساتھ جنگ کی تلقین کی ہے، دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے پورے اٹھارہ ابواب میں ایک جگہ بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ جس خوں

ریزی پر وہ اس طرح انسان کو اُکسار ہی ہے، اس کا مقصد کیا ہے اور کن اغراض کے لئے وہ بنی نوعِ انسان کا خون بہانا یا ارواح و اجساد کے تعلق کو قطع کرنا جائز سمجھتی ہے، جنگ کے مسئلہ میں مقصد جنگ کا سوال در حقیقت ایک بنیادی سوال ہے؛ کیوں کہ اس خطرناک کام کو اگر کوئی چیز مقدس بنا سکتی ہے تو وہ صرف مقصد کی پاکی و طہارت ہی ہے، ورنہ ناجائز مقاصد کے لئے تو خواہ کتنی ہی شرافت کے ساتھ جنگ کی جائے بہر حال وہ ناجائز ہوگی، اور قانونِ اخلاق کی نظر میں درندگی و بہیمیت کے سوا کچھ نہ ہوگی؛ لیکن گیتا نے اس بنیادی سوال کو صاف نظر انداز کر دیا ہے اور اس باب میں انسان کی رہنمائی کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

تاہم بعض اشلوکوں کے اندازِ بیان سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقصدِ جنگ کے بارے میں گیتا کا نقطۂ نظر کیا ہے، ایک جگہ کرشن جی فرماتے ہیں :

● ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے، جو تیرے لئے خود بہ خود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے؛ لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کر کے پاپ جمع کرے گا؛ بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے۔ (۲:۳۲-۳۴)

● سب مہارتھی یہ سمجھیں گے کہ تو خوف زدہ ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ گیا ہے، جن کی نظروں میں آج تو نہایت تعظیم کے قابل بنا ہوا ہے، وہ تجھے ناقابل سمجھنے لگیں گے، اسی طرح تیرے زور و طاقت کی مذمت کر کے تیرے بدخواہ اور دشمن ایسی ایسی بہت سی باتیں کہیں گے جو نہ کہی جانی چاہئیں، پھر اس سے بڑھ کر دُکھ کی بات اور کیا ہوگی؟ اگر تو مر گیا تو سورگ کو جائے گا اور اگر فتح یاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگے گا، اس لئے جنگ کرنے کا مستقل ارادہ کر کے اُٹھ۔ (۲:۳۵-۳۷)

● علاوہ بریں اگر تو اپنے دھرم کی طرف بھی دیکھے تو اس وقت ہمت ہارنا تجھے مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ دھرم کی رو سے حق بجانب جنگ سے بڑھ کر اور کوئی بات کشتری کے لئے بھلائی کی نہیں ہوسکتی (۱)۔ (۳۱:۲)

● میں لوگوں کا خاتمہ کرنے والا اور بڑھا ہوا کال ہوں ، یہاں لوگوں کا ناش کرنے آیا ہوں، تو اگر نہ ہو تب بھی فوجوں کی صفوں میں یہ جتنے جنگ آزما کھڑے ہیں سب تباہ ہونے والے ہیں، اس لئے تو اُٹھ، نیک نامی حاصل کر اور دشمنوں کو مغلوب کر کے وسیع سلطنت کا لطف اُٹھا، میں نے انھیں پہلے ہی مار دیا ہے۔ (۱۱: ۳۲-۳۳)

یہ خیالات اُن عام خیالات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں جو جنگ کے موقع پر ہمیشہ سپاہیوں کو لڑنے کی ترغیب دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ، نہ یہ مقاصد جنگ اُن مقاصد سے کچھ بلند ہیں جن کے لئے اہل دنیا اپنے ابنائے نوع کا خون بہایا کرتے ہیں، وہی مال وزر کی خواہش، وہی شہرت وناموری کا شوق، وہی حکومت وسلطنت کی طلب، وہی شکست کی ذلت اور بدنامی کا خوف، یہاں بھی جنگ کی تحریک کر رہا ہے جو عام دنیا پرست لوگوں میں جنگ کا جوش اور قتل وغارت گری کی خواہش پیدا کرتا ہے، اس میں کوئی بلند پایہ تعلیم نہیں ہے، کوئی اعلیٰ اخلاقی ہدایت نہیں ہے، کوئی بہتر نصب العین نہیں ہے، حیوانی خواہشات وجذبات سے بلندتر کسی جذبہ وخواہش کی طرف انسان کی رہنمائی نہیں کی گئی ہے۔

---

(۱) صرف یہی ایک فقرہ گیتا میں ہم کو ایسا ملا ہے جو جنگ کے ایک بہتر اخلاقی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تشریح گیتا میں نہیں کی گئی کہ ”حق بہ جانب جنگ“ سے اس کی مراد کیا ہے، اگر حق بہ جانب جنگ کا مطلب صرف یہی ہے کہ ایک خاندان کی دو شاخیں تخت کی مدعی ہوں اور بادشاہی نظام کے دستور وآئین کی رو سے ایک شاخ کو راج کا حق پہنچتا ہو تو اس کا برادر کشی کے لئے اُٹھنا اور لڑ کر تخت حاصل کرنا ”حق بہ جانب جنگ“ ہے، تو اس فقرے کی ساری اخلاقیات ختم ہوجاتی ہے، ایسی حق بہ جانب لڑائیاں تو شاہی خاندانوں میں ہمیشہ ہوتی ہی رہی ہیں اور کسی معقول آدمی نے کبھی یہ گمان نہیں کیا ہے کہ تخت وتاج کے لئے اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنا اور ہزارہا دوسرے انسانوں کی زندگیاں اپنی شاہانہ خود غرضیوں پر قربان کرانا کوئی پاکیزہ اخلاقی فعل ہے۔

منو کے احکام جنگ

منو (۱) کی دھرم شاستر ہندوؤں کے مذہبی قوانین کا بہترین مجموعہ ہے اور تقریباً ۱۴ سو برس سے اس کے احکام ہندو قوموں اور سلطنتوں میں معمول بہ ہیں، اس کے مصنف کی شخصیت بڑی حد تک تاریکی میں ہے، اس کی تصنیف کا زمانہ بھی متعین نہیں ہے، (۲) مگر یہ حقیقت مسلّم ہے کہ وہ آریہ قوم کے اس عہد کی تصنیف ہے جب اس کا نظامِ تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا اور سلطنتوں کے معاملات کی تنظیم کے لئے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے دساتیرِ عمل کی ضرورت پیدا ہوگئی تھی، اس مقصد کے لئے منو کے علاوہ اور بھی بہت سی شاستریں اور سمرتیاں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب میں منو کو ترجیح حاصل ہے؛ کیوں کہ دوسری کتابیں یا تو منو کی خوشہ چیں ہیں یا اس سے متناقض واقع ہونے کی صورت میں ہندو علماء نے ان کو رد کر دیا ہے، مذہبی کتابوں میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ”جو کچھ منو کہتا ہے وہی صحیح ہے“ اور ”جو سمرتی منو کے خلاف ہے، وہ معتبر نہیں ہے“ پس ہندو مذہب کے قوانین معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

چوں کہ یہ مجموعہ ایک ایسے زمانے میں مرتب ہوا ہے جب کہ ہندوستان میں آریہ قوم کی باقاعدہ سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں اور تہذیب وتمدن کی ترقی نے اس کو اپنے معاملات کے اجراء میں

---

(۱) میرے پیش نظر منو کے دو انگریزی ترجمے ہیں، ایک سر ولیم جونز کا ترجمہ جو ۱۷۹۴ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوا تھا، دوسرا ڈاکٹر برنل کا ترجمہ مع شرح جسے پروفیسر ہاپکنس نے ایڈٹ کر کے ۱۸۹۴ء میں شائع کیا، ان میں سے اول الذکر ترجمہ گورنمنٹ کے حکم سے ہوا تھا اور آج نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔

(۲) سر ولیم جونز کا خیال ہے کہ اس کی تدوین ۱۲۵۰ تا ۵۰۰ ق م کے درمیان ہوئی ہے، پروفیسر مونیر ۵۰۰ ق م کا اندازہ لگاتا ہے، جرمن مستشرق یوہانیتگن کی رائے میں ۳۵۰ ق م اس کی صحیح تاریخ ہے، شلیگل کی رائے ہے کہ ۱۰۰۰ ق م کے قریب اس کی تصنیف ہوئی ہے، پروفیسر کروک کہتا ہے کہ ۲۰۰ عیسوی سے زیادہ پرانی نہیں ہے، مگر ڈاکٹر برنل کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ۱۰۰ء سے ۵۰۰ء تک کسی زمانے میں مدون ہوئی ہے اور غالباً چالوکیہ خاندان کے کسی راجا نے اس کو اپنی سلطنت کا دستور العمل بنانے کے لئے لکھوایا تھا۔

ایک مخصوص ضابطہ کی پابندی کرنا سکھا دیا ہے، اس لئے ہم کو اس میں جنگ کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق احکام وقوانین ملتے ہیں۔

جنگ کا مقصد

سب سے پہلا سوال مقصدِ جنگ ہے، منو نے اس پر کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی ہے، تاہم حسبِ ذیل تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتا ہے :

- روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے (یا قتل کرنے) کی خواہش سے اپنی تمام قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے، وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں۔ (۸۹:۷)
- جس راجا کی فوجیں ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہتی ہیں، اس سے تمام دنیا خوف زدہ و مرعوب رہتی ہے، پس ایسے راجا کو اپنی مستعد فوج کے ساتھ تمام مخلوقات کو اپنا تابع فرمان بنانا چاہئے یا (اگر وہ بہ خوشی اطاعت قبول نہ کریں تو) دوسرے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں، یعنی رشوت، جوڑ توڑ اور جنگی طاقت۔ (۱۰۷:۷)
- کامیابی کے ان چاروں ذرائع میں سے عقل مند لوگ سلطنت کی توسیع کے لئے صلح و رضا اور جنگی طاقت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ (۱۰۹:۷)
- اس طرح جب راجا دھرم کے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض ادا کرلے تو اس کو اُن علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، جو ابھی تک اس کے قبضہ میں نہ آئے ہوں اور اپنے مقبوضہ ممالک کی خوب حفاظت کرنی چاہئے۔ (۲۵۱:۹)

● (دھرم کے مطابق عمل کرنے والے) راجا کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ ممالک فتح کرے اور جنگ سے کبھی نہ ٹلے۔(۱۱۹:۱۰)

ان اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کے سوال میں منو کی پروازِ فکر بھی کرشن جی سے کچھ زیادہ اونچی نہیں ہے، عام دنیا داروں کی طرح وہ بھی حکومت و بادشاہی کو طاقتوروں کا منتہائے مقصود سمجھتا ہے اور انھیں ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو ہر وقت اسی ملک گیری کے کام میں صرف کرتے رہیں۔

جنگ کے اخلاقی حدود

منو نے جنگ کے عملی پہلو میں بہت کچھ ترقی کی ہے اور اعمالِ جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے لئے ایسی حدود مقرر کی ہیں جو کسی حد تک اسلام کی مقرر کردہ حدود سے ملتی جلتی ہیں، ذیل میں ہم اس کے احکام لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہیں :

● کوئی شخص جو جنگ میں شامل ہو، اپنے دشمن کو چھپے ہوئے ہتھیار سے یا زہر میں بجھے ہوئے یا کانٹے دار تیر سے یا آگ میں گرم کئے ہوئے برچھے سے قتل نہ کرے۔(۹۰:۷)

● نہ (گاڑی یا گھوڑے پر سوار ہونے والا) پیدل کو قتل کرے، نہ زنانے کو، نہ اس کو جو ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگے، نہ اس کو جس کے بال کھل گئے ہوں، نہ اس کو جو بیٹھا ہوا ہو اور نہ اس کو جو کہے کہ میں تیرا قیدی ہوں، نہ اس کو جو سوتا ہو، نہ اس کو جس کے پاس زرہ نہ ہو، نہ اس کو جو ننگا ہو، نہ اس کو جو نہتا ہو، نہ اس کو جو محض تماشائی ہو شریک جنگ نہ ہو، نہ اس کو جو کسی دوسرے سے گتھا ہوا ہو۔(۷:۹۱-۹۲)

● شریف آدمی کے فرض کو یاد رکھتے ہوئے وہ ایسے شخص کو قتل نہ کرے، جس کا ہتھیار ٹوٹ گیا ہو، یا جو غم زدہ ہو، یا سخت مجروح ہو، یا دہشت زدہ ہو یا جو پیٹھ پھیر دے۔(۹۳:۷)

● گاڑی، گھوڑا، ہاتھی، چھتری، لباس (سوائے ان جواہر کے جو اس میں لگے ہوئے ہوں)، غلہ، مویشی، عورتیں اور ہر قسم کی رقیق اور جامد چیزیں (سوائے چاندی سونے کے) اُس شخص کی جائز ملک ہیں جو لڑائی میں ان کو جیتے۔ (۷:۹۶)

● ان چیزوں میں جو قیمتی اشیا ہوں، ان کے ایک حصہ کو وہ شخص جس نے انھیں لُوٹا ہو، راجا کے سامنے پیش کرے اور جو چیزیں فرداً فرداً لوٹی گئی ہوں، انھیں راجا کو تمام فوج میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ (۷:۹۷)

● جب وہ دشمن کا محاصرہ کرے تو خیمہ زن ہونے کے بعد وہ دشمن کے ملک کو تاراج کر دے، مخالف راجا کے سامانِ رسد (چارہ اور غلہ وغیرہ) پانی اور ایندھن کو غارت کرتے رہنا چاہیے۔ (۷:۱۹۵)

● اسے تالاب، کنوئیں اور خندقیں سب کو برباد کر دینا چاہیے، وہ دن اور رات دشمن کو خوف زدہ اور پریشان کرتا رہے۔ (۷:۱۹۶)

● ملک کو فتح کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کی عبادت کرے (۱) اور نیکوکار برہمنوں کی بھی، وہ لوگوں میں داد و ہش کرے اور ظلم و زیادتی سے بے خوفی کی عام منادی کر دے۔ (۷:۲۰۱)

● مگر ان لوگوں کے طرزِ عمل اور ارادوں کا حال اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد وہ اس ملک میں خود وہیں کے شاہی خاندان

---

(۱) منو کے شارح کلوکا نے دیوتاؤں سے مراد مفتوح ملک کے دیوتا لئے ہیں؛ لیکن ساتھ ہی لفظ "برہمن" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ حکم غیر آریہ قوموں کے دیوتاؤں سے متعلق نہیں ہے اور یہ اُمید بھی نہیں کی جاسکتی کہ منو نے آریوں کو غیر آریہ قوموں کے دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش کا حکم دیا ہوگا۔

میں سے کسی فرد کو حکمراں بنادے اور اس کو باقاعدہ ہدایات دے(۱)۔(۲۰۲:۷)

● اور وہ ان کے قوانین کو جس طرح وہ ان کے ہاں بیان کئے گئے ہوں مستند قرار دے، اور (نئے راجا) اور دوسرے امراء کو زر و جواہر کے عطایا سے ممنونِ احسان بنائے۔(۲۰۳:۷)

ان احکام میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھیں معرکہ کارزار میں ملحوظ رکھنا قطعاً ناممکن ہے، مثلاً یہ کہ سوار پیدل کو قتل نہ کرے، دشمن کے بال کھل جائیں تو اس پر حملہ نہ کیا جائے، دشمن کے پاس زرہ نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے، ننگے یا نہتے یا غم زدہ یا دہشت زدہ کو قتل نہ کیا جائے، دشمن کسی دوسرے شخص سے لڑنے میں مشغول ہو تو اس پر وار نہ کیا جائے، اس قسم کے احکام میں اصلاح کے جذبہ پر نمائشی اخلاق غالب آگیا ہے، اس لئے ضروریات جنگ اور اخلاقی حدود کا توازن برقرار نہیں رہا، ظاہر ہے کہ جب میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے تو سپاہی ان باتوں کا لحاظ نہیں کرسکتا اور لحاظ کرے تو لڑ نہیں سکتا، دوسری طرف بعض احکام میں منو نے

---

(۱) یہ حکم بھی صرف آریہ قوموں کی (اور صحیح تر یہ ہے کہ "ہندو آریہ" قوموں کی) باہمی جنگ سے متعلق ہے؛ کیوں کہ اشلوک نمبر: ۲۰۲ کوئی مستقل اشلوک نہیں ہے؛ بلکہ نمبر: ۲۶ سے نمبر: ۲۰۳ تک ایک مسلسل جملہ کا جزو ہے، اس خیال کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے، پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے: "یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منو اور وشنو دونوں کہتے ہیں کہ جب ایک راجا کسی بیرونی دشمن کو مغلوب کرے تو وہ خود اس ملک کے (نہ کہ اپنے ملک کے) ایک شاہزادہ کو وہاں کا راجا بنادے، اسے اپنے دشمن کے شاہی خاندان کو برباد نہ کرنا چاہئے، مگر یہ اس صورت میں جائز ہے جب کہ وہ شاہی خاندان نیچ ذات کا ہو"۔(Cambridge, History of India, Vol. I, P:290)

تاریخ ہند قدیم کا ایک اور ماہر پروفیسر ہیول (Havel) جو ہندو تہذیب کا بڑا دل دادہ ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے: "مختلف آریہ قبائل کے درمیان لڑائیاں اور آریوں سے غیر آریہ وحوش (داس اور دسیوؤں) کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، مگر چوں کہ مقدم الذکر صورت میں (آریوں کی باہمی لڑائیوں میں) یہ ایک مقرر قاعدہ تھا کہ جنگ محض توسیع مملکت کی غرض سے نہ ہونی چاہئے اور یہ کہ ایک مغلوب آریہ راجہ کو معزول نہ کیا جائے؛ بلکہ غالب اسے باج گزار بنالے، اس لئے قبائلی نزاعات نے آریوں کے اجتماعی نظام کو درہم برہم نہ ہونے دیا۔(History of Aryan Rule in India, P:33-34)

ضروریاتِ جنت پر اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو قربان بھی کر دیا ہے، مثلاً: یہ حکم کہ دشمن کے تمام وسائل کو برباد کر کے سارے ملک کو بھوکا مار دیا جائے، کسی طرح شریف تر اخلاقی حسیات کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، تاہم مجموعی حیثیت سے منو کے یہ احکام بہت مہذب ہیں اور ایسے تربیت یافتہ اخلاقی شعور کا پتہ دیتے ہیں، جو عداوت اور جنگ کی حالت میں بھی محاربین کے انسانی فرائض کا احساس رکھتا ہے اور اس بلند اخلاقی تخیل تک پہنچ چکا ہے کہ انسان پر انسانی حیثیت سے اس کے دشمن کے بھی کچھ حقوق ہیں، جنھیں بہر حال اسے ملحوظ رکھنا چاہیے، اس معاملہ میں اُصولاً منو کے احکام اسلام سے قریب تر ہیں، اگرچہ اتنے معتدل اور ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ منو کا قانون اُس عہد میں مدون ہوا تھا، جب غیر آریہ اقوام کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی اور ہندوستان میں ان کی ایک بھی حکومت باقی نہ رہی تھی، جس سے آریوں کی جنگ ہوتی، اس لئے منو کی دھرم شاستر میں ایسے قوانین کی تلاش فضول ہے جو آریہ اور غیر آریہ اقوام کی جنگ کے لئے مقرر کئے گئے ہوں، اس زمانے میں وہ تمام غیر آریہ قومیں جو ویدوں میں داس، وسیوؤں، راکشس اور اُسر وغیرہ ناموں سے یاد کی گئی ہیں، یا تو آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہو چکی تھیں یا مغلوب ومفتوح ہو کر ملک کی آبادی کا جزو بن چکی تھیں اور مجموعی طور پر ان کا نام ''شودر'' رکھ دیا گیا تھا، پس منو سے ہم کو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہندو قانون ہندوؤں کی باہمی جنگ میں فاتح ہندو کو مفتوح ہندو کے ساتھ کیا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اس کے احکام جنگ ہم کو یہ نہیں بتاتے کہ مفتوح غیر آریہ قوم کے ساتھ فاتح آریہ کو کیا سلوک کرنا چاہیے، اس چیز کے معلوم کرنے کے لئے ہمیں شودروں کے متعلق منو کے احکام پر نظر ڈالنی چاہیے۔

(۱) منو شودروں کو فطرتاً ذلیل قرار دیتا ہے، وہ اعمال کی بنا پر نہیں؛ بلکہ پیدائش کی بنا پر ان کو سب سے ادنیٰ مخلوق سمجھتا ہے:

● برہما نے اپنے منھ سے برہمن کو، ہاتھ سے کشتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔(۱)

● برہمن کے نام کا پہلا حصہ تقدس کو ظاہر کرنے والا ہو، کشتری کا طاقت کو، ویش کا دولت مند کو اور شودر کا ذلت کو۔ (۲:۳۱)

● برہمن کے نام کا دوسرا حصہ خوش حالی کو ظاہر کرے، کشتری کا تحفظ کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا غلامی و خدمت گاری کو۔ (۲:۳۲)

● دُویج ذاتیں صرف تین ہیں: برہمن، کشتری اور ویش، چوتھی شودر کی ذات کا صرف ایک جنم ہے۔ (۱۰:۴)

● ہاتھی، گھوڑے، شودر، قابلِ نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تیندوے اور سور (تناسخ کے) وہ ادنیٰ مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔ (۲۱:۴۳)

(۲) منو شودروں کو بالذات نجس و ناپاک اور کمینہ سمجھتا ہے اور معاشرت میں دوِیج یعنی شریف آریہ قوموں کو ان سے کامل پرہیز کا حکم دیتا ہے:

● شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے۔ (۳:۱۷)

● وہ کسی برادری سے خارج کئے ہوئے شخص یا چنڈال (۲) کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔ (۴:۷۹)

● جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (۴:۸۱)

---

(۱) یہی مضمون رگ وید: ۱۰: ۹۱۲ اور بھاگوت پران: ۲: ۵: ۷ ۳ میں بھی آیا ہے۔

(۲) جو شخص برہمن عورت کے بطن اور شودر مرد کے نطفہ سے پیدا ہو، وہ ''چنڈال'' ہے۔ (منو: ۱: ۱۲)

- وہ شودر کے سامنے وید(۱) نہ پڑھے۔(۹۹:۴)
- وہ شودر کا کھانا(۲) نہ کھائے۔(۲۱۱:۴)
- شودر کا کھانا رُوحانی نور کو زائل کرتا ہے۔(۲۱۸:۴)
- اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک روزہ رکھے اور اگر عمداً کھالے تو اس کا وہی کفارہ ادا کرنا چاہئے جو حیض، پاخانہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے۔(۲۲۲:۴)
- جس شخص نے چنڈال کو چھولیا ہو، وہ صرف نہانے ہی سے پاک ہوسکتا ہے۔(۸۵:۵)
- شودر کا جنازہ شہر کے جنوبی حصہ سے جائے اور دوِجوں کے جنازے مغربی شمالی اور مشرقی سمتوں سے۔(۹۲:۵)
- اگر کسی برہمن کی اپنی ذات کا آدمی موجود نہ ہو تو اس کی میت کو شودر کے ہاتھ سے نہ اُٹھوانا چاہئے ؛ کیوں کہ جو مراسم تجہیز ایک شودر کا ہاتھ لگنے سے آلودہ ہوجائیں وہ بہشت کی طرف نہیں جاسکتے۔(۱۰۴:۵)
- شودر مرد سے ویش یا کشتری یا برہمن عورت کے ہاں جو اولاد پیدا ہو وہ مخلوط نسل کی ہوگی ، ان کے نام علی الترتیب ایوگو، کشتر اور چنڈال ہیں اور یہ سب سے ادنیٰ مخلوق ہیں۔(۱۲:۱۰)

---

(۱) اگر کوئی شودر بالارادہ وید کے الفاظ سُن لے تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ یا لاکھ ڈال دی جائے ، اگر وید کی عبارت پڑھے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے اور اگر وہ اس کو یاد کرے تو اس کے جسم کے دو ٹکڑے کردیئے جائیں۔(گوتم:۱۲:۴۶) (۲) ”جو کھانا شودر کا تیار کیا ہوا ہو، خواہ اس کا ہاتھ اسے لگا ہو یا نہ لگا ہو، بہر حال اس کا کھانا جائز نہیں ہے“ (اپسمبتھ :۱:۱۶:۱-۲۲) ”اگر کوئی برہمن ایسی صورت میں مرے کہ اس کے پیٹ میں شودر کا کھانا موجود ہو تو آئندہ جنم میں وہ بستی کا سور پیدا ہوگا“ (وششٹھ :۶:۲۷) ”اگر کسی برہمن کو کھانا کھاتے میں کوئی شودر ہاتھ لگادے تو وہ کھانا چھوڑ دے“۔(اپسمبتھ :۱:۵:۱:۶)

● چنڈال اور سو پاس لوگوں کی سکونت بستی کے باہر ہونی چاہئے، انھیں ثابت برتن استعمال نہ کرنے چاہئیں، ان کی جائداد صرف کتے اور گدھے ہوں، ان کو مُردوں کے کپڑے پہنائے جائیں، ان کے کھانے کے برتن ٹوٹے ہوئے ہوں، ان کے زیور لوہے کے ہوں، وہ ہمیشہ خانہ بدوش پھرتے رہیں، جو شخص اپنے دینی و دنیوی فرائض کا پابند ہو، وہ ان سے کوئی ربط ضبط نہ رکھے، ان کے تمام تعلقات آپس ہی میں ہوں اور برابر والوں ہی میں وہ شادی بیاہ کریں۔

● ان کو کھانا ٹھیکروں میں دیا جائے، مگر دینے والا اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں نہ دے، راتوں کو وہ بستیوں میں نہ پھریں، دن کو کام کاج کے لئے آئیں تو راجہ کے مقرر کئے ہوئے مخصوص نشانات ان کے بدن پر لگے ہوئے ہوں، وہ لاوارث مُردوں کو لے جانے کا کام کریں، جن لوگوں کو قانوناً سزائے موت دی گئی ہو انھیں چنڈال قتل کریں اور وہی مقتول کے کپڑے بچھونا اور زیور لے لیں۔(۱۰:۵۱-۵۶)

● برہمن شودر سے کبھی دان نہ لے، اگر وہ اس سے دان لے کر قربانی کرے گا تو آئندہ جنم میں چنڈال پیدا ہوگا۔(۱۱:۲۴)

● اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھالے تو وہ سات دن تک آشِ جو کے سوا کچھ نہ کھائے پیئے۔(۱۱:۵۳)

(۳) منو شودروں کو دویجوں کی غلامی پر مجبور کرتا ہے، اس کے نزدیک شودر کا پیدائشی اور فطری وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ دویجوں کی خدمت کرے :

● قادر مطلق نے شودر کے لئے صرف ایک فرض رکھا ہے اور وہ یہ

ہے کہ وہ بے چون و چرا ان تینوں (برہمن، کشتری اور ویش) کی خدمت کرتا رہے۔(۹۱:۱)

● برہمن کی خدمت میں لگا رہنا شودر کا سب سے بہتر کام ہے اس کے سوا جو کام وہ کرے گا، وہ اسے کچھ فائدہ نہ دے گا۔(۱۰: ۱۲۳)

● شراجا شودر ذات کے ہر آدمی کو دو یجوں کی خدمت کا حکم دے۔(۸: ۴۸)

● شودر ذات کا ہر آدمی خواہ خریدا ہوا ہو یا نہ خریدا ہوا ہو، اسے برہمن اپنی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے؛ کیوں کہ اس کو واجب الوجود نے برہمن کی غلامی ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔(۸: ۴۱۳)

● شودر کو اگر اس کا آقا آزاد کر دے تب بھی وہ آزاد نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ جو حالت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اس سے کون اس کو نکال سکتا ہے؟(۸: ۴۱۴)

(۴) منو شودر کو اس کی اپنی کمائی ہوئی دولت و جائیداد پر بھی حقوق ملکیت دینے سے انکار کرتا ہے:

● ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے؛ کیوں کہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی جائیداد اس کا آقا لے سکتا ہے۔(۸: ۴۱۷)

● شودر اگر مال و دولت حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہو تب بھی اسے حاصل نہ کرنا چاہئے؛ کیوں کہ جو غلام دولت جمع کر لیتا ہے، وہ برہمن کو اذیت دیتا ہے۔(۱۰: ۱۲۹)

(۵) قانونِ وراثت میں بھی منو نے دو یجوں اور شودروں کے درمیان امتیاز رکھا ہے، بعض حالات میں وہ شودر کو حق میراث سے بالکل محروم کرتا ہے اور بعض حالات میں دو یجوں

سے کمتر درجہ دیتا ہے :

● اگر برہمن کی چار بیویاں چاروں ذاتوں کی ہوں اور چاروں سے اس کے ہاں بیٹے پیدا ہوں تو ان کے درمیان تقسیم اس طرح ہوگی : کاشت کار، ملازم، سانڈ، سواری کے گھوڑے، گاڑیاں، زیورات اور مکان، برہمنی کے لڑکے کو ملیں گے اور ان چیزوں کو الگ کرنے کے بعد جو املاک بچیں گی، اُن میں بھی اُس کی اعلیٰ ذات کے لحاظ سے اس کا حصہ خاص طور پر زیادہ ہوگا، برہمن لڑکا باقی ماندہ ترکہ میں سے تین سہام، اور کشتری عورت کا لڑکا دو سہام، ویش عورت کا لڑکا ڈیڑھ سہام اور شودر عورت کا لڑکا ایک سہام۔

● یا پھر ایک عالم قانون داں آدمی مجموعی طور پر تمام جائیداد کو دس حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح بانٹے: برہمنی کے لڑکے کو چار حصے، چھترانی کے لڑکے کو تین حصے، ویشنی کے کے لڑکے کو دو حصے اور شودرانی کے لڑکے کو ایک حصہ۔

● اُس برہمن کے ہاں خواہ پہلی تین ذاتوں کی بیویوں سے بیٹے ہوں یا نہ ہوں، بہر صورت شودرانی کے لڑکے کو ایک بٹا دس سے زیادہ نہ ملے گا۔

● شودر عورت کے پیٹ سے برہمن، کشتری یا ویش مرد کا لڑکا باپ کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہ پا سکے گا، اس کا باپ جو کچھ اسے دے دے، وہی اس کی ملک ہے۔(۱)

---

(۱) اس اشلوک کا مضمون اوپر کے اشلوک سے صراحتاً متناقض ہے، اس تناقض کو منو کے شارحین (کلوکا اور مدھا تیتھی) نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ شودرانی کے لڑکے کو حصہ ملنے کا انحصار اس کے اعمال پر ہے، اگر وہ نیکوکار ہو اور اس کی ماں باقاعدہ باپ کے نکاح میں آئی ہو تو اسے حصہ مل سکتا ہے۔

- دوج ذات کے مردوں کی جو اولاد اپنی ذات کی عورت سے پیدا ہوئی ہو، وہ باہم ترکہ کی مساویانہ تقسیم کرے۔(۹:۱۳۹-۱۵۶)

(٦) فوج داری قوانین میں منو نے شودروں کے ساتھ انتہائی سختی برتی ہے، وہ ان کی جان اور عزت کو قانون کی پناہ دینے میں حد درجہ بخل سے کام لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں دوجوں کے حقوق کی تعیین اور تحفظ میں اتنی فیاضی برتتا ہے کہ شودروں کے آئینی حیثیت بالکل صفر کے برابر رہ جاتی ہے:

- ایک شودر اگر دوج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے؛ کیوں کہ وہ برہما کے حصۂ اسفل سے پیدا ہوا ہے۔(۸:۲۷۰)
- اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سُرخ کر کے اس کے حلق میں اُتاری جائے۔(۸:۲۷۱)
- اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اُس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجا اس کے منھ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے۔(۸:۲۷۲)
- جو ادنیٰ ترین ذات کا آدمی (شودر) اعلیٰ ذات کے آدمی (برہمن) کے برابر بے ادبی سے ایک ہی جگہ بیٹھ جائے، اس کے پیچھے حصہ پر نشان لگا کر راجا یا تو اس کو ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کٹوا دے۔(۸:۲۸۱)
- اگر وہ برہمن پر غرور سے تھوک دے تو راجا اس کے دونوں ہونٹ کٹوا دے، اگر وہ اس پر پیشاب کرے تو اس کی شرمگاہ کو قطع کرا دے، اگر وہ برہمن کی طرف گوز صادر کرے تو اس کی جائے مخصوص کٹوا ڈالے۔(۸:۲۸۲)
- اگر وہ برہمن کے سر کے بال یا اس کے پاؤں یا اس کی ڈاڑھی

یا اس کا گلا یا اس کے بیضے پکڑے تو راجہ بلا تامل اس کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔(۸:۲۸۳)

● اگر ایک شودر کسی دوتج عورت سے زنا کرے تو اس عورت کے غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کا وہ عضو کاٹا جائے گا جس سے اس نے ارتکابِ جرم کیا ہے اور اس کی تمام جائیداد ضبط کی جائے گی اور اگر وہ عورت شادی شدہ ہو تو وہ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔

● برہمن عورت سے زنا کرنے کا جرم اگر ویش سے سرزد ہو تو اسے ایک سال قید اور کل جائیداد کی ضبطی کی سزا دی جائے گی، اگر کشتری یہ فعل کرے تو اس پر ایک ہزار پن جرمانہ کیا جائے گا، یا گدھے کے پیشاب سے اس کی ڈاڑھی مونچھ مونڈی جائے گی اور اگر وہ برہمن عورت غیر شادی شدہ ہو تو ویش کو ۵۰۰ اور کشتری کو ۱۰۰۰ پن جرمانہ دینا ہوگا، اگر ایک برہمن مرد کسی شادی شدہ عورت سے زنا بالجبر کرے تو اس پر ۱۰۰۰ پن جرمانہ کیا جائے گا اور اگر اس کی مرضی سے کرے تو صرف ۵۰۰ پن۔(۸:۳۷۴-۳۷۸)

● راجا کسی برہمن کو ہرگز نہ قتل کرے خواہ وہ کیسی ہی شدید معصیت کا مرتکب ہوا ہو، وہ برہمن مجرم کو اس کی ذات و جائیداد سے ادنیٰ تعرض کئے بغیر صرف جلاوطن کر سکتا ہے، روئے زمین پر برہمن کے قتل سے زیادہ عظیم گناہ اور کوئی نہیں ہے،(۱) اس لئے بادشاہ اپنے دل میں اس حرکت کا خیال بھی نہ لائے۔(۸:۳۸۰-۳۸۱)

---

(۱) اپستمبھ دھرم شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل، چوری اور ڈاکہ کے شدید جرائم کی پاداش میں برہمن کو صرف اتنی سزا دی جاسکتی ہے کہ اسے اندھا کر دیا جائے؛ (۲:۱۷) لیکن اگر شودر انھیں جرائم کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے موت کی سزا ہے۔(۲۷،۱۶)

- نیچ ذات کا آدمی اگر ارادتا برہمن کو دُکھ پہنچائے تو راجا اس کو مختلف قسم کی عبرت ناک جسمانی سزائیں دے۔ (۲۴۸:۹)
- ایک کشتری کو قتل کرنے کا کفارہ اُس سے چوتھائی ہے جو برہمن کو قتل کرنے والے کے لئے مقرر ہے، ویش کو قتل کرنے کا کفارہ اس کا آٹھواں حصہ ہے اور وہ شودر اگر نیکوکار ہو تو اس کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے سولہواں حصہ۔ (۱۲۷:۱۱)
- اگر برہمن کسی کشتری کو بلا ارادہ قتل کرے تو وہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لئے ایک سانڈ اور ایک ہزار گائیں دان دے یا تین سال تک نفس کش ریاضتیں کرے، اور اگر وہ بلا ارادہ کسی نیکوکار ویش کو قتل کرے تو ایک سال نفس کش ریاضت کرے یا سو گائیں اور ایک سانڈ دان دے، اور اگر شودر کو بلا ارادہ قتل کر دے تو یہی ریاضت چھ مہینہ تک کرے یا دس سپید گائیں اور ایک سانڈ برہمنوں کو دان دے۔ (۱۱: ۱۲۷-۱۳۱)
- اگر برہمن کسی بلی یا نیولے یا چوہے یا مینڈک یا کتے یا چھپکلی یا اُلو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ (۱۳۲:۱۱)

یہ احکام اپنی تفسیر و تشریح آپ کر رہے ہیں، ہندو قانون مفتوح قوموں کو جس ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے اور سوسائٹی میں ان کو جو ادنیٰ درجہ دیتا ہے، اس کی کیفیت اُن احکام سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے، اس کے مقابلہ میں اگر اسلام کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کے حقوق کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

● ● ●

مہابھارت کی جنگ

ہندو مذہبی تاریخ کی کتابوں میں ایک بڑی جنگ کا ذکر ہے، جو مہابھارت کی جنگ کہلاتی ہے، یہ جنگ واضح طور پر اقتدار کی جنگ تھی، ایک ہی خاندان کے دو افراد آپس میں لڑ رہے تھے اور ہندو تاریخ میں زبردست شخصیت شری کرشن جی اس جنگ میں نہ صرف شامل ہو گئے تھے؛ بلکہ انھوں نے پانڈوؤں کو ایک طرح سے مدد فراہم کی، ایک مورخ کی زبان میں اس جنگ کا خلاصہ یہ ہے :

بہت دنوں کی بات ہے عیسیٰ علیہ السلام سے بھی غالباً ہزار برس پہلے دلی کے قریب ہستنا پور میں آریوں کے ایک خاندان کی حکومت قائم تھی، اس خاندان کے لوگ اپنے کو چند بنشی کہتے تھے، مہاراجہ بھرت جس کے نام پر ہمارے ملک کا نام بھارت پڑا، اسی خاندان کا سب سے مشہور راجہ ہوا ہے، اسی کی اولاد میں ایک راجا وچتر ویر یہ ہوا ہے، جس کے دو بیٹے دھرت راشٹر اور پانڈو تھے، دھرت راشٹر پیدائشی اندھا تھا؛ اس لئے راجہ کے مرنے پر چھوٹے لڑکے پانڈو کو راج گدی ملی، دھرت راشٹر کی متعدد بیویاں تھیں، جن سے سو بیٹے پیدا ہوئے، ان میں سب سے بڑا بیٹا دریودھن تھا، اس کی ماں قندھاری تھی، دھرت راشٹر کے بیٹے کورو کہلاتے تھے، پانڈو کے پانچ بیٹے تھے، یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو، کنتی پہلے تین بیٹوں کی ماں تھی اور مدری آخر دو بیٹوں کی ماں تھی، یہ لوگ پانڈو کہلاتے تھے۔

کوروں اور پانڈوں کی تعلیم و تربیت ایک ہی ساتھ ہوئی، کشتی میں دریودھن اور بھیم کا جوڑ رہتا تھا، ارجن تیر اندازی میں ماہر تھا، یدھشٹر اپنی صاف گوئی کے لئے مشہور تھا، پانڈوں کی شہرت سے دریودھن جلتا تھا، ان کے خلاف اس کے دل میں بے حد نفرت تھی، پانڈو کی موت

کے بعد دھرت راشٹر نے اس کے ان کے بڑے بیٹے یدھشٹر کو ولی عہد بنانا چاہا؛ لیکن دریودھن اسے کب گوارا کرسکتا تھا وہ تو خود راج گدی پر قابض ہونا چاہتا تھا، پانڈو کو وہ اپنی راہ کا روڑا سمجھتا تھا؛ چنانچہ اس نے انھیں ختم کرنے کی سازش کی ان کے رہنے کے لئے لاکھ کا ایک گھر تعمیر کرایا، جب وہ رہنے لگے تو ایک رات اس مکان میں آگ لگانے کا منصوبہ بنایا؛ لیکن پانڈوؤں کو اس سازش کا بروقت علم ہوگیا، وہ چپکے سے نکل بھاگے، بارہ سال تک اپنی ماں کنتی کے ساتھ جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہے، ان ہی دنوں پانچال دیس کے راجا درپد کی بیٹی دروپدی کا سوئمبر ہونے والا تھا، سوئمبر میں تیر اندازی کا بہت ہی سخت امتحان رکھا گیا تھا، ایک کھمبے کے اوپری سرے پر ایک مچھلی لٹکادی گئی تھی، جو ہلتی رہتی تھی، نیچے تیل کا ایک کڑھاؤ تھا، جس میں مچھلی کا عکس پڑتا تھا، عکس دیکھ کر مچھلی کی آنکھ کو تیر کا نشانہ بنانا تھا، ارجن نے شرط پوری کی اور دروپدی سے اس کا بیاہ ہوگیا، اس رشتے کے بعد پانڈوؤں کو پانچال کے راجہ کی حمایت حاصل ہوگئی، اب پانڈو وطن لوٹے تو دھرت راشٹر نے انھیں آدھا راج سونپ دیا، یدھشٹر نے اندر پرست (دہلی) کو اپنی راجدھانی بنا کر حکومت شروع کی۔

چند ہی دنوں میں اس کی شہرت بڑھ گئی، یہ بات دریودھن ایسے حاسد کے لئے ناقابل برداشت تھی؛ چنانچہ اس نے پانڈوؤں کو مٹانے کی ایک نئی چال چلی، انھیں جوا کھیلنے پر آمادہ کرلیا، جوئے میں پانڈو اپنا راج پاٹ، دھن دولت، گھر بار سب کچھ ہار گئے، یہاں تک کہ رانی دروپدی کو بھی داؤ پر رکھ دیا، آخر میں جوئے کی ایک شرط کے مطابق انھیں ۱۲ سال جنگلوں میں گزارنا تھا؛ چنانچہ اپنی ناسمجھی اور دریودھن کی چال سے ایک بار پھر انھیں اِدھر اُدھر کی خاک چھاننی پڑی۔

بن باس کی معیاد ختم ہونے پر پانڈوؤں نے اپنا راج واپس مانگا، جس کے جواب میں دریودھن نے کہا: ''مانگنے سے کہیں راج ملا کرتا ہے؟ بازو میں قوت ہو تو مجھ سے چھین لو، میں خود سوئی کے ناکے کے برابر بھی زمین نہیں دوں گا''۔

یہ حالت دیکھ کر ارجن کی درخواست پر دوارکا کے راجہ شری کرشن جی نے مداخلت کر کے معاملے کو نپٹانا چاہا اور دریودھن کو انصاف کی تلقین کی، مگر اس ہٹ دھرم نے ایک نہ سنی اور یہی کہتا رہا کہ: ''بغیر لڑے میں سوئی کی نوک بھر بھی زمین نہیں دوں گا''۔

اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر پانڈووں خاص کر ارجن لڑائی کو ناپسند کرتے تھے، شری کرشن نے ارجن کو لڑائی کی اہمیت سمجھائی اور مشورہ دیا، کرکشیتر میں دونوں کا مقابلہ ہوا، جنگ میں پچاس لاکھ فوج نے حصہ لیا، بڑے گھمسان کا رن پڑا، خون کی ندیاں بہہ گئی، اٹھارہ دن تک مسلسل جنگ ہوتی رہی، کشتوں کے پشتے لگ گئے، پورے میدان میں لاشیں ہی لاشیں دِکھائی دیتی تھیں، ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے، کورووں کے مقابلے میں پانڈووں کی فوج اگرچہ تعداد میں کم تھی، مگر چوں کہ وہ لوگ اپنے حق کے لئے لڑ رہے تھے، اس لئے میدان ان ہی کے ہاتھ رہا، دریودھن کا پورا خاندان اور اس کے حلیف چن چن کر مارے گئے، صرف دھرت راشٹر بچا۔

پانڈو جیت تو گئے مگر یہ سودا انھیں بھی بہت ہی مہنگا پڑا، جنگ کے نتائج سے یہ لوگ بہت ہی دلبرداشتہ ہوئے، راج حاصل کرنے کے لئے انھیں اپنے بھائی بندھو اور اعزا و اقارب کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑا تھا، جنگ کے ہولناک مناظر رہ رہ کر یاد آتے تھے، آخر کار راج اور دنیا داری سے انھیں نفرت ہو گئی، انھوں نے راج گدی تو ارجن کے پوتے پرکشت کے حوالے کی اور خود گھر بار چھوڑ کر ہمالیہ پربت کا رُخ کیا اور وہی برف میں گل کر مر گئے۔

سری کرشن جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم بھی تھے اپنے ملک دوارکا کو لوٹ آئے، مگر ان کی طبیعت بھی اداس ہوتی چلی گئی اور وہ اپنا زیادہ وقت جنگل اور بنوں میں گزارنے لگے؛ لیکن ایک روز ایک چرواہے نے جو غالباً دریودھن سے ہمدردی رکھتا ہوگا، موقع پا کر سری کرشن کو جنگل میں قتل کر دیا، مہا بھارت کے بعد ہندوستان میں آریوں پر انحطاط اور زوال کی حالت طاری ہو گئی۔ (۱)

---

(۱) بحوالہ: آئینہ تاریخ: ۲۹ تا ۳۲، از: فضل حسین مرحوم ایم اے۔

اس جنگ کی ہولناکی و دہشت ناکی اور انسانی خون کے بے دریغ ضیاع کے حوالے سے کچھ مناظر مہابھارت ہی کی زبانی ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں :

(۱) سب نے میدان جنگ کو دیکھا جو انسانی خون سے بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف جوانمردوں کے جسموں سے گدھ کھینچ کھینچ کر کھا رہے تھے۔(۱)

(۲) چاروں طرف عورتوں کا بُرا حال تھا، وہ مرنے والوں کو اپنی گود میں لئے ہوئے آہ و بکا کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر شری کرشن گندھاری سے بولے کہ تمہیں افسوس ہو رہا ہے؛ حالاں کہ اسے تو کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔(۲)

(۳) اس کے بعد یودھشٹر دھرم راج سے اس جنگ میں مرنے والوں کی تعداد پوچھنے لگے، اس وقت دھرم نے کہا کہ اس لڑائی میں ۶۳ کروڑ ایک لاکھ ۳۲ ہزار جنگجو راہِ عدم ہوئے اور ۵۰۰۷ مہاراج مارے گئے، نیز ۱۴ لاکھ ۱۴ ہزار اس جنگ میں کام آئے اور اس کے علاوہ جن انسانوں نے اس یدھ بھومی میں جان دی، وہ گندھرو بن گئے ہیں۔(۳)

مقبول و مستند علمی و تعلیمی ویب سائٹ کورا "Quora" کے مطابق اس جنگ میں ایک ارب ۶۶ کروڑ، ۲۰ ہزار افراد ہلاک ہوئے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ کس قدر خون ریز تھی۔



---

(۱) مہابھارت، استری پرب: ۱۴۷۔

(۲) مہابھارت، استری پرب: ۱۴۸۔

(۳) مہابھارت، استری پرب: ۱۴۸۔

جنگ، یہودی مذہب میں

جہاد کو سب سے زیادہ جن لوگوں نے بدنام کیا وہ ہیں یہودی اور عیسائی؛ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ خود یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جنگ کا کیا تصور تھا اور ان کی مذہبی کتابیں کیا کہتی ہیں؟ اسی سلسلے میں یہ تحریر پیش کی جارہی ہے جو یہودی مذہب میں جنگ کے تصور سے متعلق ہے، اس تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان کی مذہبی کتابوں کے حوالہ سے کہا گیا ہے۔☆

مقصدِ جنگ

توراۃ میں نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر سوائے اس ایک مقصد کے جو استثنا باب: ۲، اور اعداد باب: ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے اور کسی مقصد کا نشان ہم کو نہیں ملتا، یہ مقصد کتاب اعداد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> اور خداوند نے مواب کے میدانوں میں یرون کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا: ''بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو، اور وہاں آپ بسو؛ کیوں کہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو''۔(استثنا:۲:۳۳)

☆ یہ تحریر بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور و مقبول کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' سے لی گئی ہے۔

اور کتاب استثنا میں ہے :

سو تم اٹھو، کوچ کرو اور نہر ارنوں کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبوں کے بادشاہ اموری سیحوں کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے، سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر۔ (استثنا:۲:۲۴)

لیکن حسبوں کے بادشاہ سیحوں نے ہم کو اپنے ہاں سے گزرنے نہیں دیا؛ کیوں کہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا اور اس کے دل کو سخت؛ تا کہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے، پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھ میں نے سیحوں کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا تو میراث لینا شروع کر؛ تا کہ اس کی زمین کا وارث ہو جائے، تب سیحوں یہص میں ہمارے مقابلہ کے لئے نکلا وہ اور اس کی ساری قوم؛ تا کہ ہم سے لڑیں، سو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالہ کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا سوا چار پاریوں کے جنھیں ہم نے اپنے لئے غنیمت جان کر پکڑا اور اس مال کے جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا۔ (استثنا:۲:۳۰-۳۵)

تب ہم پھرے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے، بسن کا بادشاہ عوج اور دی میں وہ اور اس کی ساری قوم ہمارے مقابلہ کے لئے نکلی؛ تا کہ ہم سے لڑے، اور خداوند نے اس وقت مجھے فرمایا: اس سے مت ڈر کہ میں اس کو اور اس کی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت

تیرے قبضہ میں کر دوں گا، تو اس سے وہی کر جو تو نے اموریوں کے
بادشاہ سیحوں سے جو حسبوں میں رہتا تھا، کیا؛ چنانچہ خداوند ہمارے
خدا بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو
میں کر دیا اور ہم نے انھیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ
رہا اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لئے ...... اور ہم نے
ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں
حسبوں کے بادشاہ سیحوں کی طرح حرم کیا؛ لیکن سارے مواشی
اور شہروں اور مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے، ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا اور قوت کی بنا پر ان کے اموال واملاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے اور اس کے نزدیک یہی قہر وتسلط اس وراثتِ ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے :

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ (الانبیاء:۱۰۵)
زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا :

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔ (الاعراف:۱۲۸)
زمین خدا کی ہے اور اس کا وارث وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے اور انجام کار کامیابی صرف پرہیز گاروں کا حصہ ہے۔

لیکن اس وراثت کا تخیل توراۃ کے خیال سے بالکل مختلف ہے، توراۃ زمین کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دیتی ہے، جیسا کہ اعداد (۳۳:۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے، مگر قرآن اسے کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے، توراۃ میں وراثتِ ارضی کا مفہوم

یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے گھر بار، ملک و مال اور جان و آبرو کی مالک بن جائے اور اس کو فنا کر کے خود اس کی جگہ بسے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس قوم کو صالح ہونے کی بنا پر اپنی خلافت و نیابت کے لئے چن لیا اور اپنی زمین کا انتظام اس کے سپرد کیا؛ تا کہ وہ ظلم و جور کو مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف کا نظام قائم کرے، پھر توراۃ میں میراثِ زمین حاصل کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں ملک تمہاری قومی میراث ہے؛ لہٰذا تم اسے لڑ کر فتح کرو، پس توراۃ کی ''وراثت ارضی'' کھلی کھلی ملک گیری ہے، اسلام کے جہاد فی سبیل اللہ کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔

حدودِ جنگ

جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہم کو توراۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں، تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے پیروؤں کو دشمن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے؟ اس کے لئے ذیل کے احکام قابل مطالعہ ہیں:

> ● اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آ پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں گا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے؛ بلکہ جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر
>
> اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دے دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کی ساری لوٹ اپنے لئے

لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو۔(۲۰:۱۰-۱۴)

● جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو، مدت تک محاصرہ کیے رہو تو تیر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو؛ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے، سو تو انھیں محاصرہ کے لام میں لانے کے لئے کاٹ نہ ڈالیو؛ کیوں کہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں۔(۲۰:۱۹)

● لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنھیں خداوند تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔(۲۰:۱۶-۱۷)

● اور جب کہ خداوند تیرا خدا انھیں تیرے حوالہ کر دے تو تو انھیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو کوئی ان سے عہد کیجیو اور نہ ان پر رحم کریو، تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو، ان کے بتوں کو ڈھا دو، ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔(۷:۲-۵)

● تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہوگے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے، اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے، نیست و نابود کر دیجیو، ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو اور ان کے ستونوں کو توڑیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو اور ان کے معبودوں کی کھدی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو۔(۲:۲)

کتاب خروج میں ہے :

آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں

اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے ہانکتا ہوں، ہوشیار رہ تا نہ ہوئے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھ لیوے، ایسا نہ ہو کہ وہ عہد تیرے درمیان پھندا ہو؛ بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھادو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالو۔ (خروج: ۳۴:۱۱-۱۲)

کتاب اعداد میں ہے :

پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہل مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اس کے اپنی قوم کے لوگوں سے مل جائے گا، تب موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو فرمایا کہ بعض تم میں سے لڑائی کے لئے تیار ہو..... سو ہزاروں بنی اسرائیل میں سے ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہوگئے، یہ سب جو لڑائی کے لئے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے ...... اور انھوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا اور سارے مردوں کو قتل کیا...... اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا اور انھوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لئے اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، مواب کے میدانوں میں، یردن کے کنارے جو یریجو کے مقابل ہے لائے...... اور موسیٰ علیہ السلام لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو

ہزاروں کے سردار تھے اور ان پر جو سینکڑوں کے سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟ ......سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے مارو؛ لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو۔ (اعداد:۳۱:۱-۱۸)

کتاب یشوع میں ہے :

● اور انھوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت، کیا جوان کیا بوڑھا، کیا بیل کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہہ تیغ کر کے حرم کیا...... پھر انھوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا، مگر روپا اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کئے۔ (یشوع:۶:۲۱-۲۵)

● انھوں نے عیؔ کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے اور ایسا ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں ان بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا، عیؔ کے لوگوں کو قتل کر چکے اور جب وہ سب تہہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا؛ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ر ہزار تھے، یعنی عی کے سب لوگ؛ کیوں کہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اُٹھایا جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم نہ کر لیا نہ کھینچا، اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے لئے لوٹا، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا۔ (یشوع:۸:۲۳-۲۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے، ایک وہ جنھیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا، دوسرے وہ جنھیں اس نے ان کی میراث میں دیا ہے، ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لئے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انھیں صلح کا پیغام دیا جائے اور اگر وہ اسے قبول کر کے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کر دیں تو ان کو باج گزار اور خدمت گزار بنالیا جائے؛ لیکن اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور مال اسباب پر قبضہ کرلیا جائے، دورانِ جنگ میں باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس لئے نہیں کہ یہ ایک مفسدانہ فعل ہے؛ بلکہ اس لئے کہ انھیں اس طرح خراب کر دینے سے فتح حاصل ہونے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام انسانی حقوق اور رعایات سے محروم کر دیتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے، ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے، ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ان کی کھیتیاں اور باغات اور عمارتیں اور عبادت گاہیں سب تہس نہس کر دی جائیں، ان کی عورتیں، مرد، بچے حتیٰ کہ جانور تک تہہ تیغ کر دیے جائیں اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے، اس جنگ کی غایت صرف یہ قرار دی گئی ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیتاً نیست و نابود کر دی جائیں، ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش کی ہی نہیں گئی جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جاں بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کر رہی ہے، اس پر جیتا جاگتا تبصرہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست ہے جو اسی میراثِ ارضی کے تخیل پر قائم ہوئی اور اس بیسوی صدی میں اس نے عربوں کے ساتھ وہی کچھ کر کے دکھا دیا جس کی ہدایت بائبل میں دی گئی تھی۔

● ● ●

جنگ اور عیسائی مذہب ☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا؛ تا کہ بنی اسرائیل میں جو بگاڑ پیدا ہو چکا تھا وہ اس کی اصلاح کریں؛ لیکن ان کو الگ شریعت نہیں دی گئی تھی، تورات میں جو احکام آئے تھے ان ہی احکام کو جاری رکھا گیا، یہ بات کسی قیاس واجتہاد اور انداز وتخمین پر مبنی نہیں؛ بلکہ خود انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں :

> یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں؛ کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توراۃ کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا، پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کرے گا، وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا؛ لیکن جو اُن پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا، وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائے گا، پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوسکو گے۔ (متیٰ:۵:۱۷-۲۰،لوقا:۱۶:۱۷)

☆ یہ پوری تحریر بھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے، صرف ابتدائی دو تین سطریں جو تمہیدی نوعیت کی ہیں، راقم الحروف کی طرف سے اضافہ ہیں، (دیکھئے: الجہاد فی الاسلام: ۳۱۷ تا ۳۷۵)۔

ایک دوسری جگہ پر یہ الفاظ آئے ہیں:

فقیہ اور فریسی موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ

تمہیں بتائیں سب کرو اور مانو، لیکن ان کے سے

کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں، وہ ایسے بھاری

بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے

ہیں مگر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳:۲-۴)

یوحنا نے اپنی انجیل میں تصریح کی ہے:

شریعت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت دی گئی اور فضیلت و صداقت

یسوع مسیح علیہ السلام کی معرفت پہنچی۔ (یوحنا ۱:۱۷)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے گئے ہیں اور ان پر صرف فضیلت و صداقت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مسیحیت میں جنگ نہ ہونے کی وجہ

اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ مسیحیت میں جنگ، صلح، حکومت، سیاست، تعزیرات وغیرہ کے متعلق وہ تمام احکام باقی رکھے گئے تھے، جو توراۃ میں مذکور تھے، دین مسیح ان میں سے کسی کا ناسخ نہ تھا کہ ایک لفظ اور ایک شوشے کا بھی منکر نہ تھا؛ لیکن مسیح نے احکام کی تنفیذ اس لیے نہیں کی کہ جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کی تنفیذ کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسیح کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی، ان کی ولادت سے ۶۰ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا اور اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی، جس وقت مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قیدِ غلامی میں جکڑی ہوئی تھی، ان کا خاص وطن یہودیہ ۶ء میں براہ راست رومی صوبہ داروں کے زیرِ انتظام آ گیا تھا، جو پروکیوریٹر (Procurator) کہلاتے تھے، جب اُن کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یروشلم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطس

(Pontius Pilate) جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا، ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے، مسیح کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرو دیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام (Jonm the Baptist) کو قتل کرا چکا تھا اور خود مسیح کی قدر و قیمت بھی ان کی قوم کی نگاہ میں جیسی کچھ تھی، اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں بنی اسرائیل نے براتبا نامی ڈاکو کی جان کو مسیح کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا، ایسی حالت میں مسیح کے لئے کیوں کر ممکن تھا کہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں جنگ کا جھنڈا لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور لڑ کر ایک آزاد دینی حکومت قائم کر دیتے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی رُوح نکل چکی ہے، اُن کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے، اس لئے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی اور اُس میں فضیلت اخلاق کی وہ رُوح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتی؛ چنانچہ اول اول انھوں نے قومی سیرت کی تعمیر ہی کی طرف توجہ کی اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ برابر کوشش کرتے رہے کہ اس تعمیری کام کے دوران میں کہیں حکومت وقت سے تصادم کا موقع نہ آ جائے؛ کیوں کہ اگر ابتدا ہی میں حکومت سے مقابلہ شروع ہو جاتا تو اصل اصلاحی کام بھی نہ ہوتا اور اس کے انجام پائے بغیر حکومت کے مقابلے میں بھی ناکامی ہوتی، اسی لئے انھوں نے حکومت کے ساتھ تصادم کرنے سے انتہائی پہلوتہی کی اور جب یہودی علماء کے شاگردوں نے اُن کو پکڑوانے کے لئے مسئلہ پوچھا کہ قیصر کو ہم ٹیکس دیں یا نہیں تو انھوں نے یہ ذومعنی جواب دے کر ٹال دیا کہ :

جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔ (لوقا ۲۰: ۲۲)

انھوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، جو تم پر ظلم کرے اسے دُعا دو اور اس کے لئے برکت چاہو، جو تمہیں بے گار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بہ جائے دو کوس جاؤ، جو

تمہارا کرتہ چھینے اس کو چوغہ بھی اُتار کر دیدو، جو تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کردو، ابتداءً ان سب احکام کا مدعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوت پیدا ہوجائے، اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت، صبر، تحمل اور بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی، ان کو مصائب وشدائد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قہر وطاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی، انھوں نے کہا کہ :

جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کئے جاؤ اور تمہیں اذیتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا۔ (مرقس: ۱۳)

انھوں نے جان کی محبت دلوں سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے کہا کہ :

جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا وہی اسے بچائے گا۔ (لوقا: ۹: ۲۴)

انھوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا اور اس کی رزاقی پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی؛ تاکہ غلامی کی وہ سب سے بڑی کمزوری دُور ہو جو ایک غلام قوم کو حکمراں قوم کے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے، انھوں نے کہا کہ :

جب تم بڑے ہوکر اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دیتے ہو تو تمہارا آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو ضرور دے گا۔ (لوقا: ۱۱: ۱۳)

انھوں نے حکومت کا رُعب دلوں سے دُور کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ جو لوگ محض جسم کو قتل کرسکتے ہیں رُوح کو قتل نہیں کرسکتے، ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے :

اصل میں ڈرنے کے قابل وہ ہے جو روح اور جسم دونوں پر ہلاکت طاری کرسکتا ہے۔ (لوقا: ۱۲: ۴-۵)

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھیں اور ابتداءً مسیح نے ان ہی تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا، اس مرحلہ کو

طے کرنے کے بعد آخری زمانے میں وہ جہاد وقتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرنے لگے تھے؛ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ :

میرے ان دشمنوں کو جنھوں نے نہ چاہا کہ میں ان پر بادشاہی کروں،
یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔

اسی طرح انھوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دے دیا تھا، جیسا کہ لکھا ہے :

اس نے ان سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی، اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے...... انھوں نے کہا کہ اے خداوند! دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں۔ (لوقا: ۲۲: ۳۶-۳۸)

لیکن مسیح کو اپنی قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بنانے کے لئے کافی نہیں تھی، اس عرصے میں نہ تو ان کے پیروؤں کی تعداد اس حد تک پہنچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کوئی کام لے سکتے اور نہ خود اُن لوگوں کی جو ان کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے، ان لوگوں کے ایمان ابھی اتنے بھی قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ علانیہ اظہارِ حق کی جرأت کرتے، مسیح کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ ان کی گرفتاری کے وقت جب اُس سے پوچھا گیا کہ تم بھی مسیح کے پیرو ہو تو اس نے "مرغ کے دو دفعے بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیح کا انکار کر دیا" (مرقس: ۱۴: ۳) ان کے ایک اور حواری یہوداہ اسکر یوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کی خاطر ان کو گرفتار کرا دیا، (متی: ۲۶: ۱۴-۱۶) اور جب ان کو گرفتار کرلیا گیا تو ان کے سارے شاگرد انھیں

چھوڑ کر بھاگ گئے، (متی: ۲۶:۵۶) ظاہر ہے کہ جب ان کے خاص حواریوں اور بھروسے کے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابل اعتماد فوج کو لے کر جہاد کی جرأت کیوں کر کر سکتے تھے، اگر رسول عربی ﷺ کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ روح پیدا کر دیتے جو صحابہؓ میں آنحضرت ﷺ نے پیدا کی تھی؛ لیکن ان کی سرکش قوم نے ان کی نبوت کو پورے تین سال بھی برداشت نہ کیا اور انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی بڑا کام کر سکتے، اس قلیل مدت میں زیادہ سے زیادہ اُتنا ہی کام ہو سکتا تھا، جتنا حضرت مسیح نے کیا، خود محمد ﷺ کی مکی زندگی کے ابتدائی تین سال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کہیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملے گا، وہی صبر و تحمل، ثبات واستقامت، تقویٰ اور خشیت، توکل علی اللہ اور تزکیۂ نفس و تنزیہ اخلاق کی تعلیمات وہاں بھی پائی جائیں گی جو مسیح کی حیاتِ نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔



یہودیوں اور مخالف فرقوں پر عیسائیوں کے مظالم

اسلام اور مسلمانوں کو شدت پسندی کا الزام سب سے زیادہ مغربی دنیا نے دیا ہے، جو عیسائیت سے وابستہ ہے، عیسائی حکمرانوں نے جو مظالم ڈھائے ہیں، ان کا تو شمار ہی نہیں، شاید دنیا میں عیسائیوں سے بڑھ کر مظالم کسی اور نے نہ ڈھائے ہوں؛ لیکن حکمرانوں سے قطع نظر کلیسا نے جو مظالم ڈھائے ہیں، ان کو سن کر بھی کلیجہ منھ کو آجاتا ہے، یہ ظلم انھوں نے یہودیوں پر بھی ڈھائے، مسلمانوں پر بھی اور خود عیسائیوں کے مخالف فرقوں پر بھی؛ چنانچہ عیسائیوں نے یہودیوں پر اور کیتھولک اور پروٹسنٹ نے ایک دوسرے پر جو جو مظالم ڈھائے، اس سلسلہ میں تین اہم تحریریں پیش کی جارہی ہیں :

(۱) ''عیسائیوں کے لرزہ خیز مظالم'' از: حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ (کتاب: اظہار الحق) اُردو ترجمہ، جلد سوم، باب ششم۔

(۲) ''کلیسا کے سنگین مظالم'' از: مولانا نفیس خان ندوی (کتاب: کلیسا)۔

(۳) ''مغربی مؤرخین کا دوہرا معیار تاریخ نویسی'' از: ڈاکٹر مختار احمد مکی (کتاب: ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی، باب: ۲۰)۔

یہودیوں پر مظالم

مصنف کشف الآثار صفحہ: ۲۷ پر بیان کرتا ہے :

> قسطنطین اعظم جو ہجرت سے تقریباً تین سو سال قبل گذرا ہے، اس نے یہودیوں کے کان کاٹنے اور ان کو مختلف ملکوں میں جلاوطن کرنے کا حکم دیا، پھر پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہِ روم نے ان کو شہر

اسکندریہ سے جو عرصہ دراز سے ان کی جائے پناہ تھی، نکال دینے کا حکم جاری کیا، یہ لوگ اس شہر میں ہر طرف سے آ کر پناہ لیا کرتے تھے اور وہاں امن وسکون کی زندگی ان کو نصیب تھی، اس نے ان کے عبادت خانوں کے مسمار کرنے، ان کو عبادت سے روکنے، ان کی شہادت قبول نہ کرنے اور ان کی اس مالی وصیت کے نافذ نہ ہونے کا حکم دیا، جو آپس میں ایک دوسرے کے حق میں کیا کرتے تھے، اور جب ان ظالمانہ احکام کے نتیجہ میں ان محکوموں کی طرف سے کچھ بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے، تو ان کا سارا مال لوٹ لیا، بہتوں کو قتل ڈالا اور ایسی خوں ریزی کی جس سے اس ملک کی تمام یہودی آبادی کانپ اُٹھی۔

پھر صفحہ:۲۸ پر کہتا ہے :

شہر الطیوخ کے یہودی جب شکست خوردہ اور مغلوب ہو کر گرفتار ہوئے تو بعض کے اعضاء کو کاٹا، بعض کو قتل کیا اور باقی ماندہ تمام افراد کو جلاوطن کیا، پھر شہنشاہ نے اپنی تمام مملکت میں قسم قسم کے ظلم کئے، آخر کار پھر ان کو اپنی حدودِ سلطنت سے باہر کر دیا؛ بلکہ دوسرے ملکوں کے سلاطین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بھی یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ایشیاء سے لے کر یورپ کی آخری حد تک پیٹ بھر کر ظلم کیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد اسپینول کی سلطنت میں ان کو تین شرطوں میں سے کسی ایک کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا کہ اولاً عیسائی مذہب کو قبول کریں اور اگر یہ منظور نہ ہو تو قید کئے جائیں، اور اگر دونوں باتیں منظور نہ ہو تو جلاوطنی قبول کریں، ملکِ فرانس میں بھی اُن کے ساتھ کچھ اسی قسم کا معاملہ کیا گیا، یہ

مسکین لاچار ایک ملک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں مارے مارے پھرتے تھے، مگر کہیں ان کو ٹھکانا نصیب نہ ہوتا تھا، اور ایشیائے بزرگ میں ان کو چین وقرار حاصل نہ تھا؛ بلکہ اکثر اوقات ان کا قتل عام ہوا، جیسا کہ فرنچ سلطنتوں میں پیش آیا۔

پھر صفحہ:۲۹ پر کہتا ہے :

فرقہ کیتھولک والے اُن پر اس خیال سے ظلم کرتے تھے کہ یہ کافر ہیں ، اس فرقہ کے بڑے لوگوں نے ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی اور یہودیوں پر چند احکام جاری کئے :

۱- جس شخص نے کسی عیسائی کے مقابلہ میں کسی یہودی کی حمایت وجانب داری کی ، وہ مجرم شمار ہوکر اپنے مذہب سے خارج کر دیا جائے گا۔

۲- اور سلطنت کے مناصب میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا منصب وعہدہ کسی یہودی کو نہیں دیا جائے گا۔

۳- اگر کوئی عیسائی کسی یہودی کا غلام ہوگا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔

۴- کوئی شخص کسی یہودی کے ساتھ نہ کھائے ، نہ اس سے کوئی معاملہ کرے۔

۵- ان کے بچوں کو ان سے چھین کر مذہبِ عیسوی کی تربیت دی جائے ، اسی طرح کے دوسرے احکام ہیں، یقیناً یہ آخری حکم نمبر:۵ بلا شک وشبہ جبر واکراہ کی انتہائی صورت ہے۔

پھر کہتا ہے :

شہر تو موس جو فرانس کا شہر ہے، وہاں کے باشندوں کی عادت تھی کہ وہ عید الفصح کے روز یہودیوں کے چہروں پر چپت مارا کرتے تھے،

شہر بزمیرس کے لوگوں کے یہاں یہ رسم تھی کہ وہ اپنی عید کے پہلے روز سے آخری دن تک یہودیوں کو پتھر مارا کرتے اور اس سنگباری کے نتیجہ میں بے شمار لوگ مارے جاتے، حاکم شہر جو عیسائی تھا شہر کے باشندوں کو اس نامعقول اور ظالمانہ حرکت پر آمادہ کیا کرتا تھا۔

پھر صفحہ: ۳۰-۳۱ پر کہتا ہے :

● سلاطین فرانس نے یہودیوں کے لئے ایک عجیب انتظام کیا کہ وہ یہودیوں کو تجارت اور کمانے کی پوری آزادی اور سہولت دیتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ کما کر خوب مال دار بن جاتے تو ان کے اموال کو لوٹ لیا جاتا، اُن کا یہ ظلم انتہائی طمع وحرص کا نتیجہ تھا، پھر جب فلپ آغسطس Philip Augutis (۱۱۶۵-۱۲۲۳) فرانس کا بادشاہ ہوا، تو اس نے اولاً یہودیوں کے ان قرضوں کا ۱/۵ جو عیسائیوں کے ذمہ تھا بطور ٹیکس وصول کر کے بقایا رقم عیسائیوں کو معاف کردی اور قرض خواہ یہودیوں کو ایک حبہ بھی نہیں دیا گیا، پھر اپنی سلطنت سے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔

● پھر جب تخت سلطنت پر سینٹ لوئیس Saint Louis (۱۲۱۴-۱۲۷۰) فائز ہوا تو اس نے دوبار یہودیوں کو اپنی سلطنت میں بلایا اور دو مرتبہ جلاوطن کیا، پھر چارلس ششم Chales 6 th (۱۳۶۸-۱۴۲۲) نے یہودیوں کو ملک فرانس سے نکال باہر کیا، تواریخ شاہد ہیں کہ ملک فرانس سے سات مرتبہ یہودیوں کو دیس نکالا ملا، ان یہودیوں کی تعداد جن کو اسپینول سے جلاوطن کیا گیا، اگر کم از کم بھی فرض کی جائے تو ایک لاکھ ستر ہزار گھرانوں سے کسی طرح کم نہ ہوگی، ملک عنسا میں بہت سے یہودیوں کا قتل عام ہوا،

بہت سے لوٹے گئے اور بہت کم ان میں سے بچ سکے، وہ بھی صرف وہ تھے جنھوں نے عیسائیت قبول کرلی، ان میں بہت سے اس طریقہ پر مرے کہ پہلے اپنے گھروں کے دروازے بند کرلئے، پھر خود اپنے آپ کو، اپنے بچوں اور اپنی بیویوں کو اور اپنے اموال کو ہلاک کرڈالا، یا تو دریا میں ڈبو دیا، یا آگ میں جلا دیا، نیز ان میں سے بے شمار لوگ جہاد مقدس میں قتل ہوئے۔

● انگریزوں نے یہودیوں پر ظلم کرنے میں اتفاق کرلیا، جب شہر یرک (York) کے یہودیوں کو اس جور وستم کی وجہ سے نا اُمیدی ہوگئی تو انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا، اس طرح پر پندرہ ہزار مرد، عورتیں، بچے مارے گئے اور اس ملک میں اس کی پوزیشن اس قدر گر گئی تھی کہ جب امراء نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی، تو سات سو یہودی قتل کئے اور ان کے مالوں کو لوٹا؛ تاکہ لوگوں پر ان کا رُعب خوب قائم ہوجائے۔

رچرڈ و جان Richard John (۱۱۵۷-۱۱۹۹) اور ہنری Henry (۱۱۶۶-۱۲۱۶) سوم جو انگلستان کے بادشاہ ہوئے ہیں، انھوں نے بارہا یہودیوں کو لوٹا، بالخصوص ہنری سوم کی یہ عادت بن گئی تھی کہ مختلف شکلوں میں ظلم اور بے رحمی سے ان کو لوٹا کرتا تھا، اس لئے بڑے بڑے دولت مند سیٹھ یہودیوں کو کنگال بنا دیا گیا، اور اس قدر شدید ظلم کیا کہ وہ جلاوطنی پر راضی ہوگئے اور انھوں نے ملک سے نکل جانے کی اجازت مانگی، مگر ان کی یہ درخواست بھی قبول نہیں کی گئی، پھر جب ایڈورڈ Edward (۱۲۳۹-۱۳۰۷) اول تخت نشین ہوا تو اس نے معاملہ یوں ختم کیا کہ پہلے تو ان کے

تمام اموال کو لوٹا اور پھر سب کو اپنی مملکت سے جلا وطن کر دیا، پندرہ ہزار سے زیادہ یہودی انتہائی فقر و فاقہ کی حالت میں جلا وطن ہوئے۔

پھر صفحہ: ۳۲ پر کہتا ہے :

ایک مسافر جس کا نام مسوتی ہے اس کا بیان ہے کہ پرتگالیوں کی حالت آج سے پچاس سال قبل یہ تھی کہ وہ یہودیوں کو پکڑ لیا کرتے اور زندہ آگ میں جلا دیتے تھے، اُن بدنصیب جلنے والوں کا تماشہ دیکھنے کے لئے عید کی طرح اجتماع ہوتا، جس میں ان کی عورتیں اور مرد سب جمع ہوتے تھے، جو خوشیاں مناتے تھے اور یہودیوں کے جلائے جانے پر عورتیں مارے خوشی کے چیختی تھیں۔

پھر صفحہ: ۳۳ پر کہتا ہے :

پوپ نے جو فرقہ کیتھولک کا سب سے بڑا پیشوا ہوتا ہے، یہودیوں کے حق میں بڑے سخت قوانین بنائے تھے۔

اس کے علاوہ سیر المتقدمین کا مصنف کہتا ہے کہ :

قسطنطین اول کے بعد چھٹے بادشاہ نے اپنے امراء سلطنت کے مشورہ سے ۳۷۹ء میں یہ حکم جاری کیا کہ ہر وہ شخص جو سلطنت روم میں آباد ہے، اس کو عیسائیت اختیار کرنا لازم ہوگا اور جو عیسائیت اختیار نہیں کرے گا، وہ قتل کر دیا جائے گا۔

بھلا بتایا جائے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا جبر ہو سکتا ہے، طامس نیوٹن نے ان پیشین گوئیوں کے متعلق ایک تفسیر لکھی ہے جو کتبِ مقدسہ میں موجود ہیں، یہ تفسیر لندن میں ۱۸۰۳ء میں طبع ہوئی، اس تفسیر کے صفحہ: ۶۵ جلد ۳ میں یروشلیم پر عیسائیوں کے تسلط کے حال میں یوں کہا گیا ہے :

رومی ماہ تموز(۱) (جولائی) کی ۱۵ تاریخ ۱۰۹۹ء میں پانچ ہفتہ کے
طویل محاصرہ کے بعد یروشلیم کو عیسائیوں نے فتح کیا، اور جو عیسائی
نہ تھے ان کا قتل عام کیا گیا، ستر ہزار سے زیادہ مسلمان قتل کئے،
یہودیوں کو ایک جگہ جمع کر کے زندہ آگ میں جلا دیا، مسجدوں میں
بڑی بڑی غنیمتیں پائیں۔

کیتھولک کے پروٹسٹنٹ اور دوسروں کے ساتھ مظالم

اب فرقہ کیتھولک کے وہ کارنامے بھی ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے غیر عیسائی قوموں کے ساتھ کئے، ان میں سے چند اہم یہ واقعات کتاب ''الثلاث عشرۃ'' رسالہ سے نقل کرتے ہیں، جو بیروت میں ۱۸۴۹ء میں عربی زبان میں طبع ہوا، اس کے صفحات نمبر: ۱۵، ۱۶ میں کہا گیا ہے:

> رومی کلیسا نے بارہا جبری تبدیلی مذہب اور استیصال کلی کے حربے پروٹسٹنٹوں کے لئے استعمال کئے ہیں، یوروپ کے ملکوں میں بکثرت یہ واقعات پیش آئے، خیال یہ ہے کہ کم از کم بتیس ہزار ایسے لوگ جو یسوع پر تو بے شک ایمان لائے تھے، مگر پوپ پر ایمان نہ رکھتے تھے اور اپنے ایمان اور اعمال کے لئے صرف کتب مقدسہ کو راہنما مانتے تھے، آگ میں جلائے گئے، ان میں سے ہزاروں لوگ اور بڑی بڑی جماعتیں تلواروں، حبس اور کلبتین کے ذریعہ (یہ ایک اوزار ہے جس سے بدن کے جوڑ الگ الگ کر کے کھینچ لئے جاتے ہیں) قتل کئے گئے اور قسم قسم کے شدید عذاب ان کو دیئے گئے، ملک فرانس کے اندر صرف ایک دن میں تیس ہزار مرد اس روز قتل کئے گئے جو ماریر ثو طاؤس کے نام سے مشہور ہے، اسی طرح ان کا دامن قدیسیوں کے خون سے رنگین ہے۔

---

(۱) تموز شامی زبان میں ماہ جولائی کا نام ہے۔

اسی کتاب کے رسالہ نمبر: ۱۲، صفحہ: ۲۲۸ میں ہے :

ایک ایسا قانون موجود ہے جو اسپانیا Hesbaye کے مقام طلیطلہ Toledo کی مجلس شوریٰ میں وضع کیا گیا تھا، جس میں یوں کہا گیا کہ ہم یہ قانون مقرر کرتے ہیں کہ جو شخص اس ملک میں رہنا قبول کرتا ہے اس کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ اس وقت تک کرسی پر بیٹھ سکے جب تک اس امر کی قسم نہ کھالے کہ وہ اپنے ملک میں کیتھولک عیسائی کے سوا اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور اگر کوئی شخص اس حکم کے بعد اس عہد کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ ابدی خدا کے سامنے بد بخت ہوگا اور ابدی آگ کا ایندھن بنے گا۔

کارٹر کی مجموع الجامع دجہ ۴۰۴ میں لکھا ہے :

لاٹرانی مجلس کہتی ہے کہ تمام سلاطین اور امراء وارباب سلطنت اس چیز کی قسم کھائیں کہ وہ اپنی پوری کوشش اور دلی توجہ کے ساتھ اپنی ان محکوم رعایا کے استیصال میں مشغول رہیں گے، جو کنیسوں کے پیشوا ہیں؛ چوں کہ وہ مصلح ہیں، اس لئے ان میں سے کسی کو اپنے علاقوں میں باقی نہ چھوڑیں گے اور اگر انھوں نے اپنے اس عہد کو ملحوظ نہ رکھا، تو ان کی قوم ان کی اطاعت سے آزاد ہوگی۔

راس ۳، یہ قانون قسطنطنیہ کی مجلس میں بھی پاس ہوا، جلسہ نمبر: ۴۵ کے حال میں لکھا ہے کہ یہی قانون پوپ مرتینوس Pope Martinv (۱۳۶۹-۱۴۳۱) پنجم کے قوانین میں سے ہے، اور اس حلف میں جس کو تمام پادریوں نے پوپ پولس Pope Julius (۱۴۸۷-۱۵۵۵) ثالث کی صدارت میں ۱۵۵۱ء میں اُٹھایا تھا، یہ عبارت موجود ہے :

بے دینوں اور ہمارے سردار پوپ اور ان کے خلفاء کے مخالف اور نافرمان لوگوں کو میں اپنی پوری طاقت سے کچل دوں گا، لاٹرانی

مجلس اور قسطنطنیہ کے جلسہ کے اراکین کہتے ہیں کہ جو شخص بھی اراتقہ (۱) کو گرفتار کرے گا، اس کو اس امر کی اجازت ہوگی کہ وہ گرفتار شدہ کے تمام اموال کو ضبط کر لے اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے استعمال میں لائے۔

مجلس لاٹرانی جلد: ۴ فصل: ۱، وجہ ۱۵۳ اور مجلس قسطنطنیہ جلسہ ۴۵ جلد ۷ میں لکھا ہے:

پوپ اینوسنتیوس Pope Innoccit III (۱۱۶۱-۱۲۱۶) سوم کہتا ہے کہ اراتقہ سے قصاص لینے کا ہم تمام سلاطین اور حکام کو حکم دیتے ہیں اور کلیسائی قصاصوں کے تحت ہم اس کو اُن پر لازم اور واجب کرتے ہیں۔

قانون نمبر: ۷، کتاب نمبر: ۵ میں یوں ہے کہ ۱۷۲۴ء میں پادشاہ لوئیس یازدہم Louis XI (۱۴۲۳-۱۴۸۳) نے قانون مقرر کئے:

۱- یہ کہ ہم حکم دیتے ہیں کہ ہماری مملکت میں صرف کیتھولک مذہب ہی جاری رہ سکتا ہے، جو لوگ اس کے علاوہ کسی اور مذہب کو اختیار کرتے ہیں، ان کو زندگی بھر قید رہنا پڑے گا، اور عورتوں کے بال کاٹ دیئے جائیں گے، اور مرتے دم تک قید رکھی جائیں گی۔

۲- ان تمام واعظوں کو جنھوں نے کیتھولک عقائد کے خلاف لوگوں کو دوسرے عقائد پر جمع کیا ہے، یا وہ لوگ جن کو دوسرے عقائد کا علم یا ممارست ہے، موت کی سزا دی جائے گی، نیز اس گفتگو میں جو پادریوں نے اسپانیا میں پادشاہ سے ۱۷۶۵ء میں کی تھی، انھوں نے پادشاہ سے کہا کہ آپ قوانین کو مضبوط کیجئے اور مذہب کو عزت بخشئے؛ تاکہ یہ چیز ہماری جانب سے ۱۷۲۴ء کے قوانین کی تجدید کا سبب بن جائے۔

---

(۱) اراتقہ Huguenots (فرانسیسی پروٹسٹنٹ فرقہ)۔

آگے لکھا ہے کہ :

من جملہ انگریزی قوانین کے جو پوپ کے حکم سے جاری ہوئے، یہ بھی ایک قانون تھا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ مورتیوں کو سجدہ کرنا ناجائز ہے، اس کو سخت قید میں ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ ان کو سجدہ کرنے کی قسم نہ کھائے، اور پادری قاضی کلیسائی کو اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ اس کو جس شخص کے اراتقی ہونے کا ذرا بھی شبہ ہو، اس کو گرفتار کر کے قوم اور حکام کے سامنے آگ میں جلا دے، اور تمام حکام اس بات کا حلف اُٹھائیں کہ وہ اراتقہ (پروٹسٹنٹ) کی بیخ کنی میں قاضی کی اعانت کریں گے، اور جب ان کا اراتقہ ہونا ثابت ہو جائے تو ان کا مال لوٹ لیا جائے اور ان کو اس کے حوالے کر دیا جائے اور ان کا جرم صرف آگ کی لپٹ اور شعلے مٹا سکیں گے۔

کوک فرائض (۱)، عدد: ۳ وجہ: ۴۰، ۴۱ نیز عدد: ۴، وجہ ۱۵ میں لکھا ہے کہ :

اور باردینوس کہتا ہے کہ شاہ کارلوس پنجم Charles V (۱۵۰۰-۱۵۵۸) اپنی غلط رائے کی بناء پر خیال کرتا تھا کہ وہ اراتقہ (پروٹسٹنٹ) کو بجائے تلوار کے بات سے نیست و نابود کر دے گا، کتاب مقدس کی فہرست میں جو روم میں لاطینی اور عربی زبان میں طبع ہوئی ہے، حرف ''ہ'' کے تحت میں یہ تعلیم موجود ہے کہ ہمارے لئے مناسب ہے کہ اراتقہ (پروٹسٹنٹ) کو ہم ہلاک کریں، اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ پادشاہ یاہو نے جھوٹے کاہنوں کو قتل کیا اور ایلیاء نے بعل کے کاہنوں کو ذبح کیا وغیرہ وغیرہ، اسی طرح کلیسا کی اولاد کے لئے بھی مناسب ہے کہ وہ بھی اراتقہ کو ہلاک کریں۔

---

(۱) ''کوک فرائض'' اظہار الحق میں ایسا ہی ہے، مگر اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ میں کوف فرائض ہے۔

پھر صفحہ: ۲۴۷ و ۲۴۸ میں ہے کہ :

مورخ منتوان سلطنت کریلین والا اور اس کے ساتھ دوسرے مؤرخین نے انجیل کے معتبر واعظ کے بارے میں جس کو تومامن رودن کہا جاتا تھا خبر دی ہے کہ اس کو پوپ نے اس لئے آگ میں جلوادیا تھا کہ اس نے رومی کلیسا کے فسادات کے خلاف وعظ کہا تھا، مؤرخین اس شخص کو قدیس شہید اور مسیح کا سچا گواہ کہتے ہیں۔

اور صفحہ: ۳۵۰ سے ۳۵۵ میں ہے :

۱۱۹۴ء میں ڈی فانسو شاہ ارغوان نے اندلس میں حکم جاری کیا کہ اس کی سلطنت سے تمام واضیین کو جلاوطن کیا جائے؛ کیوں کہ یہ لوگ اراتقہ ہیں، اور ۱۲۰۶ء میں امیر رایمون شہر ثولوس کے حاکم کے خلاف پوپ نے محکمۂ جاسوسی کے افسران کو اس شہر کی طرف روانہ کیا؛ کیوں کہ حاکم مذکور نے واضیین کو جلاوطن کرنے سے انکار کردیا تھا، پھر کچھ عرصہ کے بعد پادشاہ فرانس نے ایک بڑا لشکر جرار جس کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے، پوپ کے طلب کرنے پر اس شہر کی طرف روانہ کیا، امیر رائمون نے اپنے شہر میں محصور ہو کر اپنی مدافعت کی؛ تاکہ قوت کا جواب قوت سے دے، اس لڑائی میں لاکھوں آدمی مارے گئے، رائمون کے لوگوں نے شکست کھائی، اور ہر قسم کی ذلتوں اور عذابوں نے اُن کو گھیر لیا، پوپ اس لڑائی کے دوران اپنی قوم سے کہتا تھا کہ ہم تم کو بزرگی دیتے ہیں اور تم پر واجب کرتے ہیں کہ تم ان خبیث اراتقہ یعنی واضیین (پروٹسٹنٹ) کو نیست کرنے میں خوب جدوجہد کرو اور ان کو دفع کرنے میں اس سے زیادہ شدت وقوت سے کام لو، جس قدر سارا جیون یعنی مسلمانوں کے خلاف کرتے ہو۔

۱۴۰۰ء ماہ کانون اول (۱) دسمبر کے آخر میں پوپ کے لوگوں نے اچانک واضیین پر ملک سرودینا Sairdina کے شہر اوڈیا بیٹ مونٹ میں حملہ کر دیا، نتیجہ میں وہ لوگ بغیر لڑائی کے بھاگ کھڑے ہوئے؛ لیکن ان میں سے بہت سے لوگ تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور بہت سے لوگ برف باری کی نذر ہو گئے، پھر پوپ نے اس واقعہ کے ۸۷ سال بعد البرٹوس ارشید یا کونوس کو شہر کارمونیا میں اس امر کا پابند کیا کہ فرانس کے مغربی اطراف میں اور اوڈیا بیٹ مونٹ میں واضیین سے جنگ کرے، جہاں کچھ لوگ ان کے بقایا چلے آتے تھے، جو ۱۴۰۰ء کی جنگ سے بچ کر لوٹ آئے تھے، یہ شخص فوراً آگے بڑھا، اس کے ساتھ اُٹھارہ ہزار جنگ جو تھے، اور یہ لڑائی تقریباً ۳۰ سال تک ان عیسائیوں کے خلاف جاری رہی جو یہ کہتے تھے کہ ہم ہر وقت پادشاہ کا اکرام کرتے ہیں، جزیہ ادا کرتے ہیں، مگر ہمارا ملک اور ہمارا مذہب جس کے ہم اللہ کی طرف سے مالک ہیں اور اپنے باپ داداؤں سے ترکہ میں پایا ہے، اس کو ہم کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتے، اسی طرح اٹلی کے شہر کالابریا میں ۱۵۶۰ء کے اندر لاکھوں پروٹسٹنٹوں کا قتل عام ہوا، بعض لوگ لشکر کے ہاتھوں مارے گئے اور بعض لوگ محکمۂ جاسوسی کے ذریعہ فنا کے گھاٹ اُتر گئے، ایک رومی پروفیسر کہتا ہے کہ میرا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے، جب کبھی میں اس منظر کا تصور کرتا ہوں کہ ایک جلاد ہے اور اس کے دانتوں میں خون آلود خنجر ہے، اس کے ہاتھ جو رومال ہے، اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اس کے تمام ہاتھ پہنچوں تک خون میں لت پت ہیں، ایک ایک قیدی کو قید خانے سے اس طرح گھسیٹ کر لاتا ہے جس طرح قصائی بکری کو۔

---

(۱) کانون اول شامی زبان میں دسمبر کے مہینہ کو کہتے ہیں۔

۱۶۰۱ء میں ڈیوک سافوی نے واضیین (پروٹسٹنٹ) کے پانچ سو خاندانوں کو جلاوطن کیا، نیز ۱۶۵۵ء اور ۱۶۷۶ء میں اوڈیابیٹ موںٹ میں ان کے خلاف پھر جبری تبدیلیٔ مذہب کا سلسلہ شروع ہوا؛ کیوں کہ پادشاہ لوئیس چہاردہم پوپ کے اشارے سے اپنے لشکر کے ساتھ ان کی طرف بڑھا؛ جب کہ وہ لوگ بڑے اطمینان سے اپنے گھروں میں پڑے ہوئے تھے؛ چنانچہ فوج نے اُن میں سے بہت سوں کو قتل کرڈالا اور دس ہزار سے زیادہ نفوس کو جیل خانہ میں ڈال دیا، جہاں گھٹ کر اور بھوک سے نڈھال ہوکر ان لوگوں نے جان دے دی اور جو اُن میں سے بچ گئے اُن کو نکال کر جلاوطن کردیا، یہ کارروائی ایسے موسم میں ہوئی جب کہ کڑاکے کی سردی پڑرہی تھی، اور زمین برف پوش تھی جس کے سبب بہت سی مائیں اور ان کے شیر خوار بچے سردی سے اکڑ کر راستے ہی میں مرگئے۔

چارلس پنجم نے ۱۵۲۱ء میں ایک حکم نامہ پروٹسٹنٹوں کی جلاوطنی کی نسبت شہر فلیمنک میں پوپ کی رائے سے جاری کیا، جس کے نتیجے میں پانچ لاکھ آدمی مارے گئے، چارلس کے بعد اس کا بیٹا فلپس بادشاہ ہوا، اس نے ۱۵۵۹ء میں اندلس جاکر امیر انفا کو پروٹسٹنٹوں کے جلاوطن کرنے کے لئے اپنا جانشین بنایا، اس شخص نے چند مہینوں میں شاہی شرعی جلاد کے ہاتھوں اٹھارہ ہزار آدمی قتل کئے، اس کے بعد یہ شخص فخریہ کہا کرتا تھا کہ میں نے پورے ملک میں چھتیس ہزار انسانوں کو قتل کیا، اور وہ مقتولین جن کا ذکر پروفیسر کین کرتا ہے اور جن کو عید برتلمائی (۱) کے موقع پر ماہِ آب (۲) اگست ۱۵۷۲ء میں کامل امن وامان کے زمانے میں قتل کیا گیا، ان کا واقعہ یہ ہے کہ :

---

(۱) عید برتلمائی Lord's Faise by Bartholmew۔ (۲) آب شامی زبان میں ماہِ اگست کو کہتے ہیں۔

فرانس کے بادشاہ نے اپنی بہن کو نسبت امیر فافار کو جو علماء پروٹسٹنٹ اور شرفاء میں سے تھا، دینے کا وعدہ کرلیا تھا، پھر وہ اور اس کے دوست احباب اور ان کے کلیسا کے بڑے بڑے لوگ پیرس میں جمع ہوئے؛ تاکہ شادی کے وعدے کی تکمیل ہوجائے اور جب صبح کی نماز کے لئے ناقوس بجنے شروع ہوئے تو لوگوں نے پہلے سے طے شدہ سازش کے مطابق امیر اور اس کے ساتھیوں اور سارے پروٹسٹنٹوں پر جو پیرس میں موجود تھے اچانک حملہ کر کے اسی گھڑی دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیئے۔

اسی طرح کا واقعہ روبن ولیون میں پیش آیا؛ بلکہ اس علاقہ کے اکثر شہروں میں بھی یہی سانحہ پیش آیا، بعض مؤرخین نے تو کہا ہے کہ تقریباً ساٹھ ہزار انسان ہلاک کئے گئے اور برابر تیس سال تک یہ جبر وظلم اور قتل عام جاری رہا، اس لئے کہ پروٹسٹنٹوں نے بھی ہتھیار سنبھال لئے تھے؛ تاکہ طاقت کا جواب طاقت سے دیں، غرض اس لڑائی میں کل نو لاکھ پروٹسٹنٹ مارے گئے اور جب لوگوں نے شاہِ فرانس کا یہ کارنامہ جو عید برتلمائی میں انجام دیا گیا تھا، سنا تو اس خوشی میں برجوں سے توپیں داغی گئیں، اور پوپ تمام کارڈ نیلوں کے ساتھ مار پطرس کے کلیسا میں شکریہ کا نغمہ پڑھنے گیا اور بادشاہ کو بھی اس کارنامہ کے صلہ میں جو اس نے رومی کلیسا کے حق میں انجام دیا تھا، شکریہ کا مضمون لکھا، پھر جب بادشاہ ہنری Henryiv (۱۵۵۳-۱۶۱۰) چہارم تخت نشین ہوا تو اس نے ۱۵۹۳ء میں یہ مظالم موقوف کردیئے، مگر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسی جرم میں قتل کیا گیا کہ اس نے دین کے معاملہ میں قہر وظلم کے لئے آمادگی کیوں نہ ظاہر کی؟ پھر

> ۱۶۷۵ء میں دوبارہ ظلم وستم شروع ہوا اور بے شمار مخلوق کے قتل کے بعد مؤرخین کے بیان کے مطابق پچاس ہزار آدمی ترکِ وطن پر مجبور ہوئے؛ تاکہ موت کے چنگل سے نکل جائیں۔

ہم نے یہ تمام عبارتیں مطابق اصل کے لفظ بہ لفظ رسالہ نمبر: ۱۲ سے نقل کی ہیں۔

پروٹسٹنٹ کے مظالم

فرقہ کیتھولک کے مظالم کا نقشہ تو قارئین نے خوب اچھی طرح ملاحظہ کرلیا ہے، اب تصویر کا دوسرا رُخ یعنی فرقہ پروٹسٹنٹ کے مظالم کے کارنامے بھی سنتے جایئے، جوکہ کسی طرح اُن سے کم نہیں ہیں، یہ واقعہ ہم کتاب ''مراٗۃ الصدق'' سے نقل کرتے ہیں، جس کا ترجمہ پادری طامس انگلس نے جو کیتھولک کا عالم ہے، انگریزی سے عربی میں کیا ہے اور جو ۱۸۵۱ء میں طبع ہوئی ہے، یہ کتاب اس فرقہ کے لوگوں کے پاس ہندوستان میں بکثرت موجود ہے، اس کے صفحہ: ۴۱، ۴۲ پر لکھا ہے کہ :

> پروٹسٹنٹوں نے اپنے ابتدائی دور میں ۶۴۵ خانقاہیں اور ۹۰ مدارس اور ۲۳۷۶ عبادت خانے، ۱۱۰ شفاخانے ان کے مالکوں سے چھین کر معمولی قیمت میں بیچ ڈالے اور ان کی قیمت امراء نے آپس میں تقسیم کرلی اور ہزاروں مفلوک اور غریبوں کو برہنہ کرکے اُن مقامات سے نکال دیا۔

پھر صفحہ: ۴۵ پر کہتا ہے :

> اُن کی طمع اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے مُردوں تک کو نہیں بخشا، اُن کے جسموں کو جو عدم کی نیند سو رہے تھے، اذیت دی اور اُن کے کفن اُتارے۔

پھر صفحہ ۴۸، ۴۹ پر کہتا ہے :

> اس لوٹ مار میں بے شمار کتب خانے ضائع ہوگئے، جن کا ذکر جی

بیل ان الفاظ سے کرتا ہے کہ انھوں نے کتابوں کو لوٹ کر ان کے اوراق کو کھانا پکانے میں شمع دانوں اور جوتوں کو صاف کرنے میں استعمال کیا، کچھ کتابیں عطاروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں، اور کچھ صابن فروشوں کے ہاتھ، بہت سی کتابوں کو سمندر پار چمڑے والوں کے ہاتھ فروخت کردیا، یہ کتابیں سو پچاس نہ تھیں؛ بلکہ سواریاں ان کتابوں سے لدی ہوئی ہوتی تھیں، اور اس بری طرح ان کتابوں کو ضائع کریا کہ دوسری قوموں کو بھی تعجب ہوا، میں ایک ایسے تاجر کو جانتا ہوں جس نے دو بڑے کتب خانے صرف بیس روپے میں خریدے تھے، ان مظالم کے بعد انھوں نے کنیسوں کے خزانوں میں سے سوائے ننگی دیواروں کے کچھ بھی نہ چھوڑا، اس کے باوجود وہ لوگ اپنے آپ کو شائستہ سمجھتے ہیں اور کنیسوں میں سب اپنے مذہب کے لوگ بھر دیئے۔

پھر صفحہ: ۵۳ لغایۃ صفحہ: ۵۶ پر کہتا ہے:

اب ہم اُن ظالمانہ افعال پر غور کرتے ہیں جو پروٹسٹنٹوں نے فرقہ کیتھولک کے حق میں آج تک روا رکھے ہیں، انھوں نے ایک سو سے زیادہ ایسے قوانین مقرر کئے جو سب کے سب عدل و رحم کے خلاف اور محض ظالمانہ ہیں، ہم ان میں سے چند بیان کرتے ہیں:

۱- کوئی کیتھولک ماں باپ کا ترکہ نہیں پاسکتا۔

۲- ان کا کوئی شخص جب تک پروٹسٹنٹ نہ ہوجائے، اٹھارہ سال کی عمر ہوجانے کے بعد کسی زمین کے خریدنے کا مجاز نہیں۔

۳- ان کے لئے کوئی مدرسہ نہ ہوگا۔

۴- ان کو لکھنے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس حکم کی خلاف ورزی پر دوامی قید ہوگی۔

۵- اس مذہب کے لوگوں کو دوگنا خراج ادا کرنا ہوگا۔

٦- اگر ان لوگوں کا کوئی پادری نماز ادا کرے گا تو اس کو اپنے مال سے تین سوتیس روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا، اور اگر غیر پادری نماز ادا کرے گا تو اس کو سات سو جرمانہ اور ایک سال کی قید ہوگی۔

۷- ان میں اگر کوئی شخص اپنے بچے کو انگلستان سے باہر غیر ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجے گا تو باپ بیٹے دونوں قتل کئے جائیں گے اور تمام مال و مویشی ضبط کر لئے جائیں گے۔

۸- سلطنت کا کوئی بھی عہدہ ان کو نہیں دیا جاسکتا۔

۹- ان میں جو شخص اتوار کے دن یا عید کے روز پروٹسٹنٹ کلیسا میں حاضری نہیں دے گا اس کو دوسو روپیہ ماہوار جرمانہ ادا کرنا ہوگا اور جماعت سے خارج شمار ہو کر کسی عہدہ کے لائق نہ رہے گا۔

۱۰- ان میں اگر کوئی لندن سے ۵ میل کی مسافت پر سفر کرے گا تو ایک ہزار روپیہ جرمانہ لیا جائے گا۔

۱۱- قانون کے مطابق حکام کے یہاں کسی کی فریاد نہیں سنی جائے گی۔

۱۲- ان میں سے کوئی شخص مال و متاع لوٹے جانے کے اندیشے سے ۵ میل سے زیادہ سفر نہ کرے، اسی طرح ایک ہزار روپیہ جرمانے کے اندیشہ سے کوئی شخص حکام تک اپنی فریاد پہنچانے پر قادر نہ تھا۔

۱۳- نہ اُن کے نکاح درست ہیں، نہ اُن کے مردوں کی تجہیز و تکفین ٹھیک ہے، نہ اُن کے بچوں کی پاکی بپتسمہ سے صحیح ہے، جب تک یہ

سب کام انگریزی کلیسا کے طریقہ کے مطابق انجام نہ دیئے جائیں۔

۱۴- اس مذہب کی کوئی عورت اگر نکاح کرے گی تو حکومت اس کے جہیز میں سے ۱/۳ لے لے گی، یہ عورت اپنے خاوند کے ترکہ میں وارث نہ ہوگی، نہ خاوند کو اس کے حق میں کوئی وصیت کرنا جائز ہوگا، ان کی بیویاں اس وقت تک قید میں رہیں گی، جب تک اُن کے خاوند دس روپے ماہانہ ٹیکس نہ ادا کریں، یا پھر اپنی زمین کا ۱/۳ حصہ حکومت کو نہ دے دیں۔

۱۵- آخر کار حکومت کا یہ حکم جاری ہوا کہ اگر یہ لوگ سب کے سب پروٹسٹنٹ ہونا قبول نہ کرلیں تو ان کو قید کرکے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کردیا جائے، اور اگر یہ لوگ حکم ماننے سے انکار کریں، یا جلاوطنی کے بعد پھر بغیر اجازت واپس آمئیں تو بڑے سنگین جرم کے مرتکب شمار کئے جائیں گے۔

۱۶- ان کے قتل کئے جانے یا تجہیز و تکفین کے موقع پر پادری نہ آئے۔

۱۷- کسی کے گھر میں ہتھیار نہ رہنے پائیں۔

۱۸- کسی کو ان لوگوں میں ایسے گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ ہوگی جس کی قیمت پچاس روپے سے زیادہ ہو۔

۱۹- ان کا کوئی پادری اگر اپنے متعلقہ کام انجام نہ دے گا تو دوامی قید کا مستحق ہوگا۔

۲۰- جس پادری کی پیدائش انگلستان کی ہو، مگر وہ پروٹسٹنٹ طریقے پر نہ ہو اگر وہ انگلستان میں تین دن سے زیادہ قیام کرے گا تو غدار شمار ہو کر واجب القتل ہوگا۔

۲۱- جو شخص ایسے پادری کو پناہ دے گا، وہ بھی واجب القتل ہوگا۔
۲۲- عدالت میں کسی کیتھولک عقیدہ والے کی گواہی معتبر نہ ہوگی،
ان ظالمانہ قوانین کے تحت ملکہ ایلزبتھ کے عہد میں دوسو چار اشخاص کو قتل کیا گیا، ان میں سے ایک سو چار پادری تھے، باقی یا دولت مند طبقے کے لوگ تھے، یا وہ لوگ جن کا قصور اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ انھوں نے اپنے کیتھولک ہونے کا اقرار کیا تھا، نوے پادری اور دوسرے بڑے لوگ جیل خانے میں سڑ کر مر گئے، ایک سو پانچ اشخاص کو عمر بھر کے لئے جلاوطن کیا گیا، بہتوں کے کوڑے مارے گئے، جرمانہ کیا گیا اور اپنے اموال واملاک سے محروم کر دیئے گئے، یہاں تک کہ ان کا پورا خاندان ہلاک ہوگیا، ملکہ اسکاٹ لینڈ میری Queen Mary (۱۵۴۲-۱۵۸۷) جو ملکہ ایلزبتھ Queen Elizabeth (۱۵۳۳-۱۶۰۳) کی خالہ زاد بہن تھی محض کیتھولک ہونے کی وجہ سے قتل کی گئی۔

پھر صفحہ:۶۱، لغایۃ:۶۶ پر کہتا ہے :

ملکہ ایلزبتھ کے حکم سے ان کے بہت سے راہب اور علماء کو کشتی میں سوار کر کے سمندر میں ڈبو دیا گیا، اس کا لشکر آئر لینڈ میں اس غرض سے داخل ہوا کہ کیتھولک فرقہ کے لوگوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں جبراً داخل کر لیں، اس فوج نے ان کے تمام گرجے جلا ڈالے، ان کے علماء کو قتل کیا، ان کو اس طرح شکار کیا کرتے تھے جس طرح جنگل کے وحشی جانوروں کو شکار کیا جاتا ہے، یہ لوگ کسی کو امن نہیں دیتے تھے، اور اگر کسی کو امن دے دیتے تو امن دینے کے بعد بھی اس کو قتل کر دیتے اور جو لشکر سمروک کے قلعہ میں تھا، انھوں نے ان کو بھی

ذبح کردیا اور تمام بستیوں اور شہروں کو آگ لگادی اور کھیتوں اور جانوروں کو برباد کردیا، وہاں کے باشندوں کو عمر و درجہ کا لحاظ کئے بغیر جلاوطن کردیا، یہ قسم قسم کے مظالم کا سلسلہ جیمس اول کے عہد تک برابر جاری رہا، اس کے زمانے میں البتہ کسی قدر تخفیف ہوگئی تھی، پھر ۱۷۷۸ء میں اس بادشاہ نے ان پر رحم کیا، مگر پروٹسٹنٹ فرقہ بادشاہ سے بگڑ گیا اور ایک محضر نامہ چوالیس ہزار پروٹسٹنٹوں کی جانب سے ماہِ حزیران (جون) ۱۷۸۰ء کی دوسری تاریخ کو باشاہ کی خدمت میں پیش کرکے درخواست کی گئی کہ پارلیمنٹ کیتھولک والوں کے لئے ان ظالمانہ قوانین کو بدستور جاری رکھے، مگر پارلیمنٹ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی، تب ایک لاکھ پروٹسٹنٹ لندن میں جمع ہوئے اور کنیسوں میں آگ لگادی، اور کیتھولک والوں کے مکانات مسمار کردیئے، ایک جگہ چھتیس مقامات پر لگی ہوئی آگ دکھائی دیتی تھی، یہ فتنہ برابر چھ روز قائم رہا، مجبور ہوکر بادشاہ نے ایک دوسرا قانون ۱۷۹۱ء میں وضع کیا اور کیتھولک والوں کو کچھ حقوق دیئے گئے، جو ان کو آج تک حاصل ہیں۔

پھر صفحہ: ۴۷،۴۳، پر کہتا ہے:

تم نے آئرلینڈ کے چارٹر اسکول کا حال نہیں سنا؟ یہ بات محقق اور یقینی ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ پچیس لاکھ روپیہ جمع کرتے ہیں، بڑے بڑے مکانات کا کرایہ اس کے علاوہ بے شمار ہے، اس رقم کے ذریعہ کیتھولک والوں کے بچوں کو خرید لیتے ہیں، جو بیچارے غریب اور مفلوک ہوتے ہیں، اور ان کو خفیہ طور پر گاڑیوں میں سوار

کر کے دوسرے ممالک میں بھیج دیتے ہیں؛ تاکہ ان کے ماں باپ
نہ دیکھ سکیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ بد بخت بچے بڑے ہوکر
جب اپنے وطن کو واپس آتے ہیں تو تعارف و امتیاز نہ ہونے کے
سبب اپنی بہنوں اور بھائیوں اور ماں باپ سے نکاح کر لیتے ہیں۔

اور وہ مظالم جو فرقۂ پروٹسٹنٹ والوں نے آپس میں ایک دوسرے پر کئے ہیں، ان کا تذکرہ تطویل کے خوف سے ہم نہیں کرتے اور صرف اس مقدار پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ ذرا ان معترضین کو دیکھئے: جو ملت محمد یہ پر کس بے حیائی اور بے شرمی سے یہ الزام لگاتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنا مذہب ظلم وستم کے ذریعہ دنیا میں پھیلایا ہے؟(۱)



(۱) اظہار الحق، جلد سوم، باب ششم، صفحہ: ۷۴۴ تا ۷۹۵، تالیف: مولانا رحمۃ اللہ کیرانویؒ

کلیسا کے سنگین مظالم☆

رومن امپائر "Roman Empire" کی تاریخ میں کلیسائی مسیحیت کا آغاز نہایت غربت و کسمپرسی کی حالت میں ہوا تھا؛ لیکن سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے بعد اسے سیاسی استحکام بھی نصیب ہوا اور پھر رفتہ رفتہ وہ شہنشائیت کے مدمقابل ہوئی اور طویل کشمکش کے بعد اس نے اقتدار پر مکمل تسلط بھی حاصل کرلیا۔

شہنشائیت پر فتح کے بعد کسی بھی شعبہ میں کلیسا کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اسے اگر کسی مقاومت کا سامنا تھا تو وہ صرف اندرونی کشمکش اور پاپائی چپقلش تھی، ورنہ معاشرہ کا ہر شعبہ اس کے سامنے سرنگوں اور سماج کا ہر طبقہ اس کی مرضی کے آگے بے دست و پا تھا۔

کلیسا نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بے جا تشدد اور سنگین مظالم کا سہارا لیا، اس نے معاشرہ کے ہر طبقہ کا استحصال کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو پوری طرح نچوڑ ڈالا، ابتدائی صدیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ بندہ اپنے خالق سے براہ راست تعلق قائم کرسکتا ہے؛ لیکن کلیسائی اقتدار کے بعد الہیات کو بھی عقل وخرد کی بنیادوں پر استوار کیا گیا اور یہ عقیدہ نافذ کیا گیا کہ خالق سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہوسکتا، اس لئے پوپ کا رابطہ یا توسط ضروری ہے اور پھر نجات کے لئے ہر فرد کو اس کی خدمت میں پیش ہونا لازم ہوگیا، شادی بیاہ ہو یا موت وحیات، سیاسی جرائم ہوں یا تجارتی بددیانتی، ہر جرم و ہر گناہ میں زاد معافی کا اختیار صرف پوپ کو تھا، یوں مغرب کا ہر فرد اور اس کی زندگی کا ہر شعبہ کلیسا کے تابع ہوگیا اور پوپ اس کے جسم وروح کا آقا و مالک بن گیا۔

☆ یہ تحریر مولانا نفیس خان ندوی کی چشم کشا کتاب "کلیسا" کا ایک باب ہے، جو کسی حذف و اضافہ کے بغیر یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

محکمۂ احتساب (Inquisition)

محکمۂ احتساب، یورپ کے کیتھولک ممالک میں سرگرم ادارہ جس کا مقصد کلیسا سے اختلاف رکھنے والوں کی جانچ پڑتال کرنا اوران کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا تھا :

> Inquisition; in the church of Rome, is a tribunal, in several Roman Catholic countries, erected by the Popes for the examination and punishment of heretics.(1)

کلیسا نے اپنے اقتدار کی بنیاد جبر واستبداد پر رکھی، اس نے ہر اس آواز کو حلق ہی میں دبا دیا جس میں پوپ کے افکار ونظریات کی مخالفت تھی، صدیوں تک مسیحی دنیا میں ایمان وعقائد کا حرفِ آخر کلیسا ہی تھا؛ لیکن جب مغربی معاشرہ کا تعلق گرد وپیش کی ثقافتوں سے ہوا اور خاص کر مسلمانوں سے اختلاط عام ہوا تو غور فکر کے نئے نئے دریچے کھلنے لگے، جس کے بعد فکری اضطراب وبے چینی کا پیدا ہونا لازمی تھا؛ چنانچہ کلیسا نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور ہر اس فکر کو جو کلیسا کے خلاف تھی ''بدعت'' (Heresy) قرار دیا۔

کلیسا کی حکومت میں ''بدعت'' سب سے بڑا معاشرتی ومذہبی جرم تھا اور بدعتی آسمانی حکومت کا غدار تھا جس کا وجود کسی بھی قیمت پر قابل برداشت نہیں تھا؛ کیوں کہ بدعت کے ذریعہ رُوح آلودہ ہوجاتی تھی اور روح کی آلودگی کے بعد اس جسم کا باقی رہنا کسی بھی صورت روا نہیں تھا، نیز ملحد صرف وہ ہی نہیں تھا جو کج عقیدہ ہو؛ بلکہ وہ بھی تھا جو پوپ کا ہم نوا نہ ہو۔

چنانچہ بارہویں صدی میں پوپ انوسینٹ دوم (Innocent II) نے ایک تفتیشی ادارہ (Inquisition) کی بنیاد رکھی؛ تاکہ اس کے ذریعہ کلیسا مخالف ہر فکر کو مٹایا جاسکے اور ہر اس شخص کی بیخ کنی کی جاسکے جو کسی بھی ناحیہ سے کلیسا کے افکار ونظریات یا اس کے معتقدات کے خلاف ہو :

---

(1) An Account of the Inquisition at Goa in India. P.2.

This court was founded in the twelfth century, under the patronage of pope Innocent, who issued out orders to excite the Catholic princes and people to extirpate heretics.(1)

یہودیوں اور مسلمانوں کے علاوہ ابتدائی تین صدیوں میں رومی شہنشاہوں نے جتنے مسیحیوں کو ہلاک کیا تھا اس سے کہیں زیادہ مسیحی اس احتساب کی بھینٹ چڑھ گئے، صرف ایک ملک نیدرلینڈ (Netherland) میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی اور طرفہ یہ کہ انھیں ہلاک کرنے والے خود مسیحی تھے اور وہ روئے زمین پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات محبت کے داعی و امین کہلاتے تھے!

1185ء میں پوپ لیوسیس سوم (Lucius III) نے باقاعدہ فرمان جاری کیا کہ بشپ اور کلیسائی حکام ملک بھر کے مسلسل دورے کریں اور کلیسا کے غیر وفادار اور عقیدے کے مشکوک لوگوں کی پڑتال کریں اور انھیں گرفتار کر کے ان کے خلاف سخت کارروائی کریں :

In 1185, Pope Lucius III, dissatisfied with the negligence of the bishops in pursuing heresy, ordered them to visit their parishes at least once a year, to arrest all suspects.(2)

پوپ کے فرمان کے بموجب فرانس، اٹلی، اسپین، جرمنی، انگلستان اور دیگر مسیحی ملکوں کے ہر بڑے شہر میں احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا، جس میں کلیسا سے کسی بھی قسم کا اختلاف رکھنے والے ''ملحدین'' کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا اور انھیں سزا دی جاتی :

it is established in certain places, as Italy, Spain, Portugal, and the greatest part of the countries which are dependent upon them.(3)

---

(1) An Account of the Inquisition at Goa in India, P:2

(2) The Age of Faith by Will Durant, P:779

(3) An Account of the Inquisition at Goa in India, P:17
ہندوستان گوا میں بھی احتساب کا محکمہ قائم تھا جس کی تفصیلات مذکورہ کتاب میں درج ہیں۔

مختلف اہم جگہوں پر احتساب کی عدالت قائم کی گئی، جیسے اٹلی، اسپین، پرتگال اور ان تمام اہم ملکوں میں جو ان کے زیر اقتدار تھے۔

احتساب کی یہ عمومی عدالتیں اور خاص کر روم اور اسپین کی عدالتیں انسانی تاریخ کا سب سے تاریک باب ہے، جن کے تحت لاکھوں لاکھ انسان لقمۂ اجل بنے۔

اسپین کے محکمۂ احتساب (Spanish inquisition) کے رکارڈ کے مطابق تین لاکھ اکتالیس ہزار سے زائد افراد موت کے گھاٹ اُتارے گئے اور لاکھوں مسلمانوں اور یہودیوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔(1)

اسپین میں احتساب کے قیام کا بنیادی مقصد اسلام کی پیش قدمی کو روکنا اور مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا تھا، اس میں دنیا بھر کے دُھتکاری ہوئی وہ یہودی بھی شامل تھے، جنھیں مسلمانوں نے اسپین میں پناہ دی تھی:

> In Spain, however, it remained operative into the nineteenth century, Originally called into being against secret Judaism and secret Islam.(2)

بہر حال اسپین کا احتساب انیسویں صدی تک جاری رہا، جو کہ درحقیقت خفیہ یہودیت اور خفیہ اسلام کے خلاف تھا۔

تفتیشی ادارہ کو فعال اور سرگرم بنانے کے لئے خود عوام میں ہی جاسوس تیار کئے گئے، اس طور پر کہ کلیسا کی جانب سے یہ اعلان کردیا گیا کہ جو شخص کسی ملحد یا مشکوک کی خبر دے گا اسے اس ملحد کی جائیداد کا ایک تہائی حصہ انعام میں دیا جائے گا، بسا اوقات اس میں اضافہ کر کے نصف حصہ تک دے دیا جاتا؛ جب کہ ایک تہائی کلیسا کو اور ایک تہائی علاقائی حکمراں کو دیا جاتا تھا اور ورثا پوری طرح محروم کردیئے جاتے تھے، اس اعلان کے ساتھ ہی حرص ولالچ کا

(1) Rationalist Encyclopaedia, P:318 (416)

(2) Catholic Encyclopedia, Inquisition http://www.newadvent.org/cathen/08026a.htm

بازار گرم ہوگیا، دوست، پڑوسی، رشتہ دار سب ایک دوسرے کی چغلی کرنے اور تہمتیں لگانے لگے، حکام کی جانب سے ترغیب وتشویق بھی کی جاتی اور اگر کوئی شخص کسی ملحد کی شناخت کے بعد یا شک وشبہ کے بعد اس کی خبر حکام تک نہیں پہنچا تا تھا تو خود وہ شخص ملعون وملحد قرار دے دیا جاتا تھا اور اس کے خلاف کارروائی ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ پورے مغربی معاشرہ میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا، ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا، جائیداد کی لالچ میں بے گناہوں ومعصوم لوگوں کو بھی مشکوک قرار دیا جانے لگا، حتیٰ کہ مردہ افراد کی جائیداد ہتھیانے کے لئے ان پر بھی بدعقیدگی کے الزامات لگائے گئے اور ان کی قبریں کھود کر ان پر مقدمے چلائے گئے اور سزائیں بھی دی گئی۔(1)

احتسابی محکمہ کی گرفت میں آجانے کے بعد مظلوم انسان سزا کے رسمی اعلان سے پہلے ہی تحقیق وتفتیش کے نام پر بدترین سزا واذیت کا شکار ہوجاتے تھے، انھیں اکٹھے سینکڑوں کی تعداد میں تنگ وتاریک قید خانوں میں ٹھونس دیا جاتا جہاں سخت غلاظت ہوتی اور کیڑے مکوڑے بھرے ہوتے تھے، پھر وہ مختلف اذیت اور مسلسل فاقہ کشی کا شکار ہوتے جب کہ گرفتار ہوتے ہی مشکوک افراد کی جائیداد اور مملوکات محکمۂ احتساب کے افسروں کی دستبرد کا شکار ہوجاتے۔(2)

احتساب کے افسروں اور کارندوں کو غیر معمولی اختیارات حاصل تھے، بغیر گواہ وثبوت کے بھی انھیں کسی کو بھی گرفتار کرنے اور کارروائی کرنے کا اختیار تھا؛ چنانچہ کسی کی گرفتاری کے بعد افسران کی پوری کوشش رہتی کہ ملزم ہر کردہ وناکردہ گناہ کا اعتراف کرلے، اس مقصد کے لئے ملزم کو بدترین ایذائیں دیتے :

Torture was used to extort confessions.(3)

اعتراف کروانے کے لئے ایذا کا استعمال کیا جاتا تھ۔

---

(1) The Inquisition by E.Vacandard, P:203

(2) History of The Inquisition of Spain by H.C.Lea, V.1, P:211

(3) The Shorter Cambridge Medieval History V.2, P:679

جب احتساب کی عدالت قائم ہوتی تو افسران کی پوری کوشش ہوتی کہ کوئی بھی ان کی گرفت سے آزاد نہ ہونے پائے؛ چنانچہ عدالت کی کارروائی کا آغاز ہی سختیوں اور اذیتوں سے ہوتا:

> Trial began with torture which included the use of iron boots, thumb screws and flogging.(1)

عدالت کی جانچ کا آغاز لوہے کے جوتوں، آہنی شکنجوں اور کوڑوں کے ذریعہ اذیت سے ہوتا۔

مظلوم افراد اپنی بے گناہی میں شاذ و نادر ہی کوئی گواہ پیش کرسکتا تھا؛ کیوں کہ گواہوں کو خود مشکوک قرار دیئے جانے کا خطرہ رہتا تھا اور احتساب کی عدالت میں صرف شک کی بنیاد پر ہی کارروائی کردی جاتی تھی، اس لئے کوئی ایسے مظلوم سے بات چیت بھی نہیں کرتا تھا۔(2)

بدعتی کے خلاف ہر کسی کی گواہی معتبر سمجھی جاتی تھی خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم، بدنام زمانہ، یا کلیسا کا سزا یافتہ ہی کیوں نہ ہو، گواہی کے بعد ملحد کی ذمہ داری تھی کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود کے خلاف گواہی دے، اسے کسی گواہ پر اعتراض کرنے یا کسی گواہ کی مخالفت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے مسئلہ میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کرسکتا تھا، ایسی صورت میں خونی رشتہ دار بھی اس کے خلاف گواہی دینے پر مجبور تھے؛ کیوں کہ جج کے فیصلہ کے خلاف کسی اپیل کی گنجائش نہیں تھی۔

تفتیش کے نتائج ایک بڑے مجمع میں پڑھ کر سنائے جاتے، اور پھر مجرم سے کہا جاتا کہ وہ سب کے سامنے توبہ کرے، اس کے بعد اس کے جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو سزا دی جاتی جو عام طور پر عمر قید ہوا کرتی تھی، اور توبہ نہ کرنے کی صورت میں وہ موت کا سزاوار ہوتا تھا، اس کے علاوہ دونوں سزاؤں میں جائیداد بھی ضبط کرلی جاتی تھی، سنگین الزامات کی صورت میں اگر کوئی شخص دوران تفتیش ہی مرجاتا تو قبر سے اس کی باقیات نکال کر اس کو جلایا جاتا تھا۔

---

(1) What history tells us?by Dr.Mubarak Ali P:52

(2) The Shorter Cambridge Medieval History V.2, P:679

اربابِ کلیسا کی نظر میں بدعت سنگین جرم تھا اور ایسے مجرموں کے خلاف سنگین کارروائی ضروری تھی؛ لیکن کلیسا کے نزدیک کسی کا خون بہانا خود کلیسا کے حق میں نامناسب تھا، اسی لئے حکومت پر بھی یہ دباؤ تھا کہ وہ بھی ایسی سزا نہ دے، جس میں خون بہتا ہو، اس لئے مشکوک افراد کو خون بہانے کے سوا سخت ترین سزا دی جاتی، کبھی ملزم کے ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر لٹکا دیا جاتا تھا، کبھی اس طرح باندھا جاتا تھا کہ حرکت کرنا بھی ممکن نہ ہو، پھر اس کے گلے میں مسلسل پانی ٹپکایا جاتا تھا جس سے اس کا دم گھٹ جاتا تھا، کبھی بازوؤں اور پنڈلیوں کو رسی سے اتنا مضبوط باندھا جاتا تھا کہ رسیاں گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں، جب پوپ گریگوری نہم (Gregory IX) کا دور آیا تو اس نے سزا کے احکامات میں مزید شدت پیدا کر دی اور کہ چوں کہ آگ میں جلانے سے خون نہیں بہتا اس لئے ایسے سنگین مجرموں کو کھمبے سے باندھ کر زندہ جلا دینا چاہئے (By Burning at the Stake) اس طرح ہزاروں افراد زندہ جلا دیئے گئے۔(1)

احتساب کے نام پر کلیسا کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونے والے انسانوں کی تعداد کا حقیقی علم تو رب کائنات کو ہی ہے، جو لوگ غلیظ، متعفن اور تنگ و تاریک کوٹھریوں میں مر کھپ گئے ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں راہم دلائل و شواہد یہ بتلاتے ہیں کہ تقریباً پچاس ملین لوگ اس احتساب کے نام پر ہلاک کئے گئے :

> It has been computed that fifty millions of Christians have at different times been the victims of the persecution of the papists, and put to death for their religious opinions.(2)

اعداد و شمار کے مطابق مختلف ادوار میں پچاس ملین افراد مسیحی پاپائیت کی ایذا رسانی کا شکار ہوئے اور اپنے مذہبی افکار و نظریات کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔

(1) The Age of Faith by Will Durant, P:783

(2) AHistory of the Church by H.C.Wickersham. P:233-234

1478ء کو پوپ کی طرف سے اسپین میں ''انکویزیشن'' کے قیام کا حکم نامہ صادر ہوا، اس کے پہلے سال کی کارروائی میں دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا گیا، کئی ہزار مردوں کو قبروں سے نکال کر جلایا گیا اور سترہ ہزار افراد کو جرمانہ یا حبس دوام کی سزا سنائی گئی۔(۱)

اسپین کے محکمۂ احتساب کے حکم سے اکیلے ''ٹورکی میڈا'' کی زیر صدارت تقریباً دو ہزار نفوس زندہ جلا دیئے گئے۔

about two thousandpersons burnt by the spanish Inquisition during the presidency of Torquemada alone.(2)

جنوبی فرانس میں ''ایل بی جینس (Albigenses) نام کا مسیحی فرقہ تھا،(3) وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصلیب اور دوبارہ زندہ ہونے کا منکر تھا، پوپ انوسینٹ سوم (Innocent III) نے اس کے خلاف فوجی کارروائی کی، بستیوں کی بستیاں تباہ کردی، بعض جگہ انھیں کیتھولک مسیحیوں نے پناہ دی تو ان سب کو یہ کہہ کر بے دریغ تہہ تیغ کردیا گیا کہ فی الحال ان سب کو قتل کردو، ان میں سے جو خدا کو صحیح طور پر ماننے والے ہیں، انھیں خدا خود ہی پہچان لے گا، اس تباہی میں ایک لاکھ سے زائد افراد قتل کئے گئے۔(4)

1572ء کا واقعہ ہے، فرانس میں سینٹ برتھولیمو (St. Bartholemew) کا دن منایا جارہا تھا، یہ لوگ رومی کلیسا کے ''باغی'' مانے جاتے تھے، رات میں صبح کے قریب تاریکی میں کلیسائی فوجوں نے حملہ کردیا، وہ گھروں کے اندر گھستے گئے اور قتل عام شروع ہوا، تقریباً سات سو (700) گھروں کو تاراج کردیا گیا، پانچ ہزار (5000) سے زائد شہری بے دردی سے قتل کئے گئے، پھر دوسرے علاقوں (Provinces) میں بھی موت کا یہ کھیل کھیلا گیا، جو تین دن تک چلتا رہا، جس میں تیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک لوگ جان سے مارے گئے، ایک شخص نے بادشاہ کے سامنے اپنا ''کارنامہ'' بیان کرتے ہوئے کہا :

---

(۱) معرکۂ مذہب وسائنس: ۲۵۵-۲۵۶۔

(2) P:165, V.1,Hitistory of European Morals

(3) The Ocford Dictionary of the Christian Church Albigenses

(4) A history of the inquistion of the Middle ages V.1, V.IV

One man boasted to the king that he had killed one hundred fifty in one night.(1)

ایک شخص نے بادشاہ کے سامنے ڈینگے مارتے ہوئے کہا کہ اس نے ایک ہی رات میں ایک سو پچاس لوگوں کو قتل کیا۔

یہ نہایت ہی ہولناک اور رُوح فرسا منظر تھا، جس میں غیر انسانی ظلم وتعدی کی انتہا یہ تھی کہ معصوم بچوں کو کھڑکیوں سے اچھال کر باہر دریا میں پھینک دیا گیا :

Babies were thrown out of windows and tossed into the river.(2)

کلیسا کے ان سنگین مظالم کی وجہ سے پورا یورپ ذہنی وفکری اضطراب اور شدید کڑھن میں مبتلا تھا اور محکمۂ احتساب کے متعلق انصاف پسند مورخ کو یہ لکھنا پڑا :

پس احتساب کو استحکام حاصل ہوا جو کہ اپنے وقت کا سب سے خطرناک ادارہ (موت کی فیکٹری) بن گیا، جس نے پوری قوم کو کرب والم میں اور پاپائیت کی غلامی میں مبتلا کر دیا تھا۔

Hence rose the inquisition, which in time became a most horrible tribunal-an engine of death; which kept nations in awe, and in subjection to the papal dominion.(3)

تشدد کے طریقے

ظلم وتشدد کے کلیسائی دور میں احتساب کے نام پر جس شقاوت وسنگ دلی کا مظاہرہ کیا گیا اس کے ذکر سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، مذہب کے نام پر جس درندگی اور حیوانیت کو

(1) History of the Church by H.C.Wickersham, P:216. & A History of the Christian Church by W. Walker, P:435

(2) Acriminal History of Mankind, P:230

(3) History of the Church by H.C.Wickersham, P:148

روا رکھا گیا گرچہ عقل وخرد آسانی سے اسے قبول نہیں کرتی ؛ لیکن تاریخی حقائق اور خود مسیحی مؤرخین کے دلائل اور اعترافات کے سامنے ساری دانشمندی بے حیثیت ہوجاتی ہے اور حقیقت کے اس کڑوے گھونٹ کو یہ کہہ کر پینا پڑتا ہے کہ کلیسا کا دورِ اقتدار پوری انسانیت کے چہرہ پر ایک بدنما دھبہ ہے اور ان مستشرقین اور مغربی مفکرین کے لئے ایک شفاف آئینہ ہے جنھیں دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تو نظر آتا ہے؛ لیکن اپنی آنکھ کا شہ تیر نظر نہیں آتا۔

محکمۂ احتساب نے غیر انسانی تشدد اور انسانیت سوز مظالم کے جو طریقے اختیار کئے ان کی ایک لمبی فہرست ہے، جس کا اندازہ ان چند نمونوں سے کیا جاسکتا ہے :

● ملزم کو سلگتے کوئلے پر کھڑا کردیا جاتا اور وہ دھیرے دھیرے سلگتا رہتا :

The feet of the accused might be slowly roasted over burning coals.

● تکونے شکنجہ میں جکڑ کر تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔

he might be bound upon a triangular frame.

● کئی کئی دنوں کے لئے بیڑیوں میں ایسے جکڑ دیا جاتا کہ ہلنا ڈلنا بھی ممکن ہوتا اور وہ بھی ٹھنڈی زمین پر اپنی ہی غلاظت میں پڑا رہتا۔

Some were so manacled that they had to sit in their own filth, and could only lie on their backs on the cold earth.

● بے دردی کے ساتھ اس طرح کھینچا جاتا کہ ہاتھ پیر کسی کام کے نہیں بچتے۔

Some men had been so drawn on the rack that they had losty the use of their arms and legs.(1)

---

(1) The age of Faigh by Will Durant, P:783-784

● تپتے ہوئے لوہے سے مردوں کے ہاتھ پیر اور عورتوں کی چھاتیوں کو داغا جاتا۔

In several places the soldiers applied red-hot irons to the hands and feet of men and the brests of women.

● زندہ انسان کو آگ میں جھونک دیا جاتا، پھر ادھ جلی حالت میں باہر نکال کر سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔

they snatched him from the fire just as he was on the poing of being burned.

● مرد وعورت کو پیروں اور بالوں سے باندھ کر چمنی میں لٹاکا دیا جاتا اور نیچے آگے جلادی جاتی؛ تاکہ وہ آگ میں میں تپ کر اوردھوئیں میں گھٹ کر تڑپ تڑپ کر مرجائے۔

they hung up men and women by the hair and some by their feet, on hooks in chimneys, and smoked them with wisps of wet hay till they were suffocated.

● تڑپ تڑپ کے مرنے کے لئے تیز آگ میں بھون دیا جاتا۔

they were bound before a great fire and being half-roasted.

● برہنہ کرکے کھلے عام سر سے پاؤں تک پورے جسم میں سوئیاں چبھوئی جاتیں۔

They stripped them naked and after a thousand indignities, stuck them with pins and needles from head to foot.

● مردوں اور عورتوں کے پیٹ میں دھونکنیوں سے اس قدر ہوا بھری جاتی کہ پیٹ پھول کر پھٹ جاتا۔

They blew up men and women with bellows till they burst them.

● بازوؤں کو رسیوں سے باندھ کر کنوئیں میں مسلسل ڈبکیاں دی جاتیں۔

They tied some under the arms with ropes and plunged them again and again into wells.

● کئی کئی دنوں تک کے لئے دُودھ پلانے والی ماؤں کو باندھ دیا جاتا، پھر ان کے سامنے ان کے شیر خوار بچوں کو چھوڑ دیا جاتا جو روتے بلکتے دم توڑ دیتے۔

They bound mothers, that gave suck to posts and let their sucking infants lie langushing in their sight for several days and nights, crying and gasping for life.

● جنگلوں اور میدانوں میں چھوڑ کر جنگلی جانور کی طرح شکار کیا جاتا۔

they pursued them ingo the fields and woods where they shot them like wild beasts.

● زنجیر میں باندھ کر ہلکی ودھیمی آنچ کے اوپر جھلایا جاتا حتیٰ کہ وہ بھن جاتا۔

he was suspended over a slow fire on a chain and allowed to swing back and forth as he roasted.(1)

● ملزم کو بستر سے کھینچ کر اس کے سر پر ہتھوڑے سے مارا جاتا۔

dragging suspects from their beds and hitting people on the head with a large club.

---

(1) History of the Church by H.C.Wickersham, P:224-225

● جنگلہ میں باندھ کر بازار تک گھسیٹ کر لایا جاتا، پھر گرم گرم لوہے کے ذریعہ اس کے ہاتھ پیر کو مروڑ کر توڑ دیا جاتا۔

He was dragged to the market place on a hurdle, and his hand and foot were twisted off with red hot pincers.

● منھ کو ایک قسم کی لگام کے ذریعہ اس طرح کس دیا جاتا کہ زبان باہر نکل آتی، پھر زبان کو کاٹ دیا جاتا اور منھ کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا۔

The method was to seal their mouths with a kind of iron gag that allowed the tongue to protrude, then the end of the tongue was sliced off and burned with a red hot iron.

● زمین پر لٹا کر کلہاڑی یا لوہے کی سلاخ سے اس کی کمر توڑ دی جاتی، پھر اسے تڑپتا ہوا مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔

People were made to lie on the ground and had their backs broken with a tremendous blow of an iron bar or axe, then they were left to die.(1)

● ظلم وتشدد کی یہ وارداتیں حقیقت پسند مسیحی مورخین سے پوشیدہ نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان حقائق کے مطالعہ کے بعد مشہور مورخ گبن(Gibbon) کو یہ کہنا ہی پڑا :

The church of Rome defended by violence, the empire which she and acpuired by fraud; a system of peace and benevolence was soon

(1) Acriminal History of Mankind, P:228

disgraced by proscriptions, war, massacres, and the institution of the holy office.(1)

● رومی کلیسا نے اپنی اُس سلطنت کی حفاظت ظلم وستم سے کی، جسے اس نے دھوکہ سے حاصل کیا تھا، جلاوطنی، جنگ وجدل، کشت وخون اور احتساب مقدس کی کارروائیوں سے امن وسکون اور اُلفت ویگانگی کا پورا نظام تباہ ہوگیا۔

یہودیوں پر مظالم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصلیب کے موقع پر رومی حاکم پیلاطس نے کہا تھا :

اس کی موت کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، تم ہی لوگ اس کے ذمہ دار ہو۔(۲)

اس کا جواب یہودیوں نے نہایت غرور کے ساتھ دیا :

اس کی موت کے ہم ہی ذمہ دار ہیں، اور اگر بطور سزا کچھ مقرر ہو تو اس کو ہم اور ہماری اولاد بھگت لیں گے۔(۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی یہودیوں کا ستم جاری رہا، انھوں نے مسیحیوں کو مٹانے اور انھیں تہہ تیغ کرنے کی ہر چند کوششیں کیں؛ لیکن وہ مٹ مٹ کر بھی زندہ رہے اور بڑھتے رہے، حتیٰ کہ مسیحیت تدوین اشاعت کے مرحلہ سے گذر کر اقتدار کی کرسی پر متمکن ہوگئی، تب مسیحیوں نے ظلم وستم کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے اور :

With the triumph of Christianity, the Children of Israel had to repay His suffering a millionfold.(4)

---

(1) The Decline and Fall of Roman Empire Vol.2, P:249.

(۲) متیٰ:۲۷/۲۴-۲۵۔

(۳) متیٰ:۲۷/۲۴-۲۵۔

(4) Uses of the Past, P:91

مسیحی کے غلبہ کے بعد بنی اسرائیل کو عیسیٰ کی تکالیف کا کئی لاکھ گنا بدلہ چکانا پڑا۔
یہودیوں پر ہوئے مظالم درحقیقت ان کے کرتوتوں کی سزا تھی، انبیاء کے استہزا و توہین اور ان کے قتل کی عادت نے ان کے اندر حد سے زیادہ غرور و گھمنڈ پیدا کر دیا تھا اور اسی گھمنڈ میں انھوں نے خم ٹھوک کر کہا تھا کہ عیسیٰ کا خون ہمارے اور ہماری اولاد کے سر ہے:

> It was a punishment of the Jews in answer to their challenge, "His blood be upon us and upon our children.(1)

> یہ سزا تھی یہودیوں کے اس فخریہ اعتراف کی کہ اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد کی گردنوں پر ہوگا۔

کلیسا نے اقتدار ملنے کے بعد معاشرہ کے ہر طبقہ کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا، تاہم جو کلیسا کے سامنے سرنگوں رہا اور اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے رہا کلیسا نے اس کے ساتھ احسان وکرم کا معاملہ بھی کیا؛ لیکن اس استثناء سے یہودی پوری طرح مستثنیٰ تھے، ان کے حق میں کلیسا کا رویہ کسی بھی صورت میں نرمی کا نہیں تھا، رومی شہنشاہوں نے جب کبھی یہودیوں کے ساتھ رعایت برتنی چاہی کلیسا نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور ان کے حق میں جاری ہوئے کسی بھی قانون کو باقی رہنے نہیں دیا؛ بلکہ وقفہ وقفہ سے اپنے فرمانبردار شہنشاہوں کے ذریعہ ایسے ایسے قوانین کا نفاذ بھی کروایا جن کے تحت یہودیوں کے لئے صرف سانس لینے کا اختیار حاصل رہا:

> It has already been seen that the Church held the Jew to be a being deprived, by the guilt of his ancestors, of all natural rights save that of existence.(2)

---

(1) A Short History of the Catholic Church by H.Wedewer, P:13

(2) History of The Catholic Ghurch by Spain by H.C. Lea, V.1, P:81

> کلیسا کے نزدیک ایک یہودی اپنے آباء اجداد کے گناہوں کی وجہ سے فقط زندہ رہنے کے حق کے علاوہ تمام دیگر قدرتی حقوق سے محروم تھا۔

مغربی معاشرہ میں یہودا چھوت کی طرح تھے، ان کا ایک خاص قسم کا لباس ہوتا تھا؛ تا کہ وہ الگ ہی نظر آئیں، عیسائی عورتوں سے میل ملاپ سنگین جرم تھا، مسیحیوں پر فرض عائد کیا گیا کہ وہ یہودیوں سے لین دین اور دوسرے معاملات روا نہ رکھیں اور یہودیوں کے لئے اس بات کی قطعی اجازت نہیں تھی کہ کسی مسیحی کو غلام رکھے۔

> چنانچہ بعض احکامات ایسے بھی جاری کئے گئے جن کی بنا پر یہودی آقاؤں کے مسیحی غلاموں کو آزادی حاصل ہوگئی۔
>
> Some measures were also taken, providing for the freedom of the Christian slaves of Jewish masters.(1)

890ء میں پوپ اسٹیفن ششم (Stephen VI) نے اس بات پر شدید تشویر اور سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ مسیحی ''خدا کے دشمنوں'' (Enemies of God) کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں، ان کے ساتھ معاملات کرتے ہیں اور انھیں اپنی زمینوں میں تصرف کا حق دیتے ہیں، پس کلیسا کی اس سوچ کے نتیجہ میں یہودیوں کو متعدد بار قتل عام اور ضبطی جائیداد کا نشانہ بننا پڑا اور وہ بار رہا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔(2)

ایک موقع پر پوپ گریگوری ہفتم نے مسیحی حکماء، امراء و حکام کو ملحدین و مشرکین کے ساتھ یہودیوں کے قتل پر یہ کہتے ہوئے اُکسایا :

> Cursed be he that refraineth his sword from blood.(3)

---

(1) History of European Morals, V.2, P:64

(2) History of Inquisiton of Spain by H.C. Lea, V.1, P:81

(3) Rationalist Encyclopaedia, P:270

جس نے بھی اپنی تلوار ان کے خون سے رنگین نہیں کی وہ لعنتی ہے۔

یہودیوں نے کلیسا کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے خودکشی کی راہ اختیار کی؛ چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں بے شمار یہودیوں نے خودکشی کی (A multitude Perished by their own hands)، 1340ء میں ایک موقع پر تقریباً پانچ سو یہودیوں نے اجتماعی طور پر خودکشی کر لی، 1095ء میں ہزار ہا یہودیوں نے کلیسائی عقوبتوں سے بچنے کی خاطر خودکو ہلاک کر ڈالا۔(1)

اسپین کی احتسابی عدالتوں نے سب سے زیادہ ظلم مسلمانوں اور یہودیوں پر ڈھائے تھے، یہودیوں سے ان کو سخت چڑھ تھی اور اس قدر حقارت ونفرت تھی کہ وہ اسپین کی سرزمین پر یہودیوں کے ناپاک وجود کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا :

Spain was too holy a land to be polluted with the presence of a Jew even in captivity.(2)

اسپین اس قدر مقدس ہے کہ اسے کسی یہودی کے وجود سے ناپاک نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ قید خانہ میں ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ: ۳۱ر مارچ ۱۴۹۹ء کو اسپین حکومت کی جانب سے ایک فرمان جاری کیا گیا، جس کے تحت یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ یا تو وہ عیسائی ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں، اس فرمان کے بعد اسپین سے ہجرت کر کے دنیا بھر میں بکھرنے والے یہودیوں کی مجموعی تعداد تقریباً چار لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے :

As computing the number of exiles at 420,000.(3)

جب اسی ہزار کے قریب سرحد عبور کر کے پرتگال چلے گئے اور پچاس ہزار یہودی ہجرت کر کے عثمانی سلطنت میں جا پہنچے :

---

(1) History of European Morals, V.2, P:50

(2) The Inquisition of Spain by H.C. Lea, V.1, P:142

(3) The Inquisition of Spain by H.C. Lea, V.1, P:142

Abut eighty thousand crossed the border into portugal, and fifty thousand took refuge in the Ottoman Empire.(1)

اس فرمان کے بعد اندلس میں یہودیوں کا عرصۂ حیات تنگ سے تنگ ہوگیا، بہت سے یہودی جو اندلس میں ہی بس گئے تھے، انھوں نے اس عذاب سے خود بچانے کے لئے مسیحیت کو گلے سے لگالیا، کلیساؤں میں حاضری دی، بپتسمہ لیا، کلیسائی رسم ورواج کو اختیار بھی کیا؛ لیکن اس کے باوجود حکومت کو ان سے اطمینان نہیں تھا، اور ہزارہا دعوائے مسیحیت کے باوجود احتساب کے خونیں پنجوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکے۔

کس قدر یہودی ہلاک کئے گئے، اس سلسلہ میں کوئی مستند دستاویز تو نہیں ہے تاہم مؤرخین کا اعتراف ہے کہ اس ابتدائی دور میں تقریباً تیرہ ہزار نو مسیحی یہودیوں کو زندہ جلادیا گیا۔

There is no reliable documentation of the actual numbers of people killed Historins once believed that about thirteen thousand conversos were burned during this early period.(2)

کلیسا کی جانب سے صلیبی جنگوں (Crusades) کا سلسلہ گرچہ مسلمانوں کے خلاف شروع کیا گیا تھا؛ لیکن ان جنگوں میں یہودیوں کو بھی خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا اور جہاں کہیں ممکن ہوسکا، انھیں نیست ونابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، مغربی مؤرخین کا اعتراف ہے کہ جب کبھی بھی مسیحی غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کو وحشت ناک ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

---

(1) History of Jews by Paul Johnson, P:229

(2) Fields of blood by karen Armstrong P:129

صلیبی جنگ کے پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں مسیحی عوام میں یہودی مخالف ذہنیت میں شدت پیدا ہوئی؛ کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہودی ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کے ذمہ دار (Responsible for Crueifixion) ہیں، اس لئے ہزاروں میل مسلم دشمن کو ختم کرنے سے پہلے قریب کے ان دشمنوں کا خاتمہ کرنا ضروری ہے :

> When, in 1095, Pope Urban H Proclaimed the First Crusade, Some Christians thought it desirable to kill the Jews of Europe before proceeding so far to fight Turks in Jerusalem.(1)

> 1095ء میں جب پوپ اربن دوم نے پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کیا تو کچھ مسیحیوں نے سوچا کہ یروشلم میں ترکوں سے جنگ کرنے سے پہلے یورپ کے ان یہودیوں کو قتل کرنا ہے زیادہ مناسب ہے جو یورپ میں آباد ہیں۔

چنانچہ صلیبی جنگوں کے دوران پہلے انگلینڈ و جرمنی میں یہودیوں کو نشانہ بنایا گیا، جتماعی طور پر ان کا قتل کیا گیا اور ان کی تجارت و معیشت کو پوری طرح تباہ کر دیا گیا، یہودیوں پہ مظالم کا اندازہ مشہور مورخ ''برٹرینڈ رسل'' (Bertrand Russell) کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے :

> There were large-scale murders of Jews in Germany at the time of the first Crusade, those who were not massacred were often despoiled of their property and forcibly baptized.(2)

---

(1) The Age of Faith, P:389

(2) A History of Western Philosophy, P:434

پہلی صلیبی جنگ کے دوران جرمنی میں یہودیوں کا وسیع پیمانہ پر قتل عام کیا گیا، جنھیں قتل نہیں کیا گیا ان کی جائیدادیں چھین لی گئیں اور انھیں زبردستی بپتسمہ دیا گیا۔

The Jews, before the Crusades, had almost a monopoly of the trade in Eastern goods through-out Europe; after the Crusades, as a result of the persecution of Jews, this trade was largely in Christian hands.(1)

صلیبی جنگوں سے پہلے تمام یورپ میں مشرقی اشیاء کی تجارت کی اجارہ داری یہودیوں کے تصرف میں تھی، صلیبی جنگوں کے بعد یہودیوں کو اذیتیں دینے کے نتیجہ میں یہ تجارت وسیع طور پر مسیحیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

بلاشبہ یروشلم کی گلیوں میں بہنے والے مسلم خون میں یہودیوں کی سرخی بھی شامل تھی، کلیسا کی صلیبی فوجوں نے یروشلم کو تہہ و بالا کر دیا اور وہاں پر موت کا ایسا ٹانڈو کیا کہ عورتیں اور بچے بھی محفوظ نہ رہ سکے، ان کی تلواروں نے ہر عمر اور ہر جنس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے، یہودیوں نے جب دیکھا کہ ان کے صلیبی دشمن ان کے بچوں اور عورتوں پر حملے کر رہے ہیں، کسی عمر کے بھی بچہ کو معاف نہیں کر رہے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر گرتے چلتے گئے اور بھائی، بہن، بیوی، بچے سب ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے :

and thus they perished at each other's hands.

اور اس سے بھی زیادہ ہولناک روح فرسا منظر یہ تھا کہ ماؤوں نے اپنے دودھ پیتے بچوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں ہلاک کیا، چھریوں سے ان کے گلے کاٹ دیئے، خنجر و نیزے گھونپ دیئے ؛ کیوں کہ ان کے نزدیک غیر مختون (غیر یہودی) کے ہاتھوں مرنے سے بہتر تھا کہ خود اپنے ہی ہاتھوں یا اپنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیں :

(1) A History of Western Philosophy, P:434

Horrible to say, mothers cut the throats of nursing children with knives and stabbed others, preferring them to perish thus by their own hands rather than to be killed by the weapons of the uncircumcised.(1)

تباہی و بربادی کے اس ماحول میں بہت سے یہودیوں نے جان کی حفاظت کے لئے اپنی مرکزی عبادت گاہ میں پناہ بھی لی لیکن :

No mercy was shown to them, the building was set on fire and they were all burnt within.(2)

ان پر کوئی رحم نہیں کیا گیا، عمارت کو آگ لگا دی گئی اور وہ سب کے سب اسی میں زندہ جل کر مر گئے۔

یہودیوں کے اجڑنے کے بعد دوبارہ بسنے اور آباد ہونے کی مکمل تاریخ مسلم حکومتوں ا م رہون منت ہے، رومی شہنشاہوں نے انھیں ملک بدر کیا تو وہ مسلم اندلس میں ہی پناہ گزیں ے ، مسیحیوں نے اندلس میں زمین تنگ کر دی تو عثمانی حکومت نے ان کی اشک شوئی کی ا ں پناہ دی، صلیبی جنگوں میں بھی ان کے لئے مضبوط پشت پناہ مسلمان ہی تھے۔

لیکن ان تمام تر رواداریوں کے باوجود یہودیوں کی احسان فراموشی دیکھئے کہ انھوں نے مسلم حکومتوں میں رہ کر انھیں کے خلاف نہ صرف سازشیں رچیں ؛ بلکہ ان کی تباہی و نسل کشی کی کوششیں بھی کیں، جس کی ایک زندہ مثال ارض فلسطین ہے!

زندوں اور مُردوں کے ساتھ عیسائی مذہبی رہنماؤں کی شقاوت(٣)

اربابِ کلیسا کی اخلاقی صورت حال دیکھ کر ان کی روحانیت اور مذہبیت کا اندازہ بخوبی

(1) http://www.fordham.edu/halsall/source/1096jews.html.

(2) A History of the Crusades by Steven Runciman, V.1, P:287

(٣) ماخود کتاب مذکور، بہ عنوان: کلیسا کی اخلاقی صورت حال۔

لگایا جاسکتا ہے، یہ وہ مسیحی علماء ہیں جو خدا و آخرت کے خوف سے بالکل آزاد ہیں، عام دنیادار اور بے خوف حکمرانوں کی طرح ان کی زندگیاں عیش وطرب میں غرق ہیں اور مال و دولت کی ہوس میں وہ بھی اخلاقی قدروں کو پھلانگ چکے ہیں، اور تعجب خیز یہ کہ عام بھولے بھالے انسانوں کے ساتھ انھوں نے اپنی جماعت کے کمزوروں کو بھی نہیں بخشا، منصب واقتدار کے حصول میں بڑی بے دردی کے ساتھ زندگیوں کو تباہ و برباد کیا گیا، جسے موقع ملا اس نے طاقت کا استعمال کیا اور شدت کے ساتھ اپنے مخالف کو راستہ سے ہٹا دیا؛ چنانچہ کئی پوپ ایسے بھی گذرے ہیں جو قتل وخونریزی کے بعد ہی اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور بارہا کلیساؤں کے فرش پر لاشوں کے ڈھیر بھی لگے ہیں اور پاپائیت کے کامیاب اُمیدوار نے اپنے مخالف اور اس کے حامیوں کے ساتھ ہر قسم کی غیر شریفانہ زیادتیاں روا رکھیں، کلیسائی تاریخ کے ایک مستند مورخ ''مل مین'' (Dean Milman) کے الفاظ ہیں :

The Papacy was won by crime and vacated by murder tme after time.(1)

پاپائیت کا منصب متعدد بار جرم کے ذریعہ حاصل کیا گیا اور قتل کے ذریعہ خالی کیا گیا۔

پوپ جان چہاردہم (John XIV) بادشاہ اوٹو دوم (Otto II) کے رحم کرم پر تھا، بادشاہ اس کا حامی اور مضبوط پشت پناہ تھا، جب بادشاہ کا انتقال ہوا تو پوپ بے سہارا ہو گیا، اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف سخت کارروائی کی، اسے پاپائیت کے منصب سے ہٹا کر بونی فیس ہفتم کا پوپ بنا دیا اور اسے قید میں ڈال دیا گیا، جہاں وہ بھوک کی شدت میں تڑپتا رہا اور پھر شدت بھوک یا زہر خورانی کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہوئی :

He died from either hunger of poison.(2)

---

(1) History of Latin Christianity by Dean Milman.

(2) The catholoie Encyclopaediav.7 P:1012

اس سے قبل جان سیزدہم (John XIII) کو شاہ اوٹو اول (Otto I) کی عنایتیں ونوازشیں حاصل تھیں، اسی کی حمایت سے پوپ جان نے پاپائیت کا منصب حاصل کیا تھا، بعض سیاسی اسباب اور بداخلاقی کی بنا پر جان کے خلاف بغاوت ہوئی، مخالفین نے اسے قید کرلیا اور روم سے باہر کردیا؛ لیکن شاہ وقت کی حمایت اور اس کی مدد سے جان نے پھر سے اپنا مقام ومنصب حاصل کرلیا اور ایک بار پھر وہ اقتدار پر قابض ہوا، اس کے بعد اس نے اپنے مخالفین کے خلاف سخت کارروائی کی، مخالفین کا ایک سرغنہ شہر کا حاکم تھا جو مرچکا تھا، جن نے اس کی قبر کھدوائی، اس کی لاش کو باہر نکلوایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروادیئے، اس کے علاوہ حاکم کا جو جانشین زندہ تھا اسے اس کے بالوں کے بل لٹکایا گیا اور پھر اُتار کر بالکل عریاں کیا گیا اور گدھے پر سوار کرکے پورا شہر گھمایا گیا۔(1)

مردہ دشمن کے ساتھ سنگ دلی اور شقاوت کی یہ کوئی انوکھی مثال نہ تھی، کلیسا کی تاریخ میں اس طرح کی متعدد دلخراش مثالیں موجود ہیں، پوپ اسٹیفن ششم (Stephen VI) نے مذکورہ شقاوت سے زیادہ سنگ دلی کا معاملہ کیا، پوپ فارموسس (Formosus) اس کا ایک پیٹرو تھا، اسے جرمن امراء کی حمایتی حاصل تھی، انھیں کی مدد سے وہ پاپائیت کے منصب پر فائز ہوکر برسر اقتدار رہا تھا، اسٹیفن کا تعلق اطالوی طبقہ سے تھا جو جرمن مخالف تھا، فارموسس کے بعد اطالویوں کی مدد سے اسٹیفن پوپ بنا، پوپ بننے کے بعد اس کے حکم پر فارموسس کی قبر کھودی گئی اور اس کی سڑی گلی لاش (Putrid Body) کو باہر نکالا گیا، اس لاش کو پاپائیت کے تخت (Pontifical Throne) پر بٹھایا گیا اور اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، اس کے بعد سزا کے طور پر اس لاش کی قطع وبرید کی گئی، پھر ہجوم کے حوالہ کردیا گیا کہ اسے گلیوں اور سڑکوں پر کھینچتے ہوئے دریا میں پھینک دیا جائے۔(2)

---

(1) Rationalist Encyclopaedia, P:338

(2) The Popes and Their Church, P:32

پوپ اسٹیفن سوم (Stephen III) کے پاپائیت کے منصب پر فائز ہونے سے قبل امراء اور پادریوں کی ایک جماعت نے قسطنطین (Constantine) نامی ایک بشپ کو اپنا پوپ (Anti-Pope) تسلیم کرلیا تھا، پوپ اسٹیفن نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد قسطنطین کے خلاف سخت کارروائی کی، پہلے اسے عورتوں کا لباس پہنایا گیا، پھر اس کے پاؤں میں بھاری بوجھ باندھا گیا اس کے بعد اسے گھوڑے پر بٹھا کر شہر بھر میں گھمایا گیا اور پھر قید خانہ میں ڈال دیا گیا، قید خانہ میں اسٹیفن کے دوسر کردہ حامی کرسٹوفر (Christopher) اور اس کے بیٹے سرجیس (Sergius) نے قسطنطین کی آنکھیں نکال دیں، شدت کرب و درد کی اسی حالت میں اسے پوپ کے محل میں پادریوں کی ایک مجلس (Synod) کے سامنے پیش کیا گیا، وہاں پادریوں نے اسے مار مار کر باہر پھینک دیا :

> The infuriated priests thrashed the wretch with their own hands, and "threw him out".(1)

اس کے بعد اس بیچارہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس کی تفصیلات تذکرہ نگاروں نے قارئین کے تصور پر چھوڑ دیں۔

اس کارروائی میں پوپ اسٹیفن کے سرگرم حامی کرسٹوفر اور اس کے بیٹے سرجیس کا بنیادی کردار تھا، جس کے بعد سے کلیسائی نظام میں ان کا رُسوخ بڑھنے لگا اور دھیرے دھیرے وہ پوپ پر بھی حاوی ہونے لگے، اس لئے پوپ نے ان کے حلاف سازشیں شروع کردیں، انھیں پتہ چلا تو انھوں نے بھی جوابی سازشوں کا سلسلہ چلایا جس پر پوپ کو ان کے خلاف کھل کر اقدام کرنے کا موقع مل گیا، اس نے ان کے خلاف سخت فیصلہ لیا اور سزا کے طور پر دونوں کی آنکھیں نکلوادیں، کرسٹوفر کی آنکھیں نکالتے ہوئے اس پر اتنا تشدد ہوا کہ وہ تاب نہ لا سکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا :

> Christopher was mutilated so brutally that he died.(2)

---

(1) The Popes and Their Church, P:25. (2) The Popes and Their Church, P:26

پوپ گریگوری پنجم کو "اچھے اور نیک" پاپاؤں میں شمار کیا جاتا ہے؛ لیکن اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی اور اسے روم سے جلاوطن کردیا گیا، اس کے بعد رومیوں کی ایک جماعت نے جان شانزدہم (John XVI) کو پوپ (Anti-Pope) بنالیا؛ لیکن گریگوری نے شاہی فوج کی مدد سے جلد ہی بغاوت پر قابو پالیا، اس کے بعد پوپ جان کا حشر کچھ اس طرح ہوا کہ اس کی آنکھیں نکال لی گئیں، ناک، کان اور زبان کاٹ دیئے گئے، اسے گدھے پر بیٹھا کر اس کا منھ گدھے کی پش کی طرف کیا گیا اور پھر پورے شہر میں اسے گھمایا گیا :

> John XVI, that unhappy intruder lost his eyes,his nose, his ears, and his tongue, and was driven through Rome with his face to his ass's tail.(1)

پوپ اربن ششم (Urban VI) اور پوپ کلیمنٹ ہفتم (Clement VII) کے درمیان سخت کشمکش تھی، دونوں کے پاس فوجی طاقت تھی، ان کے مابین اس طرح خونیں جنگیں ہوئیں جس طرح خدا اور آخرت سے بے نیاز دو ظالم وسفاک بادشاہوں کے درمیان ہوتی ہیں، ان جنگوں میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، ان کے اعضاء کاٹے گئے، لوٹ مار کی گئی اور مظلوم عورتوں کی عصمتوں کو بے دردی سے تار تار کیا گیا :

> Both Popes had armies, and they raped, stole and murdered and mutilated civilians without restraint.(2)

دونوں پوپ کے پاس فوجیں تھیں، انھوں نے زنا کاری کی، چوری کی اور قتل کیا، اور بغیر کسی روک ٹوک کے شہریوں پر ستم ڈھائے۔

---

(1) The Popes and Their Church, P:37

(2) The Popes and Their Church, P:62

اگر یہ مثالیں دنیادار بادشاہوں کی ہوتیں تو معاملہ بالکل مختلف تھا، مگر یہ ساری رسہ کشی، اعلیٰ سطح پر فریب و جعل سازی اور رشوت ستانی اس عہدہ کے لئے ہیں جس کے بارے میں دعویٰ ہے کہ اس انتخاب میں ''رُوح القدس کا نور'' رہنمائی کرتا ہے! اور اس منصب کا حامل خدا اور انسانوں کے درمیان ایک نمائندہ ہوتا ہے!!

گذشتہ صفحات میں اربابِ کلیسا کے انھیں اخلاقی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے جو بالکل نمایاں اور طشت از بام تھے، ورنہ اخلاقیات کے باب میں کوئی ایسی بداخلاقی نہیں تھی جس میں وہ ملوث نہ تھے، جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی، بے ایمانی، چالاکی، بددیانتی وغیرہ ساری خرابیاں ان میں موجود تھیں اور اس کی بے شمار مثالیں خود مسیحی مؤرخین نے بھی بیان کی ہیں، کلیسا کی انھیں بداخلاقیوں کی وجہ سے کلیسا کے دورِ اقتدار کو ''تاریک دور'' (Mencken) کا تبصرہ ملاحظہ ہو :

> The great days of the Universsal Church were days of unparalleled crime and disorder, injustice and oppression, outrage and atrocity.(1)
>
> عالمی کلیسا کے اقتدار کا زمانہ درحقیقت بے مثال جرائم، بدنظمی، ظلم وتعدی، فسادات اور بدکاریوں کا زمانہ تھا۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اربابِ کلیسا میں بعض پادری واقعی نیک طینت و نیک فطرت تھے اور کلیسا کی اصلاح بھی چاہتے تھے؛ لیکن وہ اس اکثریت کے درمیان دبے کچلے ہوئے تھے جو دنیادار اور عیش پسند تھے اور جو جاہ و منصب کے حصول میں کسی بھی اخلاقی حد کو پھلانگ سکتے تھے، خود عیسائی مؤرخ پاسٹر (Dr. Ludwig Pastor) نے اس کی وضاحت کی ہے :

---

(1) Treatise on Right and Wrong by Mencken, P:105

But they were borne down by the wordly majority.(1)

مگر وہ دنیا پرستوں کی اکثریت میں دبے ہوئے تھے۔

ارباب کلیسا کا یہ اخلاقی بیان دراصل آئینہ ہے، ان متعصب نقادوں کے لئے جو اسلام کی شفاف و پاکیزہ تعلیمات کو پراگندہ کر کے پیش کرتے ہیں اور حقیقت میں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی خاطر اسلام کے روشن چہرہ کو داغدار کرتے ہیں۔



(1) The History of the popes, V.5, P:362

مالِ غنیمت سے متعلق قانونِ شریعت پر اعتراض

مفتوح قوم کا مال جو فاتح گروہ کے قبضہ میں آجاتا ہے، اس کو ''مالِ غنیمت'' کہا جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے دو قوموں کے درمیان جنگ ہوگئی اور اس میں ایک قوم نے فتح حاصل کرلی تو مفتوح قوم کی دولت کے بارے میں فاتح کے لئے کیا حکم ہے؟— تو اگر ان دو قوموں کے درمیان پہلے سے اس سلسلہ میں کوئی معاہدہ موجود ہو تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس معاہدہ پر عمل کرنا واجب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''واوفوا بالعقود'' (المائدۃ:۱) باہمی معاہدات کی پاسداری کرو، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب بین الاقوامی سطح پر جنگ کا قانون مرتب کیا گیا ہو اور اس پر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے ہوں، وہ سب ممالک اس زمرہ میں شامل سمجھے جائیں گے اور ان کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

اسلام جس دور میں آیا اس وقت اس سلسلہ میں کوئی بین قومی معاہدہ نہیں تھا، خاص کر جنگی حالات سے متعلق، فاتح قوم جہاں مفتوح قوم کو جانی و مالی نقصان پہنچاتی تھی، ان کی عزت وآبرو سے کھیلتی تھی، وہیں مال و دولت بھی لوٹ لیتی تھی، اسلام نے اس کے لئے قواعد وضوابط مقرر کئے، افسوس کہ جن لوگوں کی غارت گری نے پوری دنیا کو تنگ کر رکھا ہے اور جو زیادہ تر دوسروں کے معاشی وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ کرتے ہیں، وہ ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور ان آیات کو نشانہ بناتے ہیں، جن میں مالِ غنیمت کا ذکر آیا ہے، خاص طور پر ان دو آیتوں کو :

(۱) فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ـ (الانفال:۶۹)

جو مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اسے پاکیزہ اور حلال سمجھ کر کھاؤ

اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ معاف کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

(۲) وَ عَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيْماً ۔ (الفتح:۲۰)

اللہ نے تم سے بہت سارے مالِ غنیمت کا وعدہ کیا ہے، جسے تم پاؤ گے فوری طور پر تو فتح اس نے تمہیں عطا کردی ہے اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اُٹھنے سے روک دیئے ہیں؛ تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

دونوں آیتوں میں مالِ غنیمت کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ فرقہ پرست عناصر 'لوٹ کے مال' سے کیا کرتے ہیں اور یہ تصور دیتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کا جو بھی مال لوٹ لیں، وہ ان کے لئے جائز اور حلال ہے، مگر یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے، یہ آیات ہر غیر مسلم سے متعلق نہیں ہیں؛ بلکہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں، کہ اگر مسلمان ان پر فتح پائیں اور جنگجو حضرات قید کرلئے جائیں، تو ان کے مال کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں اُصول بیان کیا گیا کہ وہ مالِ غنیمت ہوگا، عربی زبان میں مشقت کے بغیر کسی چیز کے حاصل ہونے کو ''غنم'' (''غ'' پر پیش یا زبر) کہتے ہیں، (القاموس المحیط: ۱۴۷۶) چوں کہ جنگ کے حاصل ہونے والے مال میں تجارت یا زراعت کی مشقت نہیں اُٹھائی جاتی، اس لئے اس کو ''مالِ غنیمت'' کہتے ہیں، غنیمت کا ترجمہ ''لوٹ کے مال'' سے قطعاً درست نہیں، لوٹ تو ایک غیر قانونی طریقہ ہے، اسلام میں یہ حکم ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں سے برسر جنگ ہو اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو تو جہاں تک ممکن ہو باغات اور کھیتیوں کو تاخت و تاراج نہ کیا جائے، مکانات منہدم نہ کئے جائیں، اپنے طور پر شکست خوردہ لوگوں کا مال لے کر استعمال نہیں کیا جائے،

غزوۂ خیبر کے موقع سے فوجیوں نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ذبح کر کے پکانے لگے، (۱) رسول اللہ ﷺ نے اس پر بہت خفگی ظاہر فرمائی اور دیگیں الٹوادیں۔

مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ مفتوحین کے مال حکومت کے پاس جمع کئے جائیں، اس میں سے پانچواں حصہ حکومت کے خزانہ میں محفوظ کردیا جائے اور اسے رعایا کی بھلائی کے لئے خرچ کیا جائے، یہ رقم مسلمان رعایا پر بھی خرچ ہوگی اور غیر مسلم رعایا پر بھی، اس زمانہ میں فوجیوں کے لئے الگ ''تنخواہ'' نہیں ہوا کرتی تھی؛ اس لئے جنگ میں حاصل ہونے والے مال کے بقیہ چار حصے ان میں تقسیم کردیئے جاتے تھے، بعض صورتوں میں حکومت اپنے اختیارِ تمیزی اور عوامی مصلحت کو سامنے رکھ کر کسی مال کو روک کر بیت المال کا حصہ بھی بنا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے عراق کی مفتوحہ اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی؛ بلکہ بیت المال کی ملکیت میں باقی رکھا، بہر حال تقسیم کے بعد جو مال جس کے حصہ میں پڑے گا، وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مالِ غنیمت ہر غیر مسلم کے مال کو نہیں کہیں گے؛ بلکہ دشمن ملک کے حاصل شدہ مال کو مالِ غنیمت کہا جائے گا، اور ایسا بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ میں جو آئے، وہ اس پر قابض ہو جائے؛ بلکہ یہ سارا مال حکومت کے حوالہ کیا جائے گا پھر حکومت تقسیم کرے گی، قانونی طریقہ پر ہی کوئی شخص اس مال کا مالک ہوسکتا ہے۔

اب اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مالِ غنیمت کا تصور دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین اور مذاہب میں رہا ہے، اسلام سے پہلے عرب کے قریب ایرانیوں اور رومیوں کی حکومت تھی، ایرانیوں کے یہاں بھی یہی اُصول تھا کہ وہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کرلیتے تھے، رومی تورات کے قانون کو مانتے تھے، یہودی بھی اسی قانون پر عقیدہ رکھتے ہیں، اب دیکھئے کہ بائبل میں مالِ غنیمت کے بارے میں کیا کہا گیا ہے :

> اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردیوے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۱۳۷۴۔

اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی ساری لوٹ اپنے لئے
لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی
ہے، کھائیو۔ (استثناء: ۲۰: ۱۲-۱۴)

توریت میں جا بجا مفتوحین کو لوٹنے کا ذکر ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی؛ لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر ''گنتی'' اور ''استثناء'' نامی صحائف کو پڑھا جاسکتا ہے۔

اب خود ہمارے ہندو بھائی ایک نظر اپنی مذہبی کتابوں پر ڈال لیں، رگ وید میں ہے :

اے اگنی ! تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امراء
بڑی عمریں پائیں ، ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت
حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں ، اے اگنی ! ہم
تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی
اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔ (۱: ۷۴: ۵، ۹)

یجر وید میں ہے :

یہ اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام و آسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو
ہمارے آگے مارتے بھگائے چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی
جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے ، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو
زیر کرے۔ (۸: ۴۴)

سام وید میں ہے :

اے چابک دست بہادرو ! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک
ہو کر ہزار دو ہزار مالِ غنیمت لوٹ ، اے سرگرم کار مگھون ! پرشوق
دُعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال اور گایوں کے ایک بڑے
گلے کی تمنا کرتے ہیں۔ (۲: ۲: ۱۲: ۳)

اتھر وید میں کہا گیا ہے :

دشمن خالی ہاتھ ہو جائے، ہم ان کے اعضاء کو مفلوج کر دیں اور اس طرح اے ذوالجلال سپہ سالار اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں سینکڑوں کی طرح سے بانٹ لیں۔ (۳:۶۶:۶)

پنڈت کشیم کرن داس ترویدی جی نے اس اشلوک کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

فاتح بہادر دشمنوں کو فتح کر کے سپہ سالار کی ہدایت کے مطابق حکومت کا حصہ نکال کر ان کے مال دولت کو تقسیم کر لیں۔ (۱)

اتھر وید میں ایک اور اشلوک اس طرح ہے :

اے سپہ سالار! اپنے بہادروں میں طاقتور شخص کو زرہ پہنا دے اور دشمنوں میں ہرن کی طرح بزدلی پیدا کر دے، دشمن الٹے منہ چلا جائے، زمین ہماری طرف آجائے۔ (۳:۶۷:۶)

''منوسمرتی'' ہندو مذہب میں قانون کی کتاب کے درجہ میں ہے اور اسی قانون پر ہندو سماج کی اور نظامِ حکومت کی اساس ہے، منو جی فرماتے ہیں :

رتھ، گھوڑے، ہاتھی، چھتر، مال و دولت، جانور، عورت، گڑ، نمک، مادی چیزیں، تانبا، پیتل وغیرہ چیزیں ان میں جس چیز کو جو جیت کر لاتا ہے، وہ اسی کا ہوتا ہے۔ (منوسمرتی: ۷:۹۵، ۹۶)

آج بھی جب کوئی ملک دوسرے ملک پر فتحیاب ہوتا ہے تو مفتوحہ علاقوں میں جو چیز فاتحین کو ہاتھ آتی ہے، وہ اسے اپنی صوابدید سے تقسیم کرتے یا استعمال کرتے ہیں، ہندوستان میں تو دشمنوں کی جائیداد پر قبضہ کا بھی قانون موجود ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص بھارت سے پاکستان چلا گیا تو اس کی جائیداد اس کے رشتہ داروں کو نہیں ملے گی؛ بلکہ حکومت کے قبضہ میں چلی جائے گی؛ لیکن اسلام میں یہ ضروری نہیں کہ لامحالہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کر ہی لیا جائے،

(۱) قرآن مجید پر اعتراضات: ۱۷ بحوالہ ہندی ترجمہ: کشیم کرن داس۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلم حکومت ان چیزوں کو مفتوحین کی ملکیت میں رہنے دے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ فتح مکہ اور فتح طائف کے موقع پر اور یہودیوں کے ساتھ غزوۂ خیبر کے موقع پر کیا تھا۔

بہر حال، یہ تو عہد قدیم کی داستانیں ہیں؛ لیکن موجودہ دور کی عالمی طاقتوں اور ترقی یافتہ قوموں نے دولت لوٹنے کے لئے خون کے دریا بہا دیئے، پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم کا صفایا کر دیا، برطانیہ نے ہندوستان پر کیوں قبضہ کیا؟ اس لئے کہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ ملک سونے کی چڑیا ہے، روس نے افغانستان پر کیوں قبضہ کیا؟ وہاں کی معدنیات پر قبضہ جمانے کے لئے، امریکہ نے ملک کے اصل باشندے ریڈ انڈینز کی نسل کشی کیوں کی؟ اس لئے کہ وہاں کے وسائل پر قبضہ کر لیا جائے، یہ بے چارے ریڈ انڈینز امریکہ کے ایک علاقہ کیلاہون ریاست ٹینیسی میں بسائے گئے تھے، جب معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں سونے کی کانیں ہیں تو ان کو اس محروم کرنے کی غرض سے ۲۶؍ مئی ۱۸۳۰ء کو امریکن کانگریس کے صدر اینڈریو جیکسن کے دباؤ میں نقل مکانی ایکٹ بنا؛ تاکہ ریڈ انڈینز کو اس سونا اُگلتی زمین سے محروم کر دیا جائے اور سفید فام لوگوں کے قبضہ میں آجائے؛ چنانچہ مئی ۱۸۳۸ء میں امریکی صدر وان بیورن نے اس قانون کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا اور ریڈ انڈینز کے قبیلہ چیروکیز کو نہایت بے دردی، بے رحمی اور سفاکیت کے ساتھ سنگینوں کی نوک پر ہنکاتے ہوئے ایک ہزار میل کا سفر کرا کے اوکلوہاما پہنچایا، بے شمار لوگ راستے میں پیدل چلنے کی تکلیف سے بھوک اور برف کی ٹھنڈک سے مر گئے، یہاں تک کہ ۶؍ جون ۱۸۳۸ء کو نکلنے والا مظلوموں کا یہ قافلہ ۲۶؍ مارچ ۱۸۳۹ء کو اپنی منزل پر پہنچ سکا، اس کا نام ہی ''آنسوؤں کی شاہراہ'' بن گیا اور ریڈ انڈین شعراء و ادباء نے اس عنوان سے بڑا حزن انگیز ادب تخلیق کیا۔

ماضیٔ قریب میں امریکہ نے عراق پر جو حملہ کیا، اس کا مقصد تیل کے کنوؤں سے پٹرول غصب کرنے کے علاوہ اور کیا تھا؟ تو پہلے تو جنگوں میں محدود پیمانے پر فاتحین کو مفتوحین کا کچھ مال ہاتھ آجاتا تھا؛ لیکن آج کی دنیا میں تو پورے پورے ملک کو اپنی حرص و لالچ کا شکار بنایا جاتا ہے اور کسی جواز کے بغیر انھیں نشانہ بنا کر حملہ کیا جاتا ہے۔

جزیہ، اسلامی نقطۂ نظر ☆

''جزیہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے، جو اصل میں ''گزیہ'' تھا، (۱) اس کا رواج ایران میں تو تھا ہی، رعایا بادشاہ کو اسی نام سے ٹیکس ادا کیا کرتی تھی، بائبل میں بھی غیر اسرائیلیوں سے خصوصی ٹیکس وصول کرنے کا ذکر موجود ہے، تاہم اسلام سے پہلے مذہبی اقلیتوں کے لئے حقوق کا باضابطہ کوئی قانون موجود نہیں تھا، یہ بادشاہ کے مزاج پر موقوف ہوتا تھا، اگر وہ شریف اور منصف مزاج ہوتا تو اس کا سلوک بہتر ہوتا، اور اگر اس کا مزاج ظلم و جور اور زیادتی کا ہوتا تو تمام رعایا اور اقلیتیں خاص کر اس کے جور و جفا کا ہدف بنتی تھیں، شریعت اسلامی نے باضابطہ طور پر مذہبی اقلیت کے حقوق مقرر کئے اور اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کی نشان دہی کی۔

غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ تین طرح کے معاملات کی گنجائش باقی رکھی گئی: ایک یہ کہ ان پر کوئی ٹیکس عائد نہ ہو؛ چنانچہ فقہاء نے ایسی صلح کی اجازت دی ہے، جس میں غیر مسلموں سے کوئی پیسے وصول نہ کئے جائیں، (۲) اس کی نظیر وہ صلح ہے، جو مسلمانوں کی یہودیوں کے ساتھ مدنی زندگی کی ابتداء میں ہوئی تھی؛ بلکہ بعض مشرکین بھی اس میں شامل تھے، جس کے مطابق تمام مذاہب کے ماننے والوں کو پُرامن طریقہ پر ایک ساتھ رہنے کی تلقین کی گئی تھی، کسی پر کوئی خصوصی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی خاص رقم طئے ہو جائے کہ وہ اقلیت حکومت کو بطور ٹیکس ادا کیا کرے گی، اس رقم کی مقدار فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے صلح فرمائی تھی:

☆ یہ مضمون علامہ شبلی نعمانیؒ کا ہے، جو کسی قدر اختصار اور تلخیص کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔

(۱) دیکھئے: مفاتیح العلوم: ۳۹، روح المعانی: ۱۰/۷۸۔ (۲) دیکھئے: السیر الکبیر: ۴/۱۶۔

جزية توضع بالتراضي وهو الصلح ، وذلک يتقدر بقدر ما وضع عليه الصلح كما صالح رسول الله صلى الله عليه وسلم أهل نجران ۔ (١)

جزیہ کی ایک شکل یہ ہے کہ جو باہمی رضامندی سے مقرر کیا جاتا ہے اس کو صلح کہتے ہیں اور اس کی تعداد وہی ہوگی جو صلح میں طے پائی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے صلح کی تھی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی علاقہ جنگ کے ذریعہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا ہو اور جزیہ کے سلسلہ میں کسی خاص مقدار پر باہمی معاہدہ نہیں ہوا، اس صورت میں لوگوں کی مالی حیثیت کے لحاظ سے ایک خصوصی ٹیکس غیر مسلموں پر عائد ہوتا ہے :

وجزية يضعها الإمام من غير رضاهم ، وذلک على ثلاثة مراتب ۔ (٢)

جزیہ کی ایک صورت وہ ہے جس کو ان کی رضامندی کے بغیر امام مقرر کرتا ہے اور (رعایا کی مالی حیثیت کے اعتبار سے) اس کے تین درجے ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر غیر مسلموں سے پہلے سے جزیہ ٹیکس لینے کا معاہدہ نہ ہو، تو ان سے ٹیکس کا مطالبہ کرنا درست نہیں، دوسرے اس ٹیکس کی تعیین میں دوسرے فریق کی رضامندی اور رائے کو بھی دخل ہوتا ہے؛ البتہ بعض حالات میں خاص کر جب کوئی علاقہ بذریعہ جنگ حاصل کیا جائے تو مسلمان حکومت یک طرفہ ٹیکس عائد کرسکتی ہے؛ لیکن اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔

اس مقدار کی تفصیل یہ ہے کہ جو مالدار اور مرفہ الحال لوگ ہیں، ان پر ۴۸ درہم سالانہ، جو متوسط آمدنی کے ہوں، ان پر ۲۴ درہم سالانہ اور جو غریب یا مزدور ہوں ان پر ۱۲ درہم

(١) بدائع الصنائع: ٦/ ٨، نیز دیکھئے: المغنی: ١٣/ ٢٠٩۔

(٢) بدائع الصنائع: ٦/ ٨، نیز دیکھئے: المغنی: ١٣/ ٢٠٩۔

سالانہ جزیہ لگے گا،(۱) اس طرح مالدار شخص پر سالانہ ۱۲ تولہ یعنی تقریباً ۱۴۴ رگرام چاندی، متوسط آمدنی کے لوگوں پر ٦ تولہ یعنی ۷۲ رگرام چاندی اور غریب شخص پر ۳ تولہ یعنی ۳٦ رگرام چاندی سالانہ ٹیکس کے طور پر واجب قرار پاتی ہے؛ لہٰذا اگر دو سو روپے تولہ چاندی مانی جائے تو متمول افراد پر سالانہ دو ہزار چار سو، متوسط آمدنی کے لوگوں پر سالانہ بارہ سو اور کم آمدنی والوں پر سالانہ چھ سو روپے جزیہ ٹیکس ہوتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو بہت سی دفعہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کی مقدار غیر مسلموں پر عائد کئے جانے والے جزیہ کی مقدار سے بڑھ جاتی ہے، مثلاً: ایک مسلمان کے پاس دس لاکھ درہم ہوں تو ڈھائی فیصد کے لحاظ سے اس کو ۲۵ ہزار درہم زکوٰۃ دینی ہوگی؛ لیکن اگر اسی مسلمان کے ایک غیر مسلم دوست کے پاس اتنی یا اس سے زیادہ رقم ہو تب بھی اسے سالانہ صرف ۴۸ درہم جزیہ کے طور پر ادا کرنا ہوگا۔

پھر جزیہ کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ یہ عاقل و بالغ مردوں پر واجب ہوگا، بچوں، عورتوں اور فاتر العقل لوگوں پر واجب نہیں ہوگا: ''فلا تجب علی الصبیان والنساء والمجانین إلخ'' (۲) نیز اگر کسی پر جزیہ باقی رہ گیا تھا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو اب جزیہ معاف ہوجائے گا، اور اس کے ترکہ سے یا ورثہ سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا؛ (۳) بلکہ اگر گزشتہ سالوں کا جزیہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی وصول نہیں کیا جائے گا، اب صرف مستقبل کا جزیہ وصول کیا جائے گا۔(۴)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جزیہ کی مقدار کتنی قلیل ہے اور اس کے نفاذ میں کتنی زیادہ سہولت ملحوظ رکھی گئی ہے؟

---

(۱) بدائع الصنائع: ۶/۸۰۔

(۲) بدائع الصنائع: ۶/۸۰۔

(۳) بدائع الصنائع: ۶/۸۱، نیز دیکھئے: فتح القدیر: ۶/۵۳۔

(۴) بدائع الصنائع: ۶/۸۲۔

ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غیر مسلم رعایا پر جزیہ ٹیکس کیوں رکھا گیا ہے؟
—— اس سلسلہ میں اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس میں غیر مسلموں ہی کی رعایت ہے، اسلامی حکومت میں آمدنی کا مستقل اور اہم ذریعہ زکاۃ وعشر ہے، عشر زمینی پیداوار پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی زکوٰۃ ہی کی ایک قسم ہے، اور زکوٰۃ دوسرے مالوں میں واجب ہوتی ہے، یہ دونوں محصولات شرعی ٹیکس بھی ہیں اور عبادت بھی، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ اور عشر واجب قرار دے دیا جاتا تو یہ مذہبی آزادی کے مغایر ہوتا اور اس طرح گویا انھیں ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنا پایا جاتا؛ حالاں کہ اسلام چاہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے، وہ بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد رہیں؛ اس لئے غیر مسلموں کی زرعی پیداوار میں عشر کے بجائے خراج اور دوسرے وسائل معاش کو ملحوظ رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے بجائے جزیہ واجب قرار دیا گیا، تو درحقیقت اس میں غیر مسلموں کی رعایت ہے نہ کہ ان پر زیادتی۔

دوسرے اسلامی حکومت کے تمام مسلمان شہریوں کو فوجی خدمت انجام دینا لازم ہے؛ اگر ملک کا تحفظ خطرہ میں پڑ جائے تو حکومت مسلمان رعایا کو فوجی خدمت میں شامل ہونے پر مجبور کر سکتی ہے، اس کے برخلاف غیر مسلم شہریوں کو فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ان غیر مسلم بھائیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں، جزیہ دراصل غیر مسلم رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری کا معاوضہ ہے، مشہور محقق علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، یہاں انھیں کا ایک اقتباس کسی قدر اختصار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

آنحضرت ﷺ وخلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں، ان میں صراحت موجود ہے کہ جزیہ ان لوگوں کی حفاظت کا معاوضہ تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے والی ایلہ کو جزیہ کے سلسلہ میں جو فرمان تحریر فرمایا، اس میں یہ الفاظ لکھائے: ''**یحفظوا و یمنعوا**'' یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور وہ دشمنوں سے بچائے جائیں، (۱) حضرت عمرؓ نے

---

(۱) دیکھئے: فتوح البلدان بلاذری: ۵۹۔

وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ”غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں، وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے ان کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہئے“ (۱) اس موقع پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں، جن سے نہایت صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ دراصل حفاظت کا معاوضہ تھا اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھا، یہی سمجھ کر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے :

هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا ابن نسطونا وقومه إني عاهدتكم على الجزية والمتعة ... فلك الذمة والمتعة فإن منعناكم فلنا الجزية و إلا فلا ... كتب سنة اثنتي عشر في صفر ۔ (۲)

یہ خالد بن ولید کی تحریر ہے، صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لئے میں نے تم سے معاہدہ کیا جزیہ اور محافظت پر...... پس ہم پر تمہاری ذمہ داری اور محافظت ہم پر ہے، جب تک ہم تمہاری حفاظت کریں ہم کو جزیہ کا حق ہے...... ورنہ نہیں، ۱۲ھ صفر میں لکھا گیا۔

مسلمان گورنروں نے عراق عرب کے اضلاع میں وہاں کے باشندوں کو جو عہد نامے لکھے اور جن پر بہت سے صحابہ کے دستخط تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں :

براءة لمن كان من كذا وكذا من الجزية التي صالحهم عليها الامير خالد بن الوليد ، وقد قبضت الذى صلحهم عليه خالد والمسلمون ، لكم يد على من بدل صلح خالد ما أقررتم بالجزية ، وكنتم

(۱) صحیح بخاری میں منقول حضرت عمرؓ کے الفاظ مولانا شبلیؒ نے الفاروق میں نقل کئے ہیں، ملاحظہ ہو الفاروق: ۱/۱۵۴، مطبع معارف اعظم گڑھ ”ک“۔

(۲) تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری: ۴/۲۰۵۰ مطبوعہ یورپ۔

أمانكم امان ، وصلحكم صلح ، ونحن لكم حتى الوفاء ۔ (۱)

ان لوگوں کے لئے جنھوں نے اتنی اور اتنی مقدار کا جزیہ دینا قبول کیا ہے اور جن پر خالد بن ولید نے ان سے مصالحت کی ہے، یہ براءت نامہ ہے، خالد اور مسلمانوں نے جس مقدار پر صلح کی، وہ ہم کو وصول ہوئی، جو شخص خالد کی صلح کو بدلنا چاہے اس کو تم لوگ مجبور کر سکتے ہو، بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے رہو، تمہاری امان امان ہے اور تمہاری صلح صلح (یعنی جس سے تم صلح کرو، ہم بھی صلح کریں گے اور جس کو تم امان دو گے ہم بھی امان دیں گے)۔

اس کے مقابلے میں عراق کی رعایا نے یہ تحریر لکھی :

إنا قد ادينا الجزية التى عاهدنا عليها خالد العبد الصالح والمسلمون عباد الله الصالحون على أن يمنعونا واميرهم البغى من المسلمين وغيرهم ۔ (۲)

ہم نے وہ جزیہ ادا کر دیا، جس پر خالد سے معاہدہ کیا تھا، اس شرط پر کہ مسلمان اور نیز اور تمام قومیں اگر ہم کو گزند پہنچانا چاہیں تو جماعت اسلام اور ان کے افسر ہماری حفاظت کے ذمہ دار ہوں۔

یہ بات کہ جزیہ ان کی حفاظت کا عوض ہے، کا مسلمانوں کو اس درجہ پاس ولحاظ تھا کہ حضرت ابوعبیدہؓ جراح نے جب شام میں فتوحات حاصل کیں تو ہرقل نے ایک عظیم الشان فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیار کی، مسلمانوں کو اس کے مقابلے میں بڑی مستعدی سے بڑھنا پڑا اور ان کی تمام قوت وتوجہ فوجوں کی ترتیب میں مصروف ہوگئی، اس وقت حضرت ابوعبیدہؓ

(۱) تاریخ طبری: ۴/ ۲۰۵۴۔

(۲) تاریخ طبری: ۴/ ۲۰۵۵۔

جو فوج کے سپہ سالار تھے، نے اپنے تمام عمالوں کو جو شام کے مفتوحہ شہروں پر مامور تھے، لکھ بھیجا کہ: ''جس قدر جزیہ وخراج جہاں جہاں وصول کیا گیا ہے، سب ان لوگوں کو واپس دے دو، جن سے وصول ہوا تھا اور ان سے کہہ دو کہ ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا، اس شرط پر لیا تھا کہ تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کریں گے؛ لیکن اب اس واقعہ کے پیش آجانے کی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں اُٹھا سکتے'' ابوعبیدہؓ کے خاص الفاظ جن میں عیسائیوں سے خطاب ہے، یہ ہیں :

إنما رددنا عليكم أموالكم ؛ لأنه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع ، و إنكم قد اشترطتم علينا أن نمنعكم ، و إنا لا نقدر على ذلك وقد رددنا عليكم ما أخذنا منكم ۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کو دل سے دُعا دی اور کہا کہ خدا پھر سے تم کو ہمارے شہروں کی حکومت دے، رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار جو کچھ ہمارے پاس تھا، وہ بھی لے لیتے؛ چنانچہ سب سے پہلے اس حکم کی تعمیل حمص میں ہوئی، جہاں حضرت ابوعبیدہؓ خود مقیم تھے، انھوں نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر کہا کہ جو کچھ ذمیوں سے وصول ہوا ہے، سب ان کو واپس کردو، اس کے بعد ابوعبیدہؓ دمشق میں آئے اور سوید بن کلثوم کو اس کام پر مقرر کیا کہ ذمیوں سے جس قدر رقم وصول ہوئی ہے، سب ان کو واپس کردی جائے۔(۱)

یہی سبب کہ اگر غیر مسلم رعایا نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی تو ان کو مسلمانوں کی طرح جزیہ سے بری کردیا گیا، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب حبیب بن مسلمہ نے ایک عیسائی قوم جراجمہ (۲) پر فتح پائی تو ان لوگوں نے خود ہی فوجی خدمتوں میں شریک ہونا پسند کیا؛

---

(۱) دیکھئے: کتاب الخراج، قاضی ابویوسف ۸۱، فتوح البلدان: ۱۳۷، فتوح الشام ازدی: ۱۳۷۔

(۲) ایک عیسائی قوم تھی اور شہر جراجمہ اور اس کے مضافات میں آباد تھی، معجم البلدان: ۸۰/۳ میں اس مقام کا ذکر تفصیلاً لکھا ہے۔

چنانچہ ان کو جزیہ سے بری رکھا گیا، نہ صرف جراجمہ بلکہ بہت سے نبطیوں اور ان کے متصل کی آبادیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور جزیہ سے بری رکھے گئے، (۱) معاہدوں میں یہاں تک کہ تصریح کردی جاتی تھی کہ ذمی اگر صرف ایک سال فوجی خدمت میں شریک ہوں گے تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دیا جائے گا؛ چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانے میں کثرت سے یہ معاملہ پیش آیا، عتبہ بن فرقد نے جب آذربائیجان فتح کیا تو معاہدے میں یہ الفاظ لکھے :

علی أن یؤدوا الجزیة علی قدر طاقتھم ومن حشر منھم فی سنة وضع عنه جزاء تلک السنة۔

یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ جزیہ ادا کریں اور جو شخص کسی سال لڑائی میں بلایا جائے گا تو اس سال کا جزیہ معاف کردیا جائے گا، اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب آرمینیہ کے بعض حصے فتح ہوئے تو سپہ سالار نے معاہدے میں یہ الفاظ لکھے :

أن ینفروا لکل غارة ینفذوا لکل امرناب او لم ینسب رآہ الوالی صلاحا علی ان توضع الجزاء عمن اجاب الی ذلک ومن استغنی عنه منھم وقعد فعلیه مثل ما علی اھل آذر بائیجان من الجزاء۔ (۲)

یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ یہ لوگ جب لڑائی پیش آئے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں، اس صورت میں ان پر جزیہ نہیں لگایا جائے گا؛ لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وہ بیٹھ رہے تو اس کو آذربائیجان والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا، اسی معاہدے میں یہ لفظ بھی ہے: ''والحشر عوض من جزایھم''یعنی لڑائی میں ذمیوں کا شریک ہونا جزیے کا قائم مقام ہے، (۳) خود حضرت عمرؓ نے متعدد دفعہ یہ احکام بھیجے تھے کہ اگر

(۱) فتوح البلدان بلاذری:۱۵۹، ۱۶۱۔

(۲) تاریخ طبری: ۴/ ۱۵۷۔

(۳) تاریخ کبیر طبری: ۵/ ۲۶۶۵۔

کسی ذمی سے اتفاقیہ کسی موقع پر مدد لو تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دو، حضرت عمرؓ کے زمانے میں جرجان وغیرہ ممالک میں جو معاہدہ ہوا، اس میں یہ الفاظ تھے: ''ومن استعنا به منکم فله جزائه فی معونته عوضا عن جزائه ''(۱) یعنی ہم اگر کسی ذمی سے اعانت لیں گے تو اس اعانت کے بدلے میں جزیہ چھوڑ دیا جائے گا۔

قرآن مجید میں جزیہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: ''حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ''(التوبہ:۲۹) ''یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں دراں حالاں کہ وہ چھوٹے ہیں'' —— اس سے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ جزیہ وصول کرنے سے غیر مسلم باشندوں کی تذلیل مقصود ہے؛ لیکن یہ غلط ہے، نہ قرآن میں ایسی کوئی بات آئی ہے نہ حدیث میں، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے ایسی کوئی بات معلوم ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ''چھوٹا محسوس کرنے'' کی تعبیر سے مراد دوسرے کے اقتدار کو تسلیم کرنا اور اپنے آپ کے رعایا ہونے کو قبول کرنا ہے، منشاء یہ ہے کہ جب کوئی شخص حکومت کو ٹیکس ادا کرتا ہے، تو وہ گویا اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے تابع ہے، اور اس کے قانون کا پابند ہے، اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب قبیلہ بنو تغلب کے لوگوں نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جزیہ کے نام سے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم دوگنی شرح کے ساتھ زکوٰۃ ادا کریں گے تو حضرت عمرؓ نے اس کو قبول فرمالیا۔(۲)

غرض کہ جزیہ حکومت کی طرف سے عائد کیا جانے والا ایک ٹیکس ہے، جس کا مقصد ملک کی انتظامی اور دفاعی ضرورتوں کو پوری کرنا ہے، یہ غیر مسلموں کے حق میں زکوٰۃ کا متبادل اور ان کے تحفظ کی اُجرت ہے؛ کیوں کہ اگر ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف ہوتا، جو مذہبی آزادی کے مغائر تھا، اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں ہے، اور اس کی مقدار نہایت قلیل اور آخری حد تک قابل برداشت رکھی گئی ہے۔



(۱) تاریخ کبیر طبری:۲۶۵۸/۵۔ (۲) السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر:۱۸۷۹۷۔

غلامی کا مسئلہ اور اسلامی تعلیمات

اس تحریر میں بنیادی طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی فاضلانہ تالیف ''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مقالہ ''غلامی کا مسئلہ'' اور مولانا زاہد الراشدی کا مقالہ ''غلامی کے مسئلہ پر ایک نظر'' کو بھی سامنے رکھا گیا ہے، اور بعض دوسری تحریریں بھی پیش نظر رہی ہیں۔ (رحمانی)

غلامی سے مراد ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر مالکانہ حقوق کا قائم ہوجانا، جیسے انسان بے جان اشیاء اور حیوانات کے مالک ہوجاتے ہیں، اسی کو غلامی کہا جاتا تھا، جو غلام قرار پاتا تھا وہ اپنے اختیار سے کسی تصرف کا مجاز نہ ہوتا تھا، نہ شادی بیاہ کا، نہ خرید وفروخت کا، نہ ملازمت کا، نہ وہ کسی چیز کا مالک ہوسکتا تھا، اگر اس نے اپنے مالک کی اجازت سے تجارت کی اور دولت کمائی تو وہ دولت بھی اس کے مالک ہی کی سمجھی جاتی تھی، وہ ہر معاملہ میں اپنے مالک کے حکم کا پابند ہوتا تھا اور اس کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا کہ جس کا وہ اپنے مالک سے مطالبہ کرسکے، یہ بیچارگی اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ اسے جسمانی تشدد اور جنسی استحصال پر بھی زبان کھولنے کی اجازت نہیں تھیں۔

تاریخ کے جس مرحلے میں بھی غلامی کا آغاز ہوا ہے، اس وقت غلام کی یہی کیفیت تھی، اسلام کا غلامی کے مسئلہ پر کیا رویہ ہے اس کو سمجھنے کے لئے تین نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اسلام سے پہلے دنیا کے جو بڑے مذاہب اور مشہور تہذیبیں گزری ہیں ان کے یہاں غلامی تھی یا نہیں :

(۱) اسلام نے غلامی کے خاتمے کے لئے کیا تدبیریں کیں؟

(۲) اسلام نے معاشرے میں غلاموں کو کیا حقوق عطا کئے؟

جہاں تک اسلام سے پہلے غلامی کے رواج کی بات ہے تو اس کا سب سے قدیم تذکرہ رومی اقتدار اور رومی تہذیب میں ملتا ہے، دوسو قبل مسیح سے شروع ہو کر ۲۰۰ء تک رومی سلطنت میں غلامی اپنے عروج پر تھی، غلاموں کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر کیتھ بریڈ لے کہتے ہیں :

> روم اور اٹلی میں ۲۰۰ ق م سے لے کر ۲۰۰ء تک کی چار صدیوں میں آبادی کا چوتھائی بلکہ تہائی حصہ غلاموں پر مشتمل تھا، اس دوران کروڑوں کی تعداد میں مرد، خواتین اور بچے کسی بھی حقوق کے بغیر رہتے تھے، گویا کہ قانونی اور معاشرتی طور پر ان کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور وہ انسان شمار نہیں کئے جاتے تھے۔(1)

پلوٹرک کی بیان کردہ معلومات کے مطابق :

> کسی غلام کا نام بھی نہ ہوا کرتا تھا، انھیں کوئی چیز اپنی ملکیت میں رکھنے، شادی کرنے یا قانونی خاندان رکھنے کی کوئی اجازت نہ ہوا کرتی تھی، غلاموں کا مقصد یا تو محض محنت کرنے والے کارکنوں کا حصول ہوا کرتا تھا یا پھر یہ اپنے آقاؤں کی دولت کے اظہار کے لئے اسٹیٹس سمبل کے طور پر رکھے جاتے تھے، غلاموں کو جسمانی سزائیں دینا اور ان کا جنسی استحصال کرنا عام تھا، اپنی تعریف کے لحاظ سے ہی غلامی ایک وحشی، متشددانہ اور غیر انسانی ادارہ تھا، جس میں غلام کی حیثیت محض ایک جانور کی سی تھی۔(2)

---

(1) Resistiny Slavery in Ancient Rome.

(2) http://www.bbc.co.uk/history/ancient/romans/slavery_02.shtml.

رومی غلام زیادہ تر وہ ہوا کرتے تھے جو یا تو جنگوں میں پکڑے جائیں یا پھر وہ اپنے قرضے ادا نہ کر سکیں، کثیر تعداد میں موجود غلاموں کو کنٹرول کرنے کے لئے انھیں دائمی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنچا دی جاتی تھیں، جو وہ سوتے وقت بھی اتار نہ سکتے تھے، آقاؤں کی تفریح کے لئے غلاموں کو ایک دوسرے یا وحشی درندوں سے لڑایا جاتا، ان غلاموں کو اس کی با قاعدہ تربیت دی جاتی اور ان لڑائیوں کا نتیجہ کسی ایک کی موت کی صورت ہی میں نکلتا، غلام کو آزادی دینا اس کے مالکوں اور تماشائیوں کی صوابدید پر منحصر ہوا کرتا تھا۔

میں BC بریڈلے کا آرٹیکل ان ہی بغاوتوں کے بارے میں ہے، ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان میں سب سے مشہور بغاوت ۷۱-۷۳ میں ہوئی جس کا لیڈر مشہور گلیڈی ایٹر اسپارٹکس تھا، اس بغاوت میں بہت سے غلاموں نے حصہ لیا اور اس بغاوت کے نتیجے میں سلطنت روما تباہ ہوتے ہوئے بچی، بغاوت ناکام رہی اور اسپارٹکس کو قتل کر دیا اور اس کے ہزاروں پیروکاروں کو صلیب پر چڑھا دیا گیا جو کہ رومیوں کا عام طریق کار تھا، غلاموں کے ساتھ اسی سلوک پر ایک ناول سپارٹکس بہت مشہور رہا۔

قدیم یونان

قدیم یونانی معاشرہ میں پورا ایک طبقہ ہیلوٹس کا تھا، جو غلاموں پر مشتمل ہوتا تھا، یونان میں بہت سے لوگوں کے پاس اپنی زمین نہ تھی اور (مزارعت پر کاشت کرنے کی وجہ سے) انھیں اپنی فصل کا بڑا حصہ جاگیرداروں کو دینا ہوتا تھا، اس وجہ سے یہ لوگ قرض لینے پر مجبور ہوتے اور سوائے اپنے جسم و جان کے ان کے پاس کوئی چیز رہن رکھنے کے لئے نہ ہوا کرتی تھی، ان لوگوں کو غلام بنالیا جاتا، کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں ایتھنز شہر میں محض 2100 شہری اور 460,000 غلام موجود تھے، غلاموں کو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا تھا، پہلے عبرانیوں کے ہاں اور پھر یونانیوں میں غلاموں سے نہایت ہی سخت برتاؤ رکھا جاتا تھا، یونان کی تمام شہری ریاستوں میں معاملہ ایک جیسا نہ تھا، ایتھنز میں غلاموں سے کچھ نرمی برتی جاتی؛ بلکہ سپارٹا میں ان سے نہایت سخت سلوک کیا جاتا؛ لیکن عمومی طور پر غلام بالکل ہی بے آسرا تھے۔

چین اور کنفیوشن ممالک

چین روم کی طرح مکمل طور پر ایک غلام معاشرہ نہیں بن سکا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ یہاں ہمیشہ عام طور پر بستے کارکن موجود رہے ہیں، بعض غلاموں سے اچھا سلوک کیا جاتا رہا ہے؛ لیکن اس کے باوجود انھیں بہت سے انسانی حقوق حاصل نہ رہے ہیں۔ (1)

کنفیوشس (479-551 BC) کے فلسفے اور اخلاقیات پر یقین رکھنے والے دیگر ممالک جیسے مشرقی چین، جاپان اور کوریا میں بھی غلامی موجود رہی ہے، اسمتھ کے مطابق ابتدائی طور پر صرف حکومت کو غلام بنانے کی اجازت دی گئی جو کہ جنگی قیدیوں اور دیگر مجرموں کو غلام بنانے تک محدود تھی، کچھ عرصے بعد پرائیوٹ غلامی اور جاگیردارانہ مزدوری کا نظام بھی آہستہ آہستہ پیدا ہو گیا۔

قدیم مصر

مصر میں بھی دنیا کے دوسرے خطوں کی طرح غلامی موجود رہی ہے، مصری قوانین کے تحت پوری رعایا کو فرعون کا نہ صرف غلام سمجھا جاتا تھا؛ بلکہ ان سے فرعون کی عبادت کا مطالبہ کیا جاتا تھا، اہرام مصر کی تعمیر سے متعلق جو تفصیلات ہمیں ملتی ہیں، ان کے مطابق اہرام کی تعمیر ہزاروں کی تعداد میں غلاموں نے کی تھی، کئی کئی ٹن وزنی پتھر اُٹھانے کے دوران بہت سے غلام حادثات کا شکار بھی ہوئے تھے۔ (2)

مصر میں غربت کے باعث لوگوں میں خود کو فروخت کر دینے کا رجحان بھی موجود تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کا قرآن میں ذکر ہے، ان کو بھی اسی طرح دیا گیا، مصر کی تاریخ میں سیدنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام وہ پہلے ایڈمنسٹریٹر تھے، جنھوں نے اس رواج کو ختم کرتے ہوئے کثیر تعداد میں غلاموں کو آزادی عطا کی۔

---

(1) http://www.britannica.com/eb/article-24156/slavery.

(2) http://nefertiti.iwebland.com/timelines/topics/slavery.htm.

ـــب میں غلامی

غلاموں کا طبقہ عرب معاشرے میں ''حقیر ترین'' طبقہ تھا، عربوں کے زیادہ تر غلام افریقہ سے لائے گئے تھے، ان کے علاوہ سفید رنگت والے رومی غلام بھی ان کے ہاں پائے جاتے تھے، یہ زیادہ تر عراق یا شام سے لائے جاتے تھے، ان غلاموں کی خرید وفروخت جانوروں یا بے جان اشیاء کی طرح کی جاتی تھی، غلام کی کسی غلطی پر مالک اسے موت کی سزا بھی دے سکتا تھا، آقا کو لونڈی پر مکمل جنسی حقوق حاصل ہوا کرتے تھے؛ لیکن اگر آقا کسی لونڈی کی شادی کردے تو پھر وہ خود اپنے حق سے دستبردار ہوجایا کرتا تھا، بہت سے آقا اپنی لونڈیوں سے عصمت فروشی کروایا کرتے تھے اور ان کی آمدنی خود وصول کیا کرتے تھے، ایسی لونڈیوں کو جنس مخالف کو لبھانے کے لئے مکمل تربیت فراہم کی جاتی تھی، شب بسری کے لئے کسی دوست کو لونڈی عطا کردینے کا رواج بھی ان کے ہاں پایا جاتا تھا، عربوں میں لڑائی جھگڑا اور بین القبائل جنگیں عام تھیں، ان جنگوں میں فاتح، نہ صرف مفتوح کے جنگی قیدیوں کو غلام بناتا؛ بلکہ اس قبیلے کی خواتین اور بچوں کو بھی غلام بنانا فاتح کا حق سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں غلامی

اگر ہم مذاہب کی طرف آئیں تو دنیا کا ایک قدیم ترین مذہب ہندو مذہب ہے، یہاں بھی غلامی کا تصور موجود تھا؛ چنانچہ گوتم بدھ نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وہ غلاموں سے صرف اتنا ہی کام لیں جو وہ کرسکیں؛ چوں کہ گوتم بدھ نے ہندو معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی تو ان کی اس تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی غلامی کا تصور موجود تھا، اسی طرح آواگون کے عقیدہ کے تحت کسی شخص کے غلام ہونے کو اس کے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا قرار دیا گیا ہے؛ لیکن نام کی تبدیلی کے ساتھ ہندو مذہب اور سماج میں غلامی کا نظام ملتا ہے اور وہ ہے: طبقاتی نظام کے تحت شودر کا وجود، غلاموں پر روم و یونان میں جو بدترین مظالم ڈھائے گئے، ہندوستانی معاشرے میں شودروں کے ساتھ جن مظالم کو روا رکھا گیا، وہ کسی طرح اس سے

کم نہیں ہیں، شودر کا کام ہی تھا کہ وہ برہمن اور اونچی ذات والوں کی خدمت کرے؛ چنانچہ منو سمرتی میں ہے :

> بادشاہ کا فرض ہے کہ شودر کو برہمن کی خدمت کے لئے کہے، اگر شودر حکم عدولی کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے۔(۱)

شودر سے خدمت لینے اور بیگار لینے کے لئے معاوضہ دینا ضروری نہیں ہے :

> برہمن شودر سے با معاوضہ یا بلا معاوضہ خدمت لے سکتا ہے، برہما نے شودر کو برہمنوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔(۲)

شودر کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کوئی مال رکھ سکے :

> شودر کتنا بھی لائق کیوں نہ ہو مال نہیں رکھ سکتا۔(۳)

بلکہ ہندو فقہ کی مشہور کتاب منو سمرتی میں شودر کو غلام ہی کہا گیا ہے :

> شودر برہمن کی خدمت نہ کرے تو بھی غلام ہی ہے، شودر پیدائشی غلام ہے، غذا سور کی بدبو سے، کتے کی نظر سے اور شودر کے چھونے سے گندی ہو جاتی ہے۔(۴)

اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستانی سماج میں غلامی اپنی بدترین شکل میں موجود تھی اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کو زبردست مذہبی تائید بھی حاصل تھی۔

یہودی مذہب

دنیا کا دوسرا قدیم ترین مذہب یہودیت ہے، سیدنا حضرت ابرہیم علیہ السلام کی ایک بیوی حضرت ہاجرہ تھیں، جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، تورات ان کو حضرتِ ابراہیم کی باندی ہی قرار دیتا ہے؛ چنانچہ تورات کا مفسر ربی شلوم پیدائش ۱:۱۶ کی تفسیر میں لکھتا ہے :

(۱) منوسمرتی، باب:۸، اشلوک:۴۱۔ (۲) باب:۸، اشلوک:۴۱۳۔
(۳) باب:۱۰، اشلوک:۱۲۹۔ (۴) باب:۳، اشلوک:۲۵۱۔

ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھیں، فرعون نے سارہ کی کرامات دیکھا تو کہا کہ
اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر
رہنے سے بہتر ہے۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی ۷۰۰
بیویاں اور ۳۰۰ حرمیں (لونڈیاں) تھیں۔ (سلاطین ۱:۱۱:۳)

البتہ زیادہ تر عورتیں غلامی سے دوچار ہوتی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جو علاقہ فتح کیا جاتا، یہودی شریعت میں اس کے تمام مردوں کو قتل کر دینے کا اور عورتوں اور بچوں کو غلام اور باندی بنانے کا حکم تھا؛ چنانچہ تورات میں ہے :

اور خداوند تیرا خدا جب اسے تیرے قبضہ میں کردے تو وہاں
کے مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا؛ لیکن عورتوں، بال بچوں اور چوپایوں
اور شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لئے رکھ لینا۔ (استثناء:۲:۱۳:۱۴)

یہ تو غیر اسرائیلیوں کے ساتھ یہودیوں کا سلوک تھا؛ البتہ عبرانیوں (اسرائیلیوں) کے لئے الگ احکام ہیں، یہودی شریعت کی رو سے ایک عبرانی دوسرے عبرانی کو غلام بنانے کے لئے ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا تھا :

(۱) کوئی شخص غربت کے باعث قرض ادا نہیں کر سکتا، اس صورت میں ایک مالدار کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مدیون غریب کی طرف سے اس کا قرض ادا کردے اور اس کو اپنی غلامی میں لے لے۔

(۲) کسی نے چوری کی اور اب وہ چوری کا مال اس کے مالک کو واپس نہیں کر سکتا تو اس شخص کو یہ حق تھا کہ اپنے تئیں کسی امیر کے ہاتھ فروخت کردے اور وہ اس کی طرف سے چوری کا مال ادا کر کے اس شخص کو اپنی غلامی میں قبول کر لے۔

(۳) والدین کسی بناء پر اپنے بیٹے یا بیٹی کو کسی ہاتھ بیچ ڈالے۔(۱)

---

(۱) اسلام میں غلامی کی حقیقت:۲۸۔

عیسائی دنیا میں!

عیسائی مذہب کے بارے میں الگ سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے ان کے لئے تورات ہی کی شریعت کو جاری رکھا اور یہ حقیقت ہے کہ جیسے روم و یونان میں غلاموں کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا؛ چوں کہ رومی و یونانی تہذیب کی پالیسی عیسائی دنیا میں رائج رہی؛ اس لئے ان کے یہاں جس قدر غلامی کی کثرت اور غلاموں پر وحشیانہ مظالم ہوئے ہیں، شاید اس کی کوئی مثال نہ مل سکے؛ چنانچہ جب غلامی کو ختم کرنے کی بات آئی تو عیسائیت کے پاپائے اعظم غلامی کے حق میں تھے اور اسے باقی رکھنے کے لئے سینہ سپر تھے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ غلامی کی رسم کی حوصلہ افزائی کرنے میں کلیسا پیش پیش تھی۔

کلیسا کے نزدیک غلامی ناقابل توجہ امر (Indifferent Circumstance) تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ادوار میں کلیسا نے اس موضوع پر کبھی بحث ہی نہیں کی :

> The Church Never Called Slavery in Question at all.(1)

بعد کے دور میں جب غلامی کا موضوع زیر بحث آیا تو ارباب کلیسا نے پورے شد و مد کے ساتھ اس کی تائید وحمایت کی؛ چنانچہ سینٹ آگسٹائن کا کہنا ہے :

> غلامی خدا کے نزدیک کوئی جرم نہیں؛ بلکہ اس نے اسے گناہ کی ایک سزا کے طور پر مقرر کیا ہے۔(2)

شہنشاہ شارلمین کے عہد میں سلاؤ (Slav) قوم کو پوری طرح تباہ کیا گیا اور ان کو اس کثرت سے غلام بنایا گیا کہ لفظ سلاؤ بدل کر سلیو (Slave) یعنی غلام ہو گیا۔(3)

---

(1) Paganism and Christianity by J.A.Farrer, P.198.

(2) The City of God, Book.XIX, Chapter.XV.

(3) www.downbound.com/slavery_s/29.htm.

سینٹ امبروز (St. Ambrose) غلامی کا پرزور حامی اور اس کا مؤید تھا اور اس کی توجیہ وہ اس طرح بیان کرتا تھا :

> ......Slaves had an unusual advantage for the exercise of the Christian virtues of humility, patience, and forgiveness of enemies, and that men cursed with original sin were not fit to govern themselves anyway.(1)
>
> غلاموں کو غلامی کی حالت میں اپنے اندر عاجزی، صبر اور دشمنوں کو معاف کردینے کے مسیحی اوصاف پیدا کرنے کا بہتر موقع ملتا ہے، اس کے علاوہ ازلی گناہ کی لعنت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انسان اس قابل ہی نہیں کہ وہ آزاد رہیں اور اپنی ذات پر حکمرانی کریں۔

کلیسا نے معاشرہ میں طبقاتی تفاوت کو نہ صرف برقرار رکھا؛ بلکہ اس نے خود بھی ایک استحصالی طبقہ کی حیثیت اختیار کرلی، معاشرہ کے مظلوم طبقوں کو کلیسا کی ابتدائی تعلیمات ومساوات کے پروپیگنڈوں کی بدولت یہ توقع تھی کہ کلیسا کے اقتدار میں آنے کے بعد ان پر جبر واستبداد اور استحصال کا خاتمہ ہوجائے گا؛ لیکن کلیسائی عروج میں غلاموں کا یہ شعبہ نہ صرف سنگین مظالم کا شکار رہا؛ بلکہ جبری غلامی کا ایک سلسلہ بھی چل پڑا جس میں جنگوں کے قیدیوں کے علاوہ کثرت سے مسلمان اور یہودی شامل تھے، جن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی۔

پوپ لیو اعظم نے یہ حکم نامہ بھی جاری کررکھا تھا کہ کوئی بھی غلام نہ پادری بن سکتا ہے اور نہ کلیسا کے کسی عہدہ پر فائز ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ یہ ایک مقدس سلسلہ ہے جو غلام کی وجہ سے ناپاک ونجس ہوجائے گا :

> No slave could become a cleric lest his "vileness" should "pollute" the sacred order.(2)

---

(1) The Uses of the Past, P.188.

(2) The Social Record of Christianity, P.27.

چھٹی صدی عیسوی میں گریگوری اعظم وہ واحد پوپ تھا جو پورے یورپ میں سب سے زیادہ غلاموں کا مالک تھا، اس نے اپنے دور پاپائیت میں یہ قانون نافذ کیا تھا کہ کوئی بھی غلام کسی بھی آزاد مسیحی عورت سے شادی نہیں کرسکتا :

> Forbade slaves to marry free Christian women.(1)

غلاموں کے ساتھ ان کی اولاد بھی آقا کی ملکیت ہوتی تھی اور جس طرح مالک کو جائیداد میں تصرف کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، وہی تمام حقوق یہاں بھی حاصل تھے :

> The children of slaves were the property of their master who could dipose of or alienate them like the rest of his property.(2)

مغربی معاشرہ میں اونچے طبقہ کے افراد کو جرم کی پاداش میں جرمانے کی معمولی سزا ملتی یا کچھ سرزنش کردی جاتی؛ جب کہ غلام طبقہ کو جسمانی اذیت، گردن زدنی، جبری مشقت، زندہ جلانا، اور اکھاڑوں میں چیر پھاڑ کے لئے درندوں کے حوالہ کردینا سب کچھ شامل تھا۔

کلیسا اور غلامی

سلطنت روم اور اس کے امراء کے زوال کے ساتھ غلاموں کا ادارہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، اور یورپ میں ''جاگیرداری نظام'' رائج ہوا، جس کے تحت مسیحیوں نے زمینی کمیرا یعنی مزارع (Serf) کی شکل میں غلام بنالئے، جن کی قسمت کسی خاص قطعۂ زمین کے سے وابستہ ہوتی تھی اور اس زمین کے ساتھ وہ بھی خریدے اور بیچے جاتے تھے، زمین کے مالک ان سے سخت جسمانی مشقت لیتے، انھیں غیر انسانی سزائیں دیتے، ان کے اعضاء کاٹ ڈالنے اور مار ڈالنے تک کا اختیار رکھتے تھے، اس نظام کا سب سے تاریک پہلو یہ تھا کہ زیادہ تر جاگیریں یا تو کلیسا کے پاس تھیں، یا جاگیرداروں سے کلیسا کا مضبوط گٹھ جوڑ تھا، جس نے انھیں غلاموں پر

---

(1) The Social Record of Christianity, P.27.

(2) The Decline and Fall of Roman Empire, V.5, P.526.

زیادتیوں کا اخلاقی جواز فراہم کر رکھا تھا اور اس میں کیتھولک پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس بھی کلیسائیں شامل تھیں اور یہ سلسلہ یورپ میں اٹھارہویں صدی تک اور روس میں 1861ء تک قائم رہا۔(1)

یورپ کے اصلاحی دور میں کلیسا نے غلاموں کی آزادی کی حوصلہ افزائی ضرور کی؛ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ بہت سے غلام خود کلیسا کی جائیداد اور اس کی چاکری سے وابستہ تھے :

> The church began to encourage manunission, while ignoring the fact that many slaves were attached to church officials and church property.(2)
>
> کلیسا نے غلاموں کی آزادی کی ہمت افزائی شروع کر دی، اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ زیادہ تر غلام کلیسا کی غلامی اور کلیسا کی جائیداد سے ہی وابستہ تھے۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز مختلف انقلابات (Revolutions) سے ہوا تھا، ان انقلابات میں ایک "صنعتی انقلاب" بھی تھا، جس نے اقتصادیات و معاشیات میں زبردست تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، اس انقلاب کی تیز آندھی میں کمیروں کا نظام (Serfdom) تو خاک میں مل گیا اور ان غلاموں کو آزادی نصیب ہوئی؛ لیکن مغربی دنیا کے خمیر میں غلاموں پر انحصار اس قدر رچ بس چکا تھا کہ اس انقلاب نے ان کے اندرون میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی

The Age of Faith By Will Durant, P.555.

The Columbia Electronic Encyclopedia,
http://www.infoplease.com/ce6/bus/A0861124.html.

اور انھوں نے افریقہ کی صورت میں غلاموں کی ایک نئی زرخیز زمین دریافت کرلی، جس کی پشت پناہی خود کلیسا نے کی؛ چنانچہ 1511ء میں کلیسا نے اس بات کی اجازت دی کہ افریقہ کے لوگوں کو غلام بنا کر اسپین لایا جائے :

> In 1511 Ferdinand the Catholic gave permission to import slaves from Africa into Hispaniola.(1)

افریقی باشندوں کو غلام بنانے کا سلسلہ 1440ء کے زمانہ سے ہی شروع ہو چکا تھا، 1511ء میں کلیسا کی اجازت کے بعد غلاموں کی تجارت سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار بن گیا اور لاکھوں افریقیوں کو غلام بنایا جانے لگا، کھلے عام افریقہ کے غریب و مظلوم لوگوں پر حملے شروع ہوئے، انھیں زبردستی غلام بنایا گیا، بے دردی کے ساتھ انھیں جہازوں میں ٹھونس کر اور رسیوں میں باندھ کر لایا جاتا، جس کی وجہ سے بہت سے راستہ میں ہی ہلاک ہو جاتے، جنھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا، ایک بڑی تعداد دائمی مرض میں بھی مبتلا ہو جاتی، پھر انھیں جہازوں، گھروں، کھیتوں اور فیکٹریوں کے اندر بیگار میں لگا دیا جاتا۔

غلاموں کی تجارت ایک نفع بخش کاروبار تھا، جس کی مختلف شکلیں رائج تھیں، لوٹ مار اور قزاقوں کے ذریعہ جو غلام بنائے جاتے ان کے علاوہ بھی بہت سے غلام تھے، کچھ ایک متعین مدت کے لئے غلام ہوتے، کچھ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے غلامی اختیار کرتے اور کچھ بطور پیشہ اپنی مرضی سے بھی غلام بن کر خدمت کرتے جس میں انھیں اپنے ملک واپس جانے کی اجازت بھی ہوتی۔

1640ء میں لوئس سیزدہم نے یہ فرمان جاری کیا کہ وہ سارے افریقی جو کسی بھی طرح فرانس کی کالونیوں میں آئے ہیں اور ان کی موجودگی کی خواہ کوئی بھی شکل ہو، وہ سب کے سب غلام بنائے جاتے ہیں :

---

(1) Encyclopaedia of Religion and Ethics, S.11, P.608.

In 1640 Louis XIII issued an edict by which all Africans whatever who came into French colonies, under any circumstances, were to be made slaves.(1)

1755ء میں برطانیہ کے جزیرہ غرب الہند (West Indies) میں افریقی غلاموں کی تعداد دولاکھ چالیس ہزار تھی، جب کہ خود گوروں کی آبادی نوے ہزار تھی :

In 1755 the negro slaves in the British West Indies numbered 240,000, while the white population was only 90,000.(2)

1776ء میں جب امریکہ کی آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس وقت آبادی کا پانچواں حصہ غلام تھا :

In 1755 the negro slaves in the British west numbered 240,000, while the white population was only 90,000.(3)

جبری غلامی کی اس شکل کو کلیسا کے ذریعہ نہ صرف بڑھاوا ملا؛ بلکہ کیتھولک و آرتھوڈکس سارے کے سارے کلیسا خود اس کاروبار میں شریک تھے اور زمین کمیروں کی ملکیت کی طرح ان افریقی غلاموں کی ملکیت میں بھی کلیسا پیش پیش تھا، اٹھارہویں صدی میں امریکہ کے مختلف کلیسا چھ لاکھ غلاموں کے مالک تھے۔(4)

غلامی، دورِ جدید میں

دورِ جدید میں غلامی کی دو شکلیں ہوئیں، ایک یہ کہ افراد کو غلام بنایا جائے، دوسرے یہ کہ پوری قوم کو غلام بنالیا جائے، جیسا کہ ہندو سماج میں شودروں کا حال تھا، اس کی بدترین مثال

---

(1) Encyclopaedia of Religion and Ethics, S.11, P.608.

(2) Encyclopaedia of Religion and Ethics, V.11, p.609.

(3) The Columbia Electronic Encyclopedia http://www.infoplease.com/ce6/bus/A0861124.html.

(4) Rationnalist Encyclopaedia, P.546,547

امریکہ اور یورپ ہیں، جہاں افریقہ کے سیاہ فام لوگ جہاز میں بھر بھر کر لائے جاتے تھے اور انھیں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا جاتا تھا، امریکہ کی ریاست ورجینیا دنیا میں غلاموں کی سب سے بڑی منڈی تھی، کہا جاتا ہے کہ ولندیزی، برطانوی، پرتگالی، سویڈش اور ہسپانوی اغواء کار ۴۰ ملین کے قریب افریقی باشندوں (جن میں کئی ملین مسلمان تھے) کو جہازوں میں بھر بھر کر لائے اور امریکہ میں لاکر انھیں نیلام کر دیا، ان میں ۳۰ ملین راستے میں مر گئے، گویا ایک افریقی غلام کو امریکہ تک پہنچانے کے لئے تین افراد کو راستے میں مارا گیا، امریکہ جو آج اپنے آپ کو تہذیب وشائستگی کا نمائندہ کہتا ہے وہ غلامی کا بدترین مرکز تھا، امریکہ میں غلاموں کی طلب اس قدر وحشیانہ تھی کہ عیسائیت کے پاپائے اعظم سے لے کر امریکی صدر تک، عدلیہ کے اراکین سے لے کر بردہ فروشوں تک اور اہل قلم سے لے کر داعیانِ اصلاح تک بلا امتیاز منصبِ غلامی کے حق میں سینہ سپر تھے اور غلامی کے ثمر سے مستفید ہو رہے تھے۔

ان مستفید ہونے والوں میں پہلے امریکی صدر اور بابائے امریکی قوم جارج واشنگٹن بھی شامل تھے، صدر جارج واشنگٹن کے بعد مزید بارہ امریکی صدور بھی سینکڑوں سیاہ فام غلاموں پر مالکانہ حقوق رکھتے تھے، عہد جدید میں مغرب کے غلبہ کے بعد غلامی کی ایک اور شکل یہ سامنے آئی کہ پوری پوری قوم کو غلام بنالیا جائے، قریب قریب پورا ایشیاء اور افریقہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، اسپین اور پرتگال کا غلام رہ چکا ہے، اگر ہندوستان اور الجزائر ہی کی تاریخ آزادی کو دیکھ لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی طاقتیں غلام بنائی ہوئی قوموں کو کیسی بدترین غلامی سے دوچار کئے ہوئی تھیں، جنوبی افریقہ کی صورتِ حال تو کل کی بات ہے، جہاں چار سو سال سے زیادہ انگریزوں نے پورے ملک کو غلام بنا کر رکھا اور وہاں کے عوام کے ساتھ ایسا بدترین سلوک کیا جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آج بھی کوئی شخص کیپ ٹاؤن کے ساحل سے قریب بنے ہوئے جزیرے میں جا کر اس جیل خانے میں تصویروں کی شکل میں ان مظالم کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے، جو سیاہ فام قوم کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔

امریکہ میں

خود امریکہ میں ''جم کرو کوڈ'' نامی قوانین با قاعدہ امریکی قانون ساز اداروں نے عوامی نمائندوں کی کثرتِ رائے سے منظور کئے تھے اور ۱۹۶۵ء تک امریکہ میں علی الاعلان و بالاطمینان نافذ رہے ہیں، وہ قوانین یہ تھے :

- سیاہ فام مرد سفید فام مرد سے مصافحہ کے لئے ہاتھ نہیں بڑھا سکتا؛ چوں کہ اس سے سماجی حیثیت کی برابری کا اظہار ہوتا ہے۔
- سیاہ فام مرد سیاہ فام عورت سے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ دراز نہیں کر سکتا؛ چوں کہ اس سے زنا بالجبر کی ترغیب مل سکتی ہے۔
- سیاہ فام و سفید فام اکٹھے بیٹھ کر نہیں کھا سکتے، اگر ایسا ہو تو سفید فاموں کو کھانا پہلے پیش کیا جائے اور دونوں کے درمیان حد فاصل قائم رکھی جائے گی۔
- کسی بھی صورتِ حال میں سیاہ فام مرد سفید فام عورت کی سگریٹ جلانے کے لئے اپنا لائیٹر روشن نہیں کرے گا، اس طرز عمل سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔
- سیاہ فاموں کو ہمیشہ سفید فاموں سے متعارف کرایا جائے گا؛ کیوں کہ سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے متعارف ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔
- سفید فام، سیاہ فاموں کے لئے کسی احترامی سابقے یا لاحقے یعنی ان کے نام کے شروع میں یا آخر میں قابل احترام الفاظ و القاب کو استعمال نہیں کریں گے؛ بلکہ انھیں ان کے پہلے نام سے مخاطب کریں گے؛ جب کہ سیاہ فام سفید فاموں کو سر، مسٹر، مسز اور میڈم سے مخاطب کریں گے۔
- اگر سفید فام گاڑی چلا رہا ہو تو سیاہ فام اس کے برابر نہیں بیٹھے گا؛ بلکہ پچھلی نشستوں پر بیٹھ سکے گا۔
- سفید فام ڈرائیور کو پہلے گزرنے کا حق حاصل ہے۔

ان بنیادی ضابطوں کے علاوہ ریاست تا ریاست ایسے قوانین منظور کئے گئے، جو سراسر نسلی تعصب اور نسلی امتیاز پر مبنی تھے اور جن کو توڑنے پر سنگین سزائیں مقرر تھیں، مثلاً :

● سیاہ فام حجام کسی سفید فام خاتون یا نوعمر لڑکی کے بال نہیں تراش سکتے، (ریاست جارجیا)۔

● نابیناؤں کے ہسپتال میں سیاہ فام اور سفید فام نابینا اکٹھے نہیں رکھے جاسکتے، دونوں کے لئے علاحدہ عمارت کا انتظام ہوگا، (ریاست لوئزیانا)۔

● سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے علاحدہ دفنایا جائے گا، دونوں کے قبرستان مختلف ہوں گے۔

● سیاہ فام وسفید فام مسافروں کے علاحدہ ٹکٹ گھر، علاحدہ نشستیں، علاحدہ انتظار گاہ اور علاحدہ غسل خانے ہوں گے، (ریاست الباما)۔

● کوئی سفید فام کسی سیاہ فام بچے کو لے پالک نہیں بناسکتا، نہ ہی اس کو سفید فام بچوں کی نگرانی کے لئے رکھ سکتا ہے، نہ ہی سفید فام بچوں میں انھیں شامل کرسکتا ہے، (ریاست جنوبی کیرولائنا)۔

● سفید فام اور سیاہ فام بچوں کے اسکول علاحدہ ہوں گے، دونوں کو ایک ہی چھت تلے تعلیم نہیں دی جاسکتی، (ریاست فلوریڈا)۔

● لائبریریز میں سیاہ فام اسی مخصوص حصے میں بیٹھ سکیں گے، جو ان کے لئے مخصوص ہوگا، (ریاست شمالی کیرولائنا)۔

● ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں اور قیام گھروں میں سفید اور سیاہ فام اکٹھے نہیں رکھے جاسکتے، (ریاست جارجیا)۔

● ریاستی افواج میں سیاہ فام اور سفید فام علاحدہ رکھے جائیں گے، دونوں ایک ہی جگہ خدمات انجام نہیں دے سکتے، سیاہ فام یونٹس پر لازماً سفید فام آفیسر متعین کئے جائیں، (ریاست شمالی کیرولائنا)۔

● ہسپتالوں میں جہاں سیاہ فام مریض داخل ہوں گے، وہاں سفید فام نرسز تعینات نہیں کی جاسکتیں، سیام فام وسفید فام قیدی علاحدہ رکھے جائیں گے، ہر دو کے رہائشی کمروں کے درمیان حد فاصل قائم رکھی جائے گی، (ریاست مسی سپی)۔

● اصلاحاتی اسکولز میں سفید فام اور سیاہ فام طلباء کو لازماً علاحدہ رکھا جائے گا، (ریاست کنٹاکی)۔

● ایسے اساتذہ جو سیاہ فاموں اور سفید فاموں کو اکٹھے پڑھانے کے مرتکب پائے جائیں انھیں سخت سزا دی جائے گی، (ریاست اوکلوہاما)۔

● سیاہ فام اور سفید فام آپس میں بلیرڈ نہیں کھیل سکتے، (ریاست الباما)۔

● طعام گھروں اور ریسٹورنٹس میں سفید فام اور سیاہ فام علاحدہ بیٹھیں گے اور ساتھ نہیں کھا سکتے، (ریاست الباما)۔

● سفید فام اور سیاہ فام اسکولوں کی کتابیں ایک سے دوسرے اسکول میں نہیں بھیجی جاسکتیں، خصوصاً سیاہ فام طلبہ کی کتابیں وہیں رہیں گی، (ریاست شمالی کیرولائنا)۔

● سنیما گھروں، سرکس اور دوسرے تفریحی مقامات پر ہر دو کے داخلی دروازے ٹکٹ گھر اور نشستیں علاحدہ علاحدہ ہوں گی، (ریاست لوئزیانا)۔

● ایسی رہائشی عمارتیں جن کے کسی بھی حصے میں سفید فام مقیم ہوں وہاں پر سیاہ فاموں کو رہائش دینے والوں پر سخت سزا کا اطلاق ہوگا، (ریاست لوئزیانا)۔

● سیاہ فاموں کے لئے علاحدہ لائبریریز ہوں گی، وہ سفید فاموں کی لائبریریز سے استفادہ نہیں کرسکتے، (ریاست ٹیکساس)۔

● سیاہ فام وسفید فام مرد وزن کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

اجتماعی غلامی

افراد کی غلامی کا سلسلہ بھی کچھ بہت پہلے ختم نہیں ہوا؛ بلکہ جب مغرب نے پوری قوم کو غلام بنانے کا نسخہ دریافت کرلیا، اوران کو افراد کی غلامی کی ضرورت باقی نہیں رہی، پوری محکوم قوم حکومت کی غلام ہوتی اور پھر حکومت ان کے لئے امتیاز پر مبنی ایسے قوانین بناتی تھی کہ فاتح

---

(۱) میری لینڈ مس لیسی، دیوننگ، فلوریڈا ایریز ونا نیشنل ہسٹارک اسٹاف لسٹ: ۱۹۹۸ء۔

قوم کے افراد مفتوح قوم کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کیا کرتے تھے، اس صورتِ حال میں آہستہ آہستہ قانونی طور پر غلامی کا خاتمہ کیا گیا، ۱۸۶۵ء میں امریکہ میں غلامی کے خاتمہ کا فیصلہ کیا گیا جب کہ عوام ہی نہیں؛ بلکہ مذہبی نمائندے اور وہاں کے دانشور بھی اس فیصلے کے سخت مخالف تھے، برازیل میں ۱۸۸۸ء میں غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا، نیپال نے ۱۹۲۶ء میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا اور ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دنیا بھر میں غلامی کی مکمل ممانعت کا اعلان کیا، جس کے بعد اب دنیا میں غلامی کی کوئی صورت قانونی طور پر باقی نہیں رہی۔

اسلام اور غلامی

اسلام سے پہلے اگر غلامی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو غلام بنائے جانے کے یہ طریقے معلوم ہوتے ہیں:

- بچوں کو اغوا کر کے غلام بنالیا جائے۔
- اگر کسی کو کوئی لاوارث بچہ یا لاوارث شخص ملے تو وہ اسے غلام بنالے۔
- کسی آبادی پر حملہ کر کے اس کے تمام باشندوں کو غلام بنالیا جائے۔
- کسی شخص کو اس کے کسی جرم کی پاداش میں حکومت غلام بنالے۔
- قرض کی ادائیگی نہ کر پانے کی صورت میں مقروض کو غلام بنالیا جائے۔
- پہلے سے موجود غلاموں کی اولاد کو بھی غلام ہی قرار دے دیا جائے۔
- غربت کی وجہ سے کوئی شخص خود کو یا اپنے بیوی بچوں کو فروخت کردے۔
- جنگ ہونے کی صورت میں فاتحین جنگی قیدیوں کو غلام بنالیں۔

اسلام نے غلامی کی ان تمام صورتوں کو منع کر دیا، صرف ایک صورت باقی رکھی اور وہ یہ کہ دو ایسی قوموں کے درمیان جنگ ہو، جن کے درمیان قیدیوں کی رہائی کا کوئی معاہدہ نہیں ہو، یا کوئی ایسا بین الاقوامی معاہدہ نہ ہو جس پر جنگ کے دونوں فریقوں نے آمادگی ظاہر کی ہو، اگر دونوں فریق کسی ایسے معاہدہ میں شامل ہوں، جس کی رو سے جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کا عہد کیا

گیا ہو تو پھر انھیں غلام نہیں بنایا جا سکتا اور شرعاً ان کو رہا کرنا واجب ہوگا؛ کیوں کہ ایفاء عہد واجب ہے اور عہد شکنی گناہ کبیرہ ہے۔

ایک مثال سے دیکھ لیں کہ اسلام بین الاقوامی عرف اور معاہدات کا کس حد تک احترام کرتا ہے، جناب نبی کریم ﷺ کے پاس مسیلمہ کذاب کے دو نمائندے آئے، مسیلمہ نبوت کا دعوے دار تھا اور یمامہ کا سردار تھا، اس کے پاس بڑی فوج تھی، خط کا عنوان کچھ اس طرح تھا: ''من مسیلمہ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ'' اس نے کہا کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں اور آپ بھی اللہ کے رسول ہیں؛ اس لئے میرے ساتھ معاملات طے کریں، نبوت کا دائرہ عمل تقسیم کر لیں کہ شہروں کے پیغمبر آپ بن جائیں اور دیہات کا پیغمبر میں بن جاتا ہوں، یعنی اس نے پیشکش کی کہ ہم دونوں مل کر نبوت کرتے ہیں، اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیں کہ آپ کے بعد میں نبی ہوں گا، آپ ﷺ نے مسیلمہ کے دونوں نمائندوں سے پوچھا: کیا تم مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ''نشهد انک رسول اللہ'' ہاں آپ کے بارے میں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ''نشهد ان مسیلمة رسول اللہ'' ہم لوگ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے، مسیلمہ کی اذان بھی یہی تھی: ''اشهد ان محمد رسول اللہ'' اس کے بعد ''اشهد ان مسیلمہ رسول اللہ'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ایک جملہ فرمایا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں: ''لولا ان الرسل لا تقتل لضربت أعناقکما'' اگر (دنیا میں) یہ ضابطہ نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کئے جاتے تو میں تم دونوں کی گردنیں اُڑا دیتا۔

یہاں سے فقہاء یہ اُصول بیان فرماتے ہیں کہ ہم ان بین الاقوامی قوانین کا، عرف کا اور تعامل کا احترام کریں گے جو نص قطعی سے نہیں ٹکراتے ہوں، اس اُصول کی رو سے اسلام نے جو غلامی کا ایک طریقہ برقرار رکھا تھا وہ بھی آج کے دور میں عملاً باقی نہیں رہا، اس لئے کہ بین الاقوامی معاہدات کی رو سے آج دنیا میں جنگی قیدیوں سے متعلق واضح اُصول اور ضابطے

موجود ہیں، ان ضابطوں کی کوئی بھی خلاف ورزی نہیں کرسکتا؛ چنانچہ آج دنیا میں کہیں بھی غلامی کا کوئی امکان موجود نہیں ہے، حتیٰ کہ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا میں کہیں بھی جہاد کے عنوان سے کوئی جنگ لڑی گئی ہے تو اس میں کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی آج دنیا میں جہاد کے نام سے لڑی جانے والی جنگوں میں کسی کو غلام یا لونڈی بنایا جارہا ہے، یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں آج کے بین الاقوامی معاہدات کو اُمت مسلمہ نے قبول کرلیا ہے؛ چنانچہ موجودہ دور میں غلامی کے ممکن نہ ہونے کو ہماری شریعت تسلیم کرتی ہے؛ لیکن اگر کسی وقت دنیا کے حالات تبدیل ہوکر ایسے ہوجائیں کہ پرانی طرز کا کوئی دور واپس آجائے تو اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے اور اس کے متعلق اسلام کی تعلیمات موجود ہیں۔

جنگ کے ذریعہ جنگی قیدیوں کی شکل میں غلام بنانے کی صورت اس لئے باقی رکھی گئی کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک اختیار کیا جائے؟ اس سلسلے میں دو طریقے پائے جاتے تھے، ایک یہ کہ ان کو قتل کردیا جائے؛ تاکہ ہمیشہ کے لئے ان کی طاقت ختم ہوجائے، فاتح ملک یا قوم کو ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے، جیسا کہ گزر چکا ہے: تورات کی یہی تعلیم ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ انھیں غلام بنالیا جائے، یہ دوسرا طریقہ ان کے حق میں ایک رحمدلانہ طریقہ تھا؛ البتہ قرآن نے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں اُصولی طور پر دو صورتوں کی رہنمائی کی ہے:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ (محمد:۴)

تو جب تمہارا مقابلہ ایمان نہ لانے والوں سے ہوجائے (یعنی تم تمہارے مقابلہ پر آجائیں) تو ان کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو پھر مضبوطی کے ساتھ قید کرلو، اب اس کے بعد یا تو احسان کرو (یعنی بلا معاوضہ چھوڑ دو) یا معاوضہ لے کر رہا کردو، جب تک لڑنے والے ہتھیار نہ ڈال دیں۔

منّ سے مراد ہے ان سے کچھ لئے بغیر انھیں رہا کر دینا، فاء سے مراد ہے فدیہ یعنی مالی تاوان لے کر ان کو چھوڑ دینا، اللہ تعالیٰ نے: ''اِمَّا مِنًّا وَاِمَّا فِدَآءً'' کہہ کر یہ بات واضح کردی کہ قیدیوں کے ساتھ سلوک کا معیاری طریقہ یہی دو ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شریعت نے دو اور طریقے بھی رکھتے ہیں، ایک: قیدیوں کے تبادلہ کا، دوسرے: انھیں گرفتار کر کے غلام اور باندی بنا کر اپنے معاشرے میں جذب کر لینے کا اور یہ اس وقت کی ایک مجبوری بھی تھی؛ کیوں کہ اگر ان سب کو قتل کر دیا جاتا تو یہ کوئی مناسب بات نہیں ہوتی، اور اگر ان سب کو رہا کر دیا جاتا تو یہ قومی سلامتی کے لئے خطرے کی بات ہوتی، جس کی ایک مثال غزوۂ اُحد ہے کہ غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیا گیا اور انھوں نے مکہ پہنچ کر انتقام کی آگ سلگانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسی کے نتیجے میں غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا، جس میں ۷۰ صحابہؓ شہید کر دیے گئے، نیز اس زمانے میں بڑی جیلوں کا انتظام نہیں تھا، جن میں قیدیوں کی بڑی تعداد کو رکھا جاتا تو اس کی ایک شکل یہ اختیار کی گئی کہ انھیں جیل میں رکھے جانے کی بجائے گھروں میں گھر کا ایک فرد بنا کر رکھا جائے، اسی طرح جو خواتین ہیں انھیں باندی بنا لیا جائے اور ان سے صنفی تعلق قائم کرنے کا حق صرف اس کے مالک کو ہو، جیسے بیوی سے صرف اس کا شوہر ہی جنسی تعلق رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔

اسلام نے قیدیوں کے غلام بنانے کو جنگی قیدیوں کے لئے واحد صورت اور ترجیحی صورت نہیں بنایا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں ۷۰ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا؛ فتح مکہ کے موقع سے پورا مکہ مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا، ان کو معاف کر دیا گیا، غزوۂ حنین کے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا گیا، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ان کو غلام بنا سکتے تھے؛ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، مدینہ میں بنو نضیر اور بنو قینقاع کے قبائل اپنی سازشی حرکتوں کی وجہ سے شہر بدر کئے گئے؛ لیکن انھیں غلام نہیں بنایا گیا، بعد میں روم، ایران اور سندھ وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے اور دُور دُور تک اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع ہو گیا؛ لیکن مسلمانوں نے مفتوح قوموں کو اپنا غلام نہیں بنایا۔

غرض کہ اس وقت کے حالات میں غلامی کو بیک جنبش قلم ختم نہیں کیا جاسکتا تھا؛ کیوں کہ اس وقت کوئی ایسا بین الاقوامی معاہدہ نہیں تھا جس کے تحت قیدیوں کا آپس میں تبادلہ ہو، اگر ایسا کیا جاتا تو اس سے بڑا سماجی مسئلہ پیدا ہوجاتا، معاشرے کے ہزاروں افراد جن میں بچے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں اور بوڑھے بھی، غلام اور باندی کی حیثیت سے ان کی کفالت کی جارہی تھی، ان کی کفالت و پرورش کا مسئلہ ہوجاتا، نیز معیشت کی گاڑی کو پٹری پر قائم رکھنے میں غلاموں کا بڑا اہم رول تھا، اچانک اس کو ختم کرنے سے معاشرتی اور معاشی دشواریاں پیدا ہوجاتیں؛ البتہ اسلام نے ایسے احکام دیئے جن سے بتدریج غلامی کم سے کم ہوتی چلی گئی، ان میں سے چند تدبیریں یہ ہیں :

(۱) غلام کے آزاد کرنے کو بہت ہی افضل عمل قرار دیا گیا، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص بھی کسی مسلمان غلام کو آزاد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس (غلام) کے ہر ہر عضو کے بدلے (آزاد کرنے والے کے) ہر ہر عضو کو جہنم سے آزاد کردے گا، سعید بن مرجان کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں علی بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کے پاس گیا اور ان سے یہ حدیث بیان کی تو انھوں نے اپنے ایک غلام کی طرف رُخ کیا اور اسے آزاد کردیا، اس غلام کی قیمت عبداللہ بن جعفرؓ دس ہزار درہم یا ایک ہزار درہم لگا چکے تھے۔(۱)

خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کرکے ان سے نکاح فرمایا، آپ ﷺ کی ایک باندی حضرت میمونہؓ تھیں، انھیں بھی آزاد کردیا گیا، اور صحابہ نے بڑے تعداد میں اپنے غلاموں کو آزاد کیا؛ نواب صدیق حسن خانؒ نے ''بلوغ المرام'' کی شرح میں ''نجم الوہاج'' سے ایک فہرست نقل کی ہے، جس کے رو سے صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۹ ۳۹/ ہزار ۲ سو ۵۹ تک پہنچتی ہے، ان صحابہ کے نام اور ان کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد حسبِ ذیل ہے :

(۱) حضرت عائشہؓ: ۶۹۔

(۲) حضرت حکیم بن حزامؓ: ۱۰۰۔

---

(۱) بخاری، کتاب العتق، حدیث نمبر: ۲۵۱۷۔

(۳) حضرت عثمانؓ: ۲۰۔

(۴) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ: ۲۰۰۰۰ (۲۰؍ہزار)۔

(۵) حضرت عباسؓ ۷۰۔

(۶) حضرت عبداللہ بن عمرؓ: ۱۰۰۰۔

(۷) حضرت ذوالکلاح حمیریؓ: ۸۰۰۰۔

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۳ لکھی ہے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اگرچہ ٹھیک نہیں بتائی؛ لیکن لکھا ہے کہ انھوں نے بکثرت غلام آزاد کئے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ہمارا خیال ہے کہ صاحب نجم الوہاج کی بیان کی ہوئی یہ تعداد اصل تعداد سے کم ہے؛ کیوں کہ اس فہرست میں ان کثیر التعداد صحابہ کرامؓ کے نام نہیں ہیں، جن کے غلام آزاد کرنے کے جزئی واقعات روایات و آثار کے وسیع ذخیرہ میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوذرؓ حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ وغیرہم۔(۱)

مُکاتَب

غلام کی آزادی کا ایک راستہ مکاتبت کے ذریعہ نکالا گیا، مکاتبت سے مراد یہ ہے کہ مالک اپنے غلام سے کہے کہ تم اتنی رقم کما کر مجھے دو تو تم آزاد ہو جاؤ گے یا خود غلام اپنے آقا سے پیشکش کرے کہ میں کما کر اتنی رقم آپ کو دوں گا اور مقررہ رقم ادا ہونے کے بعد میں آزاد ہو جاؤں گا، اور مالک اس کو قبول کر لے، اس کے لئے جو مدت مقرر ہوگئی اس میں غلام خود

(۱) اسلام میں غلامی کی حقیقت: ۱۰۴۔

اپنی کمائی کا مالک ہوگا، اگر وہ غلام کو مقررہ معاوضہ ادا کردے گا اور آزاد ہوجائے گا، چوں کہ غلام کو آزاد کرنا اسلام میں بہت ہی افضل عمل ہے، اس لئے مسلمان اصحابِ ثروت ایسے غلام کی مدد کیا کرتے تھے، اسی طرح کے ایک معاملہ میں حضرت عائشہؓ نے حضرت بریرہؓ کو خرید کر آزاد کردیا۔(۱)

ایسے غلاموں کی مالی مدد بیت المال سے بھی ہوتی تھی کیوں کہ قرآن مجید نے زکوٰۃ کے جن آٹھ مصارف کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک ''فک رقاب'' یعنی غلاموں کو آزاد کرنا بھی ہے، ''وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ'' (توبہ:۶۰) ایک اور موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے غلام کے آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں مالی مدد کرنے کی ترغیب دی ہے، (بقرہ:۱۷۷) قرآن نے مکاتب بنانے کی بھی ترغیب دی ہے اور مکاتب کی مالی مدد کرنے کی بھی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ۔ (النور:۳۳)

یہاں مکاتب کی مدد کرنے کا حکم بطور استحباب کے ہے؛ لیکن اگر کوئی غلام مکاتب بننا چاہے تو اس کو مکاتب بنا دیا جائے، یہ حکم بعض مفسرین کے نزدیک واجب کے درجہ میں ہے اور جمہور کے نزدیک مستحب کے درجہ میں ہے؛ چنانچہ ایک مستشرق پول کا بیان ہے :

> اگر غلاموں کے تمام ممالک ان ترغیبات پر عمل کرتے جو پیغمبر ﷺ نے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق بیان کی ہیں تو کوئی شبہ نہیں کہ تھوڑے دنوں میں ہی غلامی کا خاتمہ ہوجاتا۔(۲)

مدبَّر

بعض لوگ اپنی ذاتی یا معاشی ضرورت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں

---

(۱) موطا مالک، کتاب العتق والولاء، باب مصیر الولاء لمن اُعتق، حدیث نمبر:۱۹۔

(۲) اسلام میں غلامی کی حقیقت:۱۰۸۔

غلام ان کے ساتھ رہیں ان کے لئے یہ راستہ نکالا گیا کہ وہ اگر غلام کو کہہ دیں یا اس کے بارے میں وصیت کردیں کہ ان کی موت کے بعد وہ آزاد ہوجائے گا تو زندگی میں وہ ان کا غلام رہے گا، مالک کی موت کے بعد وہ آزاد ہوجائے گا، اس عمل کو "تدبیر" اور اس غلام کو "مدبر" کہا جاتا تھا، یہ صورت خاص طور پر لوگوں کے لئے وجہ ترغیب بنا کرتی ؛ کیوں کہ ایک طرف پوری زندگی غلام کی خدمت حاصل رہتی تھی اور دوسری طرف یہ ان کے لئے باعث ثواب ہوتا تھا، پھر مدبر کے سلسلے میں غلام کی زیادہ رعایت کی گئی، مثلاً ایک غلام چار افراد کے درمیان مشترک ہے اور ان میں سے ایک نے اپنے حصہ میں غلام کو مدبر بنادیا تو اب بقیہ حصہ داروں کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے حصۂ غلامی کو اس پر باقی رکھیں ؛ بلکہ غلام آزاد ہوجاتا تھا اور دوسرے لوگوں کو صرف یہ حق ہوتا تھا کہ وہ مدبر بنانے والے سے اپنے اپنے حصہ کا معاوضہ وصول کرلیں۔

اُمِ ولد

مالک نے اگر اپنی باندی کا کسی دوسرے سے نکاح نہ کیا ہو تو اس کے لئے اس سے صنفی تعلق جائز تھا، اگر باندی کو اولاد ہوگئی خواہ صحیح سالم بچہ پیدا ہوا یا ناقص یا اسقاط ہوگیا ہر صورت میں مالک کے لئے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اب اسے کسی اور سے فروخت کرے یا کسی کو ہبہ کردے ؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں :

> عن بيع امهات الاولاد وقال لا يبعن ولا يوهبن ،
> ولا يؤذن يستمتع بها اليد مادام حيا واذا مات فهي
> حرة۔ (۱)

لوگ اس لئے کہ کہیں باندی اُم ولد نہ ہوجائے اپنی باندیوں سے عزل کیا کرتے تھے؛ تاکہ وہ ماں نہ بن جائیں تو رسول اللہ ﷺ نے عزل کو ناپسند فرمایا۔

---

(۱) سنن دار قطنی، کتاب المکاتب، حدیث نمبر: ۴۲۴۷۔

پھر اپنی باندی سے جو بچے پیدا ہوتے تھے، وہ حقوق میں ان بچوں کے بالکل برابر ہوتے تھے جو آزاد منکوحہ سے پیدا ہوئے ہوں۔

کفارہ کی شکل میں غلام کی آزادی

(۲) غلاموں کو آزاد کرنے کی دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ مختلف گناہوں کے لئے جو کفارات مقرر کئے گئے، ان میں نہ صرف غلام کے آزاد کرنے کو شامل کیا گیا؛ بلکہ ترجیحی بنیاد پر سب سے پہلے غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔

● اگر کسی شخص سے قتل کا ارتکاب ہو جائے تو ایک غلام کو آزاد کیا جائے: ''مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ''۔ (النساء: ۹۲)

● اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں اور بہن سے تشبیہ دیدے، جس کو اسلامی اصطلاح میں ''ظہار'' کہا جاتا ہے، جس میں بیوی سے صنفی تعلق حرام ہوتا ہے، جب تک کفارہ ادا نہ کرلے، کفارہ میں سب سے پہلے جس چیز کو ذکر کیا گیا، وہ ہے غلام کو آزاد کرنا۔ (۱)

● اگر کوئی شخص قسم کھالے اور پھر اسے پورا نہ کر پائے تو اس پر بھی کفارہ واجب ہے اور کفارہ میں غلام کو آزاد کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔ (المائدۃ: ۸۹)

● بلکہ بعض چھوٹے گناہوں کے لئے بھی غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا :

> من لطم ملوکه او ضربه فکفارته أن یعتقه۔ (۲)
>
> جس کسی شخص نے اپنے غلام کو طمانچہ مارا، یا اسے زدوکوب کیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے تصور دیا کہ اپنے بزرگوں کے ایصالِ ثواب کے لئے غلام

---

(۱) المجادلۃ: ۳، ترمذی، باب ماجاء فی کفارۃ الظہار، حدیث نمبر: ۱۲۰۰۔

(۲) موطا مالک، باب عتق الحی عن المیت، حدیث نمبر: ۱۳۔

آزاد کرنا چاہیے؛(۱) چنانچہ حضرت سعد بن عبادہؓ جو قبیلۂ خزرج کے سردار تھے، انھوں نے عرض کیا کہ میری ماں عمرۃ بن مسعود کا انتقال ہوگیا، جب کہ اور میں اس وقت غزوۂ اُحد و دومۃ الجندل میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک تھا، اب میں اس کی طرف سے کوئی غلام آزاد کردوں تو اس کو اس کا اجر ملے گا یا نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں، اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کی وفات ہوئی تو اُم المومنین کو بہت صدمہ ہوا، انھوں نے اپنے بھائی کی طرف سے بہتر غلام آزاد کیے، (۲) حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں شریک تھے، ہم نے آپس میں ذکر کیا کہ ہمارا فلاں دوست مر گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے غلام آزاد کردو، اللہ تعالیٰ غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس کا ہر عضو بخش دے گا۔

اسی طرح غیر معمولی واقعات کے پیش آنے کے وقت بھی آپ ﷺ نے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا؛ چنانچہ جس طرح سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، اسی طرح غلاموں کو آزاد کرنے سے متعلق بھی ارشاد فرمایا گیا، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماء سے روایت ہے:

امر النبی صلی الله علیه وسلم بالعتاق فی کسوف الشمس۔

رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ سورج گرہن کے وقت غلام آزاد کیا جائے۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث حضرت اسماءؓ سے مروی ہے جس میں فرمایا گیا: "کنا نؤمر عند الخسوف بالعتاق" (۳) ہم کو حکم دیا جاتا تھا کہ چاند گرہن کے وقت غلام آزاد کریں، اسی طرح نماز استسقاء کے موقع پر بھی غلام کو آزاد کرنا مستحب ہے۔

(۱) مؤطا مالک، باب عتق الحی عن المیت، حدیث نمبر: ۲۲۶۲۔

(۲) مسند احمد، حدیث واثلۃ بن اسقع من الشامیین، حدیث نمبر: ۱۶۰۱۰۔

(۳) صحیح بخاری، باب ما یستحب من العتاقۃ فی الکسوف، حدیث نمبر: ۲۵۲۰۔

غلاموں کے حقوق

ایک طرف اسلام نے ایسی صورتیں پیدا کیں کہ زیادہ سے زیادہ غلاموں کے آزاد ہونے کی صورت بنے، دوسری طرف اگرچہ غلام کے حقوق فی الجملہ دوسرے درجہ پر رکھے گئے؛ لیکن ان کو تمام انسانی حقوق دیئے گئے؛ چنانچہ :

(۱) اگر کوئی شخص غلام کا قتل کردے، خواہ قتل کرنے والا کوئی آزاد شخص ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا اور وہ بھی اس کے بدلے قتل کردیا جائے گا؛ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے :

کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی ۔ (البقرۃ:۱۷۸)

ایک اور موقع پر فرمایا گیا کہ ایک جان کے بدلے جان لی جائے گی :

وَكَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيۡهَآ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۔ (المائدۃ:۴۵)

ان آیات میں آزاد اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے فقہاء احناف اس بات پر متفق ہیں کہ :

یقتل الحر بالعبد والعبد بالحر ۔

آزاد کو غلام کے بدلے میں اور غلام کو آزاد کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا تو ہم اس پر قتل کی سزا جاری کریں گے اور اگر اپنے غلام کی ناک کاٹے گا تو ہم اس کو ناک کاٹنے کی سزا دیں گے :

من قتل عبدہ قتلناہ و من جدع جدہ عناہ ۔ (۱)

جو اپنے غلام کو قتل کرے گا، ہم اس کو قتل کریں گے، اور جو اپنے غلام کی ناک کاٹے گا، ہم اس کی ناک کاٹیں گے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، باب من قتل عبدہ أو مثل بہ، حدیث نمبر: ۴۵۱۵۔

لوگ غلام کو خصی کردیا کرتے تھے، جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عورتوں کے درمیان ان کے جانے میں، بھیجنے میں اور خدمت لینے میں سہولت ہو اور ان سے جنسی زیادتی کا کوئی خطرہ نہ رہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا اور کہا: جو کسی غلام کو خصی کرے گا، میں اس کو بھی یہی سزا دوں گا: ''من خصی عبدہ خصیناہ''۔(۱)

حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ وہ جو بیت المال سے وظائف تقسیم کرتے تھے، اس میں آزاد اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں تھا؛ چنانچہ علامہ ابن اثیرؒ اپنی کتاب ''الکامل'' میں لکھتے ہیں :

> وکان یُسوّی فی قیمته بین السابقین الاولین والمتاخرین فی الاسلام وبین الحر والعبد والذکر والانثٰی۔ (۲)
>
> حضرت ابوبکرؓ بیت المال کی تقسیم میں برابری کرتے تھے، سابقین، اولین اور اسلام قبول کرنے کے اعتبار سے متاخرین میں اور آزاد میں اور غلام میں اور مرد میں اور عورت میں۔

(۲) جیسے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم دیا گیا، اسی طرح مالک کو اس بات کا مکلف کیا گیا کہ وہ غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرائے ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ''۔(النور:۳۲)

عرب میں بعض لوگ غلاموں کی شادی کردیتے تھے اور پھر جب چاہتے ان کے درمیان تفریق کرادیتے، جب ایک غلام نے آپ ﷺ سے اس کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا: ''لوگو! غلاموں کا نکاح کر کے ان میں تفریق کیوں کرتے ہو، نکاح وطلاق کا حق صرف شوہر کو ہے''۔(۳)

---

(۱) ابوداؤد، باب من قتل عبدہ اومثل بہ، حدیث نمبر:۴۵۱۶۔

(۲) الکامل فی التاریخ، ذکر بعض أخبارہ ومناقبہ:۲/۲۶۵۔

(۳) سنن ابن ماجہ، باب طلاق العبد، حدیث نمبر:۲۰۸۱۔

(۳) غلام کا نکاح ایک آزاد عورت سے بھی ہوسکتا ہے، اس کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ آپ ﷺ نے اپنے غلام زید بن حارثہؓ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ سے کردیا۔

(۴) غلام ایک آزاد شخص کی نماز میں امامت کرسکتا ہے۔

(۵) جیسے آزاد شخص کی روایت محدثین کے یہاں مقبول ہے، اسی طرح غلام کی روایت بھی مقبول ہے۔

(۶) جیسے ایک آزاد شخص کی گواہی معتبر ہوتی ہے، اسی طرح ایک غلام کی گواہی بھی معتبر ہے اگر وہ ایک اچھا آدمی ہو؛ چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا: ''ما أعلم احداً رد شهادة العبد''(۱) مجھ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے غلام کی گواہی کو رد کردیا ہو۔

(۷) آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ جو خود کھاؤ، وہی غلام کو کھلاؤ، اور جو خود پہنو، وہی غلام کو پہناؤ :

> هم إخوانكم جعلهم الله تحت أيديكم ، فمن جعل الله أخاه تحت يده ، فليطعمه مما يأكل ويلبسه مما يلبس ولا يكلفه من العمل ما يغلبه فإن كلفه مايغلبه فيلعنه عليه ۔ (۲)
>
> غلام تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے قبضہ میں کردیا ہے، پس جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو، اس کو چاہئے کہ جو خود کھائے، اس کو بھی کھلائے، اور جو خود پہنے، وہی اس کو بھی پہنائے، اور اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس پر شاق ہو، اور اگر دے تو اس کی اعانت کرے۔

---

(۱) البحر المحیط فی التفسیر: ۲/۲۷۷۔

(۲) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۵۰۔

(۸) اسی طرح غلاموں کی تعلیم وتربیت بھی اس کے مالک کے ذمہ ہے، اور صحابہ اس پر برابر عمل کیا کرتے تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن کو دہرا اجر ملے گا، ایک وہ جو اپنی باندی کو تعلیم دے اور خوب اچھی تعلیم دے، اس کو ادب سکھائے اور خوب سکھائے اور پھر اسی کو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کر لے، دوسرا وہ شخص جو اہل کتاب تھا اور پھر اسلام لے آیا، تیسرا وہ شخص جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے سید کی خیر خواہی بھی کرتا ہے۔

جب باندیوں کی تعلیم وتربیت کا حکم ہے؛ حالاں کہ عورتوں کی تعلیم کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے تو غلاموں کے لئے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۹) اس طرح آپ ﷺ نے غلاموں اور باندیوں کے ساتھ عمومی حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے، یا تو رومیوں اور یونانیوں کی تہذیب تھی، جس میں غلاموں کو درندوں سے لڑایا جاتا تھا، یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شان ہے کہ اگر یہ واقعہ سامنے آتا کہ فلاں شخص نے اپنے غلام یا باندی کو تھپڑ مارا ہے تو آپ ﷺ حکم دیتے کہ اسے آزاد کر دو، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور صحابہ کے تذکرے میں کتنے ہی ایسے واقعات آئے ہیں، آپ ﷺ غلاموں کی غلطی پر درگذر کرنے کی کس قدر تاکید فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ یارسول! ہم غلام سے کتنی مرتبہ درگزر کریں؟ آپ ﷺ یہ سن کر خاموش رہے، اس نے تیسری مرتبہ پھر سوال کا اعادہ کیا، اب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اعفوا عنه في كل يوم سبعين مرة''(۱) ''ہر روز اس سے ۷۰ مرتبہ درگزر کرو''۔

(۱۰) اسی طرح اس بات سے منع کیا گیا کہ غلام کو لعنت ملامت کرے، ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے ایک دوست سے ملنے آئے جو اس وقت وہاں موجود نہ تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے دوست کی بیوی سے پانی طلب کیا، انھوں نے اپنی لونڈی کو بھیجا کہ پڑوس سے دُودھ لے آئے، اتفاقاً اس کو آنے میں دیر ہوئی، بی بی نے غصہ میں آکر اس پر

(۱) سنن ابی داؤد، باب فی حق المملوک، حدیث نمبر: ۵۱۶۴۔

لعنت بھیجنی شروع کردی، حضرت ابن مسعودؓ یہ سن کر فوراً گھر سے نکل آئے، ان کے دوست آئے تو کہنے لگے: "آپ سے کیا پردہ تھا گھر میں آکر بیٹھتے، کچھ کھاتے پیتے" بولے: "سب کچھ کرلیا، مگر آپ کی بیوی نے باندی غریب پر لعنت بھیجی اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: "اگر لعنت اس شخص کو کی جائے جو لعنت کا مستحق نہ ہو تو لعنت لوٹ کر لعنت بھیجنے والے پر ہی پڑ جاتی ہے۔(۱)

خلاصۂ بحث

حاصل یہ ہے کہ نہ اسلام نے غلامی کی رسم کو ایجاد کیا اور نہ اس کو فروغ دیا، غلامی کی رسم دنیا کی قدیم تہذیبوں، روم، یونان، ایران اور قدیم مذاہب ہندومت، یہودیت میں پہلے سے موجود تھی، اسلام نے اس بناء پر اس کو جاری رکھا گیا کہ اس کو اچانک ختم کردینا سخت معاشی، سماجی اور فوجی دشواریوں کا باعث ہوتا؛ لیکن اس نے تین طریقہ سے اس کی اصلاح کی:

(۱) یہ کہ آئندہ کسی شخص کے غلام بننے کو جنگی قیدی کی صورت تک محدود کردیا۔

(۲) غلام کے آزاد کرنے کی مختلف جہتوں سے ترغیب دی گئی اور کثرت سے غلام آزاد کئے گئے۔

(۳) غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کی نہ صرف ترغیب دی گئی؛ بلکہ قانونی طور پر بھی ان کے حقوق کو تحفظ دیا گیا۔



---

(۱) اسلام میں غلامی کی حقیقت: ۱۴۴۔

مشرکین کو ناپاک کہنا

قرآن مجید میں ایک جگہ شرک کرنے والوں کو ناپاک کہا گیا ہے، ہمارے بعض ہندو بھائی جو اس کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں، ان کو اس پر سخت اعتراض ہے؛ اس لئے ضروری وضاحت کی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت میں مشرکین کو ناپاک کہا گیا ہے وہ اس طرح ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔ (التوبۃ:۲۸)

اے ایمان والو! بے شک مشرکین (اپنے عقیدہ میں) ناپاک ہیں؛ اس لئے وہ اِس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب بھی نہ آئیں، اور اگر تمہیں اِفلاس کا اندیشہ ہو تو اگر اللہ چاہیں تو اپنے فضل سے تم کو عنقریب محتاج نہیں رکھیں گے، بے شک اللہ خوب جانتے ہیں اور بڑی حکمت والے ہیں۔

اس آیت کے سلسلہ میں چند نکات ملحوظ رکھے جانے چاہئیں :

(۱) یہاں مشرک سے صرف بت پرست (مورتی پوجک) مراد نہیں ہیں، جیسا کہ وی، ایچ، پی والے اور ہندو انتہاء پسند اسی کا ترجمہ کرتے ہیں؛ بلکہ وہ تمام لوگ شامل ہیں، جو خدا کی ذات یا اس کی مخصوص صفات و اختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائیں، خواہ وہ بت کا پرستار ہو، یا کسی پیغمبر کو خدا کا درجہ دیتا ہو، یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو خدا کی قدرت و اختیار میں

سا جھے دار سمجھتا ہو، جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؛ لیکن انھوں نے خدانخواستہ غیر اللہ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہو اور رسول اور اولیاءؒ کی ذات میں وہ اختیارات مانتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، تو وہ بھی مشرک کا مصداق ہیں۔

(۲) مشرکین کو ''ناپاک'' کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، ان کے کپڑے ناپاک ہیں، یا ان کا جھوٹا ناپاک ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، خود ان کی دعوت قبول فرمائی ہے، مسجدِ نبوی میں ان کو ٹھہرایا ہے، اپنے بستر پر انھیں بٹھایا اور سلایا ہے، اگر انھیں جسمانی اعتبار سے ناپاک سمجھا جاتا تو کس طرح آپ ﷺ ایسا عمل فرماتے؛ اس لئے یہاں عقیدہ اور فکر کی ناپاکی مراد ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ناپاک عزائم رکھتا ہے، یا آپ کہتے ہیں کہ فلاں دہشت گردوں کے ناپاک منصوبے ہیں، یہاں ناپاکی سے عمل اور سوچ کے غلط ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے، گویا اس آیت میں شرک کے نہایت غلط اور خلافِ واقعہ عمل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی صرف اسلام ہی نے نہیں کی ہے؛ بلکہ یہ تمام ہی مذاہب کی اصل تعلیمات ہیں، بائبل میں جگہ جگہ شرک کی مذمت آئی ہے اور ہمارے عیسائی بھائی جو آج تین کے مجموعہ (Trinity) کو خدا مانتے ہیں، ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے بائبل کا کوئی صریح فقرہ موجود نہیں ہے، اس لئے وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ تین مل کر ایک ہی ہیں، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی خدا کے بارے میں بہ تاکید وحدانیت کا ذکر ہے، شرک کی نفی ہے، کہا گیا ہے کہ خدا جسم والا نہیں ہے، وہ تنہا پورے عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں بت پرستی کی تردید میں ہندو مذہبی کتابوں کے جو حوالے نقل کئے ہیں، وہ بہت ہی چشم کشا ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل ہندو مذہب توحید ہے نہ کہ شرک، اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ویدوں کے چند حوالے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

- وہ محیط، پاک اور جسم سے خالی ہے۔ (یجر وید: ۴۰:۸)

• میں افضل ترین قوت ونعمت کا منبع، سورج کی طرح تمام عالم کو منور کرتا ہوں، میں نہ کبھی مغلوب ہوتا ہوں اور نہ مرتا ہوں، یہ تمام عالم جو نعمتوں کا مخزن ہے اس کا خالق میں ہوں، تم مجھے ہی اس دنیا کا خالق اور مبتدا سمجھو، اے اہل علم! تم نعمت وحشمت کے حصول کے لیے کوشاں رہ کر علم وغیرہ نعمتوں کے لئے مجھ ہی سے التجا کرو، میری رفاقت سے کبھی روگرداں نہ ہو۔ (رگ وید: ۵:۴۸:۱۰)

رگ وید ہی کے یہ ارشادات کس قدر بصیرت مندانہ اور عقیدۂ توحید کے بارے میں واضح ہیں :

اے بنی نوع انسان! میری حقیقی حمد وثنا راست گوئی ہے، ایسی حمد کرنے والے انسان کو میں ازلی علوم وغیرہ نعمتیں عطا کرتا ہوں...... اس لئے عالم میں جو اشیاء موجود ہیں، ان کا خالق اور قیوم میں ہوں، اس لئے تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت مت کرو اور نہ کسی کو میری جگہ معبود مانو اور جانو۔ (اتھروید: ۱۰/۴۹:۱)

پنڈت سرسوتی جی نے کینو پنشد (۱:۶) کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

جسے آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا؛ بلکہ آنکھ جس کی قدرت سے دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسے ہی تم خدا سمجھو، آنکھ سے دکھلائی جانے والی جن چیزوں کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ خدا نہیں ہیں۔

ہندو مذہب کی اہم معتبر کتابوں کی عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا ہی اصل ہندو دھرم ہے، تو مشرکوں کو ناپاک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو ہندو کہے اور اصل مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو یہودی کہے اور اصل یہودی مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو عیسائی کہے اور حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کی اصل تعلیمات پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو، وہ اپنے خیال وعقیدہ کے اعتبار سے ناپاک ہیں۔

(۴) جولوگ کسی دھرم کا نام لیتے ہوں اور اس کی اصل تعلیم پر عمل نہ کرتے ہوں، ان کو ہر مذہب میں عقیدہ کے بگاڑ کے اعتبار سے خراب نام دیئے گئے ہیں، جن لوگوں نے بائبل کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے خوب واقف ہیں کہ اس کتاب میں بہت سے مواقع پر شرک کرنے والے کو کسبی، فاحشہ، زانی، بدکار وغیرہ کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، دھرم پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان فرق ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی زیادہ سخت لب ولہجہ میں ملتا ہے ''دسیو'' اور ''داس'' کے نام سے ہندوستان کے اصل کالے باشندوں کو ویدوں میں یاد کیا جاتا ہے، جو آریہ لوگوں کے مذہب پر نہیں تھے، اس قوم کے بارے میں ویدوں کے کلمات ملاحظہ کیجئے :

- ہمارے گردوہ دسیو ہیں جن کا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج۔ (رگ وید:۱۰:۲۲:۲:۸)
- اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کرلیا۔ (رگ وید:۷:۴۹:۴)
- تو اپنے ہتھیار سے ننگے دسیوں کو قتل کرتا ہے۔ (رگ وید:۵:۲۹:۱)

کہیں ان لوگوں کو ''سیاہ رو'' مخلوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، (رگ وید:۶:۲۱) کہیں انھیں ''گھن کھائے درخت'' کہا جاتا ہے، (رگ وید:۸: ۴:۶) کہیں ''کالے غولوں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، (سام وید: ۴: ۲: ۴:۱۱) ویدوں میں اَدھرمی لوگوں کے لئے حریص راکشش اور خبیث دشمن وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔

اب انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کہ قرآن نے تو ایک جگہ مشرکین کو ناپاک کہا ہے؛ لیکن ویدیں اس مذہب کے مخالفین کو خبیث، بیل جیسے جبڑے والے، ننگے، سیاہ رو، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، بدذات، پاپی، حریص، راکشش وغیرہ کے الفاظ بے تکلف کہتی

ہیں؛ بلکہ اتھر وید میں آدھرمی لوگوں کے لیے بعینہٖ ''ناپاک'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے :

> یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لئے اٹھیں، توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انھیں مار گرا، مردار خوار چنکبرے گدھ اسے کھائیں، اس ''پلید'' کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال۔(اتھر وید:۸: ۳: ۶-۷-۱۰)

(۵) یہ تو وہ القاب ہیں جو اَدھرمی لوگوں کو دیئے گئے ہیں؛ لیکن منو جی کی تعلیمات میں عقیدہ و فکر کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ نسل و خاندان کی بنیاد پر شودروں کو نہایت ذلیل و حقیر القاب دیئے گئے ہیں اور ان کے بارے میں وہ احکام دیئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شودر جسمانی طور پر پیشاب، پائخانہ کی طرح ناپاک اور قابل اجتناب ہیں، اس سلسلہ میں میں ہندو مآخذ میں اتنا کچھ ہے کہ اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک رسالہ بھی ناکافی ہے، چند نمونے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

- ہاتھی، گھوڑے، شودر قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تیندوے اور سور (پنر جنم کے) وہ ادنیٰ درجے ہیں، جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔(منوسمرتی: ۴۳: ۱۲)
- شودر کا کھانا نہ کھائے۔(منوسمرتی: ۲۱۱: ۴)
- شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے نرک (دوزخ) میں چلا جاتا ہے۔(منوسمرتی ۱۷: ۳)
- اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک اُپاس کرے (بھوکا رہے)، اور اگر جان بوجھ کر کھالے تو اس کا کفارہ وہی ادا کرے جو حیض، پائخانہ، یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے۔(منوسمرتی: ۲۲۲: ۴)

● غذا سور کی بد بو سے، کتے کی نظر سے اور شودر کے چھونے سے
گندی ہو جاتی ہے۔ (منوسمرتی: ۲۹۱:۳)

ان تصریحات سے جو نہ صرف منوشاستر میں ہیں؛ بلکہ ایسی بعض عبارتیں خود ویدوں میں بھی موجود ہیں، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانیت کے ایک طبقہ کو ہندو مذہب کے موجودہ ماخذ کی روایت کے مطابق کس نظر سے دیکھا گیا ہے؟

● ● ●

اسلام کی پُر امن اشاعت، ایک مختصر جائزہ ☆

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فرمایا ہے کہ: ''یَآاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' (المائدۃ:٦٧) آپ اللہ کا پیغام پہنچائیے، لوگوں سے آپ کو اللہ بچائے گا، اس سے علماء نے یہ سمجھا اور استنباط کیا ہے کہ جیسے پیغام ربانی کی تبلیغ آنحضرت کے لئے لوگوں کے شر سے بچنے کی وجہ تھی، ویسے ہی اگر مسلمان بھی اشاعت اسلام کے کام میں لگیں گے تو اللہ اس اُمت کی بھی دوسری قوموں کے شر سے حفاظت کرے گا اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان چودہ صدیوں میں جب کبھی کمزور پڑے، تو دعوت وتبلیغ کے کام سے ہی ان کو عروج ملا، تاتاریوں کا حملہ اس زور کا تھا کہ لگتا تھا کہ مسلمانوں کے دن گن چکے ہیں؛ لیکن تبلیغ ودعوت اسلام کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں تاتاری مسلمان ہوگئے اور پھر انھوں نے حرم کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا، یہی واقعہ سلجوقیوں کے ساتھ بھی پیش آیا کہ وہ بھی ابتداء میں مسلمانوں کے لئے زحمت اور بعد میں رحمت بنے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تاریخ ادبیات عرب کے مشہور مصنف پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے :

> مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے۔ (تاریخ ادب عربی: ۴۸۸)

اور ٹی ڈبلیو آرنلڈ لکھتے ہیں :

> اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے بعض انتہائی شاندار اور روحانی فتوحات حاصل کی ہیں، دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی

☆ مولانا محمد عبید اختر رحمانی (نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)۔

> کافروں نے اپنے پاؤں محمد (ﷺ) کے پیروں کی گردن پر رکھ دیئے تھے، گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرہویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔(۱)

عہد نبوی میں اشاعت اسلام

اشاعت اسلام کی ابتداء حضرت خدیجہؓ سے ہوتی ہے، حضرت خدیجہؓ کو معلوم ہے کہ ان کے شوہر کتنے پاکباز اور سچے ہیں؛ لہٰذا وہ کسی قسم کے حیل و حجت کے بغیر اسلام لے آتی ہیں، آپ کے دوست حضرت ابوبکر آپ کی بات سن کر ایمان قبول کر لیتے ہیں، حضرت ابوبکر کی تبلیغی مساعی سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت طلحہؓ اور دیگر مقتدر شخصیات اسلام قبول کرتی ہیں، (۲) اسد الغابہ میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر عشرہ مبشرہ میں سے پانچ افراد نے اسلام قبول کیا، تاریخ خمیس میں ان افراد کے علاوہ حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد اور ارقم بن الارقم کا نام ملتا ہے، جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے کہنے سننے سے اسلام قبول کیا تھا (۲۸۷)، سیرت ابن ہشام میں ان افراد کے علاوہ مزید کچھ نام ملتے ہیں، علاوہ ازیں سیرت ابن ہشام میں یہ بھی مذکور ہے کہ اسلام قبول کے بعد حضرت ابوبکر نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کو ہی اپنا کام بنالیا تھا، اپنے ملنے جلنے والوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے، (۳) حضرت علیؓ باجود صغرسنی کے اسلام قبول کرکے آپ کا ساتھ دینے کا اعلان کرتے ہیں، (۴) حضرت حمزہ ابوجہل کے برتاؤ کے ردعمل میں اسلام قبول کرتے ہیں، (۵) حضرت عمرؓ

---

(۱) پریچنگ آف اسلام:۲۔

(۲) الاستیعاب:۳/۶۹۹۔

(۳) سیرت ابن ہشام:۱/۲۴۹۔

(۴) سیرت ابن اسحاق:۷/۱۴۳۔

(۵) سیرت ابن ہشام:۱/۲۹۱۔

تو نعوذ باللہ حضور کے قتل کے لئے جاتے ہیں؛ لیکن صیاد خود صید ہو جاتا ہے اور حضرت عمر اسلام کا کلمہ پڑھ کر لوٹتے ہیں، حضرت طفیل دوسی قرآن سن کر اسلام قبول کر لیتے ہیں، مدینہ سے کچھ افراد آتے ہیں، حضور کی باتیں اور قرآن سنتے ہیں تو اسلام قبول کرنے کی جانب سبقت کرتے ہیں، (۱) حضرت مصعب بن زبیر کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کے لئے بھیجا جاتا ہے، ان کے ہاتھوں پر حضرت اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ اسلام قبول کر لیتے ہیں، (۲) یہ دونوں چوں کہ اپنی قوم کے سردار بھی ہیں؛ لہٰذا ان کی فرمائش وفہمائش پر ان کے قبیلہ کے سارے آفراد اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ (۳)

حضرت قیس بن یزیدؓ ممتاز صحابی ہیں، ان کی دعوت پر ان کی قوم نے اسلام قبول کر لیا تھا، (۴) اسی طرح قیس اسلمی کے تذکرہ میں ہے "وہ اسلام لا کر پلٹے تو کہا کہ اے بنو سلیم، میں نے روم کے افراد کے حالات زندگی، عرب کاہنوں اور حمیر کے بہادروں کے اشعار سنے: لیکن محمد کا کلام ان سب سے الگ ہے، محمد کے معاملے میں میری بات مانو؛ کیوں کہ تم ان کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہو، (۵) ایک صحابی کسی چشمہ کے مالک تھے، جب وہ اسلام سے مشرف ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم کو اسلام لانے کے لئے سو اونٹ دیئے، (۶) حضرت قیس بن غزیہ کے حالات میں ہمیں ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی۔ (۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض افراد کو اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کی جانب بھی مامور فرمایا تھا: مثلاً حضرت ابوذر غفاری کو اپنی قوم کی جانب اسلام کی دعوت دینے کی جانب روانہ فرمایا، (۸) حضرت طفیلؓ دوسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کی جانب اسلام کی دعوت دینے کے لئے روانہ فرمایا؛ چنانچہ ان کی دعوت پر ان کی قوم نے اسلام قبول کر لیا، (۹) اس کے علاوہ

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۸۲۔
(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۳۴۔
(۳) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۳۵۔
(۴) اسد الغابہ: ۴/ ۴۲۹۔
(۵) اسد الغابہ: ۴/ ۴۲۷۔
(۶) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۹۳۴۔
(۷) اسد الغابہ: ۴/ ۴۱۸۔
(۸) الطبقات الکبریٰ، ابن سعد: ۴/ ۲۲۲۔
(۹) معرفۃ الصحابہ لابی نعیم: ۳/ ۱۵۶۲۔

بعض صحابہ کرام کا نام اُسوہ صحابہ کے مولف مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی ذکر کیا ہے، اسے ذکر کیا جاتا ہے :

● حضرت مالک بن مرارہؓ : انھوں نے عک اور ذی خیوان کو اسلام کی دعوت دی اوران کی قوم نے اسلام قبول کرلیا۔

● حضرت احنف بن قیسؓ : رسول اللہ ﷺ نے ان کو قبیلہ بنو لیث میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے بھیجا۔

● حضرت عبداللہؓ بن عویجہ البجلی : آپ ﷺ نے ان کو قبیلہ بنی حارثہ کے پاس بھیجا۔

● حضرت محیصہ بن مسعود: آپ ﷺ نے ان کو اہل فدک کی ارشاد وہدایت کے لئے بھیجا۔

● حضرت عمروؓ بن العاص : ان کی ننہیال قبیلہ بلی میں تھی جو بدوؤں کا قبیلہ تھا، اس تعلق سے بدوان سے مانوس تھے؛ لہٰذا ان میں تبلیغ واشاعت اسلام کے لئے بھیجا۔

● حضرت مالک بن احمرؓ : اسلام لانے کے بعد انھوں نے درخواست کی کہ اپنے قبیلہ میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے انھیں ایک خط لکھ دیا جائے۔

● حضرت ابوزید انصاری : آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ سے عبید وجعفر کو اسلام کی دعوت دی، ان دونوں نے مشرف بہ اسلام ہوکر وہاں کے تمام عرب کو اسلام کی دعوت دی، سبھی نے اسلام قبول کرلیا۔

● حضرت علاءؓ بن عبید الحضرمی : آپ ﷺ نے ان کو بحرین میں بھیجا کہ وہاں کو لوگوں نے اسلام کی دعوت دیں، منذر بن ساوی اور سی بخت کے نام خصوصیت کے ساتھ خط دیا، وہ دونوں مسلمان ہوئے اوران کے اثر سے وہاں کے تمام عرب اور بعض عجم نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

● حضرت معاذؓ بن جبل : آپ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا اور یمن والوں کو اسلام کی دعوت دینے اور اسلامی احکام سے آگاہ کرنے کی تاکید کی۔

اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو بھیجا جیسا کہ بعض مقامات پر آپ نے حضرت علیؓ کو روانہ فرمایا، حضرت خالد بن ولیدؓ اور دیگر صحابہ کرام کو روانہ فرمایا۔

جب مکہ فتح ہوگیا تو عرب کے قبائل خود اپنے نمائندگان آپ کے پاس بھیجنے لگے، کہ وہ آپ کے پاس آکر اسلام کے احکام وفرائض سے آگاہ ہوں اور واپس آکر ان کو مسلمان کرلیں۔(۱)

بنوتمیم کے وفد نے آپ ﷺ سے شاعری اور خطابت میں زور آزمائی چاہی؛ لیکن شاعری اور خطابت دونوں میں ہی مسلمان غالب رہے، یہ دیکھ کر بنوتمیم کے وفد نے اور ان کے اثر سے بنوتمیم نے اسلام قبول کرلیا۔

مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تبلیغ اسلام کے کام میں دوش بدوش شریک رہتی تھیں، حضرت اُم شریک مکہ کی عورتوں کو خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دیتی تھیں، جب کفار مکہ کو ان کی تبلیغی کوششوں کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو مکہ سے نکال دیا،(۲) حضرت طلحہؓ، حضرت اُم سلیمؓ کے کہنے سے اسلام لائے،(۳) حضرت عکرمہؓ اپنی بیوی اُم حکیمؓ بنت الحارث کے کہنے سننے سے یمن سے واپس لوٹے اور اسلام قبول کیا۔(۴)

یہ چند واقعات محض نمونہ کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں، ورنہ تو پیغمبر اسلام کی سیرت کا ہر صفحہ پرامن تبلیغ اسلام سے عبارت ہے، ان کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جہاں آپ نے کسی کو زبردستی مسلمان کیا ہو، یا جبر واکراہ سے کام لیا ہو؛ بلکہ ہر جگہ ہم یہی پاتے ہیں کہ کسی نے آپ کے اعلیٰ اخلاق وکردار، کسی نے عفوودرگذر اور کسی نے بخشش وسخاوت دیکھ کر اور کچھ افراد نے کلام الٰہی سن کر، کچھ نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا۔

---

(۱) فتح الباری: ۲۹۸/۱۰۔
(۲) اسد الغابہ، تذکرہ اُم شریک۔
(۳) الطبقات الکبریٰ: ۴۲۶/۸۔
(۴) معرفۃ الصحابہ لابی نعیم: ۲۱۷/۴۔

اس کے علاوہ مکہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس کی بنیاد پر اہل مکہ کو ڈرایا جا سکتا تھا اور زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا؛ بلکہ مکہ میں تو مسلمان خود مجبور، مقہور اور بے بس تھے، ان پر قبول اسلام کی وجہ سے ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، مشہور یورپی مصنف ٹامس کارلائل نے اس کا پرزور اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے :

> یہ بات بہت کہی گئی ہے کہ محمد نے اپنا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا، تلوار یقیناً، مگر آپ تلوار کہاں سے لائیں گے، ہر نیا فکر اپنے آغاز میں لازمی طور پر ایک اقلیت میں ہوتا ہے، وہ ابتداءً صرف ایک انسان کے دماغ میں آتا ہے، ساری دنیا میں صرف ایک آدمی اس کو ماننے والا ہوتا ہے، تمام آدمیوں کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی، ایسی حالت میں اگر وہ ایک تلوار لے اور اس کے ذریعہ سے اپنے عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔(۱)

حضور پاک ﷺ کی زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا، جس میں آپ نے کسی کو اسلام لانے پر مجبور کیا ہو، اس کو بزور تلوار کلمہ پڑھایا ہو، یا اس سلسلے میں جبر واکراہ سے کام لیا گیا ہو۔

عہد صحابہ میں اشاعت اسلام

صحابہ کرام کے دور میں بھی اسلام کی پُرامن تبلیغ و اشاعت کا کام جاری رہا، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مثنی بن حارثہ نے کسی کے کہے سنے بغیر اسلام قبول کرلیا اور ان کے اثر سے ان کی قوم کے بہت سے افراد نے بھی اسلام قبول کرلیا، حضرت ابوبکرؓ سے ان امیر العسکر بنا دینے کی گذارش کی گئی، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایک اجازت نامہ لکھ کر دے دیا، اس کے بعد انھوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا،

---

(۱) دی ہیرو آف پروفٹ: ۲۳، ترجمہ: مولانا وحید الدین خان، دین کامل۔

انھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے عراق پر حملہ کیا تو عراق میں آباد ربیعہ وغیرہ عربی قبائل سب کے سب مسلمان ہو گئے۔(۱)

حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کے اسلام کی بھی تیز رفتار اشاعت ہوئی، مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں :

> سیاہ اسواری یزدگرد کے مقدمۃ الجیش کا بڑا افسر تھا، یزدگرد جب اصفہان کے لئے روانہ ہوا تو سیاہ کو تین سو سواروں کے ساتھ جن میں ستر افراد سردار تھے، اصطخر کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ ہر شہر سے اپنے ساتھ سپاہی کا انتخاب کر کے لیتا چلے، اصطخر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے سوس کا محاصرہ کیا ہے، اس لئے یزدگرد نے سیاہ کو سوس بھیج دیا، جب سوس فتح ہوگیا تو سیاہ نے تمام سرداروں کو جمع کر کے کہا، ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ قوم اس سلطنت پر غالب ہوجائے گی، اور اصطخر کے محل ان کے گھوڑوں کے اصطبل بن جائیں گے، اب بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ ان کے مذہب میں داخل ہوجائیں؛ چنانچہ وہ سب کے سب چند شرائط پر مسلمان ہوگئے اور ان کے ساتھ سیابجہ، زط اور اندغار نے بھی جو ہندوستانی قومیں تھیں، اسلام قبول کرلیا۔(۲)

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر کے بعض قصبات کے لوگوں کو لونڈی غلام بناکر عرب میں بھیجا اور وہ فروخت ہوکر عرب میں پھیل گئے تو حضرت عمرؓ نے ان کو ہر جگہ سے بلاکر مصر بھیج دیا اور لکھا کہ ان کو اختیار ہے، خواہ اسلام لائیں، خواہ اپنے مذہب پر قائم رہیں؛ چنانچہ ان میں بلہیب کے رہنے والے کل کے کل مسلمان ہوگئے، ان کے علاوہ بھی بہت سارے قیدیوں نے اسلام قبول کیا، تاریخ طبری میں مذکور ہے، جب تمام قیدی اکٹھا ہوگئے تو عیسائیوں

---

(۱) طبری:۲۱۲۲۔ (۲) اُسوۂ صحابہ:۱۰/۱۳۵۔

کے سامنے ایک ایک قیدی کو لایا گیا اور اس کو عیسائیت پر قائم رہنے اور اسلام قبول کرنے کا اختیار دیا گیا، جب کوئی قیدی اسلام قبول کرتا تھا تو مسلمان اس زور سے تکبیر کا نعرہ مارتے تھے کہ کسی شہر کے فتح ہونے پر بھی تکبیر کی صدا میں یہ غلغلہ انگیزی نہیں پائی جاتی تھی؛ لیکن اگر وہ عیسائیت پر قائم رہتا تھا تو مسلمانوں کو اس قدر صدمہ ہوتا تھا کہ گویا کوئی آدمی خود ان کی جماعت سے نکل گیا ہے، ابومریم ایک عیسائی تھا جس کے سامنے یہ دونوں مذہب پیش کئے گئے، توفیق ایزدی نے اعانت کی، اور اس نے اسلام قبول کرلیا، مسلمانوں نے فوراً اس کو اپنی جماعت میں شامل کرلیا؛ لیکن ابومریم کے باپ، ماں اور بھائی بھی موجود تھے، انھوں نے اس کو اپنی طرف کھینچا اور باہم اس قدر کشمکش ہوئی کہ اس کے کپڑے پرزہ پرزہ ہوگئے۔(۱)

شطا مصر کا مشہور شہر ہے، وہاں کا رئیس پہلے ہی مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا تھا، جب اسلامی فوج دمیاط پہنچی تو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مسلمانوں سے جاملا اور مسلمان ہوگیا،(۲) اسلامی فوج جب آگے بڑھی تو بقارہ، اور درداوہ سے لے کر عسقلان تک ہر جگہ کثرت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ہر جگہ اسلام پھیل گیا۔(۳)

نومسلمانوں کی اتنی بہتات ہوئی کہ ان کو الگ الگ محلوں میں آباد کرنا پڑا، فسطاط میں تین محلے آباد کئے گئے جن میں دو محلے یونانی نومسلموں کے تھے اور ایک محلہ یہودی نومسلموں کا تھا۔

اسلام کی اشاعت کا قافلہ عہد عثمانی میں بھی رواں دواں رہا، عہد عثمانی میں جب آذر بائیجان والوں نے بغاوت کی اور اشعث بن قیس نے اس کو فتح کرکے ان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا تو وہاں بہت سے عرب آباد کرادیئے کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، ان لوگوں کی تبلیغی مساعی کا اثر یہ ہوا کہ جب اشعث بن قیس دوبارہ حضرت علیؓ کی جانب سے آذربائیجان کے گورنر مقرر ہوکر آئے تو ان میں اکثر لوگ مسلمان ہوکر قرآن مجید پڑھ چکے تھے۔(۴)

---

(۱) تاریخ طبری: ۲۵۸۳۔ (۲) مقریزی: ۱/۲۲۶۔

(۳) مقریزی: ۱/۱۸۴۔ (۴) فتوح البلدان: ۳۳۷۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بھی اشاعت اسلام کا کارواں تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، جب افریقہ پر فوج کشی کی گئی تو نافع بن قریشی نے فوج میں بربری قبائل کے ان افراد کو بھی شامل کیا جو اسلام قبول کر چکے تھے، اس فوج کے ساتھ جب نافع نے افریقہ کے شہروں کو فتح کیا تو مزید بہت سارے بربروں نے اسلام قبول کیا، معجم البلدان میں ہے :

واسلم علیٰ یدہ خلق من البربر وفشا فیھم دین اللہ حتی اتصل بلاد السودان۔

ان کے ہاتھ پر بہت سے بربر اسلام لائے اور ان میں خدا کا دین پھیل گیا، یہاں تک کہ سوڈان تک پہنچ گیا۔

مصر کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کو نہایت تیزی سے فتح کر لیا؛ مگر انھوں نے وہاں شدت کے ساتھ مذہبی رواداری پر عمل کیا، مصریوں کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ حکومتی سطح پر انھیں ترغیب بھی نہیں دلائی گئی، عرب حکمرانوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ عیسائی گرجا گھروں کو باقی رکھیں گے۔(۱)

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں :

مصر کے مسلم فاتحین نے عیسائیوں سے ساتھ کامل رواداری کا ثبوت دیا، اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مصری عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا مسلم حکمرانوں کی جانب سے کسی ظلم، یا نامنصفانہ دباؤ کا نتیجہ تھا۔(۲)

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا:۶/۴۸۷-۴۸۸۔

(۲) پریچنگ آف اسلام:۱۰۴۔

مصریات کے ماہر سر آرتھر کیتھ کا کہنا ہے کہ مصر کے عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا جبر و اکراہ اور تلوار کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں، یعنی قرآن وحدیث کی سادہ، صاف اور واضح تعلیمات نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے کثرت سے اسلام قبول کیا۔(۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اس کثرت سے مفتوحہ علاقوں کے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا کہ ان علاقوں کے عاملین کو خوف ہوگیا کہ اگر اسی کثرت سے اسلام قبول کیا جاتا رہا تو سرکاری خزانے میں جزیہ سے آنے والی رقم بالکل ختم ہوجائے گی، اس سلسلے میں سرکاری عامل نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں یہ تاریخی فقرہ لکھ کر بھیجا :

> محمد ﷺ ہادی (ہدایت کی راہ دکھانے والے) بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیل دار اور ٹیکس وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے،(۲)
> ایک دوسرے عامل کو آپ نے لکھا ”مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہوجائیں اور ہم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں۔(۳)

بلاذری نے فتوح البلدان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تبلیغ و اشاعت اسلام کی کوششوں کے متعلق لکھا ہے :

> انھوں نے ہندوستان کے راجاؤں کو قبول اسلام کی ترغیب کے خطوط لکھے، اور ان کو بتایا کہ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، بلاذری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سادہ اور درویشانہ زندگی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کی

---

(۱) تھیوری آف ہیومن ایوولوشن: ۳۰۳۔

(۲) کتاب الخراج امام ابو یوسف: ۷۵۔

(۳) مناقب عمر بن عبدالعزیز: ۶۴۔

خبریں ان راجاؤں تک پہنچ چکی تھیں، جب ان کو قبول اسلام کے خطوط ملے تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا، اسی طرح اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولی بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کی معرفت اہل بربر کے لئے قبول اسلام کا خط لکھا، اسماعیل نے بربریوں کے مجمع میں یہ خط پڑھ کر سنایا، بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ماوراء النہر کے حکمرانوں کو بھی قبول اسلام کا خط لکھا، خراسان کے اسلام لانے افراد سے خراج معاف کردیا گیا، اسلام لانے کے بعد جن لوگوں نے سرائے تعمیر کرائے تھے ان کو انعام سے نوازا گیا۔(۱)

تاتاریوں کا قبول اسلام

تاتاری ترکستان (روس) اور منگولیا کے کچھ حصوں میں آباد تھے، خانہ بدوش قبائل تھے، چنگیز خان (۱۱۶۲-۱۲۲۷) نے ان کو متحد کیا اور عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا، عیش وعشرت میں ڈوبے حکمران اور عوام اس آفت کا سامنا نہ کرسکے، تاتاریوں نے مفتوحین کے ساتھ ہر وہ ستم روا رکھا جو خواب وخیال میں آسکتا ہے، مسجدوں کو اصطبل گاہ بنادیا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرکے بچے نکالے گئے اوران بچوں کو نیزوں کی انی پر لہرایا گیا، سروں کے مینار قائم کیے گئے، تاتاری امراء اور سپہ سالاروں میں اس بات پر مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کے سروں کا مینار سب سے زیادہ بلند ہے، چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد فتح کرکے اسے مقتل بنادیا، لاکھوں افراد کو قتل کردیا، بغداد کے کتب خانوں کی بیش قیمت کتابیں دریائے دجلہ وفرات کی نذر ہوگئیں، خلیفہ کو ہلاکو نے بڑی بے رحمی کے ساتھ قالین پر لپیٹ کر ہاتھی سے کچلوادیا، تاتاریوں کی دہشت مسلمانوں کے دلوں پر اتنی بیٹھ گئی کہ یہ مقولہ زبان زد عام ہوگیا ''اگر کوئی

(۱) فتوح البلدان:۳۳۹، ۴۳۲، ۴۴۶، بحوالہ دعوت وعزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:۱/۴۶۔

کہے کہ تا تاریوں کو شکست ہوگئی تو اس کا یقین نہ کرنا''؛ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد تا تاریوں نے اسلام قبول کرلیا، تا تاریوں کا قبول اسلام کسی جبر کی وجہ سے قطعی نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ فاتح تھے اور فاتح پر مفتوح جبر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، پہلے تا تاری حکمرانوں نے اسلام قبول کیا، پھر امراء اور سرداروں نے اسلام قبول کیا اور آخر میں تا تاری عوام نے بھی اتنی کثرت سے اسلام قبول کرلیا کہ اب تا تاریوں میں غیر مسلم اقلیت میں ہیں۔

آرنلڈ تا تاریوں کے قبول اسلام کے تعلق سے لکھتے ہیں :

> لیکن اسلام اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اُٹھا، اور داعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کرلیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں؛ کیوں کہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تا تاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدو جہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں نے جنھوں نے ان تینوں بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں، باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، ان ہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں سے روندا تھا۔(۱)

چنگیز خان نے مرتے ہوئے اپنی عظیم سلطنت اپنے چار بیٹوں میں تقسیم کردی تھی، اسلامی مبلغین کی کوششوں سے چاروں خاندان جلد ہی اسلام کے پرچم تلے آگئے، یہ کیسے ہوا، کیوں کر ہوا، اس کی تفصیل دعوت اسلام کے مورخ آرنلڈ کی زبانی پڑھئے :

(۱) دعوت اسلام: ۲۳۵۔

مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برکہ خان تھا، جو ۱۲۵۶ تا ۱۲۶۷ تک سیرادادرا کا خان رہا، اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آیا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برکہ خان الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام وارکان کو اس خوبی سے بیان کیا کہ سیرادادرا کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لے آیا، اس کا حال برکہ خان نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برکہ خان نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خان نے سلطان مصر رکن الدین بیبرس سے مصالحت کرلی ...... غرض جب سلطان رکن الدین اور برکہ خان میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو سیرادادرا کے بہت سے مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی۔

چنگیز خان کے خاندان کی دوسری شاخ میں اسلام کس طرح پھیلا؟ اس تعلق سے آرنلڈ لکھتا ہے :

ایران میں جہاں ہلاکو خان دولت ایلخانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی، ہلاکو خان کا بیٹا تکودار جو اپنے بھائی باقا خان کا جانشیں ہوا، دولت ایلخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا، ایک عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ تکودار کی تعلیم وتربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا؛ لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے

مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار و عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت سے تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر بھیجی۔

چنگیز خان کے خاندان کی تیسری شاخ جس کی حکومت بلاد متوسطہ میں تھی اور جس کا حکمراں چغتائی بن چنگیز خان تھا، اس خاندان میں اشاعت اسلام کے تعلق سے آرنلڈ لکھتے ہیں :

بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خان اور اس کی اولاد کے حصے میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی، وہ براق خان تھا، جو چغتائی خان کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشیں ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین اپنا نام رکھا۔

براق خان کے مسلم ہونے کے بعد ایک دو مرتبہ اور ایسا ہوا کہ کبھی یہ تاتاری مسلمان ہو جاتے اور کبھی اپنے قدیم دین کی جانب لوٹ جاتے، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے سے تاتاریوں پر اچھا اثر پڑا اور انھوں نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد پھر کبھی وہ مرتد نہ ہوئے، سلطان کاشغر کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بہت ہی عجیب و غریب ہے، آرنلڈ نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر

بے اجازت داخل ہوئے؟ شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علاحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے، یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم پڑ گیا۔

شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا؛ لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلمرو چغتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کرے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین وطن واپس چلے گئے اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت

قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا
بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا اسلام پہنچا کر
بے خوف وخطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا،
چند سال کے بعد تغلق تیمور نے باپ کا تخت حاصل کرلیا تو ایک
رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت پوری کرے؛
لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی،
آخر اس نے مجبور ہوکر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے
خیمہ کے قریب اذان کہنی شروع کی، تغلق کی نیند جب خراب ہوئی تو
غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا
اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا
خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعا
میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا
مذہب اسلام ہوگیا جو چغتائی ابن چنگیز خان کی اولاد کے تسلط میں
رہتے تھے۔

چنگیز خان کی چوتھی شاخ جس کا بانی اوگتائی خان تھا، اس میں اسلام کس طرح پھیلا؟ اس کی بھی نقاب کشائی آرنلڈ نے کی ہے:

تیمور خان کے زمانہ میں خان انندا نے جو قوبلائی خان کا پوتا تھا،
اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کرلیا اور تا نگوت میں
اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے ماتحت تھی،
اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہوگئے ...... تمام سلطنت مغلیہ میں
ہر جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کرلیتے
تھے، اوگتائی خان کے عہد میں حاکم ایران کرزنامی کا حال لکھا ہے کہ

وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔

واضح رہے کہ ان ہی تاتاریوں یا مغلوں کی اولاد میں سے بابر ہے، جس نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی اور تقریباً چار سو سال تک مغلوں نے ہندوستان پر حکومت کی، خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغلوں نے ہندوستان میں اسلام کی بقاء اور نشوونما میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، حضرات صوفیائے کرام کی خدمات مسلم؛ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ صوفیائے کرام تبلیغی مشن اسی لئے آزادی سے جاری رکھ سکے کہ ان کے پس پشت ایک مسلم حکومت موجود تھی جو ہر مشکل وقت میں ان کے لئے مددگار ہوسکتی تھی اور بسا اوقات ہوئی بھی، جب کچھ راجاؤں نے صوفیائے کرام کے تبلیغی مشن میں روڑے اٹکانے چاہے، ان سے قتال کیا تو حکومت نے ایسے راجاؤں کی گوشمالی کی اور صوفیائے کرام کو ان کی ایذا رسانیوں سے بچایا، چاہے تبلیغ اسلام کی کوششوں میں مسلم سلاطین کا کوئی رول نہ مانا جائے؛ لیکن کم از کم ان کی بطور حکومت صوفیائے کرام کے لئے راہ کے روڑے صاف کرنے کی خدمت تو تسلیم کرنی چاہئے۔

سلجوقیوں کا قبول اسلام

تاتاری کی طرح سلجوقی بھی ترک ہی تھے، اور ترکوں کے ایک قبیلہ غز سے تعلق رکھتے تھے، ان ترکوں نے اسلام کیسے قبول کیا، اس تعلق سے معلومات بہت کم ہیں، بعض روسی فضلاء کا خیال ہے کہ ان ترکوں نے پہلے عیسائیت قبول کی، بعد میں اسلام قبول کیا، انھوں نے اسلام کس وجہ سے قبول کیا، اس تعلق سے کوئی مستند بات نہیں ملتی؛ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جند کے علاقہ میں جب ان کو مسلمانوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، مسلمانوں کے مذہب ومعاشرت اور رسوم ورواج سے آگاہی ہوئی تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔(۱)

---

(۱) اُردو اسلامی انسائیکلو پیڈیا: ۱۱/ ۱۳۸۔

مولانا وحید الدین خان اس تعلق سے لکھتے ہیں :

سلجوق ، ترکان غز کے ایک سردار کا نام تھا ، اس نے قبائل کی ایک فوج جمع کی اور گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیاء پر حملہ کردیا ، اس نے ایک طاقتور سلطنت بنائی ، اس کی سلطنت میں اُردن ، شام ، عراق ، فلسطین وغیرہ کے علاقے شامل تھے ، ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی ، سلجوقی ترکوں نے مسلم افواج کو زیر کر کے یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی ، سلجوق کے بعد طغرل بیگ (م: ۱۰۶۳) اور الپ ارسلان (م: ۱۰۷۳) اس کے وارث بنے ، تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ سلجوق ترک جو ابتداء وحشی قبائل تھے ، انھوں نے اسلام قبول کرلیا ، اور ۲۰۰ رسال سے زیادہ مدت تک اسلام کی پاسبانی کی ، انھوں نے شیعہ سنی ، لڑائیوں کو ختم کر کے اسلامی دنیا میں اتحاد پیدا کیا ، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنائے ، انھوں نے اسلام کے خلاف عیسائی حملوں کا طاقتور دفاع کیا۔(۱)

الجزائر میں اسلام کی اشاعت

الجزائر میں بربر قبائل کی اکثریت ہے، ان قبائل کے چاروں اطراف پہاڑ تھے جس کی وجہ سے ان کو قدرتی حفاظت ملی ہوئی تھی ، قبائلی وحشیانہ مزاج ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ان میں اشاعت اسلام کی متعدد کوششیں کی گئیں ؛ لیکن ناکام رہیں ، بربروں میں اسلام کی اشاعت اس طرح ہوئی ، جب اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا (۱۴۹۲ء) اور مسلمانوں کے لئے وہاں زندگی دوبھر ہوگئی تو مسلمان وہاں سے نکلنے لگے، قادریہ سلسلے کی ایک خانقاہ میں انھیں پناہ ملی ،

---

(۱) دین کامل: ۲۳۲۔

خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ ہنرمند ہیں مختلف علوم وفنون سے واقف ہیں، علاوہ ازیں بے وطن ہونے کی وجہ سے ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے، ایسے لوگوں کو کسی اعلیٰ مقصد میں لگانا چاہئے؛ چنانچہ خانقاہ کے شیخ نے اندلس کے مہاجرین سے اسلام کی عظیم نعمت اور قبائلیوں کے اس سے محروم ہونے پر پرزور خطاب کیا اور ان کو ان قبائل میں اسلام کی اشاعت ودعوت عام کرنے کی ترغیب دی، انھوں نے کہا:

> ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے محروم ہوچکے ہیں، ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے، جو ان کے بچوں کو بھی اُصول اخلاق اور محاسن اسلام کی تعلیم دے سکے، یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں، جن کو نہ خدا کا علم ہے اور نہ دین کا، لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورت حال کی اصلاح کے لئے تمہاری دینی حمیت اور تمہارے نور ایمان سے درخواست کروں؛ تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابل رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں وپیچاں نہ رہیں، اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہوجائیں، اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ روشن کرو، اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد ﷺ کے دین میں عیسایت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے، میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں؛ لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارت ایمانی خدا کے فضل وکرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی، میرے بچو! جاؤ،

اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ، جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ، خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد کرے۔(۱)

مہاجرین یوں ہی سب کچھ لٹا چکے تھے، وہ اس کے لئے تیار ہو گئے، یہ اندلسی مہاجرین پانچ چھ افراد کی ٹولیوں میں مختلف جگہوں کے لئے روانہ ہو گئے، انھوں نے ویران مقامات میں ڈیرہ ڈالا، قبائل کے درمیان ان کی نیکی اور پرہیزگاری کا چرچا ہونے لگا، یہ مبلغین جسمانی امراض کے علاج سے واقف تھے، اس کے علاوہ مختلف قسم کی صنعت وحرفت سے بھی آگاہ تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے ان قبائل میں اپنی ان خصوصیات کی بنا پر اثر ورسوخ قائم کرلیا، ہر مبلغ جماعت کا ڈیرہ تعلیم وتبلیغ کا مرکز بن گیا، قبائلیوں کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرنے لگے، پھر یہ طلبہ لوٹ کر اپنے قبائل میں اسلام کی دعوت دینے لگے، تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام بربری قبائل کے تمام علاقوں اور پورے الجزائر میں پھیل گیا۔

انڈونیشیا میں اشاعت اسلام

انڈونیشیا میں مسلمان کبھی عسکری طور پر داخل نہیں ہوئے؛ لیکن اس کے باوجود پورا انڈونیشا مسلمان ہے، اور یہ اسلام پر تلوار اور جبر واکراہ کا اعتراض کرنے والوں کا عملی جواب ہے کہ جس مقام پر کسی مسلمان نے تلوار نہیں چلائی، تیر نہیں پھینکا، عسکری اقدامات نہیں کئے، اس ملک کے باشندوں نے کیوں اسلام قبول کرلیا؟ انڈونیشیا میں اسلام کیسے پھیلا، اُردو انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے کچھ ذکر کیا جاتا ہے :

آج انڈونیشیا ایک عظیم ترین اسلامی ملک ہے، جہاں بیس کروڑ کے قریب مسلمان موجود ہیں، لیکن تیرہویں صدی سے قبل وہاں ایک بھی مسلمان نہیں تھا، لوگ یا تو ہندو تھے یا مظاہر پرست، اسلام کا یہاں قدم جمانا اور پھر تمام جزائر پر چھا جانا، بقول کرافورڈ ایک

(۱) پریچنگ آف اسلام: ۱۲۹ تا ۱۲۸۔

عجیب اور مہتمم بالشان واقعہ ہے، انڈونیشیا کو مسلمان حملہ آوروں نے فتح نہیں کیا بلکہ مسلمان تاجروں اور مبلغوں نے مختلف جزیروں میں راجاؤں، امیروں اور عوام کو دین حق کی تبلیغ اور اپنے اوصاف حمیدہ سے متاثر کر کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا، مجمع الجزائر میں سب سے پہلے ساترا نے اسلامی اثرات قبول کئے، بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں آچے (آچیہ) کے کچھ باشندے شیخ عبداللہ عارف کی کوششوں سے مسلمان ہوئے، ان کے خلیفہ شیخ برہان الدین نے مغربی اور جنوبی ساترا میں دین کی وسیع اشاعت کی، انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جہاں نومسلموں کو دینی تعلیم دی جاتی تھی، اور تبلیغ کے اصول سکھائے جاتے تھے، ان نومسلم مبلغوں نے مختلف علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور آچے کا پورا علاقہ اسلام کے زیر اثر آ گیا، حتی کہ ۱۲۰۵ء میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی، چودھویں صدی عیسوی میں شیخ اسماعیل کے زیر قیادت کچھ مسلمان حجاز سے پہنچے، جن کی مساعی سے سمدرا، آرو، اور پینگ کباؤ کے راجا اور باشندے مسلمان ہوگئے، پندرہویں صدی عیسوی میں بھی پالم بانگ اور لمپانگ کے راجاؤں اور باشندوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، جاوا میں اشاعت اسلام ایک تحریک کی شکل میں چودہویں صدی عیسوی یں اختیار کی، جب مولانا ملک ابراہیم نے گریسک میں ایک تبلیغی مرکز قائم کیا، اس تحریک کے مندرجہ ذیل نو ہنما بہت مشہور ہیں اور انہیں ولی کا درجہ دیا جاتا ہے، ایک اور نامور مبلغ رادن فاتح تھے، جن کی قیادت میں مبلغین اسلام نے ۱۴۲۸ء میں مجاپائت کے حکمراں کو شکست دی اور جاوا میں پہلی اسلامی سلطنت قائم کی، بورنیو

میں اشاعت اسلام کا آغاز پندرہویں صدی کے آغاز میں ہو چکا تھا، مگر مجاپائت کے خاتمے پر یکے بعد دیگر بنجر ماسین، دامکہ، برونی اور سکدانہ کے فرماں روا اور عوام مسلمان ہوتے ہو گئے، یہاں مبلغین کے سردار شیخ شمس الدین حجاز سے آئے تھے، ان کے ہاتھ پر سکدانہ کے راجا نے اسلام قبول کیا اور سلطان محمد صفی الدین کا لقب پایا، سلاویسی میں اسلام بورنیو کے نومسلموں کی بدولت پھیلا، سب سے پہلے مکلسر اور بوگی قومیں اور پھر اہل منہاسہ مسلمان ہوئے، موخر الذکر کو پرتگالیوں نے عیسائی بنالیا تھا، مکلسر کے نومسلم خاص طور پر بڑے پر جوش مبلغ ثابت ہوئے۔

جزائر مالوکا میں اسلام کی ابتداء پندرہویں صدی عیسوی میں ہوئی، جب ایک عرب مبلغ شیخ منصور نے تدورے کے راجا کو مسلمان کر کے اس کا نام سلطان جلال الدین رکھا، اسی زمانے میں ترناتے کے راجا نے بھی مسلمان ہو کر اپنا نام سلطان زین العابدین رکھا، موخر الذخر کے جانشیں سلطان باب اللہ کی کوششوں سے جزائر مالوکا میں دور دور تک اسلام پھیل گیا، جزائر سونڈا صغیر میں تبلیغ کا فرض مکاسر کے منظم اور پر جوش مبلغین نے انجام دیا، سولہویں صدی عیسوی میں سمباوا اور اس کے بعد فلورس، تیمور اور سمبا میں بھی اسلام پھیل گیا، اس طرح مبلغوں کی ایک منظم تحریک نے جس کے پاس سیاسی اقتدار تھا نہ عسکری قوت، ایسی قوموں کو مسلمان کرلیا جو بڑی بڑی سلطنتوں کی مالک اور اپنے مذہب اور تہذیب و معاشرہ کی سختی سے پابند تھیں۔(۱)

---

(۱) اُردو انسائیکلو پیڈیا: ۳/ ۳۹۰ تا ۳۹۵۔

انڈونیشیا میں جس طرح عجیب وغریب طریقہ سے پوری قوم نے اسلام قبول کیا، وہ تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے؛ چنانچہ وان لیر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا ہے، وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے، لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پراسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیاء کے لوگوں کو اسلام میں داخل کردیا۔(۱)

ہندوستان میں اشاعت اسلام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھانہ تک اسلامی فوج نے یلغار کیا تھا؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ نے سپہ سالار عثمان بن ابوالعاص کی اس روش پر ناراضگی ظاہر کی؛ کیوں کہ وہ دربار خلافت سے اجازت کے بغیر کیا گیا تھا اور اس میں اسلامی فوج کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ہندوستان کے تعلق سے تحقیق کے لئے ایک شخص کو بھیجا جس نے ہندوستان کی منفی صورت حال بیان کی جس کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہندوستان پر فوج کشی کا خیال ترک کردیا، محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ہندوستان کے مختلف ساحلی علاقوں میں مسلم آبادیاں قائم ہوچکی تھیں۔

سراندیپ میں اشاعت اسلام

سب سے پہلے مسلمان بستی کہاں قائم ہوئی، اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے؛ لیکن عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ دیار ہند میں اولین مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے :

> چوں کہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے؛ اس لئے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے

(۱) دین کامل:۲۳۷۔

> معلوم ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہی زمانہ میں 40ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کی تائید مشہور سیاح اور ناخدا بزرگ بن شہریار کی تصنیف عجائب الہند سے بھی ہوتی ہے۔

سراندیپ اور آس پاس والوں کو جب پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کے لئے عرب روانہ کیا، وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے تھے، ابوبکر صدیق کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا، وہ ان سے ملا اور رسالت مآب ﷺ کے حالات دریافت کئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہ تفصیل بیان کئے، جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) کے پاس پہنچ کر مر گیا، اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا، وہ صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا، اس نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں ظ وہ اسی سبب سے ہے۔

ملیبار میں اشاعت اسلام

متعدد روایتیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اسلام اور عربوں کا ایک بڑا مرکز وہ تھا جسے ملیبار کہتے ہیں، ملی کے معنی پہاڑ اور بار کا معنی ملک کا ہے، تحفۃ المجاہدین میں ملیبار میں مسلم آبادی اور اشاعت اسلام کے تعلق سے لکھا ہے :

> اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے، اور یہاں بود وباش اختیار کر چکے تھے جب اسلام پر دوسو برس گزرے، عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کے لئے

سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں، جارہی تھی اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنکلور کے کنارے آ کر لگا، شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آ گیا، راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر اور مذہب کا حال سنا ہے اب تم خود سناؤ! درویشوں نے اسلام کی حقیقت اس موثر انداز سے بیان کیا کہ راجہ کا دل موہ لیا، راجہ نے ان سے عدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر سے ہی گزرتے جائیں؛ چنانچہ وعدہ کے مطابق وہ آئے، راجہ نے سب امرا کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کردیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہوگیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت شروع کردو اور اپنے امرا کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو، اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے لگے، تحفۃ المجاہدین کی ایک روایت کے مطابق راجہ کا واقعہ پیغمبر اسلام کے عہد کا ہے؛ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کو غلط مانا ہے، تحفۃ المجاہدین کی تیسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہندوستان کے مغربی

> ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، باوجویکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہے، مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں، بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں، بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے؛ کیوں کہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہوجانا انھیں مسلمان تاجروں کی بود وباش کا نتیجہ ہے۔

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن آگے چل کر نائط اور موپلا کے نام سے مشہور ہوئے اور پرتگیزوں سے پہلے ان کے ہاتھوں میں جہازرانی کی باگ ڈور تھی، ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہوگئے یا شادی بیاہ کے ذریعہ برادری میں شامل ہوگئے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

برصغیر پاک وہند میں اشاعت اسلام کا سہرا صوفیہ کرام کے سر ہے جن کی مساعیٔ جمیلہ سے کفر وشرک کے مستحکم قلعے نیست ونابود ہوگئے، ہند کے بت کدوں کی رونق ماند پڑنے لگی، شمع توحید فروزاں ہونے سے کفر کی تاریکی چھٹ گئی اور دیارِ ہند میں ہر سو صدائے لا الہ الا اللہ گونجنے لگی، اس خطہ ارض میں قدم رنجہ فرمانے والے صوفیہ عظام نے اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعے یہاں کے باسیوں کے دل موہ لئے اور وہ جوق در جوق دولت اسلام سے بہرہ ور ہونے لگے، یہ ان ہی بزرگانِ دین کے قدوم میں منت لزوم کا اثر ہے کہ آج یہاں کروڑوں

مسلمان موجود ہیں، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ (T.W.Arnold) نے اپنی کتاب The Preaching of Islam میں لکھا ہے :

> Among the millians of indian Musalmans there are vast numbers of converts or descendants of comverts, in whose conversion forse played no part and the only influences at work were the teaching and persuasian of peaceful missionaries.
>
> ہندوستان میں آباد لاکھوں مسلمانوں میں سے اکثر ایسے نومسلم یانومسلموں کی نسل سے ہیں جن پر مسلمان ہونے کے لیے کسی طرح کا جبر یا تشدد نہیں ہوا بلکہ پرامن دعوت اسلام کی تعلیم وہدایت سے انھوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔

ہندوستان میں دوسرے سلسلے کے بزرگوں نے بھی تبلیغ دین اوراشاعت اسلام کی ت انجام دی ہیں اوران کی خدمات قابل قدر ہیں؛ لیکن ان سب میں گل سرسبد کی حیثیت ضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، آپ نے ہندوستان میں بڑی حکمت سے اسلام کی نشر واشاعت کا کام انجام دیا، آپ کے اخلاق وکردار میں وہ جادو تھا کہ جوایک مرتبہ دیکھ لیتا دل ہار دیتا، آپ نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کی جوشمع روشن کی تھی، اسے آپ کے خلفاء اور مریدین نے جاری رکھا اور دن بدن اس کی لو تیز سے تیز تر ہوتی گئی، ایک روایت کے مطابق: 97سال حیات رہے، جب کہ دوسری روایت میں: 103 سال کی عمر میں آپ کا وصال 633ھ 1236ء میں اجمیر میں ہوا، آرنلڈ آپ کی دعوتی خدمات کے تعلق سے لکھتے ہیں :

> ہندوستان کے مشہور ومعروف اولیائے کبار میں سے خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی ہیں جنھوں نے راجپوتانہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور 1234ء میں اجمیر میں انتقال کیا، اجمیر پہنچنے بعد جس ہندو کو

پہلے پہل آپ نے مسلمان کیا، وہ راجہ کا ایک جوگی گرو تھا، رفتہ رفتہ اُن کے مریدوں کی ایک کثیر جماعت اُن کے پاس جمع ہوگئی، جنھوں نے ان کی تعلیم وتلقین سے بت پرستی چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیا، اب ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے آپ کی شہرت سب طرف پھیل گئی اور آپ کا شہرہ سُن کر بہت سے ہندو لوگ اجمیر میں آئے اور آپ کی ترغیب سے مسلمان ہوگئے، روایت ہے کہ جب آپ اجمیر جاتے ہوئے راستے میں دہلی میں ٹھہرے تھے تو وہاں آپ نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔(۱)

مرے ٹی، ٹائی ٹس (Murray T.Titus) نے اُنیس برس تک برصغیر پاک و ہند میں رہ کر اس خطے میں اشاعت اسلام کے موضوع پر تحقیق کیا اور "اسلام ان انڈیا اینڈ پاکستان" کے عنوان سے مقالہ لکھا، اس مقالے کی تکمیل پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا، اُن کا یہ مقالہ پہلی بار 1929ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا اور پھر 1990ء میں پاکستان میں بھی اشاعت پذیر ہوا، اس مستشرق نے خواجہ صاحب کو ہندوستان کا سب سے معروف مسلم مبلغ قرار دیا ہے :

Titus, Murray T. Islam in India and Pakistan. (۲)

مرے مزید لکھتا ہے کہ خواجہ صاحب کی شہرت ایک مرشد کی حیثیت سے اجمیر کے قرب وجوار تک پھیل گئی اور ہندو بڑی تعداد میں اُن کے پاس آتے اور اُن کی ترغیب سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے۔(۳)

سیر الاولیاء کے مصنف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۱) آرنلڈ، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، دعوتِ اسلام، مترجم ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ط: لاہور محکمہ اوقاف پنجاب: 1972ء، ص: 279۔

(۲) Karachi Royal Books company, 1990, P:43.

(۳) Karachi Royal Books company, 1990, P:43.

ہندوستان میں ان کی وجہ سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت یہاں سے کافور ہوئی۔(۱)

یہ صرف صوفیانہ خوش عقیدگی نہیں ہے؛ بلکہ دیگر مورخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے :

اجمیر میں عزلت گزیں ہوئے اور اسلام کا چراغ بڑی آب وتاب سے روشن کیا، اوران کے انفاس قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان کی دولت پائی۔(۲)

جگن ناتھ آزاد نے اپنی نظم "ہندوستان ہمارا" میں ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا :

یہ چشتی خانداں ، نازاں ہے جس پر رتبہ عالی
بنا خواجہ نے اس کی وادیِ اجمیر میں ڈالی
پھلا پھولا بڑھا یہ خانداں اک پیڑ کی صورت
زمیں پر اس کا پھیلا سایباں اک پیڑ کی صورت
تناور پیڑ ہے یہ اور شاخیں ہیں کئی اس کی
ہزاروں دور گزرے پھر بھی ہے صورت نئی اس کی (۳)

شیخ اسماعیل بخاریؒ

سلطان محمود غزنوی نے یوں تو عسکری طور پر لاہور کو فتح کیا تھا؛ لیکن لاہور کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام صوفیا کرام نے انجام دیا سب سے قبل جن بزرگ نے لاہور میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا وہ شیخ اسماعیل بخاری ہیں، شیخ اسماعیل بخاری لاہور میں میں آئے،

(۱) سیر الاقطاب:101۔

(۲) آئین اکبری، سرسید ایڈیشن،ص:270، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت،ص:30۔

(۳) آزاد، جگن ناتھ، نسیم حجاز (نئی دہلی) محروم میموریل لٹریری سوسائٹی:1999ء۔

علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے، وہ یہاں آ کر وعظ وتبلیغ کرنے لگے، ان کی مجلس میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے اور ہر روز صدہا لوگ اسلام قبول کرتے تھے، تذکرہ علمائے ہند میں ان کی بابت لکھا ہے وہ گراں قدر محدث اور مفسر تھے وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے علم حدیث اور تفسیر سے لاہور کو منور کیا، ہزاروں لوگ ان کے وعظ میں شریک ہوتے تھے اور ان کا وعظ سن کر اسلام قبول کرتے تھے، خزینۃ الاصفیا کے مولف لکھتے ہیں:

''جب شیخ اسماعیل لاہور تشریف لائے اور جمعہ میں وعظ کہا تو ایک ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہوگئے''۔

شیخ ہجویریؒ

دوسرے بزرگ جنھوں نے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، وہ شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف حضرت داتا گنج بخش لاہوری ہیں، مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے علما ومشائخ سے کسب فیض کیا اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے اخیر عہد حکومت میں لاہور آئے اور یہاں آکر تصنیف وتالیف اور تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا، کئی لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، جس میں خاص طور پر قابل ذکر سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا رائے راجو ہے، مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا، آپ نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں، جس میں سے ''کشف المحجوب'' بطور خاص مشہور ہے۔

شیخ سخی سرورؒ

ان کے علاوہ دیگر بزرگوں میں سید احمد المعروف سلطان سخی سرور یا لکھ داتا ہیں، آپ ملتان میں پیدا ہوئے اور زبان زد خلق روایت کی بنیاد پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا اور پھر موضع سودھرہ (پنجاب) میں اقامت اختیار کی اور خلقت آپ پر پروانے کی طرح ٹوٹ پڑی، غیر مسلم بطور خاص آپ سے عقیدت رکھتے ہیں؛ بلکہ غیر مسلموں کی اس علاقے میں ایک نئی قوم بستی ہے جسے سلطانی کہتے ہیں اور وہ کئی

باتوں میں مسلمانوں سے مشابہ ہیں اوران کا سب سے بڑا تہوار سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے، ان کے علاوہ دیگر مشائخ میں سید احمد توختہ ترمذی ہیں، آپ ترمذ سے لاہور تشریف لائے اور ہزاروں مخلوق خدا کو فیض پہنچایا، ان کے علاوہ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی ہیں، آپ ہجری میں ترستان سے لاہور آئے اور لاہور میں نور اسلام کو عام کیا۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور اشاعت اسلام

شیخ فریدین الدینؒ گنج شکر کے آباواجداد چنگیزی حملے دوران کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، یہیں شیخ فریدالدین —— جن کا اصل نام مسعود تھا —— پیدا ہوئے، یہاں اٹھارہ برس کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ آپ دہلی کی طرف چلے، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ان کو نصیحت کی کہ وہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کر لیں اور پھر ان کے پاس دہلی آئیں، پانچ سال تکمیل تعلیم کے لئے قندھار میں گزارے اور پھر دہلی آئے تھوڑے ہی دنوں میں شیخ قطب الدین نے آپ کو نعمت ہائے روحانی سے مالا مال کر دیا، جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یکسوئی نہیں ہوتی تو مرشد کی جازت سے ہانسی چلے گئے، آپ کے روحانی استعداد سے خواجہ معین الدین اجمیری بھی متاثر تھے، (۱) فوائد میں متعدد مقامات پر سانپ سے مختلف درویشوں کے ڈسے جانے کا ذکر ملتا ہے، خود وہاں کے لوگوں کی نسبت بھی لکھا ہے کہ وہ زیادہ ترکج طبع اور درشت مزاج اور بد اعتقاد تھے، آہستہ آہستہ آپ کی عبادت در یاضت کی شہرت عام شروع ہوئی اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے حتیٰ کہ شاہان وقت بھی آپ سے ملاقات کے متمنی رہنے لگے۔

بیعت و ارشاد کے ساتھ ہی آپ کی توجہ اشاعت اسلام کی بھی جانب تھی؛ چنانچہ راجپوتوں کی کئی برادریاں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئیں، اس سلسلے میں ضلع ملتان اور ضلع منٹگمری کے گزیٹر میں درج ہے کہ اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے،

---

(۱) سیر العارفین، ص:32۔

حضرت خواجہ بختیار کا کی کو شاید ہی ہوئی ہو، مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، مثلاً سیال، راجپوت، وٹو وغیرہ، شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کے دست حق پرست پر 16 قوموں (برادریوں) نے اسلام قبول کیا۔

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اور اشاعت اسلام

شیخ بہاؤالدین ذکریا سہروردیؒ ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسس اعلیٰ ہیں، شیخ بہاؤالدین ملتان میں پیدا ہوئے، آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا، اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور سات برس تک علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی، پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رکھا، اس کے بعد حج کے لئے تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضۂ نبوی کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی، پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے مرید ہوئے، خلعت خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے کہا کہ اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کریں اور وہاں کے لوگوں کو مقصود تک پہنچائیں؛ (۱) چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی آپ کو بڑا اعتبار اور وقار حاصل ہو گیا، آپ کے درگاہ کے خادمان نے ایک کتاب انوار غوثیہ کے نام سے شائع کی ہے، اس کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت کا وعظ سن کر سندھ، ملتان اور لاہور کے اہل ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے جس میں بہت سے متمول تاجر اور بعض والیان ملک بھی تھے، دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے شیخ زکریاؒ کی تبلیغی خدمات کا یوں ذکر فرمایا ہے:

''مغربی پنجاب میں اشاعت اسلام کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔'' (۲)

(۱) سیر العارفین، ص: 109۔

(۲) مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تصوف اور تعمیر سیرت، ص: ۱۵۳۔

ڈاکٹر روبینہ لکھتی ہیں :

حضرت بہاؤالدین زکریا کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا، آپ کے خلفاء نے سلسلہ سہروردیہ کی ترویج کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام کا فریضہ بطریق احسن سرانجام دیا، آپ نے حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری (۶۴۵ھ) کو خرقہ خلافت عطا فرما کر روحانی علوم کی دولت سے مالا مال کر دیا، وہ تیس برس تک آپ کی خدمت میں رہے، پھر حضرت صدر الدین عارف (فرزندِ اکبر و سجادہ نشین درگاہ زکریا) کے حکم پر اوچ تشریف لے گئے، ان دنوں اوچ کے گرد ونواح میں ہندوؤں کا تسلط تھا، سید جلال الدین نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ کی اور کفار کو راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔(۱)

محمد دین کلیم مورخ لاہور نے لکھا ہے کہ :

حضرت بہاؤالدین ملتانی علیہ الرحمۃ مختلف ممالک اور شہروں کی سیر وسیاحت کے بعد ملتان تشریف لائے، یہاں آکر آپ نے سلسلہ عالیہ سہروردیہ کا ایک بڑا زبردست مرکز قائم کیا، جس کا کام مبلغ پیدا کرنا تھا، انھوں نے آپ کے تبلیغی دوروں کے حوالے سے یہ بتایا جاتا ہے کہ عام طور پر گرمی کا موسم کشمیر، بلخ، بخارا، دمشق، نیشا پور اور افغانستان کی طرف گزرتا اور سردی کے ایام راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقہ میں وعظ وتبلیغ پر جاتے، ساون بھادوں کے مہینوں میں دیبل، ملہیر اور سہوان کی طرف نکل جاتے۔(۲)

(۱) ڈاکٹر روبینہ، ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، ص:۹۶۔

(۲) کلیم، محمد دین، لاہور کے اولیائے سہرورد، لاہور، مکتبہ تاریخ لاہور، گڑھی شاہو، ۱۹۶۹ء، ص:۸۶۔

شہزادہ داراشکوہ نے اپنی کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' میں ان کا ذکر یوں کیا ہے :

پھر آپ شیخ الشیوخ سے اجازت لے کر ملتان آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور طالبانِ حق کی ہدایت و ارشاد میں مشغول ہوئے، آپ کی برکت سے بہت سی مخلوق راہِ راست پر آئی اور اس شہر اور اطراف کے تمام لوگ معتقد ہوئے اور آج بھی اس نواح میں آپ کے مرید کثرت سے موجود ہیں۔(۱)

ایل، بی، ون جونز (L.Bevan Jones) جو بپٹسٹ مشنری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، سلسلہ سہروردیہ کا تعارف کرواتے ہوئے شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کا یوں ذکر کرتے ہیں :

اس سلسلے کی بنیاد ضیاالدین ابونجیب سہروردی نے رکھی جن کا 1167ء میں انتقال ہوا، ہندوستان میں اسے ملتان کے شیخ بہاؤالدین زکریا نے متعارف کرایا جو بانیٔ سلسلہ کے جانشین شیخ شہاب الدین کے مرید تھے، بہاؤالدین نے 1266ء میں وفات پائی، ملتان میں ان کے مزار کا بہت احترام کیا جاتا ہے، ان کی روحانی اولاد نے اسلام کی اشاعت کا کام مستعدی اور کامیابی سے سرانجام دیا۔

بنگال میں تبلیغ و توسیع اسلام میں صوفیاء کرام کی کاوشیں

سب سے پہلے جو بزرگ شمالی ہند کے راستے بنگال تشریف لے گئے، شیخ جلال الدین تبریزی تھے، آپ ایرانی نسل سے تھے، پہلے پہل شیخ ابوسعید تبریز کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے کسب فیض کیا۔

بنگالہ میں تبلیغ اسلام کی وجہ آپ کی یہ کرامت بنی کہ شیخ جلال الدین جب دیوہ محل آئے تو ایک کمہار یا مالن کے یہاں قیام کیا، دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ وشیون کا طوفان برپا ہے، پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک

(۱) داراشکوہ، شہزادہ، سفینۃ الاولیاء، اُردو ترجمہ محمد علی لطفی، کراچی: نفیس اکیڈیمی، طبع ششم، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۵۲۔

نوجوان دیو کے سامنے بھیجا جاتا تھا اور وہ اسے کھالیتا تھا، اس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی، شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو، مجھے بھیجو؛ لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمہیں قبول نہیں کیا تو راجا مجھے قتل کرادے گا؛ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو نہلایا، دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا، شیخ بھی ساتھ تھے، بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو رخصت کردیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے، جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کردیا، صبح کو راجا اپنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا تو دیکھا کہ اس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے، لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے، راجا خود آگے بڑھا، شیخ نے کہا کہ تم بلا کھٹکے آگے آؤ، دیو کو میں نے ہلاک کردیا ہے، لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایسے ہی تھا؛ چنانچہ سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہوئے، (جوامع الکلم، ص:157) شیخ جلال الدین کی وفات کب ہوئی اس تعلق سے مختلف روایات ہیں، سیر العارفین اور آئین اکبری کے مطابق آپ کی وفات 642 ہجری یعنی 1244 میں ہوئی، یہی تاریخ خزینۃ الاصفیا میں بھی درج ہے؛ لیکن مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس نے 746 ہجری مطابق 1345 میں شیخ کی زیارت کی ہے؛ چنانچہ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :

> چاٹگام سے میں کامروپ کے پہاڑوں کی طرف کا راستہ اختیار کیا جو یہاں سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہے، میرا ارادہ اس ملک میں جانے سے یہ تھا کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی جو مشہور اولیا اللہ تھے، زیارت کروں، ان شیخ کے ہاتھ پر اس ملک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے، اس ملک کے ہندو مسلمان سبھی شیخ کی زیارت کرتے ہیں اور ان کے واسطے تحفے لاتے ہیں۔

پروفیسر گب کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے جس شیخ جلال الدین کی زیارت کی تھی وہ شیخ جلال الدین تبریزی نہیں؛ بلکہ جلال

الدین سلہٹی تھے ؛ لیکن اس نظریہ کو ماننے میں بھی اُلجھن ہے ؛
کیوں کہ شیخ جلال الدین کی اس نے جو صفات بیان کی ہیں یعنی
بغداد کی زیارت، خلیفہ مستعصم کا تاتاریوں کے ہاتھ قتل وغیرہ تو وہ شیخ
جلال الدین تبریزی پر صادق آتی ہیں۔(۱)

شیخ علاالحق سے بھی زیادہ فروغ ان کے صاحبزادے نورالحق المعروف نور قطب عالم نے پایا جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبارالاخیار میں لکھتے ہیں :

شیخ نورالحق والدین رحمتہ اللہ علیہ المشہور بہ شیخ نور قطب عالم فرزند و مرید
خلیفہ علاالحق است از مشاہیر اولیائے ہندوستان و صاحب عشق و محبت
و ذوق وشوق و تصرف و کرامت۔

شیخ نورالحق جو شیخ نور قطب عالم کے نام سے مشہور ہیں، شیخ علاءالحق
کے فرزند اور خلیفہ ہیں، ہندوستان کے مشہور بزرگوں میں سے ایک
ہیں ،عشق ومحبت، ذوق و شوق اور تصرف و کرامت میں آپ کا
بلند مقام ہے۔

جب بنگال کے راجہ غیاث الدین کو راجا گنیش نے قتل کر کے تخت سنبھالا تو گنیش نے مسلمانوں اور علما و مشائخ کا قتل شروع کیا اس کا ارادہ تھا کہ بنگال سے اسلام کا نام ونشان مٹادے، یہ دیکھ کر شیخ قطب عالم نے جونپور کے حکمراں ابراہیم شاہ شرقی کو مدد کے لئے خط لکھا، اس نے بڑی فوج بھیجی، گنیش نے فوج کے آنے کی خبر سن کر معافی مانگی، شیخ نے کہا کہ تم کافر ہو تمہاری ہم مدد کیسے کر سکتے ہیں، گنیش نے کہا کہ میں دنیا ترک کرتا ہوں اور حکومت سے علاحدہ ہوتا ہوں، آپ میرے بیٹے جدو کو مسلمان کرلیں ؛ چنانچہ جدو کو جلال الدین کا نام دیا گیا، فوج کے واپس جانے کے بعد گنیش نے بیٹے کو پھر سے غیر مسلم بنانا چاہا تو جدو نے انکار کر دیا اور سلطان جلال الدین کے نام سے تخت بنگالہ پر رونق افروز ہوا۔

---

(۱) آب کوثر ص:299۔

شیخ جلال الدین سلہٹی

آپ کا مزار مسلمانان بنگلہ دیش کی بڑی اہم زیارت گاہ ہے، ضلع سہلٹ کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے گوڑیا سہلٹ کو مسلمانوں نے 1384 میں فتح کیا، آخری ہندو راجا کو سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے بے بس کر دیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ علاقہ صوبہ بنگالہ میں داخل کیا گیا اور نظم ونسق کے لئے ایک علاحدہ صوبہ دار مقرر ہوا، اس ضلع کے تقریباً 53 فیصدی باشندے گزشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مسلمان ہیں، 1303 میں سلہٹ فتح ہوا اور 20 ذی قعدہ 740 کو شاہ جلال نے وفات پائی، قیام سلہٹ کے 37 سال میں کچھ وقت تو شیخ جلال نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد و ہدایت میں، ضلع سہلٹ میں چار ایسے مقامات مشہور ہیں جہاں شیخ جلال نے اپنے ساتھی پیروں کو بسایا اور ان سے ارشاد و ہدایت کا کام لیا یعنی سلہٹ، لاتو، ہاپنیہ ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ۔

بنگال میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام میں جو کار ہے نمایاں انجام دیئے ان کے متعلق ڈاکٹر کالی راجن قانون گو بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

> بلبنی سلاطین کے عہد حکومت میں نہ صرف بنگالے میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں بھی گہری ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا جب اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عملی پارسائی، قوت عمل اور دور اندیشی میں بڑھ کر تھے، وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی، جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی ; بلکہ ان کا مذہبی جوش اور ان کی عملی زندگی، وہ نچلے طبقہ کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت بھی توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے پنجے میں گرفتار تھے، دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہوکر اسلامی حکومت کے لئے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہوگئے، بنگالے کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد صوفیانہ

سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے، اس سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبے کا سلسلہ شروع ہوا، مندروں اور ہندو خانقاہوں کو تباہ و برباد کر کے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زر و جواہر پر قبضہ کیا تھا؛ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہوسکتی تھی اور نہ ہی ان ہی ان غیر فانی روحانی خزائن کا خاتمہ ہوسکتا تھا جن پر ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں، مسلمان اولیا نے اخلاقی اور روحانی فتح کے عمل کو مکمل کیا اور اس مقصد کے لئے ہندو دھرم اور بدھ مت کے پرانے استھانوں پر (جو برباد ہوگئے تھے) ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کر دیں، اس کے دو نتیجے ہوئے، ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں سے ہندومت کے احیا کا امکان جاتا رہا اور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے کہانیاں رائج ہوگئیں جن کے مطابق یہ نو وارد قدیمی مقدس ہستیوں کے جانشیں ہوگئے، ہندو عوام صدیوں سے ان مقامات کو مقدس مانتے آئے تھے وہ ان کی پرانی تاریخ کو بھول گئے اور بڑی آسانی سے انھوں نے اپنی ارادات کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کر دیا جو ان مقامات پر قابض ہوگئے، ہندو سوسائٹی بالخصوص نچلے طبقے کے ہندو اولیا اور غازیوں کی کرامات کے ایسے قصوں کی بدولت جو بسا اوقات قدیم ہندو اور بودھی روایتوں پر مبنی تھے، آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے، شاید ہندو تیرتھوں پر اس اثر کی سب سے نمایاں مثالیں دو ہیں، ایک راجگیر میں سرنگی رشی کنڈ کا مخدوم کنڈ بن جانا اور دوسرے دیو اوتار روایات کے معجزہ باز بدھ کا ایک مقدس

مسلمان مخدوم ولی بن جانا۔(۱)

جب کہ ایک انگریزی مورخ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ بنگال میں اشاعت اسلام کو نمایاں کامیابی ملنے کی وجہ اسلام کا ''درس مساوات'' ہے، جس کی وجہ سے ذات کے چکر میں جکڑے کم تر ذات کے لوگوں نے اسلام میں اپنی ہر قسم کی محرومی کا مداوا دیکھا اور اسے قبول کرلیا۔

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں :

> ان لوگوں کے لئے جن میں مفلس، ماہی گیر، شکاری قزاق اور ادنیٰ قوم کے کاشتکار لوگ تھے، اسلام ایک ایسا اوتار تھا جو ان کے لئے آسمان سے اترا تھا، وہ حکمراں قوم کا مذہب تھا، اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے، جنھوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جس کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے، اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اُخوت کا بلند تر تخیل پیدا کردیا اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہوکر بڑی ذلت وخواری کے دن کاٹ رہی تھیں، اسلام نے بلا تامل اپنی اُخوت کے دائرے میں شامل کردیا۔(۲)

شیخ کرامت علی جونپوریؒ

کرامت علی جونپوری (1800ء–1873ء) ایک ہندوستانی حنفی فقیہ، عالم دین، عظیم داعی و مصلح اور چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے، جونپور میں ولادت ہوئی،

---

(۱) سرو جادو ناتھ سرکار کا مسلمانوں سے تعصب ڈھکا چھپا نہیں ہے، وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے اسلام یا مسلمانوں پر حملہ کریں، ان کی کتاب زوال سلطنت مغلیہ ان کے تعصب کی بہترین عکاس ہے، اس اقتباس میں بھی انھوں نے غلط باتیں کہی ہیں، بدھوں کو اسلام کے ہندوستان آنے سے پہلے ہندو راجہ تباہ کرچکے تھے اور مسلمان صوفیا نے کبھی ہندو یا بدھ مت کے مندروں یا خانقاہوں کو اپنی اقامت گاہ نہیں بنایا، نچلے ہندوؤں کا قبول اسلام، اسلام کے مساوات کے متاثر ہوکر اور ہندو مذہب میں ذات پات کی جکڑ بندیوں سے نفرت کی بناء پر تھا۔(تاریخ بنگالہ سر جادو ناتھ سرکار، ص:68-70)

(۲) پریچنگ آف اسلام، ص:280۔

مختلف علماء سے علم حاصل کرنے کے بعد سید احمد بریلوی سے بیعت ہوئے، اور ان کے حکم سے جونپور، سلطان پور، اعظم گڑھ، غازی پور، اور فیض آباد میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے بعد بنگال وآسام میں اکیاون برس تک دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کرتے رہے، دوران سفر بنگلہ دیش کے رنگ پور میں وفات پائی۔

سید احمد بریلوی سے بیعت وحصول سلوک واحسان

اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے والد سے اجازت لے کر سید احمد بریلوی کی خدمت میں پہنچے، اور سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اول ہی ہفتہ ان کے شیخ نے کہہ دیا کہ اب ہدایت کے کام میں لگ جاؤ، اور خلافت نامہ مع شجرہ بتوسط شاہ اسماعیل دہلوی عطا کیا۔

بنگال اور آسام میں دعوت وتبلیغ کا کام

جونپور، اعظم گڑھ، غازی پور، فیض آباد اور سلطان پور میں تبلیغ واشاعت اور دعوتی واصلاحی کام کرنے کے بعد اپنے مرشد سید احمد بریلوی کے حکم کے مطابق بنگال وآسام کا رخ کیا، کرامت علی جونپوری کو جہاد بالسیف کا بہت شوق تھا، اور اس کے لئے فنون سپہ گری وشمشیر زنی کو محنت سے حاصل کیا تھا، جب ان کے مرشد نے جہاد کا ارادہ کیا تو کرامت علی جونپوری نے بھی جہاد پر آمادگی ظاہر کی اور ساتھ چلنے کو کہا، سید صاحب نے ان سے کہا کہ تم سے خدا کو وراثت نبوی اور تبلیغ دین کا کام لینا منظور ہے، اور تمہارے اندر اس کی استعداد ودیعت فرمادی ہے، تمہارے لئے یہی جہاد اکبر ہے اور تمہاری زبان وقلم میری ہدایت کی توسیع وترجمانی کریں گے۔

دعوتی کام کا آغاز

مولانا نے کلکتہ پہنچ کر کچھ روز قیام کیا، اس کے بعد بنگال وآسام کا دورہ بذریعہ کشتی شروع کر دیا، اس وقت سواری کی سہولتیں زیادہ نہ تھیں، اور بنگال میں ندیاں اور نہریں زیادہ ہونے کی وجہ سے بوٹ سے سفر کیا کرتے تھے، ہر طرح کی پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پورے اکیاون برس تک بنگال میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت کا کام کرتے رہے، رد شرک وبدعت صبح سے شام تک کا مشغلہ تھا، جا بجا مساجد ومدرسے قائم کئے؛ چوں کہ خود بوٹ پر

سفر کرتے تھے، اس لئے اپنے ہمراہ سفری مدرسہ قائم کر کے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دی، ان کے اخراجات کو برداشت کیا، اوران کو تعلیم دے کر بنگال و آسام میں دعوت وتبلیغ اور تدریس کے لئے مقرر کر دیا، مولانا نے پورے بنگال اور آسام میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا، مگر خصوصیت سے ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، دیناج پور، فرید پور، بریسا اور آسام میں گوالپاڑہ، کامیروپ، دھو پڑی ونوا کھالی میں ان کا کام سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

سفری مدرسہ

کرامت علی جونپوری کا سارا وقت اور سارا مال چوں کہ دورہ وسیاحت میں صرف ہوتا تھا، اس لئے ضرورت وقت کی بنا پر اپنے ہمراہ ایک بوٹ پر سفری مدرسہ قائم کیا، جس میں مقامی باشندوں کو تعلیم وتدریس کے ذریعہ پابند عمل وعقائد بنا کر اوراحکام شریعت سے خوب واقف کرا کر اطراف وجوانب میں اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت حق کے لئے بھیجتے، اس سفری مدرسہ کے سارے اخراجات نیز طلبہ کے مصارف خکو راک کے مولانا خود خفیل ہوتے، مدرسہ کے لئے ایک بوٹ مخصوص تھا جس پر ظاہری تعلیم، تزکیہ واخلاص اور ذکر واذکار کا طریقہ اور سلوک کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اس سفری مدرسہ سے جو حضرات فارغ ہو کر نکلے وہ خود ایک زبردست داعی ومبلغ ثابت ہوئے اور انھوں نے بنگال کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں کی اصلاح کی۔

لانا کرامت علی جونپوریؒ کی دعوتی واصلاحی جدو جہد کے اثرات

کرامت علیؒ جونپوری نے 75 برس کی عمر پائی جس میں تقریباً اکیاون سال بنگال اور آسام اور قرب وجوار میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہوئے گزارے، ان کی بعض کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعض جزائر تک بھی گئے، اس درمیان ایک دو بار جونپور بھی آنا ہوا؛ لیکن زیادہ مدت تک قیام نہ رہ سکا، ان کی دعوتی وتبلیغی کوششوں کی پوری تفصیل کتابوں میں مذکور نہیں ہے، مگر بعض تذکرہ نگاروں اور بعض دوسرے بیانات سے ان کے کام کی وسعت اور تبلیغی مساعی کا اندازا لگایا جاسکتا ہے، صوبۂ بنگال جو مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بھی مسلم اکثریتی نہ ہو سکا، مسلم سلطنت کے زوال کے بعد اس کے مسلم اکثریتی صوبہ ہونے میں کرامت علی جونپوریؒ اوران کے

خلفاء کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، الحاج محمد اجمل خاں اپنی کتاب ''سوانح حیات خواجہ معین الدین چشتی'' میں لکھتے ہیں :

> اور زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اس کے بعد کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوئے کہ مشرقی بنگال پورا پورا مسلمان ہو چکا ہے، یہ کوشش صرف جونپور کے ایک بزرگ کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیا، آپ کا نام مولانا کرامت علی صاحب جونپوری تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے نواب بہادر یار جنگ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

> میری معلومات یہ ہیں کہ جن لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے ذریعہ مشرقی بنگال میں ہدایت نصیب ہوئی یا ان کی اصلاح ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ تک پہنچتی ہے۔
>
> شیخ کرامت کے باب میں تمام معلومات وکی پیڈیا سے ماخوذ ہیں، وکی پیڈیا میں ان کی سیرت سوانح کے ذکر کردہ تمام باتیں حوالہ جات کے ساتھ مذکور ہیں، تفصیل وہاں سے ملاحظہ کی جائے۔

یہ مختلف علاقوں میں اسلام کی پر امن اشاعت کی مختصر جھلکیاں تھیں، تفصیل کے لئے مختلف ملکوں اور قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے ،ضرورت اس بات کی ہے کہ آرنلڈ کی کتاب ''اشاعت اسلام'' کے کام کو آگے بڑھایا جائے اور مختلف علاقوں میں پر امن طور پر اسلام کو اشاعت کی تاریخ مرتب کی جائے ، اس سے ایک جانب جہاں قبول اسلام کی تاریخ مرتب ہوگی، وہیں اسلام کی اشاعت میں ہمارے بزرگوں نے کن ذرائع اور طریقوں سے کام لیا، وہ معلوم ہوگا اور مزید یہ کہ اسلام کو اس وقت جس طرح دہشت گردی سے جوڑا جارہا ہے، اس کی بھی بالواسطہ طور پر بخوبی تردید ہو جائے گی۔

● ● ●

اسلام اور مسلمانوں پر شدت پسندی کا الزام

اسلام پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ایک شدت پسند مذہب ہے اور دوسرے مذاہب کو برداشت نہیں کرتا، پھر اسی نسبت سے مسلمانوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا رویہ دوسری قوموں کے ساتھ ناروا داری اور شدت پسندی کا ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ہمیں اسلامی تعلیمات کا جائزہ لینا چاہئے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے بارے میں کیا تعلیم دی ہے۔

پوری انسانیت، ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی :

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اُخوت کا سبق ملتا ہے؛ جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتہ سے ہمارا بھائی

اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اُخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر انسان بشر سے محبت ہونی چاہئے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیتِ انسان اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام قرار دیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی ہے۔

قرآن مجید نے اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۱۲، باب من قام بجنازۃ یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کردیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کردی (سیرت حلبیہ: ۲/ ۴۲۳)؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنے انتقام کی آگ بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنة:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتے، جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں، مسلمانوں کا ان کے ساتھ حسن سلوک کا، رویہ ہونا چاہئے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رُک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَ نْفُسِكُمْ ، وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۷۲)

ان کو راہِ ہدایت پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں؛ لیکن اللہ ہی جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں، اور جو مال تم خرچ کروگے، وہ اپنے ہی لئے خرچ کروگے، نیز اللہ کی خوشنودی ہی کے لئے خرچ کیا کرو، تم جو بھی خرچ کرتے ہو تم کو پورا پورا مل جائے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (۱) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے مدد کا ہاتھ نہیں کھینچنا چاہئے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہوگئے، مشرکین مکہ کا فتح مکہ تک مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ تھا، وہ ظاہر ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے: حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کررہے تھے۔(۲)

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کیا

(۱) تفسیر قرطبی: ۳/۳۳۷۔ (۲) ردالمحتار: ۳/۳۰۲، باب المصرف۔

اور فرمایا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے: ''ما أنصفناک أکلنا شیبتک ، ثم نأخذ منک الجزیة'' (۱) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں۔ (۲)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اُصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَاَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا ۔ (۳)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے :

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (۴)

اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (۵)

---

(۱) نصب الرایہ: ۳؍۴۵۴۔ (۲) دیکھئے الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۳؍۳۰۱۔
(۳) نصب الرایہ: ۴؍۳۶۹۔ (۴) بنی اسرائیل: ۳۳۔
(۵) المائدۃ: ۳۲۔

جس نے کسی کو — کسی شخص کے قتل یا زمین میں فساد مچانے کے جرم
کے بغیر — قتل کردیا، گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کرسکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل وغارت گری کا نشانہ بناسکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم — جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو — کے قاتل کے بارے میں فرمایا، کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَإِنَّ رِيْحَهَا
يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا ۔ (۱)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُر امن زندگی گزارنے کا
معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ
اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کردے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کردیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اُصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: "اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ" (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (۲) حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے "ذمی" کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (۳) امام شافعیؒ نے حضرت علیؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ (۴)

---

(۱) بخاری عن عبداللہ بن عمروؓ حدیث نمبر: ۳۱۶۶۔ (۲) مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱۔
(۳) مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱۔ (۴) مسندِ امام شافعی، السنن الکبیہقی: ۱۲/۴۳۔

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی،(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔(۲)

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اُصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا: ''اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ''۔(النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔(۳)

متعدد صحابہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے :

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (۴)

(۱) سنن دارقطنی، کتاب الحدود۔ (۲) دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/ ۳۶۸-۳۶۹۔

(۳) ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۰۔ (۴) ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۳۔

آگاہ ہو جاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی، یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا، یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (۱) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت و آبرو اور عفت و عصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلا تفریقِ مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسٰى اَن يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّنهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسٰى اَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔ (الحجرات:۱۱)

اے مسلمانو! (مردوں کا) ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے، ممکن ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اُڑایا کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ دوسری عورتیں ان سے بہتر ہوں، نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں

---

(۱) المغنی لابن قدامہ: ۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ۔

اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبرو ریزی کی بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت وآبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (۱) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے، (۲) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے، (۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز وتکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے، (۴) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے۔ (۵)

رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام مستنبط کئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا، اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۶۱۷، باب قبول الہدیۃ من المشرکین۔

(۲) الدر المنثور: ۵/۱۸۱۔

(۳) الخصائص الکبریٰ: ۱/۱۲۳۔

(۴) اعلاء السنن: ۸/۲۸۲، باب ما یفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر۔

(۵) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۵۶۵۷، باب عیادۃ المشرک۔

- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں:

أَخْلَفَ اللهُ خَيْرًا مِّنْهُ وَ أَصْلَحَكَ ۔ (۱)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم و تعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم و تعلّم بھی درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم و حکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے: ''اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ'' (۲) چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اسی لئے تعلیم و تعلّم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ۔ (۳)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے سلام کے طریقہ، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس

---

(۱) ہندیہ: ۵/۳۸۴۔

(۲) ترمذی، عن ابی ہریرۃؓ، حدیث نمبر: ۲۶۸۷۔

(۳) الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵۔

بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھودیں، اور یہ بات تنگ نظری کی نہیں ہے، ہر شخص اور ہر گروہ کو اپنی پہچان عزیز ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص کو یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ دوسرا شخص اپنی دوکان کا نام اس کی دوکان کے نام پر، یا اپنی کمپنی کا نام اس کی کمپنی کے نام پر رکھ دے؛ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان برقرار رکھیں اور اگر غیر مسلم اپنی شناخت کو قائم رکھیں تو اس کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت (کاروبار میں سرمایہ کاری) کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے، (۱) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے، (۲) حضرت خبابؓ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا جو غیر مسلم تھے: ”خباب قال كنت رجلاً قيناً فعملت للعاص بن وائل“۔ (۳)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطۂ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ”دلیل“ کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۴۸، باب معاملة النبي اهل خيبر۔

(۲) کنز العمال: ۲/۳۲۱۔

(۳) بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۷۰۶۲۔

ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطورِ 'دلیل' اُجرت دے کر ساتھ رکھا، (۱) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں: ''یجوز أن یکون الأجیر ذمیا والمستأجر مسلما بلا خوف''۔(۲)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ''ابن اُثال'' نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ''ابن سرجون'' تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی، اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضدالدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔(۳)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ سیاسی اُتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی اس سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

---

(۱) احکام أہل الذمۃ لابن قیم: ۲۰۷۔

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۱۰۵، مادہ: اجارہ۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی: ۲/۲۱۷-۲۱۹۔

سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا؛ چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے؛ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کر سکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کا طلب گار ہوا، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''لَوْ اُدْعِیٰ بِهٖ فِی الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ''۔ (۱)

بنوامیہ کے دور میں سیدنا حضرت حسینؓ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسینؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (۲) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۹۱۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۱/۱۳۵۔

مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اُصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جا سکتا اور ان سے تعاون لیا جا سکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی: ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ'' (یوسف:۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

منصفانہ قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اُصولوں پر مبنی ہوں گے، اول ان قوانین کی اطاعت پر جو مبنی بر انصاف ہوں؛ کیوں کہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے، اور ایک طرح کا عہد جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سد باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مُنکَر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ

میں یہ اُصول بتایا ہے کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہوتو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا ہے تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے، اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا :

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيَغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فان لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فان لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْاِيْمَانِ ۔ (۱)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہئے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہوتو زبان سے روکے، اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہوتو دل سے بُرا سمجھے، اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پُرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بُری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (۲)

اللہ بُری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس شخص کے جس پر ظلم ہوا ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں، (۳) —— غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا

---

(۱) مسلم، حدیث نمبر: ۴۹۔ (۲) النساء: ۱۴۸۔

(۳) دیکھئے مجمع الزوائد: ۸/۱۲۰، باب ماجاء فی أذی الجاری۔

باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

اس سلسلہ میں بنیادی تعلیم یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کا احترام کیا جائے اور ان کے مذہبی اُمور میں مداخلت نہیں کی جائے؛ چنانچہ غور کیجئے کہ قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب و محمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (۱)

دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ ہدایت واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲)

تو کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟

حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کرلے، آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے : ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے ان کو آزاد کردیا۔ (۳)

---

(۱) البقرۃ:۲۵۶۔ (۲) یونس:۹۹۔

(۳) کتاب الاموال:۱؍۱۵۴۔

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون:٦) "تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین" ایک اور موقع پر ارشاد ہے: "لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" (الشوریٰ:١٥) "ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (۱) فقہاء نے لکھا ہے :

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔ (۲)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔ (۳)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛

---

(۱) احکام الذمۃ: ۱/۳۱۶۔

(۲) احکام أہل الذمۃ: ۱/۳۱۶۔

(۳) احکام أہل الذمۃ: ۱/۳۱۶۔

کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے ؛ لیکن پھر بھی قرآن مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (الانعام:۱۰۸)

اللہ کے سوا وہ جن کی عبادت کرتے ہیں، ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملہ میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں ـــــ خواہ کسی مذہب کی ہوں ـــــ ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (۲)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَواداربھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہہ در تہہ دبیز پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔

حیاتِ نبوی ﷺ اور جہاد

رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل

(۱) ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۴۱۔ (۲) موسوعۃ الخراج:۱۴۳۔

بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہا بھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی ماخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے، اس قوم کے افسانوں سے



ہندو مذہب اور شدت پسندی ☆

جہاں تک شدت پسندی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بات ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض مسلم حکمرانوں نے ظلم و ستم کیا ہو؛ لیکن ان کے ظلم و ستم کا تعلق اسلام سے نہیں ہے، ہر مذہب کے ماننے والے لوگوں میں دونوں طرح کے حکمراں رہے ہیں، رحم دل اور انصاف پسند بھی، اور دوسری طرف ظالم اور شدت پسند بھی، اس کا تعلق ان کے اپنے مزاج، ماحول اور مشیروں سے ہے؛ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ میں مذہب کے نمائندہ علماء و مشائخ کے یہاں ایسی شدت پسندی، قتل و غارت گری پر اُکساہٹ اور خوں آشامی کی مثالیں نہیں ملیں گی، جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں ملتی ہیں۔

اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جن مسلم حکمرانوں نے ظلم کیا ہے، انھوں نے صرف غیر مسلموں پر ہی ظلم نہیں کیا ہے؛ بلکہ غیر مسلموں سے بڑھ کر خود مسلمان ان کے ظلم کا نشانہ بنے ہیں، مسلم حکمرانوں میں حجاج بن یوسف، سفاح، نادر شاہ، تیمور لنگ ایسے حکمرانوں میں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے اور غیر مسلموں سے زیادہ مسلمان ان کا ہدف بنے ہیں؛ اس لئے ان کی شدت پسندی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

☆ ڈاکٹر بھدنت آنند کوسلیان کا مضمون ''منو اسمرتی کیوں جلائی گئی؟''، جس کو مولانا پروفیسر محسن عثمانی صاحب نے اپنی کتاب ''ہندو مذہب'' مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز میں نقل کیا ہے، سے ماخوذ ہے، کہیں کہیں معمولی حذف و اضافہ ہے؛ البتہ یہ منو کے ظالمانہ قوانین کی ایک جھلک ہے، ورنہ تو ان کی تعلیمات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے لئے پیری یار راماسوامی کا مضمون بہ عنوان ''منو کا قانون'' دیکھا جا سکتا ہے، جو پروفیسر عثمانی صاحب کی مرتب کردہ ''ہندو مذہب'' میں شامل ہے۔

اس لئے میں آگے دوسری اقوام خاص کر ہندوؤں اور عیسائیوں کی شدت پسندی کے دونوں پہلوؤں پر گفتگو کروں گا، پہلے مذہب کے نمائندوں کی طرف سے ہونے والی شدت پسندی پر اور پھر ان کے حکمرانوں کی طرف سے ہونے والے ظلم وستم کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔

ہندو بھائیوں کے یہاں منوجی کی شخصیت بڑی اہم ہے، منوجی نے منواسمرتی مرتب کی جو قانون کی کتاب ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کے سُتر ۵۱۸ میں لکھا گیا ہے: ''دیوتا برھمانے منو کے قانون (منواسمرتی) کی تحقیق کی'' منو کی بنیادی تعلیمات میں انسانیت کی طبقاتی تقسیم ہے، دنیا میں دو ایسے مذہب میں جو انسانی بنیاد پر مساوات کے قائل نہیں ہیں؛ بلکہ پیدائشی طور پر ایک طبقہ کو اونچا اور ایک کو نیچا سمجھتے ہیں، یہودیوں کا خیال ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے پیدا ہونے والے لوگوں کا درجہ اونچا ہے، باقی لوگوں کا نیچا، اور ہندو مذہب میں تو انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے :

(۱) برہمن۔ (۲) چھتری۔

(۳) ویش۔ (۴) شودر۔

شودر وہ بدقسمت طبقہ ہے جس کی حالت روم ویونان کے غلاموں سے بھی بدتر ہے؛ کیوں کہ غلام کا مالک کم سے کم اپنے اوپر غلام کی کفالت کی ذمہ داری کو تسلیم کرتا تھا؛ لیکن شودر ایک ایسا غلام ہے جو ہر طرح کے حقوق سے محروم ہے اور جس کو بالکل مفت میں اونچی ذات والوں کی خدمت کرنا ہے؛ چنانچہ ڈاکٹر بھدنت آنند کوسلیاین اپنے مضمون ''منواسمرتی کیوں جلائی گئی؟'' میں منوسمرتی کی ذات پات پر مبنی شدت پسندانہ تعلیمات کے بارے میں لکھتے ہیں :

منواسمرتی اور شودر

منواسمرتی کے مطالعے سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ منومہاراج نے شودر کے لئے کیا کیا احکامات دیئے ہیں اور ان کے فرائض گنائے ہیں؟ اور شودر کو غلطی کرنے پر کیا کیا سزا دی جائے گی؛ لیکن اس منواسمرتی میں کسی بھی جگہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ آخر شودر کہتے کسے ہیں؟ شودر کون ہیں؟ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس بارے میں منواسمرتی خاموش ہے۔

شادی بیاہ سے متعلق احکام کے باب میں منو اسمرتی کے ایک شلوک میں کہا گیا ہے :

- شودر کو صرف شودری سے شادی کرنے کا اختیار ہے۔ (۳:۱۳)
- برہمن اور چھتری کو اپنے طبقہ کی لڑکی نہ ملنے پر ہی شودر لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ (۳:۱۴)
- جو برہمن جہالت کی وجہ سے شودر کے یہاں شادی کر لیتے ہیں وہ اپنے پورے خاندان سمیت شودر ہو جاتے ہیں۔ (۳:۱۵)
- اگر کوئی برہمن کسی شودر لڑکی سے شادی کر لیتا ہے تو اس پر برہمن کے گھر کا کھانا دیوتا نہیں کھاتے، جو برہمن کسی شودر عورت کا شوہر ہو جاتا ہے وہ اس فعل بد کی وجہ سے سورگ (جنت) میں نہیں جا سکتا۔ (۳:۱۸)

مہمانوں کی خاطر داری اور منو اسمرتی

ہندوستان کی اس معنی میں بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ ہمارا ملک اتنا فراخ دل ہے کہ وہ مہمانوں کی عزت کرنے اور ان کی آؤ بھگت کرنے میں پوری دنیا میں مشہور ہے اور ہندو مذہب کی کتابوں میں مہمان کو دیوتا کہا گیا ہے؛ لیکن شاید یہ سب باتیں صرف اس صورت میں ہی صحیح ہیں کہ مہمان اور میزبان دونوں ہی برہمن ہوں؛ لیکن اگر کسی برہمن کے گھر کوئی شودر یا ویش مہمان بن کر آ جائے تب منو مہاراج کا حکم ملاحظہ کیجئے :

> اگر ویش یا شودر کسی برہمن کے گھر مہمان بن کر آ جائیں تو ان پر رحم کھا کر ان کو نوکروں چاکروں کے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلا دینا چاہئے۔ (۳:۱۱۲)

مطلب یہ کہ ویش اور شودر مہمان تو برہمن کا ہی ہوگا؛ لیکن اس کی اوقات یہ ہوگی کہ وہ کھانا اس برہمن کے نوکروں کے ساتھ کھائے گا۔

برہمنوں کو شودر سے کس قدر نفرت تھی، اس کا ثبوت منو اسمرتی کے مندرجہ ذیل اشلوک سے مل جاتا ہے :

- بھگوان! شودر کو عقل سلیم عطا نہ کر، نہ اس کو کوئی اعلیٰ مقام عطا کر، نہ اس کو مذہب کی تعلیم سے آشنا کر، اور نہ اس کو دوسری مذہبی رُسومات کو ادا کرنے کے قابل بنا۔ (۴:۸۰)
- جو شخص کسی بھی شودر کو مذہبی تعلیم یا وعظ دیتا ہے یا اس کو کسی قسم کی مذہبی رسم کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے تو وہ شخص شودر کے ساتھ ہی بہت ہی خطرناک نرک (دوزخ) میں جائے گا۔ (۱:۸۴)

شودر کے ساتھ غیر انسانی سلوک یہاں تک کیا گیا کہ مرے ہوئے برہمن کو بھی شودر ہاتھ نہیں لگا سکتا، منو مہاراج لکھتے ہیں :

> اگر اپنے لوگ موجود ہوں تو برہمنوں کو چاہئے کہ کسی بھی شودر کو برہمن کی لاش کو نہ چھونے دیں، اگر کوئی شودر کسی برہمن کی لاش کو چھودے گا تو وہ برہمن سورگ میں نہیں جاسکتا۔ (۵:۱۰۴)

شودر کسی منصب کے حقدار نہیں

ہندو مذہب میں مساوات کی خواہ کتنی ہی باتیں کی جائیں؛ لیکن ہندو مذہبی کتابوں میں اس کی نفی ملتی ہے اور آج ملک میں عملاً اس کی مثالیں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں، منو اسمرتی میں منو مہاراج اس موضوع پر فرما گئے ہیں :

> جو کہنے کی حد تک بھی برہمن ہے، وہ بھی راجہ کے لئے یا راجہ کی طرف سے مذہبی منصب پر براجمان ہوسکتا ہے؛ لیکن شودر، وہ تو تین کال تک (تین عہد تک) بھی نہیں ہوسکتا۔ (۸:۲۰)

اگر کوئی حکومت کسی شودر کو کوئی منصب عطا کردے تو اس حکومت کے ذمہ دار کے لئے منو مہاراج کی سخت تنبیہ ہے :

جس راجہ کے راجیہ میں کوئی شودر جج ہوتا ہے تو اس راجیہ کا دیکھتے ہی دیکھتے خاتمہ ہو جاتا ہے، یا اس کی ایسی بدتر حالت ہوتی ہے جیسے کیچڑ میں دھنسی ہوئی گائے کی، جس ملک میں شودروں کی اکثریت ہوگی، جو ملک ملحدوں سے گھرا ہوگا، اس ملک کی تباہی جلد ہی ہو جائے گی، وہاں قحط سالی اور وبائی امراض کا دور دورہ رہے گا۔ (۲۱:۸)

برہمنوں اور شودروں کا مقام

منو اسمرتی میں برہمن کو عام انسان سے اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کیا گیا ہے، اس کے برخلاف شودر کو انسان ہی نہیں مانا گیا ہے، شودر سے اگر کسی برہمن کی شان میں کوئی گستاخی ہو جائے تو اس ضمن میں بھی منو مہاراج نے قوانین بنائے ہیں، لکھتے ہیں :

- اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ''گنہگار'' کہہ کر پکارے، یا کوئی گالی دے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دیا جائے ؛ کیوں کہ اس کی پیدائش پاؤں کے درمیان سے ہوئی ہے۔ (۲۷۰:۸)
- اگر کوئی شودر برہمن کی ذات کا نام لے کر برہمن کو کچھ کہے تو جلتی ہوئی دس انگلی کے برابر ایک لوہے کی سلاخ اس شودر کے منھ میں ڈال دینی چاہئے۔ (۲۷۱:۸)
- اگر کوئی شودر فخر کی وجہ سے برہمنوں کو نصیحت کرنے کی کوشش کرے تو اس کی اس جسارت و گستاخی کے لئے راجہ کو چاہئے کہ اس کے منھ میں اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈلوا دے۔ (۲۷۲:۸)

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ شودر اگر گالی دے تب تو مان لیتے ہیں کہ وہ سزا کا مستحق ہے؛ لیکن اگر وہ بھلی باتوں کی نصیحت کرتا ہے تب بھی اس کو سزا کا حق دار بتایا جا رہا ہے، کیسا عجیب ہے یہ قانون!

یہاں تو بات گالی دینے اور نصیحت کرنے کی تھی، اب دیکھئے کہ اگر کوئی شودر اپنے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک سے بدظن ہو کر کسی برہمن پر ہاتھ اُٹھا دے تو اس کی سزا منو اسمرتی میں کیا ہے؟ ملاحظہ کیجئے :

● اگر کوئی نیچ ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات کے ساتھ ایک آسن پر بیٹھ جائے تو راجہ اس کی کمر دیوار یا اس کو ملک سے نکال دے یا اس کے سرین کا گوشت اُتار لے۔ (۲۸۱:۸)

● اگر غرور کی وجہ سے کوئی شودر برہمن کی چوٹی، پاؤں، داڑھی، گردن یا فوطے پکڑے تو راجہ طے کرے اور اس کے دونوں ہاتھ کٹوا دے۔ (۲۸۳:۲)

شودروں کی دولت کا حکم

اگر ملک میں شودر کے پاس دولت جمع ہو جائے تو اس دولت کے بارے میں منو مہاراج نے منو اسمرتی میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ اسے ملاحظہ فرمالیجئے :

● اگر برہمن کو ضرورت پڑے تو وہ شودر کا دھن بے روک ٹوک لے لے؛ کیوں کہ اس کا دھن تو ہو ہی نہیں سکتا، جو اس کے پاس ہے وہ تو اس کے مالک (یعنی اعلیٰ ذات والوں) کا ہی ہے۔ (۴۱۷:۸)

● شودر کو کھانے کے لئے جوٹھن دیا جائے، پہننے کو پرانے کپڑے دیئے جائیں اور پھٹے پرانے کپڑے اوڑھنے و بچھانے کو دیئے جائیں۔ (۱۲۵:۱۰)

● اگر شودر کسی قابل بھی ہو تب بھی اس کے پاس دھن جمع نہیں ہونے دینا چاہئے، اگر شودر کے پاس دھن جمع ہو جاتا ہے تو وہ شودر برہمنوں کو ہی تکلیف پہنچاتا ہے۔ (۱۲۹:۱۰)

شودروں کی ہندو سماج میں کیا حیثیت ہے؟ یعنی منو مہاراج نے کیسا ہندو سماج قائم کرنا چاہا ہے؟ اس کے لئے کیا کیا قوانین مرتب کئے ہیں؟ شودر کی اس سماج میں کیا حیثیت رکھی ہے؟ ملاحظہ کیجئے، منو اسمرتی کے مندرجہ ذیل اشلوک۔

برہمن کو تو اگر کوئی شودر گالی بھی دے دیتا ہے تو اس کے بدلے میں شودر کی ہتیا (قتل) تک کر دینے کا حکم تھا، اب اگر کسی برہمن کے ہاتھوں شودر مارا جائے تو اس کے لئے کفارہ کا کیا طریقہ ہے؟ کیا قانون ہے؟ ملاحظہ کیجئے :

بلی، نیولے، نیل کنٹھ، مینڈک، کتا، گوہ، اُلّو اور کوے کی ہتیا (قتل)
اگر کر دی جائے تو اس کا کفارہ بھی وہی ہے جو کسی شودر کے قتل کرنے
پر کیا جاتا ہے۔ (۱۳۱:۱۱)

مطلب یہ ہے کہ شودر کا قتل کر ڈالنا بس اتنا ہی معمولی جرم یا گناہ ہے جتنا جرم کسی کتے، بلی، اُلّو، مینڈک، نیل کنٹھ یا نیولے کو مار دینا، یعنی شودر کی حیثیت ہندو سماج میں ان جانوروں جیسی ہے۔

اس طرح ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ منو اسمرتی میں انسان اور دوسرے انسانوں کے درمیان محض اس بنا پر فرق رکھا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ ذات کے نہیں تھے، اور یہ کہ ان کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھا گیا، ایشور نے سارے انسانوں کو برابر پیدا کیا، ایک ہی ماں باپ کی سب اولاد ہیں پھر انسان کے درمیان اس قسم کا بھید بھاؤ اور وہ بھی مذہبی نقطۂ نظر سے کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے؟ یہ بات کسی بھی طرح گلے سے نہیں اُتر سکتی، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مذہب کی آڑ لے کر کچھ اعلیٰ ذات کے لوگوں نے خود ساختہ قوانین بنا کر دوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر و حقیر سمجھا ہے اور ان کو اپنے طور پر خدمت گار بھی بنا کر رکھا اور دوسری طرف ان کو اس خدمت کے عوض کسی طرح کی مدد بھی دینے کا کوئی قانون نہیں بنایا، لیکن اگر یہ شودر اپنے طور پر کچھ کام کر کے تھوڑا بہت پیسہ جمع کرتے تھے تو اس رقم کو بھی ان کی ملکیت نہیں مانا گیا، ملاحظہ فرمائیے :

> اگر کوئی نیچ ذات کا شخص کسی طرح کام کر کے یا لالچ ولوبھ (طمع) کے ذریعے تھوڑا بہت دھن جمع کرتا ہے تو راجہ کو چاہئے کہ اس شخص کا دھن اس سے چھین کر اس کو دیش نکالا دے دے۔ (۹۶:۱۰)

بداعمالیاں اور منواسمرتی

عام قاعدہ ہے کہ ''جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھرے گا'' یعنی: جس نے جو گناہ کئے، ان کی سزا پائے گا؛ لیکن منو مہاراج نے اس معاملے میں بھی اپنی الگ بات کہی ہے۔

چاروں طبقات کے لوگ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں، یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر، ان لوگوں کے گناہ کے سبب اگر ان کا بیان لینا ہو تو منو مہاراج نے حکم دیا ہے، مثلاً:

> برہمن سے تو صرف اتنا ہی کہے کہ ''کہیے'' چھتری سے کہا جائے کہ ''سچ کہیے'' ویش کو گو بیج اور سورن کی قسم دلائی جائے اور شودر سے یہ کہا جائے کہ اپنے طور پر کئے گئے سارے گناہوں کی قسم کھائے۔ (۸۸:۸)

مطلب یہ ہے کہ منو مہاراج کی نگاہ میں بے چارہ شودر ہی ایسا شخص ہے جس سے جانے اَن جانے گناہ پر گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں، اب دیکھئے: اگر گناہ ثابت ہو جائے یعنی غلطی ثابت ہو جائے تو اس کے لئے سزا کا قاعدہ کیا ہے:

> برہمن سے جرمانہ کے طور پر دو پن (اُس وقت کا مروجہ سکہ) فی سیکڑہ ماہانہ سود لیا جائے، چھتری سے تین پن فی سیکڑہ ماہانہ سود لیا جائے اور ویش سے چار پن فی سیکڑہ ماہانہ سود لیا جائے، اور شودر سے لیا جائے، دس پن فی صد سیکڑہ ماہانہ سود۔ (۴۴:۸)

ذرا منو مہاراج کا انصاف دیکھئے کہ جو شودر برہمن کی طرح نہ تو دان لے سکتا تھا اور نہ وہ ویش و چھتریوں کی طرح دولت جمع کرنے کا ہی حق رکھتا تھا، اسی شودر سے سب سے زیادہ سود وصول کرنے کا منو مہاراج نے حکم فرمایا ہے۔

آپس میں ایک ہی سماج میں رہنے اور زندگی گزارنے سے کچھ نہ کچھ اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تھوڑی بہت کہا سنی ہو جاتی ہے تو ایسے میں منو مہاراج نے کیا قانون مرتب کیا ہے؟ ملاحظہ فرمایئے :

> اگر کوئی چھتری کسی برہمن کو چور چنڈال وغیرہ کے الفاظ کہہ دے تو اس کو ایک سو پن جرمانہ کرنا چاہئے، اور اور اگر کوئی ویش اس طرح کے الفاظ کہہ دے تو اس کو ڈیڑھ سو پن کا جرمانہ لگانا چاہئے اور اگر کوئی شودر اس قسم کے الفاظ کسی برہمن کو کہہ دے تو اس کا تو قتل ہی کر دیا جائے گا۔(۲۶۷:۸)

اب اس قانون کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمایئے، یعنی اگر اسی طرح کا معاملہ کسی برہمن سے سرزد ہو جائے تو اس کے لئے سزا اور جرمانہ کا کیا قاعدہ ہے؟ دیکھئے :

> اگر کوئی برہمن کسی چھتری کو سخت الفاظ کہہ دے تو اس کو پچاس پن جرمانہ کی سزا دی جائے، اور کوئی برہمن ویش کو سخت الفاظ کہہ دے تو پچیس پن کا جرمانہ عائد کیا جائے؛ لیکن اگر کوئی برہمن کسی شودر کو سخت الفاظ کہہ دے تو صرف بارہ پن ہی جرمانہ لگایا جانا مناسب ہے۔(۲۶۸:۸)

اب دیکھئے منو مہاراج نے کس طرح انسانوں کے درمیان فرق رکھا ہے، یعنی اگر ایک شودر جو انسان ہی ہے اور اسی ایشور کا بنایا ہوا ہے وہ کسی برہمن کو سخت الفاظ کہہ دے تو اس کے بدلے میں اس کا قتل کیا جانا واجب قرار دیا گیا؛ لیکن اگر کوئی برہمن کسی شودر کو سخت الفاظ کہہ دے تو اس برہمن پر صرف بارہ پن جرمانہ کافی مانا گیا ہے۔

سزا دینے کے معاملے میں منو مہاراج نے اپنا الگ قانون بنایا، خواہ یہ سزا وید پر تنقید کرنے کی ہو یا زنا، چوری، جوا اور شراب بنانے والوں کی ہو، سزائیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک: معاشی سزا، یعنی جرمانہ لگا دینا، دوسری: جسمانی سزا، یعنی تشدد کرنا، قتل کرنا وغیرہ، اس

معاملے میں بھی منو مہاراج نے بھید بھاؤ سے کام لیا ہے، یعنی سزا دینے نہ دینے اور ان میں فرق کرنے کے سلسلے میں برہمن اور چھتری ایک خانہ میں اور ویش اور شودر دوسرے خانہ میں رکھے گئے ہیں، ملاحظہ ہو :

> وہ (یعنی راجہ یا حکمراں) جواری، بے ایمان، ویدوں کی مذمت کرنے والوں، بدکار اور شراب بنانے والوں کو اپنے ملک سے نکال دے۔(۲۲۵:۹)

یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ وید پر تنقید کرنے والوں کو بھی وید کی مذمت کرنے والے کا خطاب دے کر ان کو جواریوں بدکاروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے، آگے دیکھئے :

> چھتری، ویش اور شودر اگر سزا بھگتنے کے قابل نہ ہوں تو راجہ ان سے سزا کے بدلے مناسب کام کرائے، برہمن سے کوئی کام نہ کرائے؛ بلکہ معمولی جرمانہ لے کر اس کو معاف کر دے۔(۲۲۹:۹)

بھلا جرمانہ وصولنے کی بھی کیا ضرورت تھی جب ایک برہمن کو بڑے سے بڑے گناہ وسنگین سے سنگین جرم کرنے پر بھی جسمانی سزا نہیں دی جاسکتی تو کسی چھوٹے موٹے جرم کے لئے جرمانہ کرنے کی بات کیوں کی جائے۔

اب لگے ہاتھوں برہمنوں کی عظمت کے بارے میں بھی منو مہاراج کے خیالات سن لیں، کہتے ہیں :

> ● شمشان گھاٹ پر بھی دی جانے والی آگ خراب نہیں ہوتی اور یگیہ میں شامل ہو کر وہ اور بڑھتی ہے، اسی طرح ہر برے سے برے کام کرنے یا ہر گناہ میں ملوث ہونے پر بھی برہمن ہمیشہ قابل پرستش ہیں؛ کیوں کہ وہ اس دھرتی کے عظیم دیوتا ہیں۔(۳۱۹:۹)
>
> ● برہمنوں کے بارے میں راجہ (حکمراں) کو مخاطب کرتے

> ہوئے منومہاراج ہدایت دیتے ہیں کہ ''ہر قسم کی سزا اور جرمانہ سے جس قدر بھی دولت جمع ہو، وہ سب برہمنوں کو دینے کے بعد اور اپنے بیٹے کو راج گدی پر بٹھا کر راجہ کو چاہئے کہ وہ اپنی قربانی پیش کردے۔(۹:۳۲۳)

دَھن دولت جٹانا ہر ایک کا پیدائشی حق ہے، کمائے نہیں تو کہاں سے کھائے؛ لیکن منومہاراج نے اس سلسلے میں بھی سارے حق صرف برہمن ہی کو دے دیئے ہیں، شودر کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے کام کر کے دولت حاصل کرے، ملاحظہ کیجئے :

> اگر کوئی نیچ ذات والا (شودر) شخص دھن دولت کے لالچ میں اونچی ذات کے شخص کو ذریعہ بنا کر دھن حاصل کرتا ہے تو راجہ کو چاہئے کہ اس شودر کا دھن چھین کر اس کو اپنے ملک سے نکال دے۔(۱۰:۹۶)

یعنی برہمن (اونچی ذات والوں کے لئے) کو تو جوتے کی دوکان کھولنے سے لے کر وزیر اعظم اور مختلف صوبوں کے وزراء اعلیٰ بننے کا حق و آزادی ہے؛ لیکن صرف بے چارہ شودر ہی ایسا بدقسمت انسان ہے کہ وہ اپنے مخصوص دھندے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

شودر کو اگر جنت حاصل کرنی ہے تو وہ صرف اس کو اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ برہمنوں کی خدمت اور چاکری کرے، اس کے علاوہ وہ جو بھی اچھے کام کرے گا، وہ کام اس کو سورگ (جنت) میں نہیں لے جا سکتے، ملاحظہ ہو :

> شودر سورگ (جنت) کے لئے یا دوسرے سکون و آرام کے لئے برہمنوں کی ہی سیوا کرے: ''یعنی شودر کو سورگ کے لئے بھی برہمنوں کی مہربانی پر ہی منحصر رہنا ہوگا، برہمن کی خدمت و چاکری کرنا ہی اصل میں شودر کا اصل دھرم ہے، اس کے علاوہ جو بھی کام کرتا ہے، وہ سب اس کے لئے اکارت ہوتا ہے''۔(۱۰:۱۲۲-۱۲۳)

● ● ●

بدھ مت پر مظالم☆

بدھ مت کی تاریخ کا یہ عجیب موڑ ہے کہ اس کو بادشاہوں کی سرپرستی بھی ملی اور سیاسی جبر کے حالات سے بھی گزرنا پڑا، ایک جانب اگر اس کو اشوک جیسا مخلص خادم ملا جس نے اس مذہب کو عالمی شکل دی، تو دوسری جانب اس کو مہر گل جیسے دشمن سے بھی پالا پڑا، جس نے اس مذہب کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، قدیم تاریخ ہند کے مصنف لکھتے ہیں :

> یہ بھی بالکل درست ہے کہ وقتاً فوقتاً متعصب بادشاہوں نے اپنے تعصب کا اظہار سخت ظلم و ستم کے افعال سے ضرور کیا اور جین یا بدھ مت والوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں، اس قسم کے اُمور کی بہت سی صحیح شہادتیں خود اس کتاب میں ملیں گی اور ان کے علاوہ اور مثالیں بھی جو اس کتاب کے ضمن میں نہ آسکیں، موجود ہیں۔ (قدیم تاریخ ہند:292)

پشی متر اور بدھ مت

۱۸۵ قبل مسیح موریہ سلطنت کمزور ہو چکی ہے؛ لیکن اس کی عظمت کا نشان باقی تھا، برہمن اس سلطنت سے خار کھائے بیٹھے تھے، موریہ سلطنت کے آخری تاجدار بدرتھ موریا کو اس کے برہمن سپہ سالار پشی متر نے فوج کے معائنہ کے بہانے بلا کر قتل کر دیا، اور خود اقتدار پر قابض ہو گیا، دھیرے دھیرے اس نے آس پاس کی تمام ریاستوں پر قبضہ کیا، وہ صرف سیاسی اعتبار سے فاتح نہیں بننا چاہتا تھا، اس نے بدھ مت کو ختم کرنے اور برہمنی ازم کو زندہ کرنے کی

☆ مولانا محمد عبید اختر رحمانی (نگران: شعبۂ تحقیق المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)۔

بھرپور کوشش کی، چنانچہ اس نے گھوڑے کی قربانی کی رسم کو جو اشوک وغیرہ کے عہد سے بند ہوگئی تھی، دوبارہ اس کا احیاء کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے بودھ مت کی خانقاہوں کو جلا ڈالا، راہبوں کو قتل کیا اور پوری کوشش کی کہ بدھ مت کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔

ڈاکٹر رام شرن ایک قدیم کتاب ''دیویاوَدان'' جو دوسری صدی یا تیسری صدی عیسوی کی ہے، کا اقتباس نوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> وہ (پشیہ متراشنگ) اپنی زبردست فوج کے ساتھ بدھ عبادت گاہوں (استوپوں) کو ڈھاتا، ان کی خانقاہوں (وہاروں) کو جلاتا اور بھکشوؤں کو موت کے گھاٹ اُتارتا ہوا، شاکل (موجودہ سیالکوٹ) تک بڑھتا چلا جاتا ہے، اور سیالکوٹ میں یہ اعلان کرتا ہے جو بھی اس کے پاس ایک بھکشو کا سر لائے گا، اس کے صلے میں اسے سونے کے سکے انعام میں دیئے جائیں گے۔(۱)

ڈاکٹر رام شرن شرما مزید لکھتے ہیں :

> مغربی بنگال میں گوڑ کے ایک شیو بھگت راجہ شاشنگ نے پیپل کے اس پیڑ کو کٹوا دیا جس کے نیچے مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا، یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس ملک سے بدھوں کا صفایا محض ان کے خلاف نظریاتی پرچار (تبلیغ) کے باعث ہوا؛ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ انھیں ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا، اب ان کے سامنے صرف دو راستے رہ گئے تھے، یا تو یہاں سے بھاگ دوسرے ملکوں میں چلے جائیں، اور وہیں بس جائیں، یا ان سماجی مجبوروں اور پابندیوں میں سے جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے، سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسلام قبول کرلیں۔(۲)

---

(۱) فرقہ وارانہ تاریخ اور رام کی ایودھیا: ۱۳-۷۔ (۲) فرقہ وارانہ تاریخ اور رام کی ایودھیا: ۱۳-۷۔

ایک اور مؤرخ ڈاکٹر اوم پرکاش اپنی کتاب "اورنگ زیب، ایک نیا زاویہ نظر" میں لکھتے ہیں :

> موریہ سلطنت کے برہمن سپہ سالار پشتیہ متر اشنگ نے آخری موریہ راجہ ورہ ورتھ کو جان سے مار کرشنگ خاندان کی بنیاد ڈالی، برہمن مذہب کی ترقی کے لئے نہ صرف اس نے بہت سی عبادت گاہوں کو برباد اور بے شمار بودھوں کا قتل کیا؛ بلکہ ایک فرمان جاری کر دیا، جس کی رو سے جو کوئی ایک بھکشو کا سر کاٹ کر پیش کرتا، اسے سو دینار کا انعام دیا جاتا۔(۱)

مشہور مؤرخ ڈی ڈی کوسمبی لکھتے ہیں :

> سب سے پہلی حقیقی اذیت وعقوبت ساتویں صدی کے شروع میں مغربی بنگال کے راجہ نرندر گپت شانک کے ہاتھوں نازل ہوئی جس نے وادی گنگا کے میدان میں دور تک فوج کشی کی، اور گیا میں "بودھی برکش" (مہاتما بدھ کو جس درخت کے نیچے گیان حاصل ہوا) کو کاٹنے کے علاوہ اس نے بہت سے بدھ مجسمے توڑ ڈالے۔

مشہور مؤرخ ونسنٹ اے اسمتھ لکھتے ہیں :

> اگر بدھ مت کے مصنفین کی روایات قابل اعتبار خیال کی جاسکیں تو پشی متر نے ہندو روایات کے بتدریج اور امن کے ساتھ احیاہی پر قناعت نہیں کی؛ بلکہ بدھ مذہب والوں کو حتی الوسع وحشیانہ انداز سے تکلیف بھی پہنچائی، ان کی خانقاہوں کو جلا کر خاکستر کر دیا، اور مگدھ سے لے کر پنجاب کے مقام جالندھر تک ان کے راہبوں کو قتل کیا، بہت سے راہب جو کسی نہ کسی طرح اس کی تلوار سے بچ گئے، دوسرے بادشاہوں کے ممالک میں چلے گئے۔(۲)

---

(۱) دیویاؤدان، ۲۵واں یا ۲۹واں اودان، بحوالہ اورنگ زیب، ایک نیا زاویہ نظر: ۱۰۔

(۲) قدیم تاریخ ہند: ۲۹۱، مترجم مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب۔

مشہور بدھ مورخ تارانا تھ اور شیلفر دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ پشی متر کفار کا حلیف تھا، اور اس نے خود بھی خانقاہوں کو جلایا اور راہبوں کو قتل کیا تھا۔(۱)

سوامی دھرم تیرتھ لکھتے ہیں :

اشوک کے جانشیں اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکے، اور بہت جلدی آخری موئی راجہ کو اس کے برہمن کمانڈر پشپامتر نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا، اور ایک بار پھر برہمنی اقتدار پورے زور و شور سے مگدھ پر غالب ہو گیا، اس نے بودھوں کو قتل کرنا اور ان کی خانقاہوں کو ختم کرنا شروع کر دیا۔(۲)

پردیپ کمار موریہ لکھتے ہیں :

سمراٹ اشوک موریہ کے ذریعہ تیسری صدی قبل مسیح میں بنائے گئے اسی ہزار وہاروں (بدھ مندروں) میں سے کچھ کو چھوڑ کر باقی سبھی کو پشیہ متر اشنگ نے مسمار کر دیا تھا، اس کے علاوہ اشوک کے ذریعہ بنائے گئے چوراسی ہزار استوپوں (بدھ عبادت گاہوں) اور سانچی استوپ کے پلروں (ستونوں) کو پشیہ متر شنگ نے مسمار کر دیا تھا۔(۳)

محترم سوپن، کے، بسواس لکھتے ہیں :

آرکیالوجسٹ (ماہر آثار قدیمہ) نے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ ہندو مندر بنیادی طور پر پہلے کے بودھ وہار (خانقاہ) تھے، یہاں تک کہ شری رنگم، کانچی پورم، پلانی اور تروپتی کے ہندو مندر قبل کے بدھ وہار تھے۔(۴)

---

(۱) قدیم تاریخ ہند:۲۹۱، مترجم مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب۔ (۲) ہندو سامراجیت کی تاریخ: ۲۷۔
(۳) ہندوستان میں ذات پات:۷۷۔ (۴) مسلم آکرمن ہم برہمنوں پر احسان:۱/ ۱۱۳۔

آگے وہ لکھتے ہیں :

برہمن پرست دوکانند نے بھی مانا ہے کہ جگناتھ مندر حقیقت میں بودھ وہار تھا۔(۱)

مہاتما جیوتی با پھولے مشہور سماجی مصلح گزرتے ہیں، جنھوں نے ذات پات کے خلاف بڑی تحریک چلائی، وہ لکھتے ہیں :

شنکرآچاریہ کے وقت بدھسٹوں کو تیل نکالنے کے کولہو میں نچوڑ کر مار ڈالا گیا، ان کی اکثر مذہبی کتابوں کو جلا کر برباد کردیا گیا، اس میں سے ''امرکوش'' نامی گرنتھ اپنے استعمال کے لئے رکھ لیا گیا۔(۲)

ڈاکٹر ایس ایل ساگر لکھتے ہیں :

ہندو راجاؤں نے طاقت سے تلوار کے زور پر بدھوں کو برباد کر کے بدھ دھرم کو مٹایا، لاکھوں بودھ سرعام قطار میں کھڑے کر کے بکروں کی طرح قتل کردیئے گئے، خوف سے گھبرا کر لاکھوں لاکھ بودھ، لنکا، برما، تبت، چین وغیرہ ملکوں میں بھاگ گئے، برہمنوں نے جو مذہبی کتابیں لکھیں، ان میں بدھوں کے بارے میں نفرت بھرے الفاظ لکھے، انھیں اچھوت بنایا۔(۳)

چوں کہ بدھ مذہب پر برہمنوں کے ذریعہ بہت ظلم ہوا ہے، اور برہمن اپنی جو امیج دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، امن پسند اور رحم دل کی، یہ اس کے خلاف ہے، اس لئے حال کے دنوں میں بعض مورخین کی کوشش یہ ہے کہ بدھوں پر ظلم سے سرے سے انکار کیا جائے، ایسے مورخین کی تردید کرتے ہوئے ولسنٹ اے اسمتھ لکھتے ہیں :

---

(۱) مسلم آکرمن ہم برہمنوں پر احسان: ۱/ ۱۱۳۔

(۲) ابلیسی استحصال: ۱۴۴۔

(۳) ہندوستان میں ذات پات: ۷۶۔

> وقتاً فوقتاً متعصب بادشاہوں نے اپنے تعصب کا اظہار سخت ظلم وستم کے افعال سے ضرور کیا، اور جین یا بدھ مت والوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں، اس قسم کے اُمور کی بہت سی صحیح شہادتیں خود اس کتاب میں ملیں گی، اور ان کے علاوہ اور مثالیں بھی جو اس کتاب کے ضمن میں نہ آسکیں، موجود ہیں۔(۱)

مہر کلا: ہن خانہ بدوش لوگ تھے جو وسط ایشیاء کے جنگلوں میں رہتے تھے، چارہ اور خوراک کی تلاش میں آگے بڑھے تو ایک گروپ یوروپ کی طرف بڑھ گیا اور ایک گروپ سجستان میں رک گیا، سجستان میں یہی لوگ گورے ہیں کے نام سے مشہور ہوئے اور انہی ہنوں نے آگے چل کر افغانستان پر قبضہ کرلیا اور وہیں سے ہندوستان کی جانب بڑھے، ہندوستان کے بڑے حصے پر ہن قابض ہوگئے اور یہاں کی بہت ساری ریاستوں سے انھوں نے خراج وصول کرنے لگے۔

ہندوستان پر یہ قبضہ ہنوں کے سردار ترمان نے کیا تھا، ۵۱۰ء میں ترمان کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا مہر گل یا مہر کلا ہندوستانی مقبوضات کا مالک ہوا، یہ انتہائی ظالم وجابر تھا، اس کی سفاکی کی داستانیں زبان زد عام وخاص ہیں، ہن عام طور پر سورج کی بطور دیوتا پوجا کرتے تھے؛ لیکن مہر گل نے ہندو مذہب شاید اختیار کرلیا تھا؛ کیوں کہ وہ شیو کا پرستار بن چکا تھا، شاید شیو کو پوجنے میں بھی اس کی سفاک طبیعت کے رجحان کو خاص دخل ہو۔

مہر گل کی زیادتیاں جب حد سے گزر گئیں تو ہندوستانی راجاؤں کے ایک متحدہ محاذ نے جس کی قیادت نرسمہہ بالادت اور یسودھرمن کررہے تھے مہر گل کو شکست دی، مہر گل بھاگ کر کشمیر چلا گیا، وہاں کے راجہ نے اس کو مہمان سمجھ کر بڑی خاطر مدارات کی، مہر گل نے اس کو دھوکے سے قتل کرکے کشمیر کی حکومت پر قبضہ کرلیا اور پھر افغانستان کی حکومت پر بھی دھوکے سے حملہ کرکے قبضہ کرلیا اور وہاں بھی ظلم وستم کا بازار گرم کردیا، اس کی سفاک طبیعت کا نمونہ یہ ہے کہ

---

(۱) قدیم تاریخ ہند: ۲۹۲، مترجم مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب۔

ایک مرتبہ کشمیر میں ایک ہاتھی کھائی سے گر گیا، گرتے ہوئے ہاتھی کی چیخ بڑی دردناک تھی؛ یہ دردناک آواز اس کو بہت بھلا معلوم ہوا، اس نے سو ہاتھی کو کھائی میں پھنکوادیا اور اس طرح اپنی سفاک طبیعت کو تسلی بخشا، اسی طرح جب اس نے قندھار یعنی موجودہ افغانستان پر دھوکے سے حملہ کیا تو وہاں کے شاہی خاندان کا صفایا کردیا اور ہزاروں آدمی کو دریائے سندھ کے کنارے ذبح کردیا۔

ہن بت پرست تھے، اور مہر گل کے وقت میں ہندو مذہب مین بھی بت پرستی شروع ہوچکی تھی، ہوسکتا ہے کہ مہر گل کی سفاک طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس کو پٹی پڑھائی گی ہو کہ وہ شیو کا اوتار ہے اور بت پرستی کے دشمن بدھ مذہب کو ختم کرنا ہی اس کا مشن ہے۔

ولسنٹ اے اسمتھ اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

> تمام ہندی روایات مہر گل کو سفاک ظالم بتلانے میں متفق ہیں، وہ دراصل ہندوستان کا اٹلا تھا، اور اس کے مزاج میں ہنوں کی سفا کی اور بے رحمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔(۱)

لیکن اس وحشی کے وحشیانہ مظالم کا خاص ہدف بدھ مذہب تھا؛ چنانچہ ولسنٹ مزید لکھتے ہیں :

> اس وحشی حملہ آور نے جو بالخصوص تباہی و بربادی کے دیوتا شیو کا پرستار تھا، بدھ کے مرنجان مرنج مذہب کے ساتھ خصومت اور دشمنی کا مظاہرہ کیا، اور نہایت بے دردی سے ستوپوں اور خانقاہوں کو برباد کرکے ان کے خزانوں کو لوٹ لیا۔(۲)

مشہور مورخ الیگزینڈر برزن جنھوں نے اسلام اور بدھ مذہب کے تعلقات پر قابل قدر کام کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، وہ اپنے مضمون ''بودھی اور اسلامی ثقافتوں کے مابین تاریخی تعامل منگول سلطنت سے پہلے'' میں لکھتے ہیں :

---

(۱) قدیم تاریخ ہند:۴۷۹۔ (۲) قدیم تاریخ ہند:۴۸۱۔

> ۵۱۵ء میں سفید فام ہن راجہ مہر کلا نے بودھوں پر ایک مختصر لیکن تباہ کن جبر کی شروعات کی، ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس کی فوجوں نے چودہ سو خانقاہیں برباد کر ڈالیں، سب سے زیادہ نقصان گندھارا کے میدانوں، کشمیر اور شمال مغربی ہندوستان نے اُٹھایا جہاں فام ہون راجہ مہر کلا کے اقتدار کے مراکز تھے، اس نے اپنی سلطنت کے زیادہ دور افتادہ علاقوں، مثلاً سوات میں اپنی اس پالیسی کا نفاذ نہیں کیا، بہر حال، ایک خاص حد تک ان علاقوں پر اس کا اثر پڑا، مثال کے طور پر سمرقند کی خانقاہیں مسمار تو نہیں کی گئیں مگر بھکشوں سے پوری طرح خالی ہوگئیں۔

مہر گل کی سفا کی یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بدھوں کے خانقاہ تباہ کرنے اور بدھ راہبوں اور عوام کی بڑی تعداد کو قتل کرنے کے بعد بچے کچھے بدھوں کو جڑ سے مٹانے کے لئے اس نے یہ اعلان کرایا تھا کہ جو کوئی کسی بدھ کا سر لائے گا، اس کو سونے کا سکہ انعام میں دیا جائے گا، اس اعلان کا عوام پر جو اثر پڑا ہوگا اور دولت کے لالچ میں لوگوں نے جس طرح کھوج کھوج کر بدھوں کا قتل کیا ہوگا، اس کا صرف اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

راجپوت اور برہمن گٹھ جوڑ اور بدھوں کی تباہی

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ مشہور ہندوستانی راجہ ہرش (۶۷۸ء) کے عہد میں ہندوستان آیا، یعنی محمد بن قاسم کی آمد سے محض اسی نوے برس پہلے، اس نے پورے ہندوستان کا سفر کیا، وہ یہاں پندرہ سال رہا، اپنے سفرنامے میں وہ لکھتا ہے کہ اس کو ہر جگہ بدھ مذہب کے ماننے والے، اس کی خانقاہیں، اس کی تعلیم گاہیں ملیں، بہت سی جگہوں پر تو راجہ بدھ مذہب کے ماننے والے تھے، سوائے جنوبی ہند کے اس کو ہر جگہ بدھ مذہب غالب نظر آیا، بدھ مذہب کے بعد ہندو مذہب کے ماننے والے تھے، اس تھوڑی مدت میں ایسا کیا انقلاب آگیا کہ بدھ مذہب

ہندوستان سے ناپید ہوگیا، اس کی جڑ کٹ گئی، اس کی وجہ بتاتے ہوئے مشہور صحافی عبدالمجید سالک اپنی کتاب ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' لکھتے ہیں :

> حقیقت یہ ہے کہ برہمن اس بدھ گردی کے زمانے میں سر پر لپیٹے پڑے رہے؛ لیکن غافل نہیں رہے، ہرش کے اقتدار کی وجہ سے انھیں کسی عام تحریک کی جرات تو نہیں ہوئی؛ لیکن وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتے رہے، دوسری بات یہ ہے کہ امتداد زمانہ سے خود بدھ میں بھی فرقہ بندی، اوہام پسندی اور بت پرستی کی خرابیاں بدرجہ اتم پیدا ہو چکی تھیں، اہنسا کے عقیدے نے بودھیوں کو قوت دفاع سے بالکل عاری کر دیا تھا، اور راجپوت بڑے بہادر اور جنگ جو تھے، انھوں نے برہمنوں کو ساتھ ملا کر ہندو دھرم کو از سر نو زندہ کیا اور بودھوں کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا، نتیجہ یہ یہ ہوا کہ بدھ مت اپنے مولد یعنی ہندوستان میں ناپید ہو گیا۔ (۱)

سوامی تیرتھ لکھتے ہیں کہ وسط ایشیاء اور افغانستان سے آنے والے غیر ملکی بھی بت پرست تھے، برہمنوں نے ان سے قربت پیدا کی، ان کو راجپوت بنا کر ہندو مذہب کے محافظ کا درجہ دیا اور ان کی جنگی صلاحیتوں اور اپنی عیارانہ مہارت سے بدھوں کا اس ملک سے صفایا کر دیا :

> یہ راجپوت کون تھے؟ اور چھتری کیسے قرار دیئے گئے، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے، اس دور سے قبل کبھی کہیں تاریخ کے کسی بھی دور میں راجپوتوں کا نام نہیں آیا، نہ ویدک یا برہمن لٹریچر میں راجپوتوں کا کوئی تذکرہ ہوا، یہ آخر کون لوگ تھے، کن ذاتوں اور قبیلوں کا مجموعہ تھے، یہ مقامی قبائل تھے یا باہر کہیں سے آئے تھے، زیادہ خیال یہ ہے کہ یہ لوگ شاید افغانستان کی جانب سے ہندوستان میں

(۱) مسلم ثقافت:23،مولانا عبدالمجید سالک۔

> وارد ہوئے، جنگجو اور جفا کش قسم کے لوگ تھے، اور ساتھ میں بت پرست بھی، یہاں آ کر وہ بہت جلد برہمنوں کے حاشیہ بردار بن گئے اور جدید مذہب کے کٹر پیروکار، اور اس کے محافظ بنا دیئے گئے، ان کو عزت واحترام دینے اور انھیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے ذات پرست برہمنوں نے انھیں چھتری کے زمرہ میں قرار دے کر برہمنوں اور ہندو مذہب کا مقدس محافظ ہونے کا اہم فرض عطا کر دیا، اپنی جنگی صلاحیت اور برہمنوں کی امداد واعانت سے یہ نئے چھتری بہت جلد ہندوستان کی سیاست پر چھا گئے۔(۱)

اس بات کو مشہور مورخ کے ایس بھگوان بھی مانتے ہیں کہ ہندوستان سے بدھوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں برہمنوں اور راجپوتوں کا ہاتھ ہے، یہ وہی راجپوت ہیں جو وسط ایشیا سے آئے، ان کو برہمنوں نے ہندو مذہب کے ذاتوں کے سلسلہ میں اونچا مقام دیا اور ان سے بدھوں کے قتل عام کا کام لیا :

> بدھ مت جو ہندوستان کے طول وعرض میں اشوک کے دور حکومت میں پھلتا پھولتا رہا، اور کنشکا وہرشا وردھنا کے دور میں ترقی پذیر رہا، پروہتوں کے مکارانہ جبر واستبداد نے اسے ملیامیٹ کر دیا اور شاہی سرپرستی سے یہ محروم ہو گیا، ملک کے مختلف حصوں میں تعمیر شدہ بدھ خانقاہوں خصوصاً ایلورا اور اجنتا کو دیکھیں تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ بے شمار رہے ہوں گے، اس سرزمین میں بدھ مت ایسا مذہب ہے جو دلیل اور فطری تجسس پر قائم ہے، اس لئے یہ ویدوں کی سرپرستی کا منکر ہے اور برہمنیت کا قائل نہیں، شستریوں اور برہمنوں نے مل کر اس روشن مذہب کے پیروؤں کی بیخ کنی کر دی ہوگی۔(۲)

---

(۱) ہندو سامراجیت کی تاریخ:۷۵۔ (۲) ہندو مذہب:۹۸، ہندومت میں تشدد، مقالہ نگار، کے ایس بھگوان۔

شنکر آچاریہ

شنکر آچاریہ کی ولادت موجودہ کیرالا کے کالڈی علاقے میں ۷۸۸ء میں ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے، بہت ذہین تھے، کم عمری میں ہی ہندو مذہب سے متعلق لٹریچر پر حاوی ہوئے، اس وقت چوں کہ ہندوستان پر بدھوں اور جینیوں کا غلبہ تھا اور ہندو ازم یا برہمنیت ازم مغلوب تھا، انھوں نے ایک جانب تو گیتا اور ہندو دھرم کی دیگر کتابوں کی تفسیر وتشریح کی، اور ہندو مذہب کو علمی اور فلسفیانہ پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی، دوسری جانب انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، انھوں نے جگہ جگہ بدھوں اور جینیوں سے مناظرے کئے اور ان کو شکست دی اور پھر راجاؤں کے اثر ورسوخ سے بدھوں اور جینیوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کے مندر توڑے گئے، مشہور بدھ تعلیم گاہ نالندہ پر بھی حملہ انہی شنکر آچاریہ کے دور میں اور انہی کے اُکسانے پر ہوا تھا، شنکر آچاریہ کے تعلق سے مشہور مورخ ایس کے بھگوان داس لکھتے ہیں :

> شنکرا نے عوام پر تعلیم کی راہیں بند کر کے صرف ایک ہی وحشت ناک جرم نہیں کیا؛ بلکہ اس کے ساتھ ہی بدھ مت کی بیخ کنی کے لئے بھی کام کیا؛ کیوں کہ اس کے عقیدے خلاف واحد مذہب تھا، انتہائی بربریت بھرے وحشیانہ اور کمینہ طریقوں سے کام لیا، یہ کہنا کہ اس نے بدھ مت کا قلع قمع اپنے علم ومنطق کے زور سے کیا، بالکل مہمل سی بات ہے، اس کے برخلاف اس نے حکمراں طبقہ کی مدد سے بدھوں کا صفایا کر ڈالا، جنوب میں پلوا اور مغرب میں چالوکیا حکومتیں برہمنیت کے پس پشت تھیں، ان کی مدد کے بغیر شنکر اچاریہ ایسی مجرمانہ حرکتیں نہ کر پاتا، اس کی براہ راست ہدایتوں کے تحت بدھی، ان کے مجسمے، یادگار کتبے جو ناگ ارجن کونڈا میں تھے، مسمار کئے گئے، اے ایچ لانگ ہرسٹ جس نے ناگ ارجن کونڈا کی کھدائی

> کا کام کیا تھا، اپنی انمول کتاب میں یہ سب باتیں ریکارڈ کی ہیں، ناگ ارجن کونڈا کی عمارتوں کو جس بے دردی سے مسمار کیا گیا ہے، وہ بھیانک ہے، وہ دولت کے متلاشیوں کا کام نہیں ہوسکتا، اس کے لئے کتنے ہی ستون، مجسمے اور سنگ تراشی کے نمونے قصداً تباہ کئے گئے ہیں۔(۱)

شنکر آچاریہ نے صرف بدھوں کے ختم کرنے پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اس نے کمزور طبقات کے لئے علم حاصل کرنے پر بھی پابندی لگادی، اس بارے میں مشہور بدھ مورخ دھرمانند کوسمبی لکھتے ہیں :

> سندھ اور پنجاب کے کچھ حصے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوجانے کے سو برس بعد شنکر آچاریہ کا طلوع ہوا، ان کے ویدانت کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ شودر لوگ وید نہ پڑھیں، اگر کوئی شودر وید منتر سن لے تو اس کے کانوں میں گرم سیسہ یا لکھ بھر دیا جائے، اگر وہ وید منتر زبان سے ادا کرے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے اور اگر وید منتروں کے ارشادات پر عمل پیرا ہو تو اسے جان سے مار ڈالا جائے۔(۲)

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ ایک جانب شنکر آچاریہ نے پورے زور وشور کے ساتھ ویدانت یعنی ہمہ اوست کے نظریہ کو فروغ دیا کہ دنیا فریب ہے، وہم ہے، خیال ہے، جو کچھ ہے وہ ذات حقیقی ہے، دوسری جانب اس نے دلتوں پر تعلیم کا دروازہ بھی بند کیا اور بدھوں اور جینیوں کا قتل عام بھی کرایا، اس موقع پر اس کو اپنا نظریہ ویدانت یاد نہیں آیا، حقیقت یہ ہے کہ ویدانت کا نظریہ صرف کمزور طبقات کو طفل تسلی دینے اور اپنے آپ میں مست رہنے کے لئے اس نے پیش کیا تھا، ورنہ اگر وہ حقیقی معنوں میں ویدانت یا ہمہ اوست کے نظریہ کا حامل ہوتا تو اس سے ایسی سفاکی کبھی سرزد نہ ہوتی، اسی بات کو کھل کر کے ایس بھگوان لکھتے ہیں :

(۱) ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ: ۹۲، کے ایس بھگوان۔

(۲) بھگوان بدھ: دھرمانند کوسمبی، مترجم اُردو پرکاش پنڈت، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص: ۳۷۔

> یہ بات صاف ہے کہ شنکر میں مذہبی رواداری و برداشت نہیں پائی جاتی، جس برہمنیت کا وہ علمبردار ہے، وہ بھی اتنی ہی بے رحم ہے جیسا کہ وہ تھی، اس نے یہ اعلان کیا کہ دنیا ایک وہم یا فریب ہے؛ لیکن بدھ مت یا مذہبی نظام میں اسے کوئی واہمہ نظر نہ آیا: بلکہ اس کے ذاتی اغراض کے راستے میں اس نے ان کو ایک رکاوٹ محسوس کیا، اس کے دوہرے معیار کی یہ روشن مثال ہے۔(۱)

سوامی دیانند سرسوتی (۱۲ر فروری ۱۸۲۴ء تا ۳۰ر اکتوبر ۱۸۸۳ء) جو آریہ سماج کے بانی تصور کئے جاتے ہیں، انھوں نے ستیارتھ پرکاش نامی کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں انھوں نے انجانے میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ جین مذہب شنکر آچاریہ کے وقت میں ہی تباہ و برباد ہوا، اور چوں کہ اس وقت ہندوستان میں جین مذہب سے زیادہ بدھ مذہب تھا؛ اس لئے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ جین سے زیادہ بدھ مذہب والوں پر تباہی آئی ہوگی، سوامی دیانند سرسوتی لکھتے ہیں :

> شنکر آچاریہ کے وقت میں جین دھونس (تباہ) ہوئے، یعنی اب جتنے بت جینیوں کے نکلتے ہیں، وہ شنکر آچاریہ کے وقت میں ٹوٹے ہیں، جو بغیر ٹوٹے نکلے ہیں وہ جینیوں نے زمین میں گاڑ دیئے تھے کہ توڑے نہ جائیں، وہ اب تک کہیں کہیں زمین سے نکلتے ہیں۔(۲)

مشہور مؤرخ ڈاکٹر معین الدین اپنی کتاب قدیم مشرق میں بدھ مذہب کے زوال کی ذمہ داری شنکر اچاریہ اور کمارل بھٹ جیسے پر جوش مبلغین اور راجاؤں کو اکسا کر بدھوں کے قتل عام اور ان کے مندروں کی تباہی پر ڈالتے ہیں؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

> کمارل بھٹ اور شنکر اچاریہ جیسے پر جوش ہندو مبلغین نے باضابطہ

---

(۱) ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ: ۹۲، کے ایس بھگوان۔

(۲) سیتارتھ پرکاش، رشی دیانند: 283۔

بدھوں کے خلاف مہم چلائی اور اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت اور دشمنی کا جذبہ پیدا کیا، نتیجہ یہ ہوا اس کے خلاف اکثر مقامات پر بلوے ہوئے اور بڑی بے دردی سے بدھوں کا قتل عام کیا گیا، بلا آخر بدھ مت اس سرزمین سے ناپید کر دیا گیا۔(۱)

مشہور مستشرق مورخ ولسنٹ اے اسمتھ مسٹر ویلر جو ماہر آثار قدیمہ بھی تھے، کے حوالے سے ہندوستان میں بدھوں کے قتل عام اور ان کے مندروں کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہندوؤں نے بدھ تک مندر جلائے تھے اور جبر کا استعمال بھی بودھوں کو پھر ہندو بنانے میں استعمال ہوا، وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ جو کھنڈرات دریافت ہوئے، ان سے آتشزدگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور جو مندر جلائے نہیں گئے، ان میں بدھ کی مورتیوں کے بجائے ہندو دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھ دی گئیں۔(۲)



(۱) قدیم مشرق جلد دوم۔

(۲) قدیم تاریخ ہند۔

مسلمانوں اور مسجدوں کے ساتھ بعض ہندو راجاؤں کا سلوک

مسلمانوں پر مندروں کو توڑنے کا الزام ہر فرقہ پرست لیڈر لگاتا ہے، جس میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے؛ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ظالم ہندو حکمرانوں نے بھی مسجدوں کو منہدم کرنے اور مسلمانوں پر ظلم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ، اس پس منظر میں یہ تحریر مرتب کی گئی ہے، جو بنیادی طور پر ''مختار احمد مکی'' کی تحریر سے مستفادہ ہے۔ (رحمانی)

ہندو راجاؤں کا سلوک بھی اپنے مسلمان رعایا کے ساتھ انتہائی ظالمانہ وجابرانہ تھا، شاہ بہرام کے زمانہ میں سلاطین غزنہ اور سلاطین غور کے درمیان جب جنگیں شروع ہوئیں اور پنجاب کی حکومت کمزور پڑگئی، اس وقت راجہ اننگ پال نے ، جو راجہ جے پال کا بیٹا تھا، ہندوستانی راجاؤں کا ایک لشکر کثیر لے کر لاہور پر چڑھائی کردی ، چھ ماہ تک محاصرہ قائم رہا، جب غزنی سے فوج نہیں آئی تو مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے، ہزاروں مسلمان شہید کردیئے گئے ، دو ہزار لاشیں صرف ایک جگہ دفن ہوئیں، تمام مسجدیں گرادی گئیں اور اس جگہ پر مندر بنادیئے گئے ۔(۱)

اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بھی ہندو راجہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو عام طور پر تباہ و برباد کرتے دیکھے گئے ، بقول مجدد الف ثانیؒ کفارِ ہند بے خوف وخطر مساجد شہید کرتے اور اپنے مندر ان کی جگہ بناتے ہیں ،(۲) اسی طرح رانا کمبھا نے جب سلطان گجرات سے ناگور

(۱) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص: ۶۳، ادبی دنیا دہلی ۱۹۷۵ء۔

(۲) مجدد الف ثانی، مکتوبات امامِ ربانی، ص: ۲۹، مکتوب نمبر: ۹۲، حوالہ شیخ محمد اکرام رودِ کوثر، دہلی ۱۹۸۷ء۔

کسی ترکیب سے حاصل کرلیا تو اس نے فیروز خان کی بلند مسجد کے ساتھ ہی شہر کی تمام مسجدوں میں آگ لگادی اور قلعہ کو تباہ برباد کر کے ویران کر دیا، ساتھ ہی شمس خان کے تمام خزانوں پر بھی قبضہ کرلیا، (۱) خود جدو ناتھ سرکار کا یہ اعتراف ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ست نامیوں نے کرنول پر قبضہ کرلیا تو شہر کو جی بھر کر لوٹا اور وہاں کی تمام مساجد میں آگ لگادی، (۲) اسی زمانہ میں کمار بھیم سنگھ نے گجرات میں بہت سی مسجدوں کو مسمار کیا، (۳) شیوا جی نے بھوانڈی اور شولا پور میں مسجدوں کو نقصان پہنچایا، (۴) بہادر شاہ اول کے بعد جودھپور میں راجہ جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ نے جودھپور کی بہت سی مسجدوں کو گرا کر ان کی جگہ مندر بنوا دیئے۔(۵)

راجستھان کے چتوڑ میں واقع کرتی استمبھ ایک سات منزلہ مندر کی عمارت ہے، اس کی ہر منزل پر یہ عبارت موجود ہے کہ اس کے پتھر یا عمارتی اشیاء کن کن مساجد، مینار، گنبد یا خانقاہ اور مقبرہ وغیرہ کو توڑ کر حاصل کیا گیا ہے اور اس میں استعمال ہوا ہے، (۶) گوالیار اور اس کے قلعہ سے مسلمان بادشاہوں کو ہمیشہ ایک خاص دلچسپی رہی، بابر نے وہاں بنے اونچے اونچے مندروں کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اس مندر کے بغل میں التمش نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی تھی؛ لیکن آج اس مسجد کا وجود بھی نہیں ہے، نہ صرف قلعہ کی مسجد بلکہ شہر میں بھی کوئی قابل ذکر مسجد موجود نہیں ہے۔

مسلم بادشاہوں پر عموماً ہندو مندروں کو توڑنے یا ہندوؤں سے مختلف نوعیت کے ٹیکس

---

(۱) مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، ص:۲۹، مکتوب نمبر:۹۲، حوالہ شیخ محمد اکرام رودِ کوثر، دہلی ۱۹۸۷ء۔

(۲) جدو ناتھ سرکار، ہسٹری آف اورنگ زیب، ص:۲/۲۹۸، کلکتہ ۱۹۷۰ء۔

(۳) ظہیر الدین فاروقی، اورنگ زیب، ص:۱۳۴، نئی دہلی ۱۹۹۰ء۔

(۴) رائے بہادر گوری شنکر، ہسٹری آف اودے پور، ص:۵۷، حوالہ شیخ محمد اکرام رودِ کوثر، دہلی ۱۹۸۷ء۔

(۵) ظہیر الدین فاروقی، اورنگ زیب، ص:۱۳۴، نئی دہلی ۱۹۹۰ء۔

(۶) ابن یعقوب، شذرات، راز نامہ فاروقی تنظیم، رانچی ۲۴ رجون ۲۰۱۴ء۔

وصولنے کا الزام لگایا جاتا ہے؛ لیکن یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کے ٹیکس قنوج کے راجہ اپنی مسلم رعایا پر Turuk Danda کے نام سے لگاتے تھے، (۱) توڈ نے راجستھان کے راجاؤں کی جانب سے لگائے جانے والے خالص مسلم ٹیکس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، بنگال کے ہندو زمیندار دوامی بندوبستی (Permanent Settlement) کے بعد اپنی مسلم رعایا سے قانونی ٹیکس کے علاوہ ہندو رسم و رواج اور پوجا پاٹ کے موقع پر بھی ٹیکس لگاتے اور جبراً وصولتے، ان کی مذہبی غیرت کو کچلنے اور دینی حس کو ختم کرنے کے لئے ان سے ڈاڑھی ٹیکس بھی وصول کئے جاتے، (۲) اس طرح یہ زمیندار اپنی مسلم رعایا سے ڈاڑھی ٹیکس، پوجا ٹیکس، پاٹھ شالہ کھولنے کا ٹیکس، زمیندار خاندان میں شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش وغیرہ پر بھی ٹیکس عائد کئے جاتے، اس طرح بہار و بنگال کے راجہ مہاراجہ اور زمیندار نماز بنری، (عید کی نماز کا ٹیکس) ایشور بریتی (بھگوان کی پرتیما کے رکھ رکھاؤ کا خرچ) ٹھاکر سیوا ٹیکس بھی وصولتے، مسلمانوں کے ذریعہ مذہبی مقامات کی زیارت کی اجازت کے لئے سلامی، کنواں، تالاب، مکان بنوانے، باغ لگوانے، باغ سے پھل توڑوانے، درخت کٹوانے کے موقع پر بھی ہندو زمیندار مسلمانوں سے سلامی وصولتے تھے۔ (۳)

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند کے بعد سے تو بڑی تعداد میں شمالی ہندوستان میں مسجدیں مسمار کی گئیں، تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب، ہریانہ اور دہلی کی تقریباً نو ہزار مسجدیں تباہ و برباد کردی گئیں ہیں، یا ان پر حکومت وقت، ہندو اور سکھوں کا غاصبانہ قبضہ ہے، خود دہلی میں برنی کمیٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک سو چھہتر (۱۷۶) ایسی مشہور مسجدیں ہیں، جو یا تو ہندوؤں یا حکومت کے تصرف میں ہیں، ان میں تبدیلی کر کے ان پر غاصبانہ قبضہ بنائے رکھا گیا ہے، بہت سی مسجدوں پر آثارِ قدیمہ کی تحویل

(۱) ایس آر بھٹ، پروبلم آف ہندو مسلم کنفلیکٹ۔

(۲) مختار احمد مکی، تحریک آزادی اور ہندوستانی مسلمان، ص: ۷۰، جمشید پور ۲۰۰۲ء۔

(۳) ایم کے اے صدیقی، ہندو اینڈ مسلم ان انڈیا، اے کومن ڈسٹینی، ص: ۱۶۹، کلکتہ ۲۰۱۲ء۔

میں ہونے کے باعث مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے سے زبردستی روکا جاتا ہے، اسی طرح مغربی بنگال اسمبلی میں خود صوبائی حکومت نے ۱۹۷۹ء میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اب بھی صرف کلکتہ میں انسٹھ (۵۹) مسجدیں ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں، مغربی بنگال کے مرشد آباد اور مالدہ شہر کی سینکڑوں مسجدیں یا تو مسمار کردی گئی ہیں یا ان میں نماز پڑھنے پر پابندی ہیں، جس میں مرشد قلی خاں کی بنوائی کٹرہ مسجد، عظیم النساء بیگم مسجد اور سلاطین عہد کی مشہور زمانہ آدینہ مسجد بھی شامل ہے، جس کا شمار اپنے وقت میں دنیا کی خوبصورت اور دوسری سب سے بڑی مسجد میں ہوتا تھا، بابری مسجد کی شہادت کے واقعہ کو ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا ہے، جب کہ ریاستی حکومت کی ایماء وشہہ اور مرکزی حکومت کی چشم پوشی کے باعث پولیس اور فوج کی موجودگی میں بابری مسجد کے ساتھ ہی ایودھیا کی سات دوسری مسجدوں کو بھی نقصان پہنچایا گیا، ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۶ء میں گجرات کی بی جے پی سرکار کے اشارہ پر سینکڑوں مسجدوں، درگاہوں اور مزارات کو نقصان پہنچایا گیا، اکثر میں مورتیاں نصب کردی گئیں یا اس پر میونسپلٹی والوں نے مسمار کر کے راتوں رات سڑک بنا ڈالی، ان لوگوں نے سینکڑوں سال سے موجود احمد آباد میں اُردو کے مشہور شاعر ولی دکنی اور برودہ میں ساڑھے تین سو سال سے موجود حضرت رشید الدین چشتی کے مزار کو بھی نہیں بخشا، جس کے زائرین میں بڑی تعداد ہندوؤں کی بھی تھی۔



یہودی مذہب میں شدت پسندی ☆

''تالمود'' یہودیوں کے نزدیک بڑی مقدس کتاب ہے، تورات سے بھی زیادہ اس کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے، یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ اگر ان کے ''حاخاموں'' (علمائے یہود) کے ملفوظات کی کوئی بے حرمتی کرے تو وہ سزائے موت کا مستحق ہے؛ بلکہ ان کے ہاں یہ جائز نہیں کہ کوئی یہودی صرف تورات پر اکتفا کرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تالمود کی روشنی میں تورات کو سمجھے۔

''تالمود'' میں ہے کہ :

یہودیوں کی رُوحیں تمام جانداروں کی روحوں سے ممتاز ہیں، وہ (نعوذ باللہ) اللہ کا جزو ہیں، جیسا کہ بیٹا باپ کا جزو ہوتا ہے، دیگر انسانوں کی روحیں شیطانی ہیں اور حیوانوں کی روحوں سے مشابہ ہیں۔

''تالمود'' میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''دنیا یہودیوں کی ملکیت ہے، انھیں ہر چیز پر تسلط کا حق حاصل ہے۔

یہودیوں کے نسلی تفاخر اور مذہبی برتری کے حوالے سے ''تالمود'' میں یہ تعلیم ملتی ہے :

''اسرائیلی خدا کے نزدیک فرشتوں سے افضل ہے، اگر کوئی غیر اسرائیلی اسرائیلی کو مارتا ہے تو وہ خدا کی عزت پر حملہ آور ہوتا ہے اور وہ سزائے موت کا مستحق ہے، اگر یہودی نہ

☆ ڈاکٹر حافظ محمد ثانی (صدر شعبہ قرآن وسنہ، ڈائریکٹر سیرت چیئر، وفاقی اُردو یونیورسٹی عبدالحق کیمپس، کراچی)، اور ڈاکٹر عابدہ پروین (ایسوسی ایٹ پروفیسر ایکٹنگ ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ کراچی) کے مقالہ بعنوان: ''یہودیت میں نسلی امتیاز اور انتہاپسندی کا تصور — تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' The Concept of Racial Discrimination and Extremism in Judaism – Analytical and Critical Study سے منقول۔

ہوتے تو زمین میں برکت نہ ہوتی، یہودیوں اور دیگر لوگوں میں فرق ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان اور حیوان میں (یہودیوں کے علاوہ) دیگر لوگ کتے ہیں"۔

مزید کہا گیا ہے کہ :

> جو یہودی نہیں ہے، وہ گدھا ہے، دنیا کی تمام اقوام جانوروں کے باڑوں کی طرح ہیں۔

''تالمود'' میں یہ بھی کہا گیا کہ: ''ہم (یہودی) خدا کے منتخب کردہ ہیں، دنیا کی قومیں ہماری خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

''تورات'' میں مذہبی انتہا پسندی کے حوالے سے جو تعلیمات ملتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں :

● جب خداوند تیرا خدا انھیں تیرے قبضے میں کردے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، ان قوموں کے شہروں میں جنھیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو جو سانس لیتی ہو، جیتا نہ چھوڑیو۔(۱)

● ''خداوند نے ساؤل کو حکم دیا: سو تو اب جا اور عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے، یک لخت حرم کر (قتل کر) اور ان پر رحم مت کر؛ بلکہ مرد اور عورت اور ننھے بچے اور شیر خوار، بیل، بھیڑ اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر''۔

● تورات کے مطابق خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملتا ہے :

> جب کہ خداوند تیرا خدا انھیں تیرے حوالے کردے تو تو انھیں مار اور حرم کر، نہ تو ان سے کوئی عہد کر اور نہ ان پر رحم کر۔

جرمن محقق ڈاکٹر اریک بیلسکوف (Dr. Erich Bischof) جو یہودیت پر مطالعہ و تحقیق کے حوالے سے اتھارٹی مانے جاتے ہیں، ایک یہودی مصنف کی کتاب (Thkume Zohar) کے حوالے سے لکھتے ہیں :

---

(۱) استثناء: ۲۰: ۱۳، ۱۶۔

یہودیوں کے نزدیک دین و مذہب کا حکم یہ ہے کہ غیروں کو (غیر یہودیوں کو) قتل کیا جائے، ان کے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، یہ قتل شرعی طریقے پر ہونا چاہئے، جو لوگ یہودی مذہب اور یہودی قانون کو نہیں مانتے، انھیں خدائے اعظم کے حضور بھینٹ چڑھا دینا چاہئے۔

گریٹر اسرائیل کے عالمی صہیونی منصوبے کی خفیہ دستاویز "یہودی پروٹوکولز" پروٹوکول ۱۴ میں تحریر ہے :

جب ہم (یہودی) اپنی سلطنت میں داخل ہوں گے تو اپنے مذہب کے علاوہ کسی مذہب کو برداشت نہیں کریں گے، خدا کی محبوب قوم کی حیثیت سے ہمارا مقدر خدائے واحد کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور اسی کے واسطے سے ہماری تقدیر دنیا کی دوسری اقوام کی تقدیر سے وابستہ ہوئی ہے، ہمیں ایمان اور اعتقاد کی دوسرے تمام (دیگر مذاہب) کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہوگا۔

یہودی اس نظریے کے حامل ہیں کہ طاقت اور فریب کاری سیاسی میدان میں خصوصی طور پر کارآمد چیزیں ہیں، ان کے ذریعے دوسروں کو ہمنوا بنانے میں مدد ملتی ہے، یہ "یہودی پروٹوکولز" کا بنیادی تصور ہے؛ چنانچہ گریٹر اسرائیل کے عالمی صہیونی منصوبے کے پروٹوکول نمبر ایک میں تحریر ہے :

سیاسی اُمور میں طاقت ایک کارگر حربہ ہے؛ بشرطیکہ اسے ہوشیاری اور دبیز پردوں میں ملفوف کر کے استعمال کیا جائے، دہشت و بربریت کے ذریعے اپنے مخالفوں کو راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے، دوسروں کو دغا دینے اور بے وقوف بنانے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رشوت، دغا وفریب نیز غداری و بے وفائی کے

حربوں سے کامیابی حاصل ہو سکے تو ان کے استعمال سے قطعاً گریز نہیں کرنا چاہئے ، اگر کسی کی جائیداد چھین کر اسے اطاعت و فرماں برداری پر مجبور کیا جا سکتا ہو اور اقتدار پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو کسی پس و پیش کے بغیر ایسا کر گزرنا چاہئے۔

نامور عیسائی محقق اور یہودیت پر گہری نگاہ رکھنے والے دانشور William Gri Mstad اپنی کتاب "Antizion" میں لکھتے ہیں :

مذہبی تعصب ، تنگ نظری ، قومی تفاخر ، نسلی غرور اور برتری کے پندار میں مبتلا یہودی دیگر مذاہب اور دنیا کی دوسری قوموں کو کس نظر سے دیکھتے تھے ، اس کا بخوبی اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف اخلاقی اور تمدنی احکام میں اسرائیل اور غیر اسرائیلی کے درمیان فرق کرتے تھے ، ایک ہی برتاؤ اسرائیلی کے ساتھ ناجائز ، مگر غیر اسرائیلی کے ساتھ جائز تھا ، مثلاً خود بائبل میں صراحت ہے کہ ''اگر ایک شخص نے دوسرے کو قرض دیا ہو تو سات سال گزر جانے پر اسے معاف کر دے ؛ البتہ وہ پردیسی سے اس کا مطالبہ کر سکتا ہے ، اسی طرح اس میں یہ حکم بھی ہے کہ تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے ، باپ بھائی کو سود پر قرض نہ دینا ، یہودیوں کی مذہبی کتاب ''تالمود'' میں اس قسم کی تعلیمات ملتی ہیں ، مثلاً :

- ...... جو فرق انسان اور حیوان میں پایا جاتا ہے ، ویسا ہی فرق یہود اور دیگر قوموں کے درمیان ہے۔
- ...... یہود کے علاوہ دیگر لوگ کتوں ، گدھوں اور خنزیروں کے مثل ہیں ، ان کی روحیں ناپاک ہیں۔
- ...... غیر یہودی کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں ، انھیں دھوکہ دینا ،

ان سے جھوٹ بولنا، ان کے ساتھ منافقت کا برتاؤ کرنا یہود کے لئے جائز ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کے بھی دشمن ہیں اور ان کے بھی۔

● ......دنیا اور اس کی تمام چیزیں یہود کی ملکیت ہیں، اللہ نے انھیں ان پر تسلط بخشا ہے اور تصرفانہ حقوق عطا کئے ہیں۔

● ......غیر یہودیوں کے مال کی حیثیت متروکہ کی ہے، یہود میں سے جس کے بھی ہاتھ لگے، وہ اس کا مالک ہے۔

● ......یہود کے اموال کو چُرانا جائز نہیں، جہاں تک غیر یہود کے اموال کا تعلق ہے، ان کی چوری کی جاسکتی ہے۔

● ......یہودی کے ساتھ خرید و فروخت میں دھوکہ دینا جائز نہیں؛ البتہ غیر یہودی کو دھوکہ دینے اور اسے دیئے گئے قرض پر بھاری سود وصول کرنے کی اجازت ہے۔

● ......اگر کسی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا مقدمہ تمہارے پاس آئے تو اگر اسرائیلی شریعت کے مطابق تم اپنے اسرائیلی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتے ہو تو ویسا ہی کرو اور کہہ دو کہ یہ ہمارا قانون ہے، اور اگر ایسا غیر یہودی قانون کے ذریعہ کر سکتے ہو تو اسی طرح فائدہ پہنچاؤ اور غیر اسرائیلی سے کہہ دو کہ یہ تو تمہارا قانون ہے اور اگر دونوں قوانین سے اسرائیلی کو فائدہ پہنچانا ممکن نہ ہو تو پھر حیلے اور فریب سے کام لو؛ تاکہ بہر حال مقدمے کا فیصلہ اسرائیلی کے حق میں ہو۔

یہودیوں کی اہم مذہبی کتاب "The Talmud Unmasked" جو عرصۂ دراز تک خفیہ رکھی گئی، یہ ان کی مذہبی اور اہم تاریخی کتاب ہے، اس کے مطالعہ سے یہودیت جنگ کے قوانین اور یہودیوں کے عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں

خیالات کا پتہ چلتا ہے، نیز اس سے ان کی تنگ نظری، مذہبی جنون، انتہا پسندی اور اپنے مخالفین کے بارے میں ان کے نظریات اور مذہبی تعلیمات کا بھی پتہ چلتا ہے، ذیل میں ''تالمود'' سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں :

● ......تمام عیسائی خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ہلاک کردیئے جائیں۔

عبدزارا(26,B Tosephoth) کہتی ہے :

''سب سے بہتر عیسائی کو بھی قتل کردینا چاہئے''۔

عیسائی کو قتل کرنے والا یہودی گناہ گار نہیں ہے؛ بلکہ وہ خدا کو ایک قابلِ قبول قربانی پیش کررہا ہے۔

Sepher or Israel (177b) میں ہدایت کی گئی ہے :

Kliphoth کی زندگی چھین لو اور انھیں قتل کردو، اس طرح تم خدا کو خوش کروگے، بالکل اسی طرح جیسے خدا کو خوشبو پیش کی جاتی ہے۔

اسی طرح Ialkut Simoni (245c-n772) میں لکھا ہے :

ہروہ شخص جو کسی ناپاک (مخالف) فرد کا خون بہاتا ہے، وہ خدا کے نزدیک اتنا ہی قابل قبول ہے، جتنا وہ شخص جو خدا کے حضور قربانی پیش کرتا ہے۔

ٹیمپل (عبادت گاہ) کی تباہی کے بعد صرف ایک ہی قربانی کی ضرورت ہے اور وہ ہے عیسائیوں کی تباہی۔

(۱) ظہر (III,227b) میں Good Pastor بیان کرتا ہے :

صرف ایک ہی قربانی مطلوب ہے، یعنی یہ کہ ہم اپنے اندر سے ناپاکوں کو علاحدہ کریں۔

(۲) ظہر (II,43a) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تصور کو کہ اولین پیدائش گدھے کی نجات کے لئے ایک بھیڑ کی پیشکش کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ :

گدھے سے یہاں غیر یہودی مراد ہیں، جن سے نجات پانے کے لئے بھیڑ کی پیشکش

کرنی چاہئے، جو اسرائیل کی گمشدہ بھیڑ ہے؛ لیکن اگر وہ قتل ہونے سے انکار کردے تو اس کا سر توڑ دو، زندہ لوگوں میں سے انھیں خارج کر دینا چاہئے؛ کیوں کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو میرے خلاف گناہ کرتا ہے، میں اس کی زندگی ہی چھین لوں گا۔

عیسائیوں کو قتل کرنے والے جنت میں اعلیٰ مقام پائیں گے۔

ظہر (I,38b اور 39a) میں کہا گیا ہے :

چوتھی جنت میں وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے Sion اور یروشلم کا نوحہ پڑھا تھا اور وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے بت پرست قوموں کا خاتمہ کیا اور وہ لوگ جنھوں نے بت پرستوں کو قتل کیا، وہ وہاں ارغوانی (لال نیلی ملی ہوئی) پوشاک پہنے ہوئے ہوں گے اور انھیں عزت کا مرتبہ ملے گا، نیز وہ دُور ہی سے شناخت کر لئے جائیں گے۔

اس میں تعلیم دی گئی کہ: یہودیوں کو عیسائیوں کو مٹا دینے کے عمل سے کبھی نہیں روکنا چاہئے، انھیں نہ تو کبھی امن کی حالت میں رہنے دیں اور نہ ان کے آگے عاجزی کریں۔

Hilkhoth Akum (X,I) میں ہدایت کی گئی ہے :

(ا) بت پرستوں کے ساتھ کبھی نہ کھاؤ اور نہ انھیں بتوں کی پرستش کی اجازت دو؛ کیوں کہ لکھا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہ کرو اور نہ ان کی خاطر رحم کا کوئی جذبہ پیدا Deuter, Ch 7,2،، یا تو انھیں اپنے بت کی جانب سے پھیر دو یا انھیں قتل کردو۔

(۲) Ibidem (X,7) میں درج ہے :

ان مقامات پر جہاں یہودی مضبوط ہیں، کسی بت پرست کو رہنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اپنے درمیان سے غداروں کو تباہ کرنے کے لئے سارے یہودیوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔

Choschen Hamm (38,16) میں ہدایت دی گئی ہے کہ: ’’شہر کے تمام باسیوں پر لازم ہے کہ وہ غدار کو قتل کرنے کے خرچ میں تعاون کریں، خواہ وہ پہلے ہی سے ٹیکس کیوں نہ دے رہے ہوں۔

تعلیم دی گئی کہ کوئی بھی تہوار، خواہ وہ کتنا ہی سنجیدہ ہو، تمہیں عیسائی کا سر اُڑانے سے باز نہ رکھے۔

Pesachim (49b) میں کہا گیا ہے :

ربی ایلزر نے کہا صلیب کے دن ''احمق'' کا سر کاٹنے کی تمہیں اجازت دی گئی ہے، خواہ وہ سبت کے دن ہی کیوں نہ واقع ہو، اس کے ماننے والوں نے اس سے کہا، ربی آپ کو تو بلکہ قربانی کا حکم دینا چاہئے، اس نے جواب دیا: ہرگز نہیں؛ کیوں کہ قربانی کے لئے تو نماز پڑھنا بھی ضروری ہے؛ لیکن سر کاٹنے کے موقع پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بھی تحریر ہے کہ: یہودیوں کے تمام اعمال اور نمازوں کا ایک ہی مقصد ہونا چاہئے کہ عیسائیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے نامور فرانسیسی فلسفی اور مصنف وولٹیئر (Voltair) نے یہودیوں کی فطرت اور ذہنیت کی عکاسی کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے :

> یہودی قوم دیگر اقوام سے ناقابل مصالحت نفرت کا اظہار کرنے کی جرأت کرتی ہے، ہمیشہ سے توہم پرست یہ قوم دوسروں کی خوش حالی کو حریصانہ نگاہ سے دیکھتی ہے، ہمیشہ کی وحشی، غربت میں بچھ جانے والی اور خوش حالی میں گستاخ۔

''عہد نامۂ قدیم'' میں مندرجہ ذیل نوع کی ہدایات وتعلیمات بآسانی دیکھنے کو ملتی ہیں :

- بنی اسرائیل (اسرائیلی) خدا کی طرف سے باقی لوگوں کی نسبت منتخب قوم ہیں۔
- اسرائیلیوں کو تمام دوسرے لوگوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اور خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ایک دن وہ ساری دنیا پر اقتدار اور حکمرانی کریں گے۔
- اسرائیلیوں کو (خدا کی جانب سے) حکم دیا جاتا ہے کہ دنیا کے

> جس حصے میں بھی وہ آباد ہونا چاہیں ، وہاں کے تمام لوگوں کو قتل کردیں ، اور یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ ان بدیسی قوموں کے تمام افراد کو ہلاک کردیں جو ان کی غلامی قبول نہیں کرتیں۔

یہودیوں میں نسلی برتری ،قومی و مذہبی تفاخر، اقتدار اور غلبے کی یہ روایات تب سے چلی آرہی ہیں، جب مشرق وسطیٰ میں اسرائیل ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا، انھوں نے اپنی مذہبی روایات اور تعلیمات کو اپنے ذہنوں میں اس طرح ڈھال لیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہودی پروردگار عالم کی منتخب قوم ہیں، انھیں دنیا پر حکومت کرنے کا فرض ودیعت کیا گیا ہے، یہ روایت بائبل میں اس طرح درج ہے :

> ● اور بادشاہ تم میں سے ہوں گے اور رُوئے زمین پر جہاں بھی اولاد آدم کے قدم پہنچیں گے، تم وہاں حکمراں ہوگے، میں تمہارے نطفے کو آسمانوں تلے ساری دھرتی بخش دوں گا اور وہ تمام اقوام پر اس طرح حکومت کریں گے، جیسے وہ چاہیں گے ظ اور بالآخر تمام دھرتی پر ان کا قبضہ ہوجائے گا اور وہ ہمیشہ کے لئے ان کی وراثت بن جائے گی۔



تاریخ میں سب سے زیادہ جنگیں کس نے کی؟

● یہ ۲۳۸ قبل مسیح سے ۱۲۹ قبل مسیح کا زمانہ ہے، ایک ہی ملک یعنی ایران کی دو غیر مسلم حکومتوں Seleucid اور پارتھیا کے درمیان مسلسل ۱۰۹ سال ایک جنگ لڑی گئی جو تاریخ میں Seleucid-Parthia War کے نام سے مشہور ہوئی ، یہ جنگ مسلمانوں کے کسی دو فرقوں یا باہم مسلمانوں کے دو ملکوں یا سلطنتوں کے درمیان نہیں ؛ بلکہ ایک ہی ملک ایران کی دو غیر مسلم حکومتوں کے درمیان لڑی گئی ،مگر مسلمانوں کو ظالم قرار دیا جاتا ہے۔

مایا تہذیب کے باشندے قربانی دینے والے افراد کے دھڑکتے دل سینے سے نکال لیا کرتے تھے ،قدیم مصر میں کچھ فرعونوں کو مرنے کے بعد اس انداز سے دفن کیا گیا کہ ان کے ساتھ ان کے ملازموں کو بھی زندہ دفنا دیا گیا ؛لیکن شدت پسند، اجڈ، گنوار ،جنگلی اور غیر مہذب مسلمان کو کہا جاتا ہے۔

● ۹۲ قبل مسیح سے ۶۲۹ ء کے درمیان ، رومی اور فارسی ساسانی سلطنت کے درمیان ۷۲۱ سال تک وقفے وقفے سے انسانی تاریخ کی طویل ترین جنگوں میں سے ایک جنگ لڑی گئی جو تاریخ میں Persian-Roman Wars کے نام سے مشہور ہوئی ، جو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے کسی دو فرقوں یا باہم مسلمانوں کے دو ملکوں یا سلطنتوں کے درمیان نہیں ؛ بلکہ دو غیر مسلم حکومتوں کے درمیان لڑی گئی۔

● ۱۵۳۶ء سے ۱۸۱۸ء تک اسپینی غاصبوں نے جنوبی امریکہ کے اصل باشندوں میوچ لوگوں (Mapuche People) کی زمینوں پہ قبضہ کرنے اور ان کی نسل مٹانے کے لئے ۲۸۲ سال ایک طویل جنگ لڑی جو انسانی تاریخ کی طویل ترین جنگوں میں سے ایک شمار کی جاتی ہے، اس جنگ کے نتیجے میں ہزاروں سال سے جنوبی امریکہ کے چلی کے خطے میں آباد

لوگوں کی کافی حد تک نسل مٹادی گئی اور ان کی زمینوں پہ قبضہ کرلیا گیا، یہ جنگ ایک عیسائی ملک اسپین کی طرف سے ایک خطے کی اصل آبادی کی نسل مٹانے اور ان کے ملک پہ قبضے کے لئے لڑی گئی۔

● ۱۵۶۸ء سے ۱۶۴۸ء تک اسپین اور ہائی لینڈ کے درمیان ہائی لینڈ پہ اسپین کے قبضے کے خلاف یورپ بلکہ پوری دنیا کی تاریخ کی سب سے طویل جنگوں میں سے ایک لڑی گئی، جو ۲۸۲ سال جاری رہی اور تاریخ میں Arauco War کے نام سے مشہور ہوئی۔

برما میں ۱۹۴۹ء سے اب تک گزشتہ سڑسٹھ سال سے دو نسلی گروہوں کیرن اور برمی تمادا کے درمیان مسلسل خانہ جنگی چل رہی ہے، جو مسلمانوں کے کسی دو فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ غیر مسلموں کی دو نسلوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے جو Karen Conflict کے نام سے مشہور ہے۔

● ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک مسلسل تیس سال ایک جنگ لڑی گئی جس کو تاریخ میں جنگ تیس سالہ یا Thirty Years War کا نام دیا جاتا ہے، یہ جنگ عیسائیوں کے دو فرقوں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے درمیان ہونے والی فرقہ وارانہ جنگ تھی، جو زیادہ تر یورپی ملک جرمنی میں لڑی گئی، اس جنگ میں براعظم یورپ کے کئی طاقتور ممالک جیسے: ہائی لینڈ، سویڈن، بوہیمیا، ڈنمارک، ناروے، فرانس، انگلستان، برانڈ برگ، ٹرانسیل وانیا، مجارستان، زو پوروشین قازیکس، مقدس رومی سلطنت، کیتھولک (جرمنی)، آسٹریا، الیکٹروریٹ آف بویریا، مملکت کروشیا، ہسپانیہ سمیت طرفین کی نو لاکھ پینتالیس ہزار افواج نے حصہ لیا، یہ جنگ بھوک اور بیماروں کا سبب بنی، جنگ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی طویل عرصے تک قابو نہ پایا جاسکا، بالآخر یہ جنگ ویسٹ فالن معاہدۂ امن کے بعد ختم ہوئی، یہ جنگ تاریخ کی سب سے بڑی فرقہ وارانہ جنگ تھی جو مسلمانوں کے کسی دو فرقوں کے درمیان نہیں؛ بلکہ عیسائیوں کے دو فرقوں کے درمیان لڑی گئی اور تقریباً پورا براعظم یورپ اس جنگ میں شریک تھا، آج تک کسی بھی دو مسلمان فرقوں کے درمیان اتنی بڑی جنگ نہیں لڑی گئی۔

● ۱۳۳۷ء سے ۱۴۵۳ء کے درمیان فرانس اور انگلستان کے درمیان ۱۱۶ سال تک ایک جنگ لڑی گئی، جنگ کی بنیادی وجہ تخت کے لئے آپس کی لڑائی تھی، فرانس کے چارلس چہارم کا کوئی بیٹا نہ تھا اور وہ بغیر بیٹے کے ہی ۱۳۲۸ء میں فوت ہوگیا، اس کی موت کے بعد انگلستان کے ایڈورڈ سوم نے فیصلہ کیا کہ اپنی ماں کے ذریعہ وہ ہی حقیقی طور پر فرانس کا نیا بادشاہ بنے گا، بس اسی بات پہ جو جنگ شروع ہوئی وہ ۱۱۶ سال جاری رہی، جس میں لاکھوں افراد مارے گئے، یہ جنگ تاریخ کی سب سے بڑی جنگوں میں سے ایک تھی جو مسلمانوں کے کوئی دو ملکوں کے درمیان نہیں؛ بلکہ عیسائیوں کے دو ملکوں کے درمیان لڑی گئی، اس جنگ کے سامنے مسلمانوں کی ساری تاریخ کی آپس کی جنگیں جیسا کہ امویوں اور عباسیوں، عباسیوں اور ترکوں، سلجوقیوں اور غزنویوں، لودھیوں اور مغلوں، تیموریوں، سلطنت عثمانیہ اور ایران اور ایران و اعراق کی جنگیں ایک مذاق لگتی ہیں۔

● ۲۸ر جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء تک انسانی تاریخ کی سب سے ہولناک جنگوں میں سے ایک جنگ لڑی گئی، جو پہلی جنگ عظیم کے نام سے مشہور ہوئی، اس جنگ میں عیسائی یورپ کے تین ملکوں جرمنی، بلغاریہ، آسٹریا، ہنگری اور اتحادیوں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان لڑی گئی، جنگ میں اتحادیوں کی سوا چار کروڑ اور جرمن کی طرف سے سوا دو کروڑ افواج نے حصہ لیا اور ایک کروڑ سے زائد انسان اس جنگ میں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے گئے، اس جنگ میں دو کروڑ دس لاکھ کے لگ بھگ افراد زخمی بھی ہوئے، محققین کے اندازے کے مطابق اس جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہلاک ہونے والے غیر فوجی افراد کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ ہے، اتنی بڑی ہلاکتوں کی وجہ سے ''اسپینش فلو'' پھیل گیا، جو تاریخ کی سب سے موذی انفلوئنزا کی وباء ہے، لاکھوں کروڑوں افراد بے گھر ہوگئے یا اپنے گھروں سے بے دخل ہوگئے، جائیداد اور صنعتوں کا نقصان بہت خطیر تھا، خاص طور پر فرانس اور بلجیم میں، جہاں لڑائی خاص طور پر شدید تھی، کل جانی نقصان تین کروڑ سے تجاوز کر گیا، زخمیوں اور مقتولین کی یہ تعداد اس سے پہلے کی انسانی تاریخ کی تمام جنگوں میں

ہونے والی مجموعی ہلاکتوں سے بھی زیادہ تھی، صرف اس ایک جنگ میں جتنے انسان مارے گئے اتنے اسلامی تاریخ کی تمام مجموعی جنگوں میں نہیں مارے گئے۔

● ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک انسانی تاریخ کی سب سے ہولناک جنگوں میں سے ایک جنگ لڑی گئی جو ''دوسری جنگ عظیم'' کے نام سے مشہور ہوئی، یہ جنگ جرمنی، جاپان اور اٹلی اور اتحادیوں یعنی امریکہ، برطانیہ، روس اور تائیوان کے درمیان لڑی گئی، جنگ میں طرفین کے ڈھائی کروڑ فوجی اور تین کروڑ ستر لاکھ عام شہری مارے گئے، کل جانی نقصان پانچ کروڑ سے زائد تھا، جنگ میں ۶۱ ملکوں نے حصہ لیا جن میں سے کوئی مسلمان نہیں تھا، حصہ لینے والے ان غیر مسلم ممالک کی مجموعی آبادی دنیا کی آبادی کا ۸۰ فیصد تھی، جنگ کا سب سے ظالمانہ پہلو ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکہ کا ایٹمی حملہ تھا، جاپان تقریباً جنگ ہار چکا تھا؛ لیکن دنیا میں انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکے دار امریکہ نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، صرف اس ایک جنگ میں جتنے انسان مارے گئے اتنے اسلامی تاریخ کی تمام مجموعی جنگوں میں نہیں مارے گئے۔



ظلم وسفاکی میں شہرت پانے والے حکمران، کیا کوئی مسلم حکمران یا فاتح بھی ان میں شامل ہے؟

۱- ہیراڈاعظم (Herod The Great) ۷۳ قبل از مسیح میں فلسطین میں پیدا ہوا، جس کا ذکر انجیل مقدس میں بھی موجود ہے اور جس کی وجہ سے شہرت اپنی جان بچانے کے لئے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کروانے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کروانے کی کوشش کرنے کے حوالے سے ہے، قدیم انسانی تاریخ کے ماہر ''جوزفس'' (Josephus) نے اس کے مظالم کے بے شمار واقعات رقم کئے ہیں۔

۲- نیرو (Nero)، روم کا یہ بدنام زمانہ حکمران ایک لے پالک بچہ تھا۔

۳- پوپ الیگزینڈر ششم، تاریخ میں پوپ کے منصب پر کئی ایسے لوگ بھی فائز رہے جو ظلم و جور میں اپنی مثال آپ تھے، مگر ان سب میں بلا شبہ پوپ الیگزینڈر ششم سب سے نمایاں ہے، وہ ۱۴۳۱ء میں پیدا ہوا، اس کی پاپائیت کا زمانہ ۱۴۹۲ء تا ۱۵۰۳ء ہے، اس نے اپنے عہدہ کو اپنی لالچ پوری کرنے کے لئے بیدردی سے استعمال کیا، اس کا ایک مخصوص طریقہ واردات یہ بھی تھا کہ وہ اپنی خوبصورت بیٹی ''لوکریزیا'' (Lucrezia) کی شادی کسی امیر آدمی سے کر دیتا اور اسے خوب جہیز بھی دیتا، بعد ازاں وہ اس شادی کو بحیثیت ''پوپ'' منسوخ کر دیتا (حالاں کہ رومن کیتھولک عیسائیوں کے نزدیک طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے) پھر کچھ عرصے بعد وہ اپنی بیٹی کو دوبارہ کسی امیر آدمی سے بیاہ دیتا۔

۴- کلیگولا (Caligula)۔

۵- کنگ جان (King John) یہ ۲۴ر دسمبر ۱۱۶۶ء کو پیدا ہوا اور ۱۹ر اکتوبر ۱۲۱۶ء کو اس نے وفات پائی۔

۶- میکسی میلین روبسپیار (Maximilien Ro Bespierre): یہ شخص ۱۷۸۹ء میں برپا ہونے والے فرانسیسی انقلاب کا سب سے اہم معمار تھا اور بعد از انقلاب قائم ہونے والی حکومت میں سب سے بڑا لیڈر گردانا جاتا تھا۔

۷- چنگیز خان (Genghis Khan): وہ ۱۱۶۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۲۲۷ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا، اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مالک تھا، ظاہر ہے کہ اس سلطنت کو تشکیل دینے میں کروڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔

۸- ولاد دی امپیلر (Vlad the Impaler): اس شخص کا ایک نام اور بھی ہے جو زبان زد عام ہے اور یقیناً آپ نے بھی ضرور سن رکھا ہوگا اور وہ نام ہے ''ڈریکولا''۔

۹- اوان دی ٹیریبل (Ivan The Terrible): ۲۵ر اگست ۱۵۳۰ء پیدا ہونے والا روس کا یہ بادشاہ ۱۶ر جنوری ۱۵۴۷ء کو تخت نشین ہوا اور اپنی موت یعنی ۲۸ر مارچ ۱۵۸۴ء تک حکمرانی کرتا رہا، اس نے نہ صرف روس کو متحد کیا؛ بلکہ اس کو ایک مستحکم مملکت میں بدل ڈالا مگر اس تمام مرحلے کو سر کرنے میں اس نے جو مظالم ڈھائے انھیں کی وجہ سے اسے ''دی ٹیریبل'' کہا جاتا ہے۔

۱۰- اٹیلا دی ہن (Attila The Hun): ہن (Hun) خانہ بدوش قبائل تھے، جو چوتھی سے چھٹی صدی عیسوی کے درمیان مشرقی یورپ سے لے کر وسطی ایشیاء کے درمیانی علاقے میں آباد تھے، ۴۳۴ء تا ۴۵۳ء تک اٹیلا (Attila) ان کا حکمران رہا، وہ ایک خوفناک جنگجو تھا۔

۱۱- لیو پولڈ دوم (Leopold II): لیو پولڈ دوم نے ۱۸۶۵ء سے لے کر ۱۹۰۹ء یعنی اپنی وفات تک بیلجیم کے دوسرے بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی، کانگو پر اس کا سامراجی قبضہ کئی دہائیوں تک برقرار رہا۔

۱۲- پول پاٹ (Pol Pot): پول پاٹ ایک کمبوڈین انقلابی سیاست داں تھا جو ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک جمہوریہ کمپوچیا کا وزیر اعظم رہا۔

۱۳- جوزف اسٹالن (Joseph Stalin): جوزف اسٹالن (۱۸/دسمبر ۱۸۷۸ء تا ۵/مارچ ۱۹۵۳ء) سابقہ سویت یونین کا ایک انقلابی سیاست داں تھا، اس کا تعلق جارجیا سے تھا، ۱۹۲۰ء کی دہائی کے وسط سے لے کر ۱۹۵۳ء میں اپنی موت تک سودیت یونین (روس) کا حکمران رہا۔

۱۴- ایڈولف ہٹلر ۲۰ (Adolf Hitler): ۲۰/اپریل ۱۸۸۹ء کو پیدا ہونے والے جرمنی کے اس حکمراں نے ۳۰/اپریل ۱۹۴۵ء کو جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے وقت اپنی کالی کرتوت سے شرمسار ہوکر خودکشی کر لی تھی۔

● یہ تو کہا جاتا ہے کہ مسلم حکمران حکومت کے لئے بھائیوں اور باپ کا قتل کرتے تھے؛ لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ ہیراڈ اعظم نے اپنے ہی تین بیٹوں اور اپنی دس بیویوں میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ بیوی کو بھی قتل کر دیا تھا، اور اسی پر بس نہیں کیا، اس نے اپنے دور کے سربراہ پادری کو پانی میں ڈبو کر مار ڈالا، اس کے علاوہ اسے اپنی ساس اور اپنے چچاؤں کے قتل میں بھی ملوث سمجھا جاتا ہے۔

● روم کے نیرو نے اپنی ماں ''اگریپینا دی ینگر (Agrippina The Younger) کو قتل کر دیا تھا، بعد ازاں کچھ عرصے بعد ہی اس نے اپنی دونوں بیویوں کو بھی باری باری قتل کر دیا، آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے پورے روم کو آگ لگا دی اور اس کا الزام شہر کے بے گناہ عوام پر عائد کر دیا، یہ آگ ''دی گریٹ فائر آف روم'' کہلاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو نیرو آرام سے بیٹھا بانسری بجا رہا تھا، وہ یہیں پر نہیں رکا؛ بلکہ اس نے روم کے بچ جانے والے شہریوں پر ہی آگ لگائے جانے کی سازش کا الزام لگا دیا اور ان پر مقدمات چلا کر بہت سوں کو شدید تشدد کروا کے مروا دیا، اس کی یہ ذہنی کج روی بالآخر اتنی بڑھی کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی ہی جان لے لی۔

● عیسائیت کا پوپ الیگزینڈر ششم رقص وسرود کی محفلیں منعقد کرتا اور تقریبات میں شریک ہونے والے امراء کی ناجائز دولت کو اپنے اختیارات کے تحت ضبط کر کے اپنی پرتعیش زندگی کے لئے استعمال میں لاتا۔

● یہ آپ کو یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ رومی بادشاہ کیگولا اتنا بے رحم تھا کہ رات کے کھانے کے دوران کسی زندہ انسان کو آرے سے چیرتے ہوئے دیکھنا اس کی بہترین تفریح تھی، اس بادشاہ کی مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کو سینیٹر نامزد کردیا تھا، ایک جنگ کے دوران اس نے اپنی ساری فوج کو سمندر میں جھونک دیا، کیگولا نامی یہ رومی بادشاہ انتہائی خود پسند تھا اور اس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا، یہ شخص کسی بھی معاملے میں محض شک کی بنیاد پر کسی کو بھی قتل کردیا کرتا تھا، اس نے اپنی بہنوں کے ساتھ شادیاں رچائیں، نیز دوسروں کی بیویوں کو ورغلا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنانا اس کا محبوب مشغلہ تھا، اوپر سے وہ بہت شیخی باز بھی تھا، اس کا زمانہ ۳۷ تا ۴۱ بعد از مسیح کا ہے۔

● برطانیہ کے بادشاہ کنگ جان (۱۱۶۶-۱۲۱۶) نے اپنے مخالفین کو قلعے میں قید کروا کر بھوکا پیاسا مار دیا، اس کو بآسانی انگلستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ ظالم بادشاہ کہا جاسکتا ہے، بادشاہت کے حصول کے لئے اس نے اپنے ہی بھائی کے خلاف فرانس کے بادشاہ کے ساتھ مل کر سازش کی، اس نے بادشاہ بننے کے بعد ایک بہت بڑی بری و بحری فوج تشکیل دی اور اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے عوام پر بھاری محصولات عائد کئے، معززین کی جائیدادیں ضبط کرلیں اور امراء کو قید میں ڈال کر ان پر تشدد کے ذریعہ ان کی دولت ہتھیالی۔

● فرانسیسی میکسی ملین روبسپیار ''عوام اور جمہوریت دوست'' انسان نے تین لاکھ انقلاب دشمنوں کو گرفتار کرکے ان میں سے سترہ ہزار افراد کو ''گلوٹین'' کے ذریعے گردنیں کاٹ کر موت کے گھاٹ اُتار دیا، اس کے اسی رویے کے باعث اسے گرفتار کرلیا گیا اور اس کی گردن بھی ''گلوٹین'' کے ذریعہ ہی ماردی گئی۔

● چنگیز خان چالیس ملین لوگوں کی اموات کا ذمہ دار تھا، اس کے حملوں کے نتیجے میں اس وقت کی دنیا کی آبادی کا تقریباً گیارہ فیصد حصہ ختم ہوگیا تھا، یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی موت کو چھپانے کے لئے، جنازے کے راستے میں آنے والی تمام آبادیوں کو نیست و نابود کردیا گیا، یہ نام دنیا بھر میں ظلم و بربریت کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔

● ۱۴۳۰ء میں پیدا ہونے والے رومانیہ کے بادشاہ کو ''دی امپیلر'' (میخیں ٹھونکنے والا) کا خطاب ''ٹارگوسیٹ'' نامی شہر کے باہر لڑی جانے والی جنگ کے دوران دیا گیا؛ کیوں کہ اس جنگ میں اس نے دو ہزار مسلم ترک عثمانی فوجیوں کے جسموں میں لکڑی کی میخیں ٹھونکنے کے احکامات جاری کئے تھے، جنھیں اس عمل کے بعد چیل کوؤں کی خوراک بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا، وہ جیتے جاگتے انسانوں کو اس طریقے سے دردناک موت سے ہمکنار کرتا تھا کہ روح کانپ اُٹھے، وہ میدان جنگ میں اپنے دشمنوں کو لکڑی کی لمبی لمبی تیز میخیں جسم میں ٹھونک کر سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیتا تھا، اس کی افواج کنوؤں کے پانی میں زہر ملا دیتیں، فصلیں اُجاڑ دیتیں اور وبائی امراض کے شکار مریضوں کو دشمنوں میں بھیج کر انھیں بھی موذی وبائی امراض میں مبتلا کر دیتیں۔

● روس کے بادشاہ ایوان دی ٹیریبل نے اپنی حاملہ بہو کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اپنے بیٹے کو بھی غیظ و غضب کی حالت میں قتل کر ڈالا، اس کی ذہنی رو اس حد تک بہک چکی تھی کہ جو بھی اس کے سامنے آتا اور اگر اس وقت بادشاہ نفسیاتی دورے اور جنوں میں مبتلا ہوتا تو اس بدنصیب شخص کی خیر نہ ہوتی اور اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا، روس کے مشہور ''سینٹ باسل کیتھڈرل (St. Basil's Cathedral) کے تعمیر ساز کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور وہ بادشاہ کے ہاتھوں اپنی آنکھیں گنوا کر اندھا کر دیا گیا، اس نے امراء کی جائیدادوں پر قبضے کرنے شروع کر دیئے اور اپنی ایک ایسی ذاتی پولیس فورس قائم کی جو اس کے حکم پر اس کے مخالفین کو کچل کر رکھ دیتی تھی، اس نے اپنے ان اقدامات کو جائز قرار دینے کے لئے ہی دو بار کے کئی معززین کو ان کے منصبوں سے یہ الزام لگا کر ہٹا دیا کہ وہ ملکہ کی موت کے ذمہ دار تھے۔

● یورپی بادشاہ اٹیلا دی ہن نے اپنے ہی بھائی ''بلیڈا'' (Bleda) کو صرف اس لئے موت کے گھاٹ اُتار دیا؛ کہ وہ پورے علاقے کا بلا شرکت غیرے حکمران بن سکے، نیئس (Naissus) نامی شہر کی تباہی تو اس قدر ہولناک تھی کہ مرنے والوں کی لاشوں نے ''دریائے ڈینوب'' (Rrver Danube) کو پاٹ کر رکھ دیا اور وہ کئی برس تک ان نعشوں سے بھرا رہا،

اٹیلا اتنا ظالم تھا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی دو بیٹوں کو مار کر کھا گیا تھا، لاکھوں لوگ اس کی بربریت اور لوٹ مار کا نشانہ بنے۔

● بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ دوم نے کانگو کے دس ملین باشندوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، تاریخ میں اس کو ایک اور نام سے بھی شہرت ملی اور وہ تھا: ''کانگو کا قصاب''، اسی سے اس کی ظالمانہ فطرت اور جابرانہ طبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کانگو ربڑ کی دولت سے مالا مال تھا اور لیوپولڈ کی حریصانہ نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں، پس اس نے اس کی اپنی فوجیں چڑھادیں، اس کی سنگ دلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بار بار اپنی افواج کو یہ احکامات بھجوا رہا تھا کہ کانگو کا جو بھی مقامی باشندہ اس کے خلاف بغاوت کرے اس کا سر کاٹ کر بطور ثبوت کے بادشاہ کی خدمت میں بلجیم بھیج دیا جائے، یہ سامراجی استحصال کی ایک بدترین مثال تھی۔

● کمبوڈین سوشلسٹ ملحد پول پاٹ کے دور میں بیس لاکھ لوگ بھوک، پھانسیوں اور ناقص صحت کی وجہ سے ہونے والے امراض کے باعث موت کا شکار ہوگئے، وہ ایک کمیونسٹ رہنما تھا، اس نے اساتذہ، سائنس دانوں، ماہرین تعلیم، عام شہریوں کی بڑی تعداد، مذہبی راہنماؤں یہاں تک کہ جو شخص ذرا سا بھی پڑھا لکھا تھا انھیں حراست میں لے کر کیمپوں میں قید کردیا، جہاں بعدازاں انھیں بڑے پیمانے پر پھانسیوں پر چڑھادیا گیا، اندازہ ہے کہ اس کے دور میں بیس لاکھ لوگ بھوک، پھانسیوں اور ناقص صحت کی وجہ سے ہونے والے امراض کے باعث موت کا شکار ہوگئے۔

● سوشلسٹ ملحد سٹالن کے ظالمانہ اور آمرانہ دورِ حکومت میں تقریباً بیس ملین لوگ مارے گئے، کمیونسٹ نظریے کو ماننے والے حکمراں کے طور پر اس نے اپنی حکومت کے دوران ملک کے بڑے رقبے کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، لاکھوں کسانوں نے اپنی زمین حکومت کو دینے سے انکار کیا تو اس وجہ سے انھیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، اس تمام عرصے میں اسی کشمکش کے باعث روس قحط کا شکار ہوگیا، جس کے نتیجہ میں کئی لاکھ اور لوگ بھی موت کی وادیوں

میں اُتر گئے ، اپنے مطلق العنان دورِ حکومت میں اسٹالن نے اپنی خفیہ پولیس کو بے انتہا اختیارات دیتے ہوئے ایک وسیع ادارے میں بتدیل کر دیا،شہریوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی جاسوسی کریں اور حکومت کو رپورٹ کریں،ان جاسوسی اطلاعات کی وجہ سے بھی لاکھوں لوگوں کو یا تو ''گلاگ'' (ولائی کیمپوں) میں بھیج دیا گیا یا پھر انھیں قتل کر دیا گیا؛ کیوں کہ ان کی وفاداریاں مشکوک قرار پائی گئیں تھیں۔

کیا آپ کو اس فہرست میں کوئی مسلمان نظر آیا؟ نہیں ناں! جان لیجئے کہ اسلام کے عظیم فاتحین حضرت خالد بن ولیدؓ ،محمد بن قاسم ،موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، عقبہ بن نافع ، محمود غزنوی، بابر، جہانگیر، اورنگ زیب کے پروپیگنڈے محض تصب اور جھوٹ پر مبنی ہیں، جس میں وہ تاریخ کے حقیقی قاتلوں کے قتل چھپا کر مسلم فاتحین کو صرف بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(۱)



(۱) بحوالہ:https://www.ezpress.pk/story/1199782/10۔

قاتل، جابر، ظالم، انتہا پسند اور بنیاد پرست کون؟ مسلمان یا کوئی اور؟

عہد حاضر میں جہاں اُمتِ مسلمہ اپنی کم علمی کی بدولت مخدوش حالات سے گزر رہی ہے، وہیں وہ باقی مذاہب کے ماننے والوں کے نزدیک بنیاد پرست، رجعتی اور دہشت گردی گردانی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں روسی عیسائی ریاست نے قفقاز کے رہائشیوں کو نشانہ بنایا اور اندازاً پندرہ لاکھ مسلمانوں کو شہید اور پانچ لاکھ کو ہجرت پہ مجبور کردیا، نقل مکانی کرنے والوں کی اکثریت بھوک وافلاس اور مختلف بیماریوں کے باعث لقمۂ اجل بن گئی۔

اٹھارہویں صدی میں ہی جنوبی افریقہ کے جنگی مہارت کے حامل اور مفتوح بستیوں کو تاراج کرنے جیسی شہرت کے حامل عیسائی حکمراں شاکا زولو نے اپنے دورِ حکومت میں دس سے بیس لاکھ انسانوں کو قتل کیا، مقتولین میں قیدی عورتوں، بچوں اور جانوروں کی ایک بڑی تعداد الگ سے تھی۔

۱۶ / لاکھ مربع میل کا علاقہ یعنی تقریباً آدھی دنیا کے فاتح اسکندر اعظم سوئم یونانی ریاست مقدونیہ کا سربراہ تھا، دنیا کو فتح کرنے کے جنون میں وہ مختلف ممالک کو تاراج کرتا ہوا برصغیر تک آن پہنچا، اس کے جنون کا شکار ۱۸ / لاکھ سے زائد انسان ہوئے جس کی بنیاد پر اسے قاتل اور ظالم کی بجائے اسکندر اعظم کا خطاب دیا گیا۔

نپولین بوناپارٹ فرانس کا عیسائی حکمران تھا، جس نے اپنے دور میں پورے یورپ میں انقلابی جنگوں کا سایہ مسلط کیا، جس کے نتیجے میں اندازاً ۵۰ / لاکھ انسان ہلاک ہوئے

اور بڑی تعداد میں زخمی اور بے گھر ہوئے، عیسائی ہونے کے ناطے اسے دہشت گرد کی بجائے دنیا کے عظیم فاتح جرنیل کا خطاب دیا گیا، پچاس لاکھ لوگ مر بھی گئے تو کیا ہوا؟ آخر انقلابی تو انقلابی ہی ہوتا ہے، کوئی جہادی تو تھا نہیں کہ دہشت گرد ٹھہرایا جاتا!

یکم اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا، عین شیما اور جیکل ہسپتال کے اوپر گرا، جس کے نتیجے میں ۸۸ ہزار افراد آن واحد میں ہلاک ہوئے اور ۷۰ ہزار سے زائد زخمی ہوئے، دھماکے کے نیچے میں ۱۲ مربع کلومیٹر کا علاقہ مکمل تباہ ہوگیا، ہلاک اور زخمی ہونے والوں میں اکثریت عام شہریوں کی تھی، ہیروشیما پر ایٹمی حملے کے باوجود بھی جاپانیوں نے شکست تسلیم نہ کی تو امریکہ بہادر نے انسانی حقوق کا سبق سکھانے کے لئے ۹/ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر بھی ایٹم بم گرادیا، جس کے پلک جھپکتے ہی تقریباً اسی ہزار انسان لقمۂ اجل بنے اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے سیکولر امریکہ بہادر نے جاپانیوں کو سبق سکھانے کے لئے مزید چار ایٹم بم تیار کر رکھے تھے کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے، یوں امریکہ فاتح قرار پایا، کہا جاتا ہے کہ آج بھی جاپان کے ان ایٹمی حملوں سے متاثر علاقوں میں بچوں کی ایک بڑی تعداد پیدائشی طور پر معذور ہوتی ہے۔

۱۹۷۶ء میں اپنے قیام سے لے کر آج تک دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے دہشت گرد سیکولر امریکہ نے ۷۰ ممالک پہ حملہ کیا اور ایک ارب تیس کروڑ انسانوں کو لقمۂ اجل بنایا، جن میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔

عراق پر امریکہ نے زہریلی گیسوں اور خطرناک ہتھیاروں کے شبہ کے پیش نظر حملہ کیا، تقریباً ۱۵ لاکھ عراقی مسلمانوں کو شہید اور لاتعداد کو زخمی اور بے گھر کردیا، اتنی تباہی پھیلانے کے بعد جب جوتے پڑنے لگے تو ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ یہ کہہ کر معذرت کرتے ہوئے واپسی کی راہ لی کہ اسے غلط فہمی ہوگئی تھی۔

تاج برطانیہ کے انگریز عیسائیوں نے برصغیر سمیت دنیا بھر میں لاکھوں انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد دنیا پہ اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے، اللہ کے حکم سے

افغانستان میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد دنیا پہ اپنی گرفت کھو بیٹھے، مگر ان کی پھیلائی ہوئی خباثت سے آج بھی لاکھوں لوگ متاثر ہو رہے ہیں، جس کی ایک چھوٹی سی مثال کشمیر ہے۔

۱۹۴۳ء میں خوراک ذخیرہ کرنے کی غرض سے برطانوی وزیر اعظم چرچل کے حکم سے اشیائے خورونوش کی مصنوعی قلت پیدا کر کے ۷۰ لاکھ بنگالیوں کو موت کے سے دوچار کر دیا گیا۔

۱۹۹۲ء میں سرب اور کروڑوں عیسائیوں نے بوسنیائی مسلمانوں کو باقاعدہ طور پر سوچ سمجھے منصوبے کے تحت نسل کشی کی، تقریباً ایک لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے، بیس ہزار سے زائد خواتین کی بے حرمتی اور بیس لاکھ مسلمانوں کو جلاوطنی پہ مجبور کر دیا گیا، اس دوران مظلوم مسلمانوں کو ہتھیاروں کی سپلائی روک دی گئی، مسلم اُمہ سمیت بین الاقوامی برادری تماشا بنی رہی۔

افریقی ملک روانڈا میں مسلمان اقلیت کل آبادی کا دو فیصد ہے، ۱۹۹۴ء میں اکثریتی تتسی اور اقلیتی ہوتو قبائل کے درمیان نسلی فسادات شروع ہو گئے، جن میں محض سو دن کے اندر دس لاکھ انسان قتل اور پانچ لاکھ خواتین کی بے حرمتی کے بعد ان میں سے اکثر کو قتل کر دیا گیا، یہ منظم قتل عام عیسائی حکمرانوں کی ایماء پر ہوا۔

سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں انقلاب فرانس کے نام پر فرانسیسی حکمرانوں کے خلاف ایک لہر اُٹھی اور حکمرانوں کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اس انقلاب کا مقصد حکمرانوں سے نجات اور ایک سیکولر، لبرل اور روشن خیال معاشرے کا قیام تھا، اس انقلاب کی بھینٹ ڈیڑھ لاکھ انسان چڑھے، زخمی اور بے گھر انسانوں کی تعداد کا شمار الگ ہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز تب ہوا جب عیسائی گوریلو ہرنسپ نے آسٹریا کے عیسائی لیڈر فرڈیننڈ کو قتل کیا، عیسائیوں کی شروع کی گئی اس جنگ میں مشین گنوں، کیمیائی ہتھیاروں اور زہریلی گیسوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا، نتیجتاً اس جنگ میں دو کروڑ انسان ہلاک اور دو کروڑ زخمی ہوئے۔

جنرل روتھر دن ٹروتھا ایک جرمن عیسائی جرنیل تھا جس کے ہاتھوں نیمبیا کے علاقے ہیریرو اور نما کا میں ایک لاکھ انسان مارے گئے، اس نے ہیریرو قبائل کے افراد کو بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سمیت بلاتفریق قتل کرنے کا حکم دیا اور اکثریت کو صحرا میں ڈھکیل دیا، جہاں بھوک اور پیاس سے ان کی اموات واقع ہوئیں۔

برطانوی حکومت کی قائم کردہ ناجائز ریاست اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی سات لاکھ فلسطینیوں کو ملک بدر کر دیا گیا، ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۸ء سے اب تک ۱۵ لاکھ سے زائد فلسطینی شہید ہو چکے ہیں اور ایک بڑی تعداد اسرائیلی بیگار کیمپوں میں محصور ہے، جہاں وہ بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہیں، قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

افغانستان میں جب سویت انقلاب ٹینکوں پر بٹھا کر لایا گیا تو مقامی سرخوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا، اس انقلاب میں سولہ لاکھ افغان شہید اور پچاس لاکھ ملک بدر ہو گئے، پھر سیکولر امریکہ نے چڑھائی کر کے چار لاکھ افغانوں کو شہید کر دیا، زخمی اور بے گھر افغانوں کا شمار الگ ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

۱۹۴۲ء میں سوشلسٹ ملحد سٹالن کے حکم پر کریمیا کے ڈھائی لاکھ تاددیوں کو زبردستی ان کے ملک سے بے دخل کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو صرف تیس منٹ کا وقت دینے کے بعد ٹرینوں میں لاد کر کریمیا سے باہر نکال دیا گیا، اکثریت کو کشتیوں میں ڈال کر سمندر میں لے جا کر بیچ منجدھار میں ڈبو دیا گیا، ملک بدر افراد میں سے بھی گنے چنے چند لوگ ہی زندہ بچ پائے۔

ماؤزے تنگ چین کے انقلابی لیڈر نے تقریباً پانچ کروڑ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اس کے دور میں کسانوں کا استحصال کیا گیا، ایک آلو چوری کرنے کے جرم میں دھکا دے کر نہر میں گرا دیا جاتا، والدین کے ہاتھوں بچوں کو زندہ درگور کروانا، ناک کان وغیرہ کاٹ دینا اور سردی میں کسانوں سے ننگے بدن مشقت کروانا عام سی باتیں تھیں۔

خمیر روس کا سرخ انقلاب ۱۹۷۵ء میں ریاست کمبوڈیا میں سرخ کمیونسٹ انقلاب آیا، جسے خمیرہ روگ کا نام دیا گیا، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے حقوق کے نام پر اٹھنے والی

اس سرخ آندھی نے چار سال کے اندر ۲۰ لاکھ انسانوں کو نگل لیا، آج ہمارے ہاں بھی سرخے ان ہی قاتلوں کو انقلابی قرار دے کر ان کے راستے پہ چلنے کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔

منگول سردار چنگیز خان نے اپنے دور میں کئی علاقے تاراج کر دیئے اور ایک گھنٹے کے اندر ۱۷ لاکھ ۴۸ ہزار انسانوں کو قتل کر کے ریکارڈ قائم کیا اور انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کروائے، اس کے دور میں چار کروڑ انسان مارے گئے، اس کی اس ریت کو اس اس کے پوتے ہلاکو خان نے بھی جاری رکھا اور کروڑوں انسانوں کا قتل عام کیا، ان کی بربریت کا نشانہ بننے والوں میں چینی اور مسلمان شامل تھے، چنگیز خان مسلمان نہیں تھا۔

برما میں مسلمان کل آبادی کا چار فیصد ہیں اور ان کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے، جب کہ بدھ مت پیروکاروں کی تعداد اسّی فیصد سے بھی زائد ہے، ۲۰۱۵ء میں بدھسٹوں نے ہزاروں روہنگیا مسلمانوں کو شہید کر دیا اور دو لاکھ کو ملک بدر کر دیا، جب کہ زندہ بچ جانے والوں کو کیمپوں میں محصور کر کے جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔

بھارتی ریاست گجرات میں مودی اور اس کے پیروکار ہندو انتہا پسندوں نے مسلمانوں کا قتل عام کروایا، ایودھیا میں مسلمان ان انتہا پسند ہندوؤں کی بربریت کا نشانہ بنے تاریخی بابری مسجد سمیت کئی مساجد کو شہید کر دیا گیا، بھارت مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے ہاتھوں ایک لاکھ سے زائد کشمیری شہید ہوئے، عصمتیں پامال ہوئیں، املاک برباد کر دی گئیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

اس کے علاوہ اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو بہت سے ممالک اور بھی ہیں، جہاں مسلمان کسی نہ کسی صورت میں آج بھی ان کی انتہا پسندی اور سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں، کمال حیرت ہے کہ مذکورہ بالا کرداروں میں ایک بھی شخص مسلمان نہیں تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے دینیات پڑھی اور نہ کبھی مدرسے ہی گیا، مگر اس کے باوجود پتہ نہیں اتنا وحشی پن کہاں سے ان میں در آیا؟ انقلاب کے نام پر کروڑوں انسانوں کو قتل کرنا درست ہو گیا، جب کہ جہاد کے نام پہ استعماری قوتوں کے خلاف بندوق اُٹھانا دہشت گردی! اچھا انصاف ہے! عیسائیت،

یہودیت، ہندوازم، سیکولرازم اور سوشلزم کے نام پر کروڑوں انسانوں کو انقلابات کی بھینٹ چڑھا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ اسلام کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا اور ہم اپنی کم فہمی اور جہالت کی وجہ سے قاتلوں کو ہیرو اور اسلام اور مسلم فاتحین کو چور، قاتل ڈاکو اور قدامت پسندی سمجھتے ہیں۔

کیا آپ کو کبھی ٹی وی اختیار کے کسی جاوید چودھری اور حسن نثار جیسے دانشوروں نے اس بارے میں کچھ بتایا؟ حقیقت چھپانے والے ان دوغلے اور منافق کالم نگاروں اور اینکرز سے ہوشیار رہیں۔(۱)



(۱) https://www.zeropoint.com.pk/special-features/2017/06/05/282834

جنگ عظیم اول و دوم اور امریکہ کی خوں آشامی

● امریکی تاریخ پر ایک سرسری اور طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلتے ہیں، جس سے ہمیں آج کی انسانیت اور حقوق انسانی کے سب سے بڑے مسیحا کی تاریخ کو سمجھنے کا پورا اندازہ ہوجائے گا، انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں تاریخ کو ایسے دلدوز وہیبت ناک مناظر دیکھنے کو ملے جن کی تاریخ کو رقم کرنے میں امریکہ کا اہم کردار رہا ہے۔

● ۱۹۱۶ء میں پہلی جنگ عظیم میں کل ۱۶ سولہ ممالک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، صرف ترکی ایسا واحد ملک تھا جس نے اس خونی جنگ سے اپنے آپ کو کنارہ کش رکھا اور اس کی جنگ عظیم کا حلیف بننے سے انکار کردیا، یہ جنگ سربیا کے ایک قوم پرست اور آسٹریا اور ہنگری کے ولی عہد فرانس فرڈی نینڈ کے قتل سے شروع ہوئی، ۱۹۱۶ء میں شروع ہونے والی پہلی جنگ عظیم نے ۸۵ لاکھ ۲۸ ہزار ۸۰۰ سے زیادہ انسانی جانوں کو لقمۂ تر بنالیا، ۱۹۱۸ء میں یہ جنگ اپنے اختتام پر پہنچی۔

● ۱۹۳۹ء میں شروع ہونے والی دوسری جنگ عظیم میں کل ۷۲ ممالک نے حصہ لیا اور یہ سب کے سب غیر مسلم تھے اور اسی دوران ہیروشیما کا انسانیت سوز سانحہ بھی دیکھنے میں آیا، جس میں موجودہ دور کے حقوق انسانی اور امن و شانتی پھیلانے کے سب سے بڑے مسیحا امریکہ نے ایک ایٹم بم کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کو سوختہ کرڈالا، اور اس ملک کی آب وہوا کو مسموم و پراگندہ بناڈالا، جہاں کی فضا پر اب بھی موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے، جہاں ماہرین سائنس جاکر اب بھی تجربہ کرتے ہیں کہ یہ شہر کب اپنی سابقہ حالت پر لوٹ سکے گا، بات اسی پر ختم نہیں ہوئی؛ بلکہ تین دن کے وقفہ سے ۹/اگست ۱۹۴۵ء کو ایک اور ایٹم بم جاپان کے شہر

ناگاسا کی پر گرادیا اور آن کی آن میں ۲۸ ہزار سے زائد انسانوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا، اور دوسری جنگ عظیم میں ۹۴ لاکھ ۴۰ ہزار انسان موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔

● ۱۹۴۵ء میں ہی چین پر ڈھائی سو جنگی طیاروں کی مدد سے دو لاکھ پونڈ بارود برسا کر موت کا رقص عام کیا۔

● ۱۹۵۰ء میں امریکہ نے کوریا پر چڑھائی کردی۔

● ۱۹۵۴ء میں کیوبا میں۔

● ۱۹۶۴ء میں امریکہ وویتنام کی جنگ نے ۴۵ ہزار سے زائد لوگوں کو موت کی لپیٹ میں لے لیا، اس جنگ کا ایندھن بننے والوں میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی، جو یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا جرم کیا ہے، کس جرم کی پاداش میں انھیں موت کی نیند سلایا جارہا ہے۔

● ۱۹۶۵ء میں پیروں اور ۱۹۷۳ء میں لاوس میں ۱۹۷۵ء میں ویتنام میں ۱۹۸۷ء میں گرینیڈا، ۱۹۸۴ء میں لبنان میں ۱۹۸۹ء میں پناما میں ۱۹۹۱ء میں عراق میں ۱۹۹۸ء میں سوڈان میں اور ۱۹۹۹ء میں یوگوسلاویہ میں، ان تمام خونی جنگوں کے بعد سوچا جانے لگا کہ شاید اب امریکی انسانیت جاگ اُٹھی ہو، اس کا نعرہ امن حقیقت میں تبدیل ہوجائے اور دنیا امن وشانتی کا گہوارہ بن جائے، امن وامان کا بول بالا ہوجائے؛ لیکن ضمیر فروش اور مردہ دل کے جسم میں انسانیت تھی ہی کہاں کہ جاگتی؛ کیوں کہ وہ تو خون چوسنے کا عادی ہوگیا تھا، ۲۰۰۱ء کے بعد افغانستان وعراق میں اپنی درندگی وسفاکیت اور حیوانیت وبہیمیت کا کھیل کھیلا جانے لگا۔

دوسرے ملکوں پر امریکی حملے

امریکہ نے سینکڑوں مرتبہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بہت سے ممالک پر فوجی کارروائیاں کی ہیں، مثلاً: ۱۹۴۲ء میں ٹوکیو اور جاپان کے دوسرے شہروں پر، ۴۶-۱۹۴۵ء میں چین پر، ۱۹۴۵ء میں گوشیمالہ پر، ۱۹۵۰ء میں کوریا پر، ۱۹۵۸ء میں انڈونیشیا پر، ۱۹۵۹ء میں کیوبا پر، ۱۹۶۰ء میں پھر گوشیمالہ پر، ۱۹۶۰ء میں ویتنام پر، ۱۹۶۴ء

میں کنگو، ۷۳-۱۹۶۴ء میں لاس، ۱۹۶۵ء میں پیرو، ۶۹-۱۹۶۷ء میں پھر گوئٹیمالہ پر، ۱۹۷۲ء میں شمالی ویتنام کے بینکانگ اور دیگر بندرگاہوں پر، ۱۹۸۳ء میں غرناطہ، ۱۹۸۶ء میں لیبیا پر، ۱۹۸۹ء میں نیامہ پر ۱۹۹۱ء میں یوگوسلاویہ اور عراق پر، ۲۰۰۱ء میں افغانستان اور ۲۰۰۳ء میں پھر عراق پر۔(۱)

امریکہ دوسری جنگ عظیم سے اب تک ۳۷ سے زیادہ اقوام پر بمباری کر چکا ہے، اس بمباری کے نتیجے میں دو کروڑ سے زیادہ انسان ہلاک ہوئے ہیں۔(۲)



(۱) بحوالہ: عالمی سہارا، ۱۰ ردسمبر ۲۰۰۵ء، ص: ۸۔

(۲) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مشہور ویب سائٹ گلوبل ریسرچ کی تحقیق۔

مسلم کش فسادات

۱۹۴۷ء سے لے کر فروری ۲۰۲۰ء تک متعدد فسادات میں ۱؍لاکھ، ۶۵ ہزار ۱۰۲ مسلمان بے دردی سے قتل کئے جا چکے ہیں، جب کہ بے شمار مسلمان وہ ہیں جو اس طرح زخمی ہوئے کہ تاحیات دوسروں کے محتاج ہو کر رہ گئے اور زندگی ان کے لئے موت سے بدتر ہو گئی، ان کا گھر باران سے چھین گیا، خون پسینہ بہا کر پائی پائی جوڑ کر کھڑا کیا گیا کاروبار چشم زدن ہی میں دھڑام سے زمین پر آپڑا، ذیل میں چند مشہور اور شرمناک فسادات کے اعداد بیان کئے جاتے ہیں۔

۱- کلکتہ فسادات ۱۹۶۴ء: کلکتہ کے ان مسلم مخالف فسادات میں ۴۲۸ مسلمان شدید زخمی ہوئے اور ۷۰ ہزار سے زائد مسلمانوں کے گھر بار اُجاڑ دیئے گئے۔

۲- نیلی قتل عام ۱۹۸۳ء: اس فساد کی آگ آسام کے نیلی سے بھڑکی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۸۰۰ بنگالی مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے، یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہونے والا سب سے بڑا قتل عام تھا، جس میں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں تک پر رحم نہیں کھایا گیا۔

۳- گجرات فسادات ۱۹۶۹ء: ۱۹۶۹ء ان دنگوں میں تقریباً ۶۳۰ مسلمان قتل ہوئے، گجرات فسادات کے ذریعہ دلوں میں بھڑکائی گئی آگ کی تپش ۱۹۷۰ء میں مہاراشٹر کے علاقے بھیونڈی، جلگاؤں اور مہاڈ میں بھی محسوس کی گئی، جہاں مقامی مسلمانوں کو بڑی طرح زدوکوب کیا گیا، ان کی دُکانیں لوٹ لی گئیں، مکانات کو نذر آتش کر دیا گیا اور ان کی املاک و جائیداد کو سخت سے سخت نقصان پہنچایا گیا۔

۴- ہاشم پورہ فساد ۱۹۸۷ء: یہ فساد اُتر پردیش کے شہر میرٹھ کے ایک محلے ہاشم پورہ سے اس وقت شروع ہوا، جب PAC (ریاستی مسلح کانسٹبل) کی ایک ۱۹ رکنی ٹیم نے ہاشم پورہ سے ۴۲ مسلم نوجوانوں کو رات گئے ان کے گھروں سے اُٹھایا اور انھیں ٹرک میں لا کر ضلع غازی آباد کے قریب موجود مرادنگر کے جنگلوں میں لے گئے، جہاں انھیں بے دردانہ طریقہ پر گولی سے شوٹ کر کے ان کی لاش کو نہر میں پھینک دیا گیا، کچھ دنوں بعد یہ لاشیں نہر کی اوپری سطح پر تیرتی ہوئی پائی گئیں۔

۵- بمبئی فساد ۱۹۹۲ء: انہدام بابری مسجد کے بعد ملک بھر میں دنگے شروع ہو گئے، جن کی ایک بھاری قیمت بمبئی کے مسلمانوں کو اپنے خون سے چکانی پڑی، دی ہندو کی فرنٹ لائن میگزین کے مطابق ۹۰۰ مسلمان اس دنگے میں عوامی بھیڑ اور پولیس کی فارنگ سے ہلاک ہوئے جب کہ ۲ ہزار ۳۶ زخمی اور ہزاروں بے گھر ہو گئے، بی بی سی کے مطابق یہ ساری کارروائی منصوبہ بند اور منظم طریقے پر انجام دی گئی تھیں۔

۶- گجرات مسلم کش فسادات ۲۰۰۲ء: یوں تو تقسیم ہند کے بعد ہی مسلمانوں کو گجرات کی فضا کبھی راس نہیں آئی اور وقتاً فوقتاً انھیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا؛ لیکن ۲۰۰۲ء کے فسادات ہندوستان کی تاریخ کے سیاہ داغ ہیں، اس فساد کا آغاز گودھرا ٹرین میں آتش زنی کے بعد ہوا، بلا ثبوت مسلمانوں کو اس سانحہ کا ملزم ٹھہرایا گیا اور منصوبہ بند طریقے پر ان کی نسل کشی کا گھناؤنا عمل شروع کر دیا گیا، ان فسادات کے دوران مسلم نوجوان لڑکیوں کو جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا، مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا گیا، ان فسادات میں تقریباً دو ہزار مسلمان کام آئے، جب کہ دو لاکھ سے زائد کو اپنے گھروں سے محروم ہونا پڑا۔(۱)
۵۷۲ مسلم مذہبی مقامات کو نقصان پہنچایا گیا، جن میں مساجد کی تعداد ستر فیصد تھی، باقی درگاہ، امام باڑا، قبرستان اور یتیم خانے تھے، ان فسادات میں گجرات کے ۲۵ اضلاع میں سے

---

(۱) بحوالہ: وکی پیڈیا۔

۱۲۰ ۱۲اضلاع متاثر ہوئے، ۱۵۱ شہر، ۹۹۳ گاؤں، ۱۸۲ اسمبلی حلقوں میں سے ۱۵۴ حلقے اور کل ۴۶۴ پولیس تھانوں میں سے ۲۸۴ پولیس تھانے فسادات سے متاثر ہوئے۔(۱)

۷- مظفر نگر فسادات ۲۰۱۳ء: اگست تا ستمبر تقریباً ایک ماہ تک چلنے والے ان فسادات میں ۴۲ مسلمان ہلاک، ۲۰۰ سے زائد شدید زخمی اور ۵۰ ہزار سے زائد بے گھر ہوئے۔

۸- نئی دہلی تشدد ۲۰۲۰ء: شمال مشرقی دہلی میں ہونے والے ان دنگوں میں چالیس سے زائد افراد جاں بحق اور سینکڑوں زخمی ہوئے، مہلوکین اور متاثرین میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

فسادات کی تفصیلات اور اعداد و شمار مشہور ویب سائٹ وکی پیڈیا سے لئے گئے ہیں۔



(۱) بحوالہ: الیکشن کمیشن رپورٹ ۲۰۰۳ء۔

سکھ مخالف فسادات ۱۹۸۴ء

۱۹۸۴ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل ان ہی کے دو باڈی گارڈوں نے کردیا، اس کے بعد پورے ملک میں فسادات پھوٹ پڑے، ان فسادات میں اس وقت کی حکومت کانگریس کے کردار پر بھی ہمیشہ انگلیاں اُٹھتی رہی ہیں، جب راجیو گاندھی سے سکھوں کے قتل عام کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بڑے ہی اطمینان سے کہا: ''کہ جب کوئی بڑا مرتا ہے تو زمین کانپ ہی جاتی ہے'' ان فسادات میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ۶/ہزار ۱۵۰ سکھ ہلاک ہوئے، جن میں سے صرف ریاست دہلی میں ہلاک ہونے والے سکھوں کی تعداد ۲۸۰۰ ہے، جب کہ غیر سرکاری اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ان فسادات میں کم ازکم ۸ ہزار سے ۱۷ ہزار تک سکھ ہلاک ہوئے اور تقریباً کم ازکم پچاس ہزار سکھوں کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ان کے آشیانوں سے محروم کردیا گیا۔

آپریشن بلیو اسٹار ۱۹۸۴ء خالصتان تحریک کے رہنما اور لیڈر جرنیل سنگھ برندران والے اور ان کے حامیوں نے امرتسر کے ہرمندر صاحب (گولڈن ٹیمپل) میں پناہ لی تھی، انھیں وہاں سے نکالنے اور گرفتار کرنے کے لئے ایک سے آٹھ جون ۱۹۸۴ء سن کو بھارتی فوج نے ایک آپریشن کیا، جسے آپریشن بلیو اسٹار کے نام سے جانا جاتا ہے، اس آپریشن میں خالصہ رہنما سنگھ برندران والے سمیت ۴۹۳ سکھ مارے گئے اور سکھوں کے مقدس مقام گولڈن ٹیمپل کو شدید نقصان پہنچایا گیا، بھارتی فوج کے ہاتھوں سینکڑوں سکھوں کے قتل سے ہی دلبرداشتہ ہوکر اس وقت کی وزیر اعظم اندرگاندھی کو ان ہی کے دو باڈی گارڈ نے قتل کردیا تھا۔

نوٹ:- یہ سرکاری اعداد وشمار ہیں؛ جب کہ غیر سرکاری اعداد وشمار اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

الجزائری مسلمانوں پر فرانسیسیوں کے انسانیت سوز مظالم

جب فرانسیسی عیسائی استعمار نے اپنی عیارانہ سازشوں سے الجزائر میں اپنے پیر جمالئے اور وہاں کے مسلمان باشندوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا تو نتیجتاً ۱۹۴۵ء میں الجزائری باشندوں کی ایک بڑی تعداد نے اس جبر واستبداد کے خلاف آواز بلند کی اور وہ احتجاجا سڑکوں پر نکل آئے، عیسائی حکومت اس عوامی بیداری اور بغاوت سے بے حد خوفزدہ ہوگئی، اس بغاوت کو کچلنے کے لئے ۸ رمئی ۱۹۴۵ء کو شہر قسطنطنیہ کے قصبے سطیف میں احتجاج کررہے الجزائری مسلمانوں پر اندھا دھن بے تحاشا فائرنگ کردی گئی، جس کے نتیجے میں ۱۰۲۰ شہری ہلاک ہوگئے؛ لیکن یہ اعداد وشمار فرانسیسی حکومت کے بیان کردہ ہیں؛ حالاں کہ مصری ادارہ ''ایس آرسی'' کے مطابق اس سفاکانہ گولی باری میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد تقریباً ۴۵۰۰۰ سے تجاوز کرگئی تھی، یہ دراصل الجزائر کی جانب سے آزادی کے لئے کی جانے والی طویل جدوجہد اور عیسائی سامراجیت کی آٹھ سالہ قتل وغارت گری کا نقطۂ آغاز تھا، اس جدوجہد اور قتل وغارت گری کو تاریخ میں ''الجزائری جنگ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آزادی کی یہ جنگ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۲ء تک جاری رہی اور آخر کا ۱۹ رمارچ ۱۹۶۲ء میں الجزائر کو آزادی کی نعمت حاصل ہوئی، اس آزادی کی لڑائی میں تقریباً ڈھائی سے تین لاکھ الجزائری مسلمانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، ان مرنے والوں میں ایک بہت بڑی تعداد عام شہریوں کی بھی تھی اور تقریباً ۲۰ لاکھ شہریوں کے مکانات اُجاڑ دیئے گئے اور انھیں آسمان کے نیلے سائبان تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ (بحوالہ: وکی پیڈیا)

● ● ●

عراق میں امریکہ کی قتل و غارت گری

عراق میں ۲۰۰۳ء سے تاہنوز امریکی درندوں کا وحشیانہ قتل عام جاری ہے، اس خون کی ہولی میں اب تک متعدد بے قصور لوگ قتل کیے جاچکے ہیں، ان ہلاک ہونے والوں کی صحیح تعداد کیا ہے، اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا؛ البتہ اس بارے میں ہمیں مختلف اعداد و شمار ملتے ہیں جن میں سے چند مستند آنکڑے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱- آئی بی سی پی (عراق باڈی کاؤنٹ پراجیکٹ) نے ۲۰۰۳ء سے یکم اپریل ۲۰۱۹ء تک ایک لاکھ ۸۳ ہزار ۵۳۵ سے لے کر دو لاکھ ۶ ہزار ۱۰۷ عراقیوں کے ہلاک ہونے کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔

۲- آئی ایف اے ایس (عراق فیملی ہیلتھ سروے) نے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۶ء تک محض اس تین سال کی قلیل مدت میں ایک لاکھ ۵۱ ہزار عراقیوں کے ہلاک ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

۳- جب کہ لیس نیست اسٹڈی کے دعوے کے مطابق ان تین سالوں میں امریکی فوج نے چھ لاکھ ۵۵ ہزار عراقی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، جن میں سے چھ لاکھ ایک ہزار ۲۷ افراد کو بے حد بے رحمی کے ساتھ بہیمانہ طور پر قتل کیا گیا تھا۔

۴- اوآر بی (اوپینین ریسرچ بزنس) نے ۲۰۰۳ء سے ۱۹ر اگست ۲۰۰۷ء تک امریکی افواج کے ہاتھوں ۱۱ر لاکھ ۲۰ ہزار عراقیوں کی ہلاکت کا دعویٰ کیا ہے۔(۱)



---

(۱) بحوالہ: ویکی پیڈیا۔

بے قصور افغان شہری، امریکی بربریت کا شکار

۲۰۰۱ء سے لے کر اب تک ۳۱ ہزار عام افغانی شہری امریکی افواج کے ہاتھوں قتل کئے جا چکے ہیں؛ حالاں کہ ان افغانیوں کو نہ تو طالبان سے کوئی سروکار تھا اور نہ ہی وہ دہشت گردی کی دال سے واقف تھے، جب کہ ۲۹ ہزار ۹۰۰ افغانیوں کو بُری طرح زدوکوب کر کے اپاہج کر دیا گیا ہے۔

ایک لاکھ گیارہ ہزار افغانیوں کو — جن میں عام شہری، بوڑھے، عورتیں، بچے، افغانی فوج کے سپاہی اور افسر وغیرہ شامل ہیں — ''دہشت گردی سے مقابلے'' کے خوبصورت عنوان کے نام پر ہونے والی امریکی جھڑپوں میں اپنی جان گنوانی پڑی ہے، جب کہ مستند غیر سرکاری ادارے سی ڈبلیو پی (دی کوسٹ آف وار پراجیکٹ) نے ان جھڑپوں میں ۳؍لاکھ ۶۰ ہزار سے زائد افغانی مسلمانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔(۱)



(۱) بحوالہ: وکی پیڈیا۔

امریکی شہ پر کی جانے والی خانہ جنگی میں شامی مسلمانوں کی ہلاکتیں

۱- ایس سی پی آر (سیرین سنٹر فار پالیسی ریسرچ) کے مطابق ۱۵؍مارچ ۲۰۱۱ء سے لے کر ۱۱؍فروری ۲۰۱۶ء تک ملک شام میں ہونے والی سول وار میں تقریباً ۴؍لاکھ ۷۰ ہزار شامی مسلمان لقمۂ اجل بنے۔

۲- اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے سفیر نے اپنی رپورٹ میں ۴؍لاکھ شامیوں کے مارے میں جانے کی بات کہی ہے۔

۳- ایس او ایچ آر (سیرین آبزرویٹری فار ہیومن رائٹس) نے ۱۵؍مارچ ۲۰۱۱ء سے ۳۱؍دسمبر ۲۰۱۹ء تک ۴؍لاکھ ۸۰ ہزار ۶۳۶ سے لے کر ۵؍لاکھ ۸۵ ہزار شامی مسلمانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔ (بحوالہ: وکی پیڈیا)

فلسطینیوں پر مظالم

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک برطانوی راج کے دوران ملک فلسطین میں سامراجی کارروائیوں کے سبب تقریباً ۲۶ ہزار ۱۳۱ فلسطینی مسلمان شہید ہوئے، جب کہ ۱۷ ہزار ۳۰۰ فلسطینی شدید طور پر زخمی ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک اسرائیلی افواج کے متعدد حملوں میں ۶۵ ہزار ۵۲۱ سے زیادہ فلسطینی ہلاک، جب کہ متعدد باشندے شدید زخمی ہوئے، ایک نہایت اہم بات یہ کہ اعداد و شمار ان عام فلسطینی شہریوں کے ہیں کہ جن کو سیاست و حکومت سے کوئی سروکار نہ تھا، ان ہلاک ہونے والوں میں بیشتر تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے، وہ فلسطینی جو سفاک امریکی اور اسرائیلی فوجوں کے مظالم کے سامنے سینہ سپر ہو کر ان سے برسر پیکار تھے، ان کی تعداد تو کئی لاکھوں میں ہے۔ (بحوالہ: وکی پیڈیا)

ہٹلر کے مظالم

ہٹلر نے اپنی ۱۹۲۰ء کی تقریر میں صاف کہا تھا کہ یہودیوں کو سرکاری دفتروں اوراداروں سے نکال دینا چاہئے، نہ اخبارات ان کے قبضے میں ہوں اور نہ انھیں شہریت کے حقوق ملنے پائیں؛ چنانچہ برسر اقتدار آتے ہی اس نے یہودیوں کو جرمن زندگی سے علاحدہ کردیااورانھیں اپنے ملک سے نکل جانے پر مجبور کیا۔

ہٹلر نے جواہانت آمیز سلوک ان سے روا کھا، اس کی تفصیل پڑھ کر انسان لرز اُٹھتا ہے؛ چنانچہ آسٹریا کے دارالخلافہ ''دی آنا'' میں یہودیوں پرلرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے، مارچ ۱۹۳۸ء میں ان کی دُکانوں کا بائیکاٹ کیا گیا، ان کی دُکانوں کے بورڈ اُلٹے کردیئے گئے اوران پر سوراور کُتّے ایسی غلیظ گالیاں لکھی گئی، دوسروں کواور خود یہودیوں کوبھی یہودی دُکانوں میں داخل ہونے کی ممانعت کردی گئی، پھر یہودیوں پر سر بازار حملے کئے گئے اورانھیں حکم دیا گیا کہ وہ بازاروں میں جھاڑو دیں، کھڑکیاں دھوئیں، بعض سڑکوں پر رینگ کر چلیں، گھاس کھائیں اور کھڑکیوں میں سے نہ جھانکیں وغیرہ وغیرہ۔

بڑے بڑے نازی لیڈروں نے اپنی تقریر میں یہودیوں کوفحش گالیاں دیں، بعض کو بغیرکسی وجہ کے پکڑ کر جیل خانے میں بند کردیا گیااوروہاں ریڈیو لگادیئے گئے، جن کے ذریعہ چوبیس گھنٹے یہوداوران کے اکابرین کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا، کئی یہودیوں کی دُکانیں لوٹ لی گئیں اورانھیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا، تمام آریہ لڑکیوں کو یہودیوں کے یہاں ملازمت کرنے سے روک دیا گیا، یہودیوں کووطن چھوڑنے کے لئے کوئی سہولت بہم نہیں پہنچائی گئی اور نہ انھیں زادِ راہ دیا گیا، ان مظالم سے تنگ آکر بہت سے یہودیوں نے خودکشی کرلی۔

حکومت نے یہودیوں کے معبد اور مقدس مقامات بھی تباہ کر دیئے؛ چنانچہ نیورم برگ کی ٹاؤن کونسل نے یہودیوں کا صومعہ (عبادت خانہ) اور ان کے ثقافتی مرکز کی عمارت گرادی اور اس موقع پر نیورم برگ کے میئر نے تقریر کرتے ہوئے کہا: آج ہم نے اپنے شہر کو ایک چمکتی ہوئی لعنت سے پاک کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے آخری انکشاف وہ ہے جو نیویارک ٹائمز کے ایک ایڈیٹر نے کیا ہے، اس خبر کی ضروری تفصیل یہ ہے کہ ہٹلر پولینڈ میں یہودیوں کے لئے ایک نو آبادی قائم کرر ہا ہے، یہ نو آبادی صرف پچاس سے ساٹھ میل رقبے کی ہوگی اور اس کے اِرد گرد خاردار تاروں کا جنگلہ لگا دیا جائے گا، اس نو آبادی میں کم سے کم بیس لاکھ یہودی گھسیڑے جائیں گے، جو یہودی اس علاقے میں آباد ہوں گے انھیں ایک ہینڈ بیگ کے سوا کچھ لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی، ایڈیٹر صاحب کا بیان ہے کہ اس علاقے کی زمین بالکل بنجر ہے، گویا یہودیوں کے لئے ہٹلر موت کا پھندا تیار کر رہا ہے۔(۱)



(۱) بحوالہ: نازی ازم، از: عبدالرحیم شبلی: ۳۸-۴۱۔

ہولوکاسٹ کا المیہ

۱- دوسری جنگ عظیم (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۵ء) کے دوران جرمنی میں ایک جنونی اور سرپھرے ڈکٹیٹر ایڈولف ہٹلر نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو دردناک موت سے دوچار کیا، ہلاک کئے جانے والے ان یہودیوں کی تعداد یورپ میں موجود ان کی کل آبادی کا دوتہائی تھی، یہودیوں کو محض یہودی النسل ہونے کی بنیاد پر نہایت ہی وحشیانہ طور پر قتل کیا گیا، کبھی انھیں زہریلی گیس کے چیمبر میں ڈال دیا گیا، جہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر گئے، تو کبھی فائرنگ اسکواڈ کے سامنے ہاتھ باندھ کر اور آنکھوں پر پٹی لگا کر اندھا دھند گولیوں سے بھون دیا گیا، کبھی زبردستی زہریلے انجکشن دیئے گئے تو کبھی سائنسی تجربہ گاہوں میں مختلف دواؤں اور کیمیکل کی تیاری میں تجربے کے نام پر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔(۱)

۲- سوویت یونین کے ڈکٹیٹر جوزف سٹالن کی گردن پر تقریباً ۶۰ لاکھ بے گناہوں کے قتل کا بوجھ ہے، جو نسل کشی، جلاوطنی، فوجی تشدد اور بھک مری کے سبب ہلاک ہوئے۔(۲)

۳- اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی کا شمار تاریخ کے ظالم و جابر لوگوں میں ہوتا ہے، اس پر ان چالیس لاکھ بے گناہوں کے خون کے چھینٹے ہیں، جنھیں اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران قتل کرائے، نیز افریقی ملک ایتھوپیا پر قبضے کے دوران اس نے ۳۰ ہزار افریقی باشندوں کو ہلاک کر ڈالا۔(۳)



(۱) بحوالہ: وکی پیڈیا۔ (۲) بحوالہ: کورا (Quora)۔ (۳) بحوالہ: کورا (Quora)۔

کمیونسٹوں کے جنسی و جنگی جرائم ☆

ملحد سوویت یونین کی طرف سے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۹۱ء کے درمیان کیے گئے جنسی جرائم کی بڑی لمبی فہرست ہے، یہ جنسی اور جنگی جرائم سوویت یونین کی سرخ فوج اور این کے وی ڈی کی طرف سے کیے گئے جو کہ کمیونسٹ ملحد سٹالن کی سرخ دہشت گردی یا Red Terror اور کچھ اس کی ملحد فوج کی طرف سے جنگی قیدیوں اور عام عوام کے خلاف کیے گئے، (1) جنگ کے بعد اتحادیوں نے ملحد سوشلسٹ نازی جرمنی کے خلاف جنگی جرائم کی تحقیقات کے لئے ایک کنونشن قائم کیا جس کے سربراہوں میں کئی سوویت یونین سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح ایک فاتح جنگی قوت کی وجہ سے ملحد سوویت یونین کے جنگی جرائم عالمی جنگی جرائم کے قوانین سے بچ گئے۔ (2)

جون ۲۰۱۷ء میں روس کے صدر ولادی میر پوتین نے سابق ملحد سوویت یونین کے صدر سٹالن کے ان جنگی جرائم کو خود تسلیم کیا؛ لیکن ساتھ ہی الزام عائد کیا کہ یہ جرم بڑھا کر پیش کئے گئے ہیں، (3) جب کہ حقائق ان کو ثابت کرتے ہیں اور اس کو ہم حوالہ جات کے ساتھ انشاءاللہ اپنے اس مضمون میں پیش کریں گے۔

☆ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے والے اور امن پسندی اور انسانیت کو سب سے بڑا مذہب قرار دینے والے لبرل سیکولر کالم نگاروں اور ملحدین کو جواب۔ (تدوین و ترجمہ: ڈاکٹر احید حسن)۔

(1) Stative, Alexander (2010) The Soviet Counterinsurgency in the Western Borderlands, Cambridge University Press P:277 ISBN 978-0-521-76833-7.

(2) Davies, Norman (2006), Europe at War 1939-1945 No: Simple Victory, Macmillan, P:198 ISBN 978-0-333-69285-1.

(3) David Filipov (26 June 2017), For Russians, Stalin is the 'most outstanading' figure in World history, Followed by Putin, The Washington Post, Retrieved 7 August 2017.

ملحد سوویت یونین نے ۱۹۱۹ء میں ملحد سوشلسٹ انقلاب کے بعد سابق عیسائی زار روس کی طرف سے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کے دستخط شدہ ہیگ کنونشن کو ماننے سے انکار کردیا اور ۱۹۵۵ء تک انکار کرتا رہا،(1) اس نے ایسی صورت حال پیدا کی جس میں ملحد سوویت یونین اور ملحد نازی (واضح رہے کہ ہٹلر سوشلسٹ ملحد تھا) جرمنی مفتوحہ اقوام کے خلاف اپنے جنگی اور جنسی جرائم انجام دینے کے لئے آزاد ہوگیا۔(2)

کئی مؤرخین کے مطابق ملحد سوویت یونین کی این کے وی ڈی سے پہلے کی فوج چیکا نے ڈھائی لاکھ انسانوں کو مار ڈالا،(4,3) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس ملحد جنگی فوج نے جنگ سے زیادہ لوگوں کا قتل غیر جنگی حالات میں کیا۔(5)

۱۹۲۱-۱۹۲۲ء کے درمیان میخائیل ٹراٹسکی (سوویت ملحد فوج کا قائد جو بعد ازاں خود بھی سوویت یونین کے ملحد قائد سٹالن کے ظلم کا نشانہ بنا) نے تمبوف صوبے میں دیہاتیوں کی ایک بغاوت کے خلاف قیادت کی اور مقامی باشندوں کو بغیر مقدموں اور کیس کے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا،(6) ان ہی وجوہات کی بنیاد پر سائمن سیبیگ مونٹیفیور نے ٹراٹسکی کو کسی بھی

---

(1) Grenkevich, Leonid D; Glantz, David M. (1999). Glantz, David M; ed The Soviet Partisan Movement, 1941-1944: a Critical historiographical analysis. P:110 ISBN 978-0-7146-4874-3.

(2) Andrew, Christopher; Mitrokhin, Vasili (2000), The Sword and the Shield: The Mitrokhin Archive and the Secret History of the KGB, Basic Books, P:28 ISBN 978-0-465-00312-9.

(3) Overy, Richard J. (2004), The Dictators: Hitler's Germany and Stalin's Russia. W. W. Norton & Company. P:180 ISBN 978-0-393-02030-4.

(4) Page : 649, Figes (1996).

(5) Suvorov, Viktor. The Chief Culprit: Stalin's Grand Design to Start World War II. Annapolis, MD: Naval Institute Press, 2008.

(6) Sebag-Montefiore, Simon (2005). Stalin: The Court of the Red Tsar. New York: Vintage Books. P : 222. ISBN 0-307-42793-5.

دوسرے بالشویک کی طرح بے رحم قرار دیا، (1) این کے وی ڈی کو ملحد سرخ فوج سیاسی استحصال میں مدد فراہم کرتی رہی۔(2)

جب ملحد سوویت یونین کی سرخ فوج ۱۹۴۱ء کے جرمن حملے سے پسپا ہوئی اور جس کو ''آپریشن بار بروسا'' کہا جاتا ہے، اس وقت ملحد سوویت یونین کی فوج نے جرمن قیدی فوجیوں کے خلاف بے شمار جنگی جرائم کیے جو دہرمیکٹ وار کرائم بیورو کی ان دستاویزات میں سامنے آئے جو کہ ۱۹۳۹ء میں قائم کی گئی تھی، (3) ملحد سوویت یونین کی فوج نے جو ۱۹۴۱ء میں برونیکی، دسمبر ۱۹۴۱ء میں فیوڈوشیا اور ۱۹۴۳ء میں گریشینو میں معصوم عوام کا بے دریغ قتل عام کیا اور ان کی بے رحم نسل کشی کی ملحد این کے وی ڈی فوج نے اپریل اور مئی ۱۹۴۰ء میں پولینڈ کے بیس ہزار فوجیوں اور افسروں کو جنگی قید میں مار ڈالا جو کہ عالمی جنگی قوانین کے بالکل خلاف تھا، ملحد سوویت یونین نے چین کے صوبے سنکیانگ پہ حملے کے دوران کیمیائی ہتھیار استعمال کئے جس میں مسٹرڈ گیس بھی شامل تھی اور اس حملے میں عوام کا بے دریغ قتل عام کیا گیا، (5,4) ۱۹۴۰ء میں ملحد سوویت یونین نے غیر قانونی طور پر ایسٹونیا پہ قبضہ کر لیا اور اس کو ایسٹونین سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کا نام دیا، (6) ۱۹۴۱ء میں ملحد سوویت یونین کی بدنام زمانہ سرخ فوج

(1) Pipes, Richard. Russia under the Bolshevik Regime. New York: Vintage Books, 2004.

(2) Nagorski, Andrew (2007-09-18) The Greatest Battle (Google Books) Simon and Schuster. P : 83. ISBN 9781416545736. Retrived 2015-02-15.

(3) De Zayas, Alfred M., The wehrmacht War Crimes Bureau, 1939-1945, University of Nebraska Press, Lincoln, NE, 1989, 3rd revised edition Picton Press, Rockland, Maine 2003. 13: OCLC 598598774 Translation of : Die Wehrmacht-Untersuchungsstelle.

(4) Pearson, Graham S. "Uses of CW Since the First World War". FEDERATION OF AMERICAN SCIENTISTS. Archived from the original on 2010-08-22. Retrieved 2010-06-28.

(5) Sven Anders Hedin; Folke Bergman (1944). History of the expedition in Asia, 1927-1935, Part 3. Stockholm: Gotebory Elanders Boktryckeri aktiebolag. P : 112. Retrieved 28 November 2010.

(6) Magnus Ilmjarv Haaletu alistumine, (Silent Submission), Tallinn, Argo, 2004, ISBN 9949-415-04-7.

نے ۳۴ ہزار ایسٹونین عام افراد کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا، جن میں سے بمشکل تیس فیصد جنگ میں جان بچا سکے، ان میں سے بھی آدھے سے کم جنگ میں استعمال کئے گئے جب کہ باقی ملحد سوویت یونین کے بدنام حراستی بیگار کیمپوں میں جان کی بازی ہار گئے جن کو گلاگ کیمپ کہا جاتا تھا، (1) جب سوویت یونین نے دیکھا کہ ایسٹونیا پہ ملحد نازی جرمنی قبضہ کر لے گا تو جن قیدیوں کو ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا تھا ان کو ملحد افواج نے قتل کر دیا، (2) ایسٹونیا کے تین لاکھ شہریوں کو جلاوطن کر دیا گیا یا، (5,4,3) اس جنگ میں ایسٹونیا کی بیس فیصد آبادی یعنی تقریباً دو لاکھ انسان ملحد سوویت یونین نے مار ڈالے، (6) جب کہ ہزاروں افراد کو قازقستان اور سائبریا کی سرد جہنم میں مرنے کے لئے وہاں جلاوطن کر دیا گیا، (9,8,7) جس میں ایسٹونیا کی یہودی

---

(1) Toomas Hiio, ed. (2006). Estonia, 1940-1945: Reports of the Estonian International Commission for the Investigation of Crimes Against Humanity. Estonian Foundation for the Investigation of Crimes Against Humanity. P : 886. ISBN 978994913045.

(2) The Baltic Revolution: Estonia, Latvia, Lithuania and the Path to Independence by Anatol Lieven P : 424 ISBN 0-300-06078-5.

(3) Communist Crimes org Historical Introduction Retrived 14 February 2016.

(4) Vetik, Raivo (2002) "Cultural and Social Makeup of Estonia In Pal Kolsto National Integration and Violent Conflit in Post-Soviet Societies: The Cases of Estonia and Moldova, Rowman & Littlefield Publishers. P : 74. ISBN 978161639459.

(5) Conclusions of the Estonian International Commission for the Investigation of Crimes Against Humanity Archived 9 June 2007 at the Wayback Machine, Historycommission,ee; accessed 13 December 2016.

(6) Kareda, Endel (1949). Estonia in the Soviet Grip: Life and Conditions under Soviet Occupation 1947-1949. London: Boreas.

(7) Usstalu, Evald (1952). The History of Estonian People. London: Boreas.

(8) Laar, Mart (2006) Deportation From Estonia in 1941 and 1949 Archived 2009-02-25 at the Wayback Machine, Estonia Today: Fact Sheet of the Press and Information Department, Estonian Ministry of Foreign Affairs (June 2006).

(9) 70th anniversary of Deportation and uprising of 1941, The Baltic Times, 29 June 2011; retrieved 6 May 2013.

آبادی کا دس فیصد سے زائد افراد بھی شامل تھے۔(1)

وہ ایسٹونین جولینن گارڈ میں رہ رہے تھے، پہلے یعنی ۱۹۴۵ء میں ہی جلاوطن کئے جاچکے تھے، ۱۹۴۱ء میں ملحد سٹالن کی Scorched Earth حکمت عملی پہ عمل درآمد کرتے ہوئے سٹالن کی افواج نے سوویت یونین کے مغربی حصوں میں ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرڈالا، اس کارروائی میں درجنوں دیہات، اسکول اور عوامی عمارات ملحد افواج نے جلا ڈالیں، ایسٹونیا کے اسکول کے ایک بچے تولیولنڈ سار کی ہاتھ کی انگلیاں توڑ کرا سے صرف اس لئے ملحد افواج نے قتل کیا؛ کیوں کہ اس نے ایسٹونیا کا جھنڈا لہرایا تھا، ایسٹونیا کی جنگ آزادی کے قائد کارل پارٹس کے بیٹے مارٹیشیس پارٹس کو ملحد افواج نے زندہ تیزاب میں ڈال کر مارڈالا، اگست ۱۹۴۱ء میں ایسٹونیا کے ایک گاؤں ویردکیالا کی تمام آبادی کو ملحد سوویت یونین کی فوج نے موت کے گھاٹ اُتارڈالا جس میں دو اور چھ سال کے بچے بھی شامل تھے، ملحد سوویت یونین کی فوج کے ان مظالم کے خلاف جنگ پھوٹ پڑی، جس میں ایک لاکھ جوانوں نے اپنے ملک کی عوام کو ملحد افواج سے بچانے کے لئے عہد کیا، ملحد سوویت یونین کی فوج کا ظلم اس حد تک تھا کہ کئی بار بے گناہ لوگوں کو زندہ جلا دیا جاتا، (2) ملحد افواج نے جن لوگوں کا قتل عام کیا وہ اکثر نہتے لوگ تھے۔(3)

۱۴/جون ۱۹۴۱ء میں ملحد سوویت فوج نے ہزاروں لوگوں کو جن میں بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، انھیں گھروں سے اُٹھا کر مال گاڑیوں میں جانوروں کی طرح لاد کر سائبیریا کی سرد جہنم کے موت کے پیغام کیمپوں کی طرف جلاوطن کر دیا، یہ جرم ماسکو کی ملحد قیادت کے حکم پہ کیا گیا اور عوام کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں، ملحد سوویت یونین نے لٹویا پر قبضے

---

(1) Weiss-Wendt, Anton (1998). "The Soviet Occupation of Estonia in 1940-41 and the Jews" (PDF). Holocaust and Genocide Studies. 12 (2): 308-25. doi : 10.1093/hgs/12.2.308.

(2) Martin, Terry (1998). "The Origins of Soviet Ethnic Cleansing" The Journal of Modern History. 70 (4) : 813-861 doi : 10.1086/235168. JSTOR 10.1086/235168.

(3) Mart Laar, War in the Woods, The Compass Press, Washington, 1992, p. 10.

کے بعد بے شمار نہتے لوگوں کو حراست میں لے لیا، (1) ملحد سوویت یونین کی طرف لٹویا کی تین لاکھ آبادی کو جلاوطن کر دیا گیا اور کچھ کو بیگار کیمپوں میں قید میں ڈال دیا گیا، ملحد سوویت یونین کے غاصبانہ قبضہ کے دوران لٹویا کے سات لاکھ اسّی ہزار بے گناہ لوگ مار دیئے گئے، جن میں ساڑھے چار لاکھ جنگی گزین تھے، (2) صرف ملحد اسیری کیمپوں میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۳ء کے دوران چودہ ہزار افراد موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ (3)

جن لوگوں کو جلاوطن کیا گیا ان میں سے بیس ہزار سے زائد افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے جن میں پانچ ہزار بچے بھی شامل تھے، (4) ملحد سوویت یونین کی فوج نے اذیتی کیمپوں میں قیدیوں پہ حیوانی تشدد کئے، قیدیوں کو زندہ کھولتے ہوئے پانی سے جلا دیا جاتا، بعض جگہ جیسا کہ Przemyslany میں لوگوں کے ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹ کر آنکھیں نکال دی گئیں Czortkow میں خواتین کے پستان کاٹ دیئے گئے، Drohobycz میں لوگوں کو ایک خاردار تار سے باندھ کر قتل کر دیا گیا، (5) ماہر سماجیات پروفیسر تادیوسز پیوٹروسکی کے مطابق ۱۹۳۹-۱۹۴۱ء کے درمیان ملحد سوویت یونین نے مشرقی پولینڈ کی ڈیڑھ ملین عوام کو جلاوطن کر دیا، جس میں سے اکثر خود پولینڈ کے شہری اور کچھ یہودی شامل تھے، ان ڈیڑھ ملین لوگوں میں سے صرف چند خوش قسمت ہی واپس اپنے ملک پولینڈ زندہ واپس آسکے، (6)

---

(1) Eesti rahva kannatuste aasta. Tallinn, 1996, p. 234.

(2) Deportation of 14 June 1941 : crime against humanity : materials of an International Conference 12-13 June. (2001) Latvijas vestures instituts. 14 June 2012 Retrieved 18 June 2017 via latvianhistory. com.

(3) Communist Crimes.org Historical Introduction, Retrieved 14 February 2916.

(4) International Commission ror the Evaluation of the Crimes of the Nazi and Soviet Wccupation Regimes in Lithuania, Mass Arrests and Torture in 1944-1953, pp. 2-3 (=10%+of 142,579 arrested).

(5) International Commission ror the Evaluation of the Crimes of the Nazi and Soviet Wccupation Regimes in Lithuania, Deportations of the Population in 1944-1953 Archived 1 June 2013 at the wayback Machine, Paragraph 14.

(6) Jan T. Gross. Revolution From Abroad: The Soviet Conquest of Poland's Western Ukraine and Western Belorussia. Princeton University Press, 2002 ISBN 0-691-09603-1 pp. 181-182.

امریکی پروفیسر کارول قویگلی کے مطابق ملحد سوویت یونین کی فوج نے پولینڈ کے تین لاکھ بیس ہزار جنگی قیدیوں میں سے ایک تہائی سے زیادہ کو عالمی جنگی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قتل کرڈالا، (1) پولینڈ کی حکومت کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد قتل کیے گئے تھے، (2) کراکو میں ملحد سوویت یونین کی فوج نے پولینڈ کی عورتوں اور لڑکیوں کی بے دریغ عصمت دری کی اور ملحد افواج نے عوام کی ہر چیز لوٹ لی۔ (3)

۱۹۴۳ء میں ملحد سوویت یونین کی فوج نے آپریشن الوس کے خفیہ نام کے تحت کالمک نے وہاں کی وسیع آبادی کو ان کے ملک سے جلاوطن کر دیا اور سائبیریا کی طرف جلاوطن کیے گئے، لوگوں میں سے ایک لاکھ کے لگ بھگ جاں بحق ہو گئے۔ (4)

جرمنی کی حکومت کی طرف سے جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق مشرقی یورپ میں ملحد سوویت یونین کی فوج نے جرمنی ودل کھستر میں ہزار نہتے غیر فوجی افراد کا قتل عام کیا اور دو لاکھ پانچ ہزار جرمن افراد ملحد سوویت یونین میں جبری مشقت کے دوران جاں بحق ہو گئے، (5)

---

(1) Tadeusz Piotrowski (1998), Poland's Holocaust, Mcfarland, ISBN 0-784-0371-3. Chapter: Soviet terror, P. 14 (Google Books). "By the time the war was over, some I million Polish citizens Christiands and Jews alike had died at the hands of the Soviests".

(2) Carroll Quigley, Tragedy & Hope : A History of the World in Our Time G.S.G.& Associates, Incorporated; New Ed edition, June 1975, ISBN 0-945001-10-X.

(3) Joanna Ostrowska; Marcin Zaremba (2009-03-07) "Kobieca gehenna" (The women's ordeal) No 10 (2695) (in Polish), Polityka. pp. 64-66 Retrieved Paril 21, 2011.

(4) Rita Pagacz-Moczarska (2004). Okupowany krakow-z- Prorektorem Andrzejem Chwalba rozmawia Rita Pagacz-Moczarska [Prof. Andrzej Chwalba talks about the Soviet-occupied Krakow] Alma Mater, No 4 (in Polish). Jagiellonian University. Archived Fromthe original on May 24, 2008. Retrieved January 5,2014.

(5) http://news.bbc.co.uk/2/hi/europe/country_profiles/4580467.stm Regions and territories : Kalmykia.

ان میں وہ عام سوا لاکھ افراد شامل نہیں ہیں جو جنگ برلن میں مارے گئے۔(1)

اعداد و شمار کے مطابق ملحد سوویت یونین کی فوج نے جنگ کے دوران ڈھائی لاکھ سے دو ملین لڑکیوں اور خواتین کی عزت تار تار کر دی،(2) ۱۹۵۵ء کے بعد ملحد سوویت یونین کی فوج نے ان تمام شہروں میں خواتین اور لڑکیوں کی بے دریغ عصمت دری کی، جہاں جہاں ملحد سوویت یونین کا قبضہ تھا، پولینڈ کی آزادی کے دوران ملحد سوویت یونین کی فوج نے وہاں کی لڑکیوں سے اجتماعی جنسی زیادتیاں کی، کچھ خواتین جو بھاگ اور چھپ نہیں سکتی تھیں ان سے ایک ایک دن میں پندرہ بار جنسی زیادتی کی گئی۔(3)

مؤرخ انتونی بیوور کے مطابق ملحد سوویت فوج نے جرمنی میں برلن کی فتح کے بعد آٹھ سال کی لڑکیوں تک سے جنسی درندگی کی، (4) نیمارک کے مطابق یہ جنسی زیادتیاں ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء تک جاری رہیں، (5) نیمارک کے مطابق جرمنی پہ ملحد سوویت یونین کی فوج کے قبضے کے پہلے دن سے آخر تک وہاں کی خواتین کو ملحد فوج کی طرف سے جنسی درندگیوں کا نشانہ بنایا گیا،(6) جرمنی میں جنسی زیادتی سے متاثرہ خواتین کی تعداد پانچ ہزار سے دو لاکھ تھی، (9,8,7)

---

(1) Vertreibung uud Vertreibungsverbrechen 1945-1978. Bericht des Bundesarchivs Vom 28 Mai 1974. Archivalien und ausgewalte Erlebenisberichte, Bonn 1989.

(2) Clodfelter, Michael, Warfare and Armed ConFlicts: A Statistical Reference to Casualty and Other Figures, 1500-2000, 2nd Ed. ISBN 0-7864-1204-6.

(3) Hauna Schissler The Miracle Years: A Cultural History of West Germany, 1949-1968 [3].

(4) Ostrowska, Zaremba: "Kobieca gehenna" Krytyka Polityczna, 4 March 2009. Source: Polityka nr 10/2009 (2695).

(5) They raped every German female from eight to 80, The Guardian.

(6) Naimark 1995, p. 79.45.

(7) Naimark 1995, p. 132-133.46.

(8) Bessel Richard; Dirk Schumann (2003). Life after Death: Approaches to a Cultural and Social History of Europe. Cambridge University Press. p. 132. ISBN 0-521-00922-7.

(9) Ungvary, Krisztian (2005). The Siege of Budapest. New Haven: Yale University Press. pp. 348-350. ISBN 0-300-10468-5.

نارمن نیمارک کے مطابق ملحد سوویت یونین کی فوج کی طرف سے ہنگری پہ حملے کے دوران وہاں کی لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کو قید میں ڈال کر جنسی درندگی کا نشانہ بنایا گیا اور کئی کو قتل کر دیا گیا، (1) یہاں تک کہ ملحد سوویت یونین کی فوج نے غیر جانبدار ممالک کے سفارت خانوں پہ حملے کر کے وہاں کی خواتین سفیروں اور دیگر عملے کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا، (2) ایک سویڈش نمائندے نے ہنگری کے شہر بدھا پیسٹ پہ ملحد سوویت یونین کی فوج کے قبضے کے بعد شہر میں داخلے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

بدھا پیسٹ کے محاصرے کے دوران اور بعد میں آنے والے دنوں میں ملحد سوویت فوج نے شہر کو آزادی سے لوٹا، وہ ہر فصل ہر کھیت میں داخل ہو گئے، کسی غریب کو چھوڑا نہ کسی امیر کو، انھوں نے ہر وہ چیز لوٹ لی جس کی انھیں ضرورت تھی، ہر دکان، عمارت، بینک کئی کئی بار لوٹے گئے، فرنیچر اور بھاری چیزیں جو ساتھ نہیں لے کر جا سکتے تھے وہ تباہ و برباد کر دی گئیں، کئی موقعوں پہ لوٹ مار کے بعد گھروں کو آگ لگا دی گئی، بینک لوٹ لوٹ کر خالی کر دیے گئے۔(3)

برلن پہ قبضے کے بعد ملحد سوویت یونین کی فوج نے ہر نظر آنے والی چیز لوٹ لی جیسے کہ لیٹرین اور غسل خانے بھی ہتھوڑوں سے تباہ کر ڈالے جن کی تباہی سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہونا تھا، بجلی کی ترسیل کا نظام تباہ و برباد کر دیا گیا اور بے شمار گھروں کو حیوانی انداز میں جلا دیا گیا، (4)

---

(1) James, Mark (2005) "Remembering Rape: Divide Social Memory and the Red Army in Hungary 1944-1945" Past & Present. Oxford University Press. 188 (August 2005): 133-161. doi: 10.1093/pastj/gti020. ISBN 1477-464X.

(2) Naimark, Norman M. (1995). the Russians in Germany: A History of the Soviet Zone of Occupation, 1945-1949. Cambridge: Belknap pp. 70-71. ISBN 0-674-78405-7.

(3) Birstein. Vadim (3 May 2002). "Johnson's Russia List" Archived from the original on January 9,2012 Retrieved 2015-02-11.

(4) Montgomery, John Flournoy (1947). Swiss Legation Report of the Russian Invasion of Hungary in the Spring of 1945. Hungary The Unwilling Satellite. Wnw York: The Devin Adair Co. p. Appendix III. ISBN 1-931313-57-1.

ملحد سوویت یونین نے خود اس بات کی تصدیق کی کہ چھبیس لاکھ جرمن قیدیوں میں سے ساڑھے چار لاکھ سے زائد قتل کر دیئے گئے تھے، (1) بے شمار جرمن فوجی اور عام افراد ملحد سوویت کی قید میں حیوانی تشدد سے مار دیئے گئے، جرمن حکام کے مطابق ان کی تعداد ایک ملین تھی جن کو عالمی جنگی قوانین کے برعکس ملحد سوویت یونین نے اپنی تحویل میں قتل کر ڈالا، (2) جب جرمن فوج نے دوبارہ فیوڈوشیا کا قبضہ حاصل کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ ہر زخمی سپاہی کو ملحد افواج نے عالمی جنگی قوانین کے خلاف قتل کر ڈالا، کچھ زخمی جو ہسپتال میں داخل تھے، ان کو ہسپتال کے بیڈس پہ قتل کر دیا گیا، کچھ کو اُٹھا کر ہسپتال کی چھت سے پھینک کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا، کچھ کو بار بار برفیلے ٹھنڈے پانی میں ڈال کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔(3)

مورخ محمد کاکڑ، ڈبلیو مائیکل ریزمین اور چارلس نورچی کے مطابق ملحد سوویت یونین کی فوج نے ۱۹۷۹ء میں افغانستان پہ قبضے کے بعد افغان عوام کی نسل کشی کی، (5,4) افغان عوام کی نسل کشی مہم کے تحت ملحد سوویت یونین اور اس کی معاون افواج نے دو ملین افغان عوام کا قتل عام کیا، (6) ۱۹۸۰ء کے موسم گرما کے دوران ملحد سوویت فوج نے نہتے افغان مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا، (7) ملحد سوویت یونین کی فوج نے افغانستان میں متحارب مجاہدین اور عام غیر متحارب مسلمانوں کا بلا تمیز قتل عام کیا۔(8)

---

(1) Hannah Pakul (2009). the last empres: Madame Chiang kai-Shek and the Birth of modern China. Simon and Schuster p. 530. ISBN 1-4391-4893-7. Retrieved 2010-06-28.

(2) Rossiiskaia Akademiia nauk. Liudskie Poteri SSSR V Period vtoroi mirovoi voiny:Sbornik statei. Sankt-Peterburgy 1995 ISBN 5-86789-023-6.

(3) Rudiger Overmans. Deutsche militarische Verlustein Zweiten Weltkrieg Oldenbourg 2000. ISBN 3-486-56531-1.

(4) Zayas (1990), pp. 180-186.

(5) Kakar, Mohammed the Soviet Invasion and the Afghan Response, 1979-1982. University of California Press. ISBN 9780520208933.

(6) Reisman, W. Michael; Norchi, Charles H. "Genocide and the Soviet Occupation of Afghanistan" (PDF) Retrieved 7 January 2017.

(7) Klass, Rosanne (1994). the Widening Circle of Genocide. Transaction Publishers. p. 129. ISBN 9781412839655.

(8) Kakar, Mohammed. the Soviet Invasion and the Afghan Response, 1979-1982. University of California Press. ISBN 9780520208933.

نومبر ۱۹۸۰ء میں لغمان اور کاما سمیت کئی علاقوں میں یہ کیا گیا، ملحد سوویت یونین کی فوج اور خاد کے افراد نے افغان خواتین کو گھروں اور یہاں تک کہ دارالامانوں سے اغوا کرا کے ان کو جنسی درندگی کا نشانہ بنایا، (1) ۱۹۸۴ء میں ملحد سوویت یونین کی فوج کے سابق افراد نے خود اس بات کی تصدیق کی کہ افغان خواتین اور بچیوں کو بے دریغ حیوانی جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، (2) اب ملحد سوویت یونین کی فوج کی جنگی اور جنسی درندگیوں اور عالمی جنگی قوانین کی بے دریغ خلاف ورزیوں کے بعد اب کچھ ان ممالک کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں، جہاں سوشلسٹ ملحدین نے اقتدار ملنے کے بعد عوام کا بے دریغ قتل عام کیا۔

خمیر روس کا سرخ انقلاب: ۱۹۷۵ء میں ریاست کمبوڈیا میں سرخ کمیونسٹ انقلاب آیا، جسے خمیر روگ کا نام دیا گیا، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے حقوق کے نام پر اُٹھنے والی اس سرخ آندھی نے چار سال کے اندر ۲۰ لاکھ انسانوں کو نگل لیا۔

سوویت کمیونسٹ چرچ یگوڈا روس کی خفیہ پولیس کا چیف اور بدنام زمانہ گلاگ کیمپوں کا بانی تھا، ایک اندازے کے مطابق اس نے دس لاکھ انسانوں کو ان کیمپوں میں بیگار اور تشدد کے ذریعہ قتل کیا اور سرخ انقلاب کے بانی ہونے کے کارن موصوف کے مظالم تاریخ کی گرد میں چھپا دیئے گئے۔

لینن روسی کمیونسٹ صدر تھا، مارکسسٹ اور سوشلسٹ، ملحد نظریات کا حامل سرخا تھا، اس کے دور میں زمینیں حکومتی ملکیت میں تھیں اور ان پر مزدوروں سے مزدوری کروائی جاتی اور اس کے عوض انھیں حکومت کی مرضی سے اُجرت دی جاتی، ایسے میں زیادتیوں کا ہونا لازمی امر تھا، جب اس صورت حال کے پیش نظر مزدوروں نے بغاوت کی تو ان کی مزاحمت کچلنے کے لئے

(1) Kakar, Mohammed. the Soviet Invasion and the Afghan Response, 1979-1982. University of California Press. ISBN 9780520208933.

(2) The War Chronicles: From Flintlocks to Machine Guns. Fair Winds. p. 393. ISBN 9781616734046.

طاقت کا بے دریغ استعمال کیا گیا، جس کے نتیجے میں دو کروڑ انسان قتل ہوئے، میڈیا وغیرہ پر مکمل حکومتی کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسے انقلاب کی راہ میں پیش کی جانے والی قربانیوں کے عنوان سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

۱۹۴۴ء میں سوشلسٹ ملحد سٹالن کے حکم پر کریمیا کے ڈھائی لاکھ تاتاریوں کو زبردستی ان کے ملک سے بے دخل کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو صرف تیس منٹ کا وقت دینے کے بعد ٹرینوں میں لاد کر کریمیا سے باہر نکال دیا گیا، اکثریت کو کشتیوں میں ڈال کر سمندر میں لے جا کر بیچ منجدھار میں ڈبو دیا گیا، ملک بدر افراد میں سے بھی گنے چنے چند لوگ ہی زندہ بچ پائے۔

سٹالن روس کی کمیونسٹ پارٹی کا سربراہ تھا، جو پیدائشی طور پہ عیسائی تھا، مگر بعد میں سوشلسٹ اور ملحد نظریات کی طرف مائل ہو گیا، اس کے دور میں پانچ کروڑ لوگ قتل کئے گئے، مگر آفرینش ہے کہ ۱۹۴۵، ۱۹۴۶ء میں اسے دو بار نوبل پرائز کے لئے نامزد کیا گیا، سٹالن کے اس کے ظالمانہ اور آمرانہ دورِ حکومت میں تقریباً بیس ملین لوگ مارے گئے۔

ایڈولف ہٹلر پیدائشی طور پر عیسائی تھا جو بعد میں ملحد ہو گیا اور سوشلسٹ نظریات کی طرف راغب ہو گیا، ہٹلر نے اپنے دورِ حکومت میں ایک سے ڈیڑھ کروڑ انسانوں کا قتل عام کیا جن میں یہودی، جنگی قیدی، معذور اور سیاسی مخالفین شامل تھے، قتل کے لئے تشدد، بیگار، اور زہریلے چیمبرز کا استعمال کیا گیا۔

پول پاٹ ایک کمبوڈین سیاست داں تھا جو ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک جمہوریہ کمپوچیا کا وزیر اعظم رہا، وہ ایک کمیونسٹ رہنما تھا، اس نے اساتذہ، سائنس دانوں، ماہرین تعلیم، عام شہری، مذہبی راہنماؤں، یہاں تک کہ جو شخص ذرا سا بھی پڑھا لکھا تھا، انھیں حراست میں لے کر کیمپوں میں قید کر دیا، جہاں بعد ازاں انھیں بڑے پیمانے پر پھانسیوں پر چڑھا دیا گیا، اندازہ ہے کہ اس کے دور میں بیس لاکھ لوگ بھوک، پھانسیوں اور ناقص صحت کی وجہ سے ہونے والے امراض کے باعث موت کا شکار ہو گئے۔

ماؤزے تنگ چین کا کمیونسٹ سربراہ تھا، اس کے دورِ حکومت میں تقریباً پانچ کروڑ

انسانوں کو مار دیا گیا، اس کے دور میں کسانوں کا تاریخی استحصال کیا گیا، ایک آلو چور کو نہر میں دھکا دینا، والدین کے ہاتھوں بچوں کا زندہ دفن کرنا، ناک کان کاٹنا، سردیوں میں کسانوں سے ننگے بدن کام کروانا عام تھا۔

لینن روس کا کمیونسٹ صدر تھا اور مارکسٹ سوشلسٹ ملحد نظریات کا حامل تھا، اس کے دورِ حکومت میں تقریباً دو کروڑ انسانوں کا قتل عام کیا گیا، اس کے دور میں تمام زمینیں حکومت کی ملکیت میں لی گئیں، جن پہ کسانوں سے مزدوری لی جاتی تھی اور حکومت کی مرضی کی اُجرت دی جاتی تھی، میڈیا پر مکمل حکومتی کنٹرول قائم کیا گیا، کسانوں کی مزاحمت کو کچلنے کے لئے طاقت کا استعمال اور بے دریغ انسانوں کو قتل کیا گیا۔(2,1)

کمال حیرت ہے کہ مذکورہ بالا کرداروں میں ایک بھی شخص مسلمان نہیں تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے دینیات پڑھی اور نہ ہی کبھی مدرسہ گیا، مگر اس کے باوجود پتہ نہیں اتنا وحشی پن کہاں سے ان میں در آیا؟ انقلاب کے نام پر کروڑوں انسانوں کو قتل کرنا تو درست ہو گیا جب کہ جہاد کے نام پر استعماری قوتوں کے خلاف بندوق اُٹھانا دہشت گردی کہلایا، اچھا انصاف ہے!



(1) Sciolino, Elaine (August 3, 1984). "4 Soviet Deserters Tell of Cruel Afghanistan War" the New York Times. Retrieved 6 January 2017.

(2) https://mobile.facebook.com/permalink.php?story_fbid=1607079379597776&id=1519762028329512&substory_index=0&_rdr&refsrc=https%3A%2F%2Fm.

http://www.dunyapak6facebook.com%2Fpermalink.php.

istan.com/90903/#.W0rMCc9RU0M.

اقلیتوں کے ساتھ سلوک، اہل مغرب اور مسلمان ☆

مغربی مؤرخین نے اپنی تاریخ نویسی میں ہمیشہ دوہرے معیار کا مظاہرہ کیا ہے اور کبھی بھی اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھا۔

جس زمانہ میں ہندوستان میں سلطنت دہلی زوال پذیر تھی اور مغلیہ سلطنت کا ستارہ طلوع ہورہا تھا، اس دور میں یورپین امریکہ میں آباد ہورہے تھے، امریکہ میں پہلے سے، بہت سے مہذب ومتمدن قبیلے موجود تھے؛ لیکن ان یورپی قوموں نے اپنے اسلحہ کی برتری کی بنیاد پر وہاں کے اصلی باشندے مثلاً : آزٹکس یوکاٹن (Aztecs Yukaton) اور انکاس (Incas) کی مایا ریاستوں کے خلاف جنگ چھیڑدی، بڑے پیمانہ پر قتل عام ہوا اور بقیہ لوگوں کو غلام بنالیا گیا، ان کے مواضعات کو تاراج کر کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا گیا، میکسیکو جس کی آبادی ۱۵۰۰ء میں ایک کروڑ دس لاکھ تھی، ۱۵۶۵ء میں ۴۴ رلاکھ ۴۰ ہزار رہ گئی اور ۱۷۰۰ء میں مزید گھٹ کر صرف ۲۰ رلاکھ رہ گئی۔ (۱)

وہاں کے قدیم بادشاہ کو گرفتار کر کے اسے اُلٹا لٹکادیا گیا، اس کے سامنے اس کی رعایا کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر جلایا جاتا، پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو کتوں سے نچوایا جاتا، (۲) آسٹریلیا اور تسمانیہ کے قدیم باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے ان یورپی اقوام کی وجہ سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے، میکسیکو کے یہ لوگ جنگلی بھی نہیں تھے؛ بلکہ اعلیٰ درجہ کی تہذیب کے حامل تھے، ان کی زبان اور رسم الخط ترقی یافتہ تھیں، نظام شمسی پر مبنی

☆ مسلمانوں نے اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور مغرب نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا؟ اس کی چند مثالیں ڈاکٹر مختار احمد مکی کے اس مضمون میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

(۱) چارلس اوگلے، مائنور یٹیز ان نیوورلڈ (نیویارک ۱۹۸۵ء)، ص: ۱۶۔

(۲) اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما (کانپور ۱۹۶۲ء)، ص: ۴۳۔

ان کے کیلنڈر تھے، وہ اہرام نما بلند و بالا عمارتیں، عبادت خانے، قلعے اور محلات کے خالق تھے، ان کی تہذیب میں تجارت عروج پر تھی، ان کا حکومتی نظام خاصا منظم تھا، ان کے پتھر اور دھاتوں کے بنے اوزار اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے نمونے ہوتے، ٹونو چٹلان (Tonochatlan) اور ٹکسکو (Texcoco) جیسے بڑے شہران کی تہذیب کے نمونہ تھے، جو میکسیکو کی وادی میں واقع تھے، ان شہروں کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ تھی، ان کے بازاروں میں لوگوں کا ازدہام ہوتا اور یہ بازار کسی بھی طرح اسپین کے بازار سے کچھ کم نہ تھے۔(۱)

لیکن یورپی مؤرخین نے ان پر ڈھائے گئے، ان مظالم کو قابل توجہ نہیں سمجھا، خود یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بنی نوع انسان کا خون بہایا، رعایا اگر حکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو اس کے لئے ہولناک عذاب تھے، مثلاً: ۲۳ر اگست ۱۵۷۵ء کو فرانس کے شہنشاہ نے حکم دیا کہ پیرس کے تمام پروٹسٹنٹ پیروکاروں کو قتل کر دیا جائے، اس ظالمانہ فرمان میں بچے، بوڑھے، مرد اور عورت کی کچھ تمیز نہیں تھی، بادشاہ بذاتِ خود اس کھیل کا نظارہ اپنے محل سے کر رہا تھا، (۲) راجرس (Rodgers) کو بیوی اور دس بچے سمیت مذہبی اختلاف کے باعث زندہ جلا دیا گیا، (۳) اس طرح خود عیسائی مؤرخین کے حوالہ سے ایسے بے شمار شواہد موجود ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیحی مبلغین تشدد اور طاقت کے ذریعہ لوگوں کے مذاہب تبدیل کیا کرتے تھے، ایک مؤرخ انہارڈی (Enhardi) کا کہنا ہے کہ یورپ کے سیکسن قوم کو جبراً عیسائی بنایا گیا، مسیحی مبلغوں میں ایک گروہ اخوان السیف (Brethren of Swords) تھا، جس نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے آگ اور تلوار کا سہارا لیا، جیوٹ فرقہ سے وابستہ مشنری مبلغین تبلیغ میں عام طور پر تشدد کا راستہ اختیار کرتے تھے، جان ویلے (John Ville) اپنی کتاب سینٹ لوئیس کی سوانح میں تحریر کرتا ہے:

(۱) ماروین اور ہاس (۱۹۵۸ء)، ص: ۴۹-۵۰۔

(۲) اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما (کانپور ۱۹۶۲ء)، ص: ۴۳۔

(۳) مرزا یاور جنگ سمیع اللہ خان، ہند عہد اورنگ زیب میں (دہلی ۱۹۶۶ء)، ص: ۳۱۔

سینٹ لوئیس کی وصیت تھی کہ جو شخص دین عیسوی کی مذمت میں کسی کی زبان سے کوئی لفظ سنے اسے چاہئے کہ فوراً اپنی تلوار اس کے پیٹ میں اُتار دے۔

روم کے پوپ انوسٹنٹ کا حکم تھا کہ منکرین عقائد کیتھولک کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، اندلس کی اسلامی یونیورسیٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب نوجوان عیسائی یورپ کے مختلف حصوں میں پہنچتے تو انھیں ہر جگہ ستایا جاتا، انھیں میں سے جب ایک نے قوس قزح کے متعلق کہا کہ یہ خدا کی انتقام لینے والی کمان نہیں ہے؛ بلکہ پانی کے قطرات پر سورج کی روشنی پڑنے سے نمایاں ہوتی ہے، تو اس کو قید کر دیا گیا اور قید خانہ میں ہی جب اس کی موت ہوگئی تو اس کو وہیں دفن کر دیا گیا؛ لیکن بعد میں مذہبی فتوے کے مطابق اس کی لاش قبر سے نکال کر آگ میں جلادی گئی، علم وحکمت کی باتوں کو روکنے کے لئے یورپ میں جاسوسی کا ایک محکمہ قائم تھا، اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء سے لے کر ۱۴۹۱ء تک ایک لاکھ چودہ ہزار نو سو چھ آدمی محض اس وجہ سے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم وحکمت اور فلسفہ کی باتیں کرتے تھے، ان میں سے ایک ہزار تیس کو زندہ آگ میں ڈال کر جلا دیا گیا، جب کہ سولہ ہزار آٹھ سو ساٹھ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور بقیہ کو سخت ترین سزائیں تجویز کی گئیں۔

جس زمانہ میں اورنگ زیب ہندوستان کا حکمراں تھا، برطانیہ کے اندر عجیب وغریب قانون رائج تھا، جس عورت پر کوئی ڈائن (ساحرہ) ہونے کا الزام لگایا جاتا تو اس عورت کو امتحان کی غرض سے کسی اتھاہ ندی، نالہ، تالاب یا سمندر میں ڈال دیا جاتا، اگر وہ ڈوب کر مرجائے تو یہ ثابت ہوتا کہ وہ ڈائن نہیں تھی؛ لیکن اگر وہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ گئی تو اس کا ڈائن ہونا ثابت تھا اور اسے قتل کر دیا جاتا، (۱) اس طرح ہزار ہا بے گناہ عورتیں پانی کی نذر ہوگئیں، کبھی ان بے گناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی جاتی تھیں اور لوہا گرم کر کے داغے جاتے اور ان سے جرم کا اقرار کرایا جاتا، اگر وہ ان ناقابل برداشت اذیتوں کے باعث جرم قبول کر لیتیں تو انھیں قتل کر دیا جاتا۔

(۱) اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما (کانپور ۱۹۶۲ء)، ص: ۴۴۔

یورپ میں ایک بھیانک مذہبی عدالت انکوئے زیشن (Inquisition) کے نام سے پوپ کے ذریعہ قائم کی گئی تھی، جس کا مقصد کیتھولک چرچ کی مخالف کرنے والوں کو سزا دینا تھا، اس کے تحت پروٹسٹنٹ کے علاوہ یہودی اور مسلمانوں کو بھی نشانہ بنایا گیا، چرچ نے بعد میں ایک حکم جاری کر کے کہا کہ لوگوں کا خون نہ بہایا جائے تو اس کا متبادل زندہ لوگوں کو آگ کی نذر کرنے میں تلاش کیا گیا، اس کا نام عقیدہ کا قانون (Act of Faith) رکھا گیا، اس کے تحت عالمی شہرت یافتہ افراد جیوڈار نو برونو (Giodamo Bumo) اور گیلی لیو گیلے لائی (Galileo Galilei) وغیرہ کو بھی نہیں بخشا گیا، ان تمام کتابوں اور رسائل جو عیسائی عقائد سے ذرا بھی مختلف ہوں اور جن کی تعداد چار ہزار تین سو ستائیس تھی، ممنوعہ (Forbidden) قرار دے کر اس کے رکھنے اور اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی، اس کے تحت وینس میں ممنوعہ کتابوں کا ایک دفتر انڈکس (The Index of Librorum Prohibitorum) قائم کیا گیا، اس فہرست میں باسکل وکٹر ہیوگو، جان لاک، کانٹ، ہنری برگساں، جین پال سارتر، جان کالوین، اسپونزا ڈیوڈ ہیوم، جان ملٹن اور ارنسٹ ریناں وغیرہ کی کتابیں بھی شامل تھیں، ان کتابوں کو جلا دیا گیا اور ان کے مالکوں یا کتب فروشوں پر جرمانے عائد کئے گئے۔

انکوزیشن کرنے والے کے ساتھ ۵۰ گھوڑ سوار اور ۲۰۰ پیادہ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا، عام طور پر گمراہ یا منحرف لوگوں کو چار ہفتوں کا گریس پیریڈ (Grace Period) دیا جاتا؛ تاکہ وہ رضا کارانہ طور پر اقرار کر لیں اور پوپ کے مذہب عیسائیت کو قبول کر لیں، جو ایسا کرتا اسے کم سزا دی جاتی، ۱۲۴۴ء-۱۲۴۵ء میں Taulouse میں ۸ سے ۱۰ ہزار لوگوں کو گریس پیریڈ گزرنے کے بعد طلب کیا گیا، ان کے خلاف کوئی بھی گواہی دے سکتا تھا، سزا دینے کے مختلف طریقے مروج تھے، مثلاً: جوڈس چیئر (Judas Chair)، آرا کشی (Sawing) آنتیں نکالنا (Disembowelment) لکڑی پر بھوننا (The Stakes) سر کا شکنجہ (Head Vice) پیئر (Pier) اور پہیہ (Wheel) وغیرہ۔

جوڈس کرسی میں ایک مخروطی شکل کی ایک کرسی ہوتی، گمراہ ملزم کے عضو مخصوصہ کو اس

سیٹ کے سوراخ سے گذار کر بیٹھایا جاتا اور رسی کے ذریعہ اس کو اس وقت تک کھینچا جاتا جب تک وہ جسم سے اکھڑ جائے، سر کے شکنجہ میں ملزم کے سر کو شکنجے میں رکھا جاتا اور اسے اتنا کسا جاتا کہ کھوپڑی ٹوٹ کر بکھر نہ جائے، پیئر ایک خاص قسم کی مشین تھی جسے انسانی جسم کے منھ یا شرم گاہ میں داخل کی جاتی اور اس کے لیور کے ذریعہ اسے آہستہ آہستہ پھیلایا جاتا تاوقتیکہ اس کی نوکیں انسانی جسم سے باہر نہ نکل جائے، پہیہ میں عیسائیت کے منحرفین کو ایک بڑے پہیہ میں کس کر باندھ دیا جاتا، پھر نیچے آگ جلا کر اس کو گھومایا جاتا، آرا کشی میں منحرفین کو چھت سے اُلٹا لٹکا دیا جاتا اور ایک آرا کی مدد سے دونوں جانگھوں کے درمیان سے ان کا پیٹ کاٹا جاتا، آنتیں نکالنے کے تحت انسانی جسم کے پیٹ میں آنتوں کی جگہ ایک سوراخ کر دیا جاتا اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ ملزم کی آنت باہر نکالی جاتی؛ تاکہ سزا کا عمل لمبے عرصہ تک جاری رکھا جاسکے، لکڑی پر بھوننے کا عمل منحرف پر الزام کی سطح کے مطابق ہوتا، نادم منحرف کو گلا گھونٹ کر مارا جاتا، پھر اسے جلایا جاتا؛ جب کہ دوسرے منحرف کو وقفہ وقفہ سے کوئلہ کی آگ پر زندہ بھونا جاتا، یہ سارے وہ طریقے تھے جس سے موت تکلیف دہ ہوتی اور جلدی نہیں ہوتی تھی، ۱۹۶۵ء میں اس ادارہ کا نام بدل کر CDF یعنی (Confederation of Doctrine of the Faith) کردیا گیا اور انکوزیشن سے متعلق کتابوں پر پابندی عائد کردی گئی۔

مختلف مؤرخین کے ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف اسپین میں ملکہ ازبیلا اول اور فرڈینںڈ کے دور حکومت میں انکوئے زیشن کے تحت ۶۸ ملین پروٹسٹنٹ فرقہ کے پیروکاروں کو بربریت واذیت کا نشانہ بنایا گیا، ۱۴۸۰ء سے ۱۵۲۴ء کے درمیان ۳۴۴، ۱۴/ افراد کو عقیدہ کا قانون (Acto de fe) کے تحت جلادیا گیا، جن میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں اور یہودیوں کی تھی، جنھوں نے اپنی جان بچانے کے لئے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا؛ لیکن ان میں یہودیت یا مسلمانیت کی کچھ خوبو باقی تھی، لاکھوں مسلمانوں کو ان کا سب کچھ چھین کر ان کے تین تا پندرہ سال کے بچوں کو عیسائی پادریوں کے حوالہ کرکے اور ان کے جوان اور ضعیف العمر مردوں کو خصی کرکے شمالی افریقہ کے ممالک مثلاً موریتانیہ، مراکش، تیونس اور ٹرکی

کی جانب جلا وطن کر دیا گیا، ان کی عورتیں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا، ان کی مسجدوں کو عیسائی عبادت خانوں میں تبدیل کر دیا گیا (اسی وجہ سے مسجد قرطبہ اپنی حالت میں موجود ہے)۔

یکم جنوری ۱۵۶۷ء کو غرناطہ کے عظیم کتب خانہ سے ۷۰ ہزار عربی کتابوں کو ہزاروں عیسائی خبطیوں کی موجودگی میں ایک چوک پر اسپین کے تیسرے گرینڈ انکوئے زیٹر کارڈینل ایکس زیمینس (Cardinal Xiemesde Cisnevox) 1436-1517ء کے حکم سے نذر آتش کر دیا گیا، نتیجتاً اسپین کی آبادی میں زبردست گراوٹ آئی، ۱۵۸۶ء میں وہاں کی آبادی جو کہ آٹھ ملین افراد پر مشتمل تھی، ۱۶۱۵ء میں صرف پانچ ملین رہ گئی، اس طرح انھوں نے اپنے طور پر مورش (اسپینی مسلمان) کے مسئلہ کا حل تلاش لیا، ایک مورخ ویکن درد (Vacandard) کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی اس جلاوطنی نے اسپین پر منفی اثرات مرتب کیے؛ کیوں کہ ملک دانشور اور کاریگر افراد سے یکا یک خالی ہو کر عقلی طور پر دیوالیہ ہو گیا؛ کیوں کہ وہاں بڑی تعداد میں مسلمان سائنس داں، ریاضی داں، اساتذہ، تجار، معمار، سنگ تراش، شاعر اور ادیب وغیرہ تھے، اسپین اگلے سو سال بعد ہی دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا۔

۱۰۶۶ء میں جب ولیم اول نے برطانیہ پر حملہ کیا تو اس کا حکم تھا کہ انسانوں اور جانوروں میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے اور گھر، قلعہ، کھیتی باڑی سب کو برباد کر دیا جائے، ۱۷ ہویں صدی میں جرمنی میں تیس سالہ جنگ لڑی گئی، جس میں یورپ کی کئی حکومتیں ملوث تھیں، اس طویل مدت کی جنگ میں بوہیما کے ۳۵ ہزار گاؤں میں صرف چھ ہزار گاؤں باقی بچ سکے، ورد یا، بیوریا، فرینکو بنا، سوابیا وغیرہ خون ریزی، قحط اور وباؤ سے بالکل تباہ و برباد ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں صرف ساٹھ لاکھ لوگ زندہ بچے، الیگزینڈر پادیل کا کہنا ہے کہ اپنی فاتحانہ جنگوں میں مسلمانوں نے جس صبر وضبط (Tolerance) کا مظاہرہ کیا اس سے بہت سے عیسائیوں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) الیگزینڈر پادیل، دی اسٹرگل فور پاور این مسلم ایشیاء (نیو یارک: ۱۹۲۳ء)۔

ایک عیسائی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے کہ جب صلیبیوں کی پہلی مہم بلغاریہ سے گذری تو تمام دیہات اور قصبات میں قتل وغارت کا بازار گرم کردیا گیا، جو بھی انسان نظر آتا اسے مار ڈالا جاتا، جو بچہ نظر آتا اس کی تکہ بوٹی کر کے آگ میں پھینک دیا جاتا، مرد وزن، طفل و پیر، یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کی قید نہیں تھی، جس بستی سے بھی وہ گذرتے قتل وغارت کا یہی منظر ہوتا اور وہ بستی قبرستان میں تبدیل ہو جاتی۔

جب یہ صلیبی سورما اپنے دوسرے حملے میں معرۃ النعمان پہنچے تو اہل مصر سے جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کے وعدہ کے باوجود ایک لاکھ کے قریب لوگوں کو قتل کردیا گیا، بیت المقدس کے محاصرہ کے دوران اس کے سپہ سالار نے ان کی جان ومال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا، اس کے باوجود بیت المقدس میں پناہ گزیں تمام لوگوں کو ذبح کردیا گیا، خود عیسائی مؤرخین کے مطابق فوجیوں کے گھٹنوں تک خون جا پہنچا تھا، صرف مسجد اقصیٰ کے اندر ستر ہزار نفوس کو ذبح کیا گیا، حالاں کہ جب حضرت عمرؓ اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دور میں دوبار بیت المقدس فتح ہوا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک قطرہ خون نہیں بہایا گیا، حضرت عمرؓ نے فلسطین پر قبضہ کے بعد بیت المقدس کے باشندوں سے جو تحریری معاہدے کئے تھے، اس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے :

> یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے عمرؓ امیر المومنین نے ایلیا والوں کو عطا کی، یہ امان ان کی جان ومال اور ان کے کلیسا اور صلیبوں کے لئے ہے، اس میں ان کی ساری ملت خواہ وہ بیمار ہوں یا تندرست، سب شامل ہیں، ان کی عبادت گاہوں میں سکونت اختیار نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کو گرایا جائے گا، ان کے کلیسا، ان کے ملحقات، ان کی صلیبوں اور ان کی جائیدادوں میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، دین کے بارے میں ان پر جبر واکراہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کو کسی قسم کا آزار پہنچایا جائے گا،" دستخط عمر بن خطاب"۔(۱)

(۱) وکٹرانی کارسڈن، مترجم محمد یحییٰ خان یہودی پروٹوکولز (کلکتہ: ۲۰۰۲ء)، ص: ۹۲۔

جب کہ صلاح الدین ایوبی کے فتح بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے وقت کسی عیسائی کو کوئی تکلیف نہیں دی گئی اور صرف مالدار لوگوں پر جزیہ لگایا گیا، اپنے حریف صلیبی جنرل رچرڈ کا علاج انھوں نے اپنے خاص طبیب سے کروایا تھا، شائد یہی وجہ تھی کہ جرمنی کا بادشاہ فریڈرک دوم جو پوپ کے حکم سے اس جنگ میں میں شریک تھا، جب مسلم بادشاہ محمد الکامل سے ملا تو اس سے کہا تھا کہ سلطان تم کتنے خوش قسمت ہو کہ تمہارا کوئی پوپ نہیں ہے، رومن ایمپائر کے زوال (Decline of Roman Empire) کا مصنف گبن لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے یوروشلم پر قبضہ کیا تو انھوں نے عبادت کی پوری چھوٹ دی، شہر کے ایک حصہ میں ان کے شہریوں کو اپنے پادری کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی اور پوری بستی کے لئے سونے کے صرف دو سکے بطور ٹیکس لگائے گئے، مسلمانوں کے قبضہ کے بعد یروشلم میں عیسائی زائرین کی آمد و رفت میں بے انتہا اضافہ ہوا؛ لیکن چار سو اسی (۴۸۰) سال بعد جب عیسائیوں نے اسے دوبارہ مسلمانوں سے آزاد کرایا تو یروشلم میں شہریوں اور عوامی دولت کو لوٹنے والے لوگوں کی نجی دولت مان لی گئی، قتل عام ہوا، جن لوگوں نے مخالفت میں آواز اُٹھائی عورت مرد کی تمیز کئے بغیر انھیں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا، تین روز تک قتل عام جاری رہا، ستر ہزار مسلمانوں کے قتل عام کے بعد یہودیوں کو ان کی عبادت گاہوں میں جلا دیا گیا :

> In contrast to the toleration of the muslims the Following account of the occupation of Jerusalam by the crusaders is highly illuminating. in the pillage of private and public wealth the adventures had agreed to respect the excusive property of the first occupant. A bloody sacrifice was offered by mistaken votaries to the god of Christians, resistence might provoke but neither sage nor sex could mollify; their implicable rage; they indulged

> themselves three days in a promiscous massacre. After seventy thousands Muslims had been put to the sword, and harmless Jews had been bumt in their synagogue, they could still reserve a multitude of captives when interest of lassitude pursuaded them to spare. (1)

لنڈن ٹائمس کی ایک خبر کے مطابق انیس سو ساٹھ کی دہائی میں جنوبی وشمالی ویتنام کی جنگوں میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ، ننانوے ہزار، چھ سو ارسٹھ لاکھ، ستائیس ہزار، چوراسی ٹن بم گرائے، وہاں کی نباتات کو تباہ کرنے کے لئے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن کا تباہ کن مادہ پھینکا اور چھتیس لاکھ ایکڑ زمین پر زہریلی دوائیں چھڑکی گئیں، جن کا اثر کم از کم سو سال تک باقی رہے گا، اس لڑائی میں چھتیس لاکھ، باسٹھ ہزار افراد مارے گئے، ایک کروڑ افراد پناہ گزیں اور نو لاکھ بچے یتیم اور پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری مجروح ہوئے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یورپی مؤرخین کو قرونِ وسطیٰ کے تمام حکمرانوں پر بہتان تراشی سے کافی دلچسپی تھی، اس کے لئے ان کے پاس فرصت اور مہلت بھی تھی، تاہم انھیں میں سے کچھ انصاف پسند مؤرخین اس کی شدت سے تردید بھی کرتے رہے، ایک انگریز مفکر رابرٹ پریفالٹ نے اپنی کتاب دی میکنگ آف ہسٹری میں تحریر کرتا ہے:

> مشرقی ممالک میں مذہب اسلام کی پیروکاروں نے کبھی کسی موقع پر بھی ظلم و زیادتی اور تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی اقلیتوں کے حقوق کو غصب کرنے کی کوشش کی۔

الفنسٹن نے مسلم حکمرانوں کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ان کی حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالوں کی حفاظت کی جاتی تھی، برندابن، گووردھن اور متھرا کے مندروں کو شاہی خزانہ سے مدد دی جاتی تھی، متھرا ضلع کے گھوبردھن ہری دیوی کا مندر ۱۵۰۰ء میں تعمیر

(1) Gibbon Decline of Roman Empire.

ہوا، احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کی جانب سے اس مندر کے اخراجات کے لئے روپیہ ملتے تھے، اکبرآباد کے اچھیرا قصبے کے کسانوں اور زمین داروں کے نام احمد شاہ کے فرمان کے الفاظ اس طرح ہیں :

اس فرمان کے ذریعہ ۱۷ بیگھہ زمین بن لگان مندر کے پجاری شیتل داس بیراگی کے نام دھرمادے میں دی جاتی ہے، جس سے وہ دیوتا کے بھوگ اور ٹھاکر جی کے خرچ کا بوجھ برداشت کر سکے، اس زمین کی مال گزاری بیراگی جی کے لئے منظور کی جاتی ہے، جس سے وہ ٹھاکر جی کے لئے ضروری چیزیں خرید سکیں، اچھیرا بازار کے چودھری کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر ایک گاڑی کے اناج پر پاؤ سیر ٹھاکر جی کے لئے رکھ لیا جائے اور بیراگی جی کو وہ ضرور ملے، فرمان بتاریخ رمضان ۱۱۳۹ھ شہنشاہ کی بلند بخت حکومت کا چھٹا سال فرمان ضلع آگرہ اچھیرا کے نرسنگھ مندر کے لئے ۱۱۶۷ھ، مطابق : ۱۷۵۴ء۔ (مہر احمد شاہ بادشاہ)

خلاصۃ التواریخ کے مؤرخ بٹالہ کے سجان رائے نے تھانیشور کے سالانہ ہندو میلے اور نہان سے متعلق یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ :

جب سکندر لودی نے اس میلے کو بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو دربار کے ایک مشہور مؤرخ اور عالم میاں عبد اللہ اجودھنی نے اس کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مندروں کا گرانا اور ندی تالاب کے کنارے پرانے زمانے سے ہونے والے نہان کو بند کرنا قطعی طور پر غیر قانونی اور شریعت کے خلاف ہے، سکندر لودی غصہ سے لال پیلا ہو کر ایک ننگی تلوار لے کر اس پر جھپٹا کہ تو بت پرستوں کی طرف داری کرتا ہے، اس عالم نے بے خوف ہو کر جواب

دیا کہ میں بادشاہ سلامت کو شریعت کا حکم بتا رہا تھا، اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ خواہ آپ اسے مانیں یا نہ مانیں، بادشاہ پر اس بات کا گہرا اثر پڑا، اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور پھر کبھی اس نے اس ہندو میلے کو بند نہ کرنے کا ارادہ کیا۔(۱)

ایم ان رائے کا کہنا ہے کہ :

یہ ایک دم غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت صرف تلوار کے ذریعہ ہوئی ہے، تلوار کے ذریعہ کسی ملک کے عام اُصولوں کو شاید کسی حد تک دبایا یا بدلا جا سکتا ہے؛ لیکن اس سے انسانی شعور کو نہیں بدلا جا سکتا، قدیم مذہبوں کی عظیم عمارتوں کو اسلام کی تلوار نے برباد نہیں کیا؛ بلکہ ان کے ماننے والوں کے ذریعہ انھیں چھوڑ دیئے جانے کے باعث ہوا، کتنا ہی ظلم وستم کیوں نہ ہی ہوا ہو پورے ملک کو اپنے روایتی مذہب کو چھوڑنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔(۲)

It is altogether a misconception that the Arabian Progress was due to the sword alone. The sword may change an acknowiedged natioal creed, but it can not affect the consciences of men ... the principle of equality proclaimed by Islam proved to be a factor in its spectacular triumph ... It contrasted sharply with the oppressive laws goveming the class and caste ridden societies of Roman, Byzantine, persian and later, of Indian Empores. (M.N.Roy Historical Role of Islam)

(۱) سبحان رائے، خلاصۃ التواریخ۔

(۲) ایم این رائے، ہسٹوریکل رول آف اسلام (بیکانیر باگ دیوی پرکاش ۱۹۹۶ء)، ص:۹۴۔

مشہور مؤرخ ولیم میور کا کہنا ہے :

مسلمان فاتحین نے مفتوح قوموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری اور برداشت کا رویہ اختیار کیا، اس کے برعکس روم کے حکمرانوں نے وحشت اور بربریت کے پہاڑ مفتوح قوموں پر ڈھائے۔

بقول بشمبر ناتھ پانڈے :

یہ بات قابل غور ہے کہ عرب فاتح کا جو رویہ اپنی ماتحت قوموں کے ساتھ تھا وہ ہندوستان میں آکر بالکل بدل گیا، ہندوؤں کے مندروں کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، بُت پرستی پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی، سندھ میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ہی بتوں کی پوجا کی بھی عام اجازت تھی۔(۱)

جدو ناتھ سرکار اپنی تصنیف اورنگ زیب میں ایک جگہ ضمناً تحریر کرتے ہیں :

شروع کے عرب فاتحوں خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہیں چھیڑتے، جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوتے جو فاتح مسلمانوں کو حاصل تھے، ورنہ پھر ان کو جزیہ دینا پڑتا، جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی پوری آزادی ہوتی۔(۲)

کے ایم پانیکر کا کہنا ہے کہ :

فتح و تسخیر کے وقت تو ہندوؤں کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے ضرور

(۱) بشمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، آزاد ہند کلکتہ ۲۲ راکتوبر ۱۹۸۳ء۔
(۲) جدو ناتھ سرکار، تاریخ اورنگ زیب: ۳/ ۲۵۳۔

دو چار ہونا پڑا؛ کیوں کہ وہ یکا یک بڑے علاقے اور اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیئے گئے تھے، ان کے مذہب کو بھی تحقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا اور ان کی عبادت گاہیں برباد کی گئیں؛ لیکن جونہی فتح اور کامرانی کا جوش ختم ہوتا اور ملک کی اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے پر جوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ کاشتکار نہیں لائے تھے، دہلی پر فوج کے ذریعہ ہی قبضہ ہوا تھا اور فوج ہی نے گنگا کی وادی کے راجاؤں کو شکست دی تھی، مسلمان سلاطین کے لئے لشکریوں کے ذریعہ زمین کاشت کرانا ممکن بھی نہ تھا، زمین امراء میں جاگیر کے طور پر ضرور تقسیم کر دی گئی تھی؛ لیکن کاشتکار ہندو ہی رہے، اس کی کبھی فکر نہ ہوئی کہ ہندو زمین داروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنالیا جائے، اور نہ ہی اشاعت اسلام کی کوشش ہی کی گئی؛ کیوں کہ دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس تک قائم رہی؛ لیکن یہاں اب بھی ہندوؤں کی غیر معمولی اکثریت ہے، نظام آراضی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، اس لئے گاؤں میں ہندوؤں کی زندگی ویسی ہی رہی جیسے کہ پہلے تھی۔(۱)

جی ڈی ایچ کول کا کہنا ہے کہ:

مسلم حکومت نہ تو ظالمانہ تھی اور نہ ہی غیر روشن خیال، مسلمان علم دوست تھے، یہ مسلمان نہیں؛ بلکہ عیسائی راہب تھے، جنھوں نے اسکندریہ (Alexanderia) کا یونانی کتب خانہ جلا دیا تھا۔(۲)

---

(۱) کے ایم پانیکر، اے سروے آوف انڈیا، ص:۱۳۱۔

(۲) جی ڈی ایچ کول اور ایم آئی کول، انٹیلیکینٹ ریویو آوف یورپ ٹوڈے (لندن ۱۹۳۳ء)۔

اسلام پر بے جا اعتراضات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق

کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلوار سے اسلام پھیلایا؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو بے سروپا الزامات لگائے گئے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلوار کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کی ہے اور طاقت کا استعمال کر کے لوگوں کو مسلمان بنایا ہے، یہ اعتراض بالکل بے جا اور بے معنی ہے، اس سلسلے میں تین نکات پر غور کرنا چاہئے :

(۱) کیا خود اسلام نے جبر وتلوار کے ذریعہ تبدیلیٔ مذہب کی اجازت دی ہے؟

(۲) جو غیر مسلم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر اقتدار آگئے یا جنھوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور شکست سے دو چار ہو کر مسلمانوں کے رحم وکرم پر منحصر ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

(۳) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اشاعتِ اسلام کا کام کس طریقہ پر انجام پایا؟

جبر کے ذریعہ تبدیلیٔ مذہب، اسلام کی نظر میں

اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمادیا ہے کہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے؛ لہٰذا دین کے معاملہ میں کوئی جبر ودباؤ نہیں ہے: ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ'' (البقرۃ:۲۵۶) اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا: آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، آپ داروغہ نہیں ہیں کہ ان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کریں: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ'' (الغاشیۃ:۲۱-۲۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ اللہ چاہتا تو تمام انسان ہی مومن ہو جاتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟ ''اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ'' (یونس:۹۹) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت

فرمائی گئی کہ اگر غیر مسلم آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، آپ پر تو محض یہ ہے کہ پیغامِ ہدایت کو صاف صاف اور کھلے طور پر پہنچادیں اور بس: ''فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ '' (النحل:۸۲) آپ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر پر بضد ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین: ''لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ'' (الکافرون:۶) ایک اور موقع پر آپ کی زبان مبارک سے کہلادیا گیا کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال: ''لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ''۔ (الشوریٰ:۱۵)

پھر یہ کہ ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے نہ کہ زبان کے اقرار کا اسی لئے قرآن مجید نے ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اُولٰۤئِكَ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ '' (مجادلہ:۲۲) ''مِنَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ '' (المائدۃ:۴۱) اور دل کے انکار واقرار پر دوسرے کا قابو نہیں ہے، طاقت کے ذریعہ دل کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام خود دین کے معاملے میں جبر واکراہ کا قائل نہیں ہے اور اگر جبراً کسی سے کلمۂ ایمان کا اقرار کرالیا جائے تب بھی کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، تو ظاہر ہے کہ جب خود اسلام نے دین کے معاملے میں جبر واکراہ سے منع کیا ہے اور جبر واکراہ کے ذریعہ عقیدۂ توحید کا اقرار کرالیا جائے تو انسان مومن نہیں ہوتا تو کیسے آپ ﷺ طاقت اور تلوار کا استعمال کرکے کسی کو مسلمان بناتے یا مسلمان بنانا پسند فرماتے۔

قابو یافتہ لوگوں پر دین کے معاملہ میں جبر؟

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں متعدد ایسے مواقع پیش آئے جب آپ ﷺ کسی گروہ یا فرد کو مسلمان ہونے پر مجبور کرسکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، چند مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) ہجرت کے دوسرے ہی سال غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا، جس میں مکہ کے بڑے بڑے بہادر اور سردار شریک جنگ تھے، یہ جنگ جو آپ پر اہل مکہ کی طرف سے مسلط کی گئی، اس میں مسلمانوں کی تعداد اپنے دشمنوں کے مقابلہ ایک تہائی سے بھی کم تھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی، ستر اعداء اسلام جنگ میں مارے گئے اور ستر قید کئے گئے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ان ستر اشخاص کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے تھے، ان قیدیوں کے ساتھ آپ نے نہ صرف یہ کہ کسی طرح کے جبر و اکراہ کا سلوک نہیں فرمایا؛ بلکہ ان کے ساتھ نہایت حسن سلوک کا معاملہ فرمایا، علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان قیدیوں کے ساتھ آپ کے حسن سلوک کا خوب نقشہ کھینچا ہے (☆):

> اسیرانِ جنگ دو دو چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے، جو حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اُٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا؛ لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ ہی کو واپس کر دیتے، اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔(۱)
>
> قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت ﷺ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا،

☆ علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اقتباس میں بعض الفاظ کی تسہیل کی گئی ہے۔ (رحمانی)

(۱) روض الانف: ۲/۷۵، مطبع جمالیہ مصر: ۱۹۱۴ء۔

حضرت عمرؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا تو گو نبی ہوں؛ لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔(۱)

حضرت عباسؓ (کے بدن پر کرتا نہ تھا؛ لیکن ان) کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ اُن کے بدن پر ٹھیک نہیں اُترتا تھا، عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ اس کا قد حضرت عباس کے قد کے تھا، اپنا کرتا منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتا عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا بدلہ تھا۔(۲)

(۲) مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ نے ایک میثاق تیار کرایا، اس معاہدہ کی بنیادی مقاصد تین تھے: مدینہ کے تمام باشندوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ، دوسرے: سبھوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی، تیسرے: مدینہ پر کوئی حملہ ہو تو مسلمان اور یہودی مل کر اس کا مقابلہ کریں گا، غرض کہ اس معاہدہ کا ایک اہم رکن تمام لوگوں کے لئے مذہبی آزادی تھا۔

(۳) مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کے تین بڑے قبائل تھے، یہ عظیم الشان قلعوں میں مقیم تھے اور ان کی معاشی حالت بہت اچھی تھی، ان میں ایک مشہور قبیلہ بنو قینقاع کا تھا، انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ شکنی کی :

إن بني قينقاع كانوا اول يهود نقضوا ما بينهم وبين رسول الله صلى الله عليه وسلم وحاربوا فيما بين بدر واحد۔ (۳)

---

(۱) ابن ہشام: ۲/۴۷، بر حاشیہ روض الانف۔

(۲) ابن ہشام: ۲/۴۷، بر حاشیہ روض الانف۔

(۳) ابن ہشام: ۲/۵۶، از: سیرۃ النبی ﷺ۔

آپ ﷺ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی؛ لیکن وہ کسی طرح نہیں مانے، یہاں تک کہ دونوں طرف سے جنگ کا اعلان ہوگیا، مسلمانوں نے ان کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، یہ محاصرہ پندرہ دنوں تک جاری رہا، بالآخر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں گے ہم اس کو قبول کریں گے، عبداللہ بن اُبی جوان کا حلیف تھا، اس نے حضور ﷺ کے سامنے تجویز پیش کی کہ اِن کو جلاوطن کردیا جائے؛ چنانچہ یہ جلاوطن کردیئے گئے، یہ سات سو افراد تھے، یہ شام کے علاقے میں ''اذرعات'' نامی جگہ منتقل ہوگئے —— اگر آپ چاہتے تو ان سبھوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرسکتے تھے اور دباؤ ڈال سکتے تھے؛ لیکن آپ نے ان سے اسلام لانے کا کوئی مطالبہ نہیں فرمایا۔

(۴) یہودیوں کا دوسرا قبیلہ بنونضیر بھی مدینہ کے قریب آباد تھا اور ان کا قلعہ بھی بہت شاندار تھا، انھوں نے جب مسلمانوں سے بدعہدی کی اور معاہدہ توڑ دیا تو آپ ﷺ نے ان کو دس دنوں کا موقع دیا کہ وہ کہیں اور منتقل ہوجائیں؛ چوں کہ ان کی سازشوں کا پردہ فاش ہوگیا تھا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش رچی تھی، ان کی تعداد تقریباً اٹھارہ سو سے دو ہزار تک تھی، چھ سو اونٹوں پر سوار ہوکر یہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ یہاں سے نکل گئے، کچھ خیبر میں بس گئے اور زیادہ تر شام کی طرف چلے گئے، (سیرت احمد مجتبیٰ: ۲/ ۳۵۵) —— اگر آپ چاہتے تو ان کو شہر سے نکالنے کے بجائے ایمان لانے پر مجبور کرتے، اس سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انصار کی بعض اولاد نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا، اس لئے یہودی ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، جب کہ انصار مدینہ نے اس کو روک لیا تھا تو اس موقع پر قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی: ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' (البقرۃ: ۲۵۶)؛ چنانچہ آپ نے انصار کو ان کی اولاد کو روکنے سے منع فرمادیا۔ (ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الاسیر یکرہ فی الاسلام)

(۵) اس طرح کے واقعات کئی بار پیش آئے کہ کسی قبیلہ نے مسلمانوں سے جنگ کی ان کو شکست ہوئی مسلمان اسی موقف میں تھے کہ انھیں ایمان لانے پر مجبور کرتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔

اس کی سب سے بڑی مثال فتح مکہ کا موقع ہے، اہل مکہ نے آپ ﷺ کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا تھا اور اپنی طرف سے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ مسلمان کفر کی طرف واپس ہو جائیں، اس پس منظر میں اگر آپ اہل مکہ کو مسلمان ہونے پر مجبور کرتے تو یہ کوئی ناحق بات نہیں ہوتی؛ لیکن جب مکہ فتح ہوا اور وہ تمام لوگ آپ کے سامنے تھے جنھوں نے آپ کو اور ایمان لانے والے کو ناقابل برداشت اذیتیں پہنچائی تھیں اور مدینہ جانے کے بعد بھی مسلمانوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہے؛ لیکن آپ نے اس موقع پر ان سبھوں کو معاف کر دیا اور فرمایا کہ جو سلوک حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا، وہی سلوک آج میں تمہارے ساتھ کرتا ہوں :

أنتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو أرحم الراحمین۔

اگر آپ ﷺ چاہتے تو اس موقع پر تمام مشرکین کو مسلمان ہونے پر مجبور کر سکتے تھے؛ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا بہت سے لوگ کفر کی حالت پر باقی رہے، یہاں تک اس سال اسی حالت میں حج بیت اللہ میں بھی شرکت کی؛ البتہ اسلام کی سربلندی، رسول اللہ ﷺ کے عفو و کرم اور معبودانِ باطل کی ناطاقتی کو دیکھ کر از خود جوق در جوق ایمان لے آئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اگر آپ کسی گروہ کو جبر و اکراہ کے ذریعہ مسلمان بنانا چاہتے تو اس سے بڑھ کر کوئی اور موقع نہیں تھا؛ کیوں کہ مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بسایا تھا اور کعبۃ اللہ کو اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ تعمیر کیا تھا، اور وہ توحید کے علمبردار تھے اور اہل مکہ انھیں کی اولاد تھے، جو اُن کے راستہ سے بھٹک گئے تھے۔

(٦) مکہ سے قریب ہی بنو ہوازن کا قبیلہ آباد تھا، جب مکہ فتح ہو گیا تو بنو ہوازن نے معرکہ سنبھالا اور جنگ پر کمر بستہ ہو گئے؛ کیوں کہ انھیں اپنے تیر اندازوں پر بڑا ناز تھا، یہ معرکہ حنین سے شروع ہوا اور طائف پر ختم ہوا، اس جنگ میں چھ ہزار لوگ قید کئے گئے تھے، جن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے، اگر آپ چاہتے تو ان سب کو اسلام قبول

کرنے پر مجبور کرسکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ان کو آزاد فرمادیا، اس سلسلے میں جو واقعہ پیش آیا وہ بھی قابل ذکر ہے (☆):

> حنین کے جنگی قیدی اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیرانِ جنگ رہا کردیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ ﷺ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہؓ اسی قبیلہ کی تھیں، رئیس قبیلہ (زہیر بن صُرد) نے کھڑے ہوکر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہوکر کہا: ''جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، ان ہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دُودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ اُمیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے، وہ تمہارا ہے؛ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو'' نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے؛ لیکن میں تمام سے اِن کے لئے سفارش کرتا ہوں'' مہاجرین اور انصار بول اُٹھے، ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار قیدی ایک ساتھ آزاد کردیئے گئے۔(۱)

اس موقع پر یہ بات بالکل ممکن تھی کہ آپ ﷺ ان کی رہائی کو مسلمان ہونے سے مشروط کردیتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔

☆ بعض الفاظ کو دوسرے آسان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔(رحمانی)

(۱) سیرۃ النبی ﷺ: ۲/۳۸۸-۳۸۹۔

(۷) اسی طرح انفرادی طور پر بھی کئی ایسے مواقع آئے جن میں کوئی اہم دشمن مسلمانوں کی گرفت میں آگیا، آپ اگر چاہتے تو اسے ایمان پر مجبور کرسکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، اس کی مثال ثمامہ بن اثال حنفی ہے، یمن کے لوگ مسلمانوں کی دعوتی کوششوں سے عامتاً مسلمان ہوچکے تھے؛ لیکن قبیلہ بنوحنیفہ اسی قبیلہ کے سردار تھے وہ ایک معرکہ میں مسلمانوں کے قید میں آگئے مسلمان اس کو لے کر مدینہ آئے اور اس زمانے میں قید کرنے کے طریقے کے مطابق مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا، آپ مسجد میں تشریف لائے تو دریافت فرمایا: ثمامہ تم کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: اے محمد! اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جو قتل کا مستحق ہے، اور اگر رحم کریں گے تو ایک ایسے شخص پر کریں گے جو آپ کا شکر گزار رہے گا، اور اگر آپ مال چاہتے ہوں تو جو چاہیں گے میں دوں گا، رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، کل ہوکر پھر آپ ﷺ تشریف لائے اور پھر یہی سوال کیا، انھوں نے وہی بات دُہرائی جو کل کہی تھی، آج بھی آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، تیسرے دن پھر آپ نے یہی سوال کیا اور حضرت ثمامہ نے وہی جواب دیا جو پچھلے دو دنوں سے دے رہے تھے، اگر آپ چاہتے تو ان کو ایمان لانے پر مجبور کرسکتے تھے اور ظاہری طور پر صحیح وہ جان بچانے کے لئے شاید اس کو قبول بھی کرلیتے؛ لیکن آپ ﷺ نے بغیر کسی شرط کے حکم جاری فرمایا کہ ثمامہ کو رہا کردیا جائے، انھوں نے تین دنوں سے پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے جو اخلاق دیکھے تھے، اس نے ان کے دل کی دنیا کو فتح کرلیا، وہ وہاں سے نکلے قریب کے ایک درخت کی آڑ میں جاکر غسل کیا، مسجد واپس آئے اور بارگاہِ نبوی میں عرض کیا:

> یارسول اللہ ﷺ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ ﷺ سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں تھا اور اب آپ ﷺ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ ﷺ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں بُرا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ ﷺ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

قریش کی ستم گری محتاج بیان نہیں، شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ ﷺ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے دردان کی آوازیں سن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے؛ لیکن رحمت عالم ﷺ نے قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ ابن اثال تھے، مسلمان ہوکر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیلی مذہب پران کو طعنہ دیا، انھوں نے غصہ سے کہا: ''خدا کی قسم! اب رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا'' اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے آپ ﷺ کی طرف رُجوع کیا، حضور ﷺ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اُٹھالو؛ چنانچہ پھر حسبِ دستور غلہ جانے لگا۔ (سیرۃ النبی: ۲/۲۹۰)

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن مواقع پر غیر مسلم افراد یا غیر مسلم گروہوں کو ایمان لانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا، ان مواقع پر بھی آپ نے کبھی دین کے معاملے میں جبر اور دباؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا، جو لوگ ایمان کے دامن میں آئے، اپنی مرضی اور خوشی سے آئے؛ کیوں کہ دین کے لئے جبر و دباؤ اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کا منشا انسان کا امتحان ہے اور امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی عمل پر آدمی کو مجبور نہیں کیا جائے؛ بلکہ اسے اختیار دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوتی کوششیں

پیغمبر اسلام ﷺ ۶۱۰ء میں نبوت سے نوازے گئے، اس کے بعد آپ نے اہل مکہ میں توحید کی دعوت دینے کا کام شروع کیا، یہ دعوت کئی مرحلوں میں دی اور پروان چڑھی:

(۱) سب سے پہلے آپ کے چند قریبی لوگ ایمان لائے، آپ کی شریک حیات حضرت خدیجہؓ، آپ کے عزیز حضرت علیؓ بن ابی طالب، آپ کے غلام حضرت زید بن حارثہؓ جو حضرت خدیجہؓ کی طرف سے آپ کو ملے تھے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ جو آپ کے گہرے، مخلص اور وفادار دوست تھے۔

(۲) نبوت کے تیسرے سال آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں، آپ ﷺ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو مدعو کیا اور ضیافت کے بعد ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، مگر اس موقع پر سوائے حضرت علیؓ کے کسی نے آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا۔

(۳) پھر ارشاد ربانی ہوا کہ آپ عمومی دعوت شروع کریں: ''فاصدع بما تؤمر'' آپ ﷺ نے اس موقع پر صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو آواز دی، مکہ کی قدیم روایت کے مطابق کسی اہم واقعہ پر لوگوں کو جمع کرنے کا یہی طریقہ تھا، تمام اہل مکہ جمع ہو گئے، آپ نے پہلے ان سے دریافت فرمایا کہ میں نے آپ لوگوں کے درمیان اپنی عمر کے چالیس سال گزارے ہیں، آپ لوگوں نے مجھے اپنے تجربہ میں سچا پایا یا جھوٹا؟ لوگوں نے کہا: ہم نے ہمیشہ آپ کو سچا پایا ہے، آپ نے پھر دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے دیانت دار پایا ہے یا خیانت کرنے والا؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم نے آپ کو امانت دار پایا ہے، اور کیوں نہ کہتے کہ راست گوئی اور دیانت داری کی وجہ سے مکہ میں آپ کا لقب ہی 'صادق' اور 'امین' ہو گیا تھا، آپ نے بات کو مزید پختہ کرنے کے لئے فرمایا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمنوں کی ایک فوج تم پر حملہ کرنے کے لئے کھڑی ہے تو کیا تم اس پر یقین کر لو گے؟ لوگوں نے عرض کیا: ظاہری حالات تو ایسے نہیں ہیں؛ لیکن چوں کہ ہم نے آپ کو سچا پایا ہے؛ اس لئے ہم آپ کی بات کا یقین کریں گے، پھر اس کے بعد آپ نے اسلام کی دعوت پیش کی، آپ کا کردار اتنا بلند و پاکیزہ تھا کہ کسی کو آپ پر انگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکی؛ لیکن کفر و شرک کا یقین جو آباء واجداد کی طرف سے گھٹی میں پڑا ہوا تھا، اس نے لوگوں کو ایمان کا شرف حاصل کرنے سے محروم رکھا اور دشمن رسول ابولہب نے تو آپ کو اس بات پر بُرا بھلا بھی کہا۔

(۴) جب یہ اجتماعی دعوت مفید نہ ہو سکی تو اب آپ نے انفرادی طور پر دعوت دینی شروع کی، اس دعوت کے نتیجہ میں جو لوگ ایمان لائے ان کو ''سابقون اولون'' کہا جاتا ہے، ان کے نام یہ ہیں :

حضرت بلال حَبشی، حضرت خبّاب بن اَرَتؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زُبیر بن عَوّامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عَوفؓ، حضرت سَعد بن ابی وَقّاصؓ، حضرت طَلحہ بن عبداللہؓ، حضرت ابوسَلَمہ عبداللہ بن عبدالاسدؓ، حضرت اَبوعُبَیدہ عامر بن عبداللہ بن الجَرّاحؓ، حضرت اَرقمؓ، حضرت عثمان بن مَظعُونؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت فاطمہ بنت الخطابؓ، حضرت اُم الفَضل لُبابۃ الکبریٰؓ (زوجہ حضرت عباسؓ)، حضرت اَسماء بنت ابوبکر صدیقؓ، حضرت یاسر بن عامرؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سُمَیّہ بنت مسلمؓ، حضرت عُبَیدہ بن حارثؓ، حضرت خالد بن سعید بن عاصؓ، حضرت نُعیم بن عبداللہؓ، حضرت جَعفر بن ابی طالبؓ، حضرت عبداللہ بن جَحشؓ، حضرت سائب بن مَظعُونؓ، حضرت عبداللہ بن مظعونؓ، حضرت قُدامہ بن مَظعُونؓ، حضرت سعد بن عثمانؓ، حضرت مسعود بن رَبیعہؓ، حضرت خُنَیس بن حُذافہ سہمیؓ، حضرت عَیّاش بن ربیعہؓ اور مکہ کے باہر کے لوگوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ۔

(۵) مکہ میں مشرکین نے آپ ﷺ کی دعوت کی شدت سے مخالف کی اور آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور کردیں، تو عرب کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے اندر تجسس پیدا ہوگیا کہ صحیح صورتِ حال کی تحقیق کی جائے؛ چنانچہ کئی قبیلوں کے سردار اور باشعور شخصیات آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انھوں نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا؛ بلکہ اپنے قبیلہ کو بھی اسلام کی دعوت دی اور قبیلہ کے ڈھیر سارے لوگ دامن اسلام میں آئے، ایسے اسلام قبول کرنے والوں میں چند اہم نام یہ ہیں:

۱- طفیل بن عمرو دوسیؓ: یہ بڑے شاعر تھے، انھوں نے اپنے قبیلہ دوس میں اسلام کی دعوت دی، آہستہ آہستہ پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔(۱)

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصہ دوس والطفیل: ۶۳۰/۲۔

۲- ضماد بن ثعلبہؓ: یہ قبیلہ ازدشنوۃ کے سردار تھے، وہ مکہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اوران کی دعوت پر پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔

۳- حضرت ابوذ غفاریؓ: یہ قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے تھے، ان کا قبیلہ شام کے راستہ میں آباد تھا، یہ تحقیق حال کے لئے مکہ مکرمہ آئے، آپ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا ، واپس جاکر اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی، آدھا قبیلہ تو اسی وقت مسلمان ہوگیا اور آدھا قبیلہ اس وقت مسلمان ہوا جب آپ مدینہ تشریف لا چکے تھے۔

۴- قبیلۂ اسلم: یہ قبیلہ غفار سے قریب ہی آباد تھا، جب بنوغفار نے اسلام قبول کیا تو اس قبیلہ کے لوگ بھی دامن ایمان میں آگئے۔

پھر آہستہ آہستہ انفرادی طور پر مختلف لوگ اسلام قبول کرتے رہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نبوت کے پانچویں سال پندرہ مسلمانوں نے آپ کی اجازت سے حبش کی طرف ہجرت کی، جو مکہ کے مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے، پھر اگلے سال یعنی نبوت کے چھٹے سال دوبارہ مسلمانوں کا وفد حبشہ کی طرف گیا جو ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتوں پر مشتمل تھا اور ظاہر ہے کہ زیادہ تر حضرات حبش کی ہجرت میں شامل نہیں تھے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انفرادی محنت کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

(۶) حج میں پورے عرب کے لوگ مکہ ومنیٰ میں جمع ہوجاتے تھے، آپ اس موقع کو اسلام کی دعوت کے لئے استعمال فرماتے تھے؛ سن ۱۰ رنبوی میں آپ کی ملاقات مدینہ کے لوگوں سے ہوئی، آپ نے اسلام کی دعوت پیش کی اور چار مردوں اور دوعورتوں نے اسلام قبول کیا، آئندہ سال حج کے موقع سے دوبارہ اہل مدینہ سے ملاقات ہوئی، یہ بارہ آدمی تھے، جن میں سے ۵ گذشتہ سال کے اہل ایمان تھے، اور سن ۱۳ رنبوی میں ۷۲ مرد اور دوعورتوں نے اسلام قبول کیا، آپ ﷺ نے ان مسلمانوں کے لئے ۱۲ رنقباء (سردار) بھی منتخب فرمائے، جن میں ۹ کا تعلق بنی خزرج سے تھا اور ۳ کا بنی اَوس سے، خود رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کی

تعلیم وتربیت کے لئے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھی بھیج دیا، قبیلہ اوس کی پانچ شاخیں تھیں :

۱- عمرو بن مالک بن اوس۔
۲- عوف بن مالک بن اوس۔
۳- مرہ بن مالک بن اوس۔
۴- امراء القیس بن مالک بن اوس۔
۵- جشم بن مالک بن اوس۔

اور قبیلہ خزرج کی بھی پانچ شاخیں تھیں :

۱- عمرو بن خزرج۔
۲- عوف بن خزرج۔
۳- جشم بن خزرج۔
۴- کعب بن خزرج۔
۵- حارث بن خزرج۔

ان دونوں قبائل سے آپ نے ۱۲ ر سردار مقرر کردیئے؛ چنانچہ ان حضرات نے اس تیزی کے ساتھ مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی کہ تین خاندان کے سوا پورے مدینہ نے اسلام قبول کرلیا۔(۱)

(۷) مکہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں خود مکہ میں کتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۰۰ کے قریب مسلمانوں نے تو حبشہ کو ہجرت کی اور تقریباً پانچ سو مردوں اور عورتوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی ،(۲) ان کے علاوہ ایک تعداد وہ تھی جو مسلمان ہوچکی تھی؛ لیکن انھوں نے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا تھا، اور کچھ لوگ وہ تھے جن کا مسلمان ہونا

(۱) پیغمبر اسلام: ۱۷۰، از: ڈاکٹر حمید اللہ، نیز دیکھئے: سیرۃ النبی: ۲/ ۱۳۔
(۲) کتاب السیرۃ النبویۃ والدعوۃ فی العہد المکی: أحمد غلوش، المبحث الحادی عشر: المسلمون فی نہایۃ المرحلۃ المکیۃ: ۵۲۰۔

اہل مکہ کو معلوم تھا اور وہ ہجرت کرنا چاہتے تھے؛ لیکن اہل مکہ نے ان کو زبردستی روک رکھا تھا اور ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی، رسول اللہ ﷺ خاص اہتمام سے ان کے لئے دُعا فرمایا کرتے تھے۔

(۸) ان کے علاوہ مکہ سے باہر کے وہ قبائل تھے، جو اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی دعوت پر مسلمان ہوئے، جیسے: قبیلہ دوس، قبیلہ ازد، بنوغفار، بنواسلم اور انصار مدینہ، ہجرت کے بعد دعوت اسلام کے کام کو بڑھانے کے لئے سب سے پہلے آپ نے امن وامان کی طرف توجہ دی اور اس کے لئے مہاجرین، قبائل انصار اور قبائل یہود کے درمیان ایک باہمی امن معاہدہ کرایا اور تمام قبائل کے نمائندوں کے اس پر دستخط کئے؛ کیوں کہ جب تک دشمنوں کی طرف سے اطمینان نہ ہوجائے اور سماج میں امن واعتدال کی حالت قائم نہ ہو تو دعوتی اور تربیتی کاموں کا انجام دینا دشوار ہوتا ہے؛ چنانچہ اس سے اسلام کی دعوت واشاعت میں مزید سہولت فراہم ہوئی، متعدد قبائل کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا؛ چنانچہ :

● قبیلہ مُزینہ اپنے چار سو افراد کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور ایمان لے آیا۔

● قبیلہ اشجعہ کی طرف سے نمائندے آئے، ابتداءً انھوں نے صلح کا معاہدہ کیا، پھر از خود مسلمان ہوگئے۔

● قبیلہ جُہینہ ایک ہزار افراد کے ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔

● غزوۂ بدر میں جو لوگ قید کئے گئے، ان میں سے بھی بعض لوگ اسلام سے متاثر ہوکر دامن اسلام میں آگئے۔

● حضرت جبیر بن مطعمؓ اسیرانِ بدر کے فدیہ ادا کرنے کے سلسلہ میں آئے تو ایک دن رسول اللہ ﷺ سورہ طور کی آیت نمبر: ۳۵-۳۶ تلاوت فرمارہے تھے، وہ ان آیات سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئے، ان کا بیان ہے کہ لگتا تھا کہ میرا دل پرواز کر جائے گا۔

(۹) نبوت کے پانچویں سال تمام دشمن طاقتوں نے مل کر مدینہ پر حملہ کیا؛ لیکن اللہ تعالیٰ

کی مدد اور مسلمانوں کی بلند ہمتی اور حسن تدبیر کے ذریعہ انھیں ناکامی ہوئی، دشمنانِ اسلام کے اس حملہ کے بعد اہل مکہ نے محسوس کیا کہ وہ طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کو کچل نہیں سکتے، دوسری طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی سے بچنا اور افہام وتفہیم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے؛ اس لئے نبوت کے چھٹے سال مکہ کے باہر حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے خود ان کی شرائط پر صلح کی، جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، اس موقع سے ڈیڑھ ہزار مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اور ظاہر ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد مدینہ منورہ میں رہی ہوں گی اور مدینہ کے باہر جن قبائل نے اسلام قبول کیا تھا، وہ سب کے سب اس میں شامل نہیں تھے، ان سب کا مسلمان ہونا صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کوششوں کا فیض تھا، اس صلح کے نتیجہ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان آپسی ملاقات اور آمد ورفت کے رشتے قائم ہوئے؛ چنانچہ مشہور محدث امام زہریؒ فرماتے ہیں :

> جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوگئی، ایک دوسرے سے لوگ بے خوف ہوتے باہم ملتے جلتے، باتیں کرتے تو کوئی عقل مند ایسا نہ تھا، جس سے اسلام کے متعلق گفتگو آئی ہو اور اس نے قبول نہ کیا؛ چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوتے تھے، صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے۔ (سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۲؍۱۵، بحوالہ طبری)

اہل مکہ سے صلح ہوجانے اور ان کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہونے کے بعد دعوتِ اسلام کی مہم کو فروغ ہوا، عرب کے مختلف علاقوں میں بھی اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کی معلوم حکومتوں تک اسلام کی دعوت پر مشتمل خطوط لکھے، اس کا اثر یہ ہوا کہ صرف دو سال کے بعد جب اہل مکہ نے معاہدہ کو توڑا اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ (جو اس وقت تک مشرک تھے) کے مطالبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار صحابہؓ تھے، یہ یقینی طور پر اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی پُرامن مخلصانہ اور بہی خواہانہ دعوت کا اثر تھا۔

(۱۰) فتح مکہ کے موقع سے آپ ﷺ نے لوگوں پر مسلمان ہونے کے لئے کوئی دباؤ نہیں ڈالا ؛ لیکن کفر و شرک کے باوجود عرب کعبۃ اللہ کو بے حد عقیدت و احترام کی نیت سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو حق پر ہوگا، اسی کو اس مقدس گھر کی تولیت حاصل ہوگی؛ لہٰذا جب مکہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا اور کعبۃ اللہ کی چھت سے ندائے توحید بلند ہونے لگی تو پورے عرب کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے نام لیوا ہی حق پر ہیں، اس لئے اب وہ جوق در جوق ایمان لانے لگے، اہل مکہ میں سے بھی بہت سے لوگ ایمان لائے اور پورے جزیرۃ العرب سے بھی لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے، رسول اللہ ﷺ نے مختلف علاقوں میں مختلف صحابہ کو اسلام کی دعوت، مسلمان ہو جانے والوں کی تربیت اور جو علاقہ مسلمان ہو جاتا وہاں کے انتظام و انصرام کے لئے روانہ فرمایا، اگرچہ اس کی پوری تفصیل سیرت کی کتابوں میں محفوظ نہیں ہے؛ کیوں کہ دعوت عبادت کے درجہ میں ہے اور عبادتیں اظہار و اعلان کے ساتھ انجام نہیں دی جاتیں، پھر بھی کچھ نام جو حدیث و سیرت کی کتابوں میں آ گئی ہیں، وہ یہ ہیں :

- علی بن ابی طالبؓ: قبیلہ ہمدان وحذیمہ و مدحج۔
- مغیرہ بن شعبہؓ: نجران۔
- وبر بن یحنس: ابنائے فارس۔
- محیصہ بن مسعود: فدک۔
- احنف: قبیلہ سلیم۔
- خالد بن ولیدؓ: اطراف مکہ۔
- عمرو بن العاصؓ: عمان۔
- مہاجر بن ابی اُمیہ: بطرف حارث بن عبد کلال شہزادۂ یمن۔

(۱۱) بعض مقامات کے لئے آپ ﷺ نے اپنے تربیت یافتہ صحابہ کو بہ ظاہر تحصیل زکوٰۃ وغیرہ کے لئے بھیجا؛ لیکن اس کے پیچھے اصل منشاء دعوت و تبلیغ کا کام تھا؛ چنانچہ ان کے ذریعے بڑے بڑے علاقے اصل کی آغوش میں آ گئے، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مہاجر بن ابی اُمیہ: صنعائے یمن۔
- زیاد بن لبید: حضر موت۔
- خالد بن ولید: صنعائے یمن۔
- عدی بن حاتم: قبیلۂ طے (یمن)۔
- عطاء بن حضرمی: بحرین۔
- حضرت ابوموسیٰ اشعری: زبید وعدن۔
- حضرت معاذ بن جبل: جند۔
- جریر بن عبداللہ بجلی: ذوالکلاع حمیری۔

(۱۲) کچھ قبائل وہ تھے جن کے ذمہ دار اعلیٰ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سمجھنے کے لئے خود آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، انھوں نے چند روز آپ ﷺ کے یہاں گزارے اور آپ ﷺ کی دعوت سے متاثر ہوکر خوش دلی کے ساتھ مسلمان ہوئے، پھر ان کی دعوت پر ان کے قبیلہ کے لوگ ایمان لے آئے، ایسے چند سرداران قبائل کے نام اس طرح ہیں:

- طفیل بن عمرو دوسی: قبیلۂ دوس۔
- عروہ بن مسعود: ثقیف۔
- عامر بن شہر: ہمدان۔
- ضمام بن ثعلبہ: بنو سعد۔
- منقذ بن حبان: بحرین۔
- ثمامہ بن اثال: اطرافِ نجد۔

(۱۳) خود مکہ کا حال یہ تھا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد اس کے اطراف کے لوگ تیزی سے مسلمان ہونے لگے جس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں: ''وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا'' (النصر:۲) فتح مکہ کے چند ہی ماہ بعد حج کا زمانہ آیا، حج کا مرکز کعبۃ اللہ ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

مرکز توحید کی حیثیت سے تعمیر فرمایا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ اب دوبارہ اس کو توحید کا مرکز بنایا جائے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اعلان کرادیا کہ آئندہ سال مشرکین حج میں شامل نہیں ہوں گے، آپ ﷺ کی طرف سے بہ طور نمائندہ اسی اعلان کے لئے حضرت علیؓ بھیجے گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج مقرر فرمایا گیا، اس کے بعد حجاز کے لوگ عامۃ مسلمان ہو گئے اور قریب قریب پورا جزیرۃ العرب دامن ایمان میں آ گیا۔

(۱۴) اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فتح مکہ کے بعد بڑی تعداد میں وفود آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں جو اپنے قبائل کے نمائندے تھے، یہ وفود جب واپس ہوتے تو پورا پورا قبیلہ مسلمان ہو جاتا، یوں تو صلح حدیبیہ کے بعد ہی سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا؛ لیکن ۹ھ میں بڑی تعداد میں خدمت نبوی ﷺ میں وفود آئے، اسی لئے اس سال کو "عام الوفود" کہا جاتا ہے، ان وفود کی تعداد کے بارے میں اہل سیر کا بیان مختلف ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرۃ النبی جلد دوم میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جو اضافہ کیا ہے، اس میں وفود کی تعداد بھی ذکر کی ہے اور سیرت شامی کے حوالہ سے ایک سو چار وفود کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

ان میں سے چند وفود جن کی تفصیل سیرت نگاروں نے ذکر کی ہے، کے نام یہ ہیں :

- وفد مزینہ (ارکان: ۴۰۰)۔
- وفد بنی اسد بن خزیمہ (ارکان: ۱۰)۔
- وفد بنی تمیم (ایک قول کے مطابق: ۹۰ ارکان)۔
- وفد بنی عبس (ارکان: ۹)۔
- وفد بنی سلیم (ارکان: ۱)۔
- وفد صداء (ارکان: ۴۰۰)۔
- وفد ہمدان (ارکان: ۱۲۰)۔
- وفد بنی مشفق۔

---

(۱) دیکھئے: سیرت النبی ﷺ: ۲/ ۲۸، بہ عنوان وفود عرب، اور شاہ مصباح الدین شکیل نے اپنی موقر کتاب سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ میں ان کی تعداد طالب ہاشمی کے حوالہ سے ایک سو نو لکھی ہے، (جلد دوم: ۳۳۶)۔

- وفد نجران (ارکان: ۶۰)۔
- وفد بنی باہلہ۔
- وفد ازد (ایک قول کے مطابق: ۱۹/افراد)۔
- وفد بنی فزارہ (ایک قول کے مطابق: ۱۹/افراد)۔
- وفد بہراء (ارکان: ۱۳)۔
- وفد نہد (تہامہ سے)۔
- وفد بنی سعد ہذیم۔
- وفد دارم یا دارین (ارکان: ۱۰)۔
- وفد بنی سعد (ارکان: ۱)۔
- وفد بلی (بلیہ) (تعداد معلوم نہیں)۔
- وفد تجیب (ارکان: ۱۳)۔
- وفد اشعریین (ارکان: ۵۳)۔
- وفد بنی عذرہ (ارکان: ۱۲)۔
- وفد بنی عامر بن صعصعہ (ارکان: ۱۳)۔
- وفد بنی کلاب (ارکان: ۱۳)۔
- وفد بنی عبدالقیس (ارکان: ۱۴)۔
- وفد بنی ذی رہ (ارکان: ۱۳)۔
- وفد بنی البکاء (ارکان: ۳)۔
- وفد بنی کنانہ (ارکان: ۱)۔
- وفد بنی ہلال بن عامر (ارکان: تین سردار اور کچھ ساتھی)۔
- وفد طئے (ارکان: ۱۵)۔
- وفد بحرین۔
- وفد عمان۔

(۱۵) دعوتی نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جیسے آپ ﷺ نے دعوتِ طعام کے ذریعہ تمام بنو ہاشم کو اسلام کی دعوت دی، صفا کی پہاڑی سے تمام اہلِ مکہ کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، حج کے اجتماعات کے ذریعہ پورے جزیرۃ العرب تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی سعی کی، اسی طرح ٦ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے دور دور تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے خطوط کا ذریعہ اختیار کیا؛ کیوں کہ اس وقت ایک خطہ سے دوسرے خطہ تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں تھا، ان میں سے جن جگہوں کو خطوط بھیجنے کا ریکارڈ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، اور جن میں سے بعض خطوط دریافت بھی ہوگئے ہیں، وہ یہ ہیں :

نمبر شمار	بادشاہ کا نام	ملک کا نام	سفیر کا نام
(۱)	اصحم بن ابجر نجاشی	شاہِ حبش	حضرت عمر بن اُمیہ ضمری
(۲)	ہرقل	قیصر روم	حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی
(۳)	خسرو پرویز	کسریٰ عجم	حضرت عبداللہ بن حذافہ
(۴)	جریج بن متی مقوقس	عزیز مصر	حضرت حاطب بن بلتعہ
(۵)	حارث بن ابی شمر غسانی	شاہِ دمشق	حضرت شجاع بن وہب اسدی
(٦)	ہوزہ بن علی حنفی	والیٔ یمامہ	حضرت سلیط بن عمرو عامری
(۷)	المنذر بن ساویٰ	والیٔ بحرین	حضرت علاء بن حضرمی

ان میں بعض لوگ وہ بھی تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا، ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں دُور دُور تک اسلام کی روشنی پہنچ گئی تھی، لوگ اپنی رضامندی سے ایمان لائے تھے، اس میں نہ تلوار کا کوئی دخل تھا اور نہ کہیں طاقت کا استعمال کیا گیا تھا اور نہ کسی قسم کا دباؤ اس میں شامل تھا۔

اہلِ مغرب کا اعتراف

اس سچائی کا اعتراف انصاف پسند غیر مسلم اہلِ علم ودانش نے بھی کیا ہے؛ چنانچہ :

باسورا سمتھ : آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کا یوں اعتراف کرتے ہیں :

آپ ﷺ نے کسی کو تکلیف نہیں پہنچایا، آپ کی عادت یہ تھی کہ مصافحہ کرتے وقت اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک کہ دوسرا نہ کھینچ لیتا، کسی کی حفاظت کا ذمہ لیتے تو اسے پورے طور پر نبھاتے، آپ شیریں کلام تھے، جو آپ ﷺ کو دیکھتا، اس کا دل آپ کی عزت، محبت اور احترام سے معمور ہو جاتا تھا، جو بھی آپ سے قریب ہوتا، وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔(۱)

باڈلے : آنحضرت ﷺ کی امن پسندی اور دنیا پر احسانات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

محمد ﷺ خون بہانے کے دلدادہ نہیں تھے، جنگ میں جو لوگ قید ہوتے، ان کو اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو وہ فدیہ دے کر آزاد ہو جائیں، یا پھر اسلام قبول کرلیں، (۲) قرآن کہتا ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ایک دو مواقع کے سوا آپ ﷺ نے ہمیشہ دشمنوں سے اچھا سلوک کیا ہے، (۳) اگر آپ ﷺ انتقام کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانا چاہتے تو یہ کر سکتے تھے اور یہ اس زمانہ کے دستور کے خلاف بھی نہیں ہوتا، اور اس زمانے سے بہت بعد تک عیسائی مذہب کے اخلاقی اُصولوں کے بھی یہ عین مطابق ہوتا، ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو انھوں نے قتل عام کیا،

---

(۱) باسورا سمتھ: ۱۳۱۔ (۲) یہ مذکورہ مستشرق کی غلط فہمی ہے، سیرت رسول میں ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں کہ آپ ﷺ نے قیدیوں سے فدیہ نہ ملنے پر ان کو اسلام لانے پر مجبور کیا ہو۔

(۳) یہ ایک دو مواقع میں بھی آپ ﷺ کا طرزِ عمل انصاف سے ہٹ کر نہیں ہے؛ بلکہ عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔

اور پورے شہر کو تباہ و برباد کر دیا؛ لیکن صلاح الدین ایوبی نے جس وقت بیت المقدس کو عیسائیوں سے دوبارہ واپس لیا تو اس نے عیسائیوں کی طرح کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی، اور نہ خود مسلمانوں نے ہی مذہبی جنگجوؤں کی طرح ان ممالک کو تباہ و برباد اور ویران کیا؛ بلکہ وہ جہاں گئے، انھوں نے وہاں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، اور اس علاقہ و خطہ کو سرسبز و شاداب بنایا۔

یوروپ میں علوم و فنون کو از سر نو زندہ کئے جانے کا سہرا محمد ﷺ کے پیروکاروں کا شرمندہ احسان ہے، جس وقت اسلامی ثقافت و تہذیب اپنے عروج پر تھی، اس وقت یوروپ جہالت کی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا، آپ ﷺ نے جو بھی جنگ کی، وہ مصلحت کا تقاضا اور حالات و ظروف کے اعتبار سے ناگزیر تھی اور جو بعد میں مجموعی طور پر فائدہ مند بھی ثابت ہوئی، یہ بات یقینی ہے کہ آپ ﷺ ان حملہ آوروں کی طرح نہ تھے، جن کی فطرت میدان جنگ میں خون بہانا ہوتی ہے اور جنھیں انسانی خون دیکھ کر ہی تسکین ملتی ہے۔(۱)

آرتھر گلمن: پیغمبر اسلام ﷺ کے حسن اخلاق اور دشمنوں کو معاف کرنے کے فراخدلانہ رویہ پر اس طرح قلم اُٹھاتے ہیں:

محمد (ﷺ) کی فتح مذہبی تھی نہ کہ سیاسی، آپ نے ذاتی تعریف کی ہر نشانی اور علامت کو رد کر دیا اور کسی بھی طرح کے شاہی لقب کو اختیار کرنے سے منع کر دیا، جب سرکش اور آپ ﷺ پر ظلم کرنے والے سرداران قریش آپ کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑے تھے

(۱) The Messenger : 137۔

تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم مجھ سے کیا اُمید کر رہے ہو کہ میں تم سے کیسا برتاؤ کروں گا؟ ان سب نے کہا تھا کہ آپ شریف بھائی ہیں، اور آپ سے ہمیں رحم و معافی کی اُمید ہے، آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ تمہاری اُمید رائیگاں نہیں جائے گی، تم سب آزاد ہو، تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔(۱)

جان بیگٹ گلب : سرورِ دو عالم ﷺ کے صلح کل اور امن پسندی کو خراجِ احترام پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فلسطین، مصر اور شام میں مسلمانوں کی تیز رفتار فتوحات کے سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ ان مفتوح اقوام سے زبردستی مذہب تبدیل نہیں کرایا گیا؛ بلکہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے اسلام کو اپنایا؛ کیوں کہ پیغمبر اسلام محمد (ﷺ) نے جبری تبدیلی مذہب کی حمایت کبھی نہیں کی اور نہ ہی کبھی عیسائیوں اور یہودیوں کا زبردستی مذہب تبدیل کرایا، مدینہ کے یہودیوں کو مدینہ سے اس لئے نکالا گیا کہ وہ فتنہ پرور قوم تھی اور محمد (ﷺ) کے مشن کی پوری طرح مخالف تھی، دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ آپ (ﷺ) کی یہودیوں سے مخالفت سیاسی تھی، مذہبی نہیں، ان کو مدینہ سے نکال دینے کے بعد بھی کچھ یہودی مدینہ میں موجود تھے؛ لیکن ان موجودہ یہودیوں کو کبھی مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا، نہ ہی اس سلسلے میں ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا گیا، قرآن میں کئی آیتیں ایسی ہیں جو مذہبی آزادی کی وضاحت کرتی ہیں اور جن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا ہوتا ہے، نہ کہ ان پر جبر کر کے اسلام کی طرف لے آنا۔(۲)

---

(۱) The saracens by Arthur gilmen P 1887:London184

(۲) _The life and times of Muhammad by John baggotglobal, P : 35

کیرن آرم اسٹرانگ : عہد نبوی ﷺ میں اقلیتوں کی مذہبی آزادی کا تذکرہ یوں کرتی ہیں :

اسلامی حکومت کے اندر یہودیوں، عیسائیوں کو مکمل آزادی تھی اور ان کو تبلیغ مذہب کی بھی اجازت تھی ، بشرطیکہ وہ مسلمانوں کی محبوب ترین ہستی محمد (ﷺ) کے خلاف گستاخی اور دریدہ دہنی نہ کریں۔

ایک دوسرے مقام پر کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں :

محمد (ﷺ) ایسی تہذیب اور مذہب کے بانی تھے ،جس کی بنیاد تلوار پر نہیں تھی ،مغربی پروپیگنڈے اور پروپگنڈے کو افسانوی اور داستانی رنگ دینے کے باوجود اسلام کے نام میں امن وامان اور دیگر اقوام سے صلح کا مفہوم شامل ہے۔(1)

ٹی ڈبلیو آرنلڈ : جنھوں نے اسلام کی دنیا بھر میں پُر امن تبلیغ واشاعت پر شہرۂ آفاق کتاب لکھی ہے، وہ اپنے مطالعہ کا خلاصہ جو برسوں کی مدت اور ہزاروں صفحات پر محیط ہے، بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

اسلام جیسا کوئی مذہب وسیع النظر، روادار اور صلح کل والا نہیں ملے گا، جس نے دیگر اقوام اور مذاہب کے افراد کو اتنی زیادہ آزادی دی ہو، اسلام دیگر اقوام ومذاہب کے دین وایمان سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے ،سوائے ان چند استثنائی صورتوں کے ، جب مسلمان حکمرانوں نے ملکی مصلحت اور حکمت کے خیال سے مذہبی اتحاد کا طریقہ اختیار کیا، رواداری مسلمانوں کی فطرت اور دوسروں کو مکمل آزادی ان کا خاصہ رہا ہے، ہمیں اپنی پوری توجہ ظلم وزیادتی کے چند گنے چنے واقعات پر ہی مبذول نہیں کرنی چاہئے ، جو کہیں کہیں پیش

---

(1) Muhammad A western attempt to understand islam by karen Armstrong London, 199, P: 266

آئے ہیں، اس کے مقابل اسلام کی وسیع النظری، مذہبی آزادی
اور رواداری کے واقعات جو تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے
ہیں، ان پر بھی انصاف کی نگاہ ڈالنی چاہئے۔(۱)

ٹامس کارلائل : معروف مستشرق عالم ''ٹامس کارلائل'' (۱۷۹۵ء—۱۸۸۱ء) نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں اسلام کی اشاعت میں تلوار کے عمل دخل کو قطعاً جھوٹ اور یاوہ گوئی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

یہ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں کہ ایک شخص، جو اپنی دعوت کے
ابتدائی دنوں میں بالکل تن تنہا ہو، کوئی اس کو ماننے والا نہ ہو، وہ
اکیلے پوری قوم اور جماعت کے خلاف تلوار لے کر اُٹھ کھڑا ہو
اور انھیں اپنے آپ کو منوانے پر مجبور کر دے۔(۲)

لارڈ ہیڈلی : مغربی مفکر لارڈ ہیڈلی بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے طرز عمل کے تعلق سے لکھتا ہے :

کیا آپ (ﷺ) کا بدر کے قیدیوں کے ساتھ یہ طرز عمل اس بات
کی دلیل نہیں ہے کہ محمد نہ متشدد تھے اور نہ ہی خون کے پیاسے تھے،
جیسا کہ ان کے دشمن اور مخالفین کہتے ہیں؛ بلکہ ان کا طرز عمل بقدر
استطاعت ہمیشہ جنگ و جدال سے گریز کا تھا، جب پورا جزیرہ
عرب ان کے زیر نگیں ہوگیا تھا، تب بھی انھوں نے کسی کو اسلام
قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا؛ بلکہ مخالفین کو جان و مال کی حفاظت کا
پروانہ دیا اور حکم دیا کہ کوئی بھی ان کے مذہبی معتقدات اور مذہبی
رسوم و رواج میں مداخلت نہ کرے۔(۳)

---

(۱) The preaching of Islam by T. W. Arnold, P : 398

(۲) محمد المثل الاعلیٰ، تعریب: محمد السباعی، ص: ۲۱، مصر: ۲۰۰۸ء۔

(۳) الرسول ﷺ فی عیون غربیۃ منصفۃ، ص: ۱۰۴۔

ولیم میور : مشہور انگریزی مورخ ولیم میور اپنی کتاب 'لائف آف محمد' میں محمد ﷺ کے لوگوں کی کایا پلٹ کردینے کی حیرت انگیز صلاحیت اور معاشرہ کو بدل دینے کی معجزانہ قوت اور اس کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں :

> محمد اپنے کلام کی وضاحت، آسان دین میں دوسروں سے ممتاز ہیں، اور ان کے کارناموں سے عقل حیرت زدہ ہے؛ کیوں کہ انھوں نے جس طرح لوگوں کے اخلاق کو سنوارا، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ (الرسول ﷺ فی عیون غربیۃ منصفۃ، ص:۱۰۶)

ڈاکٹر این، کے، سنگھ، انٹرنیشنل سنٹر فار ریلیجیس اسٹڈیز دہلی کے ڈائرکٹر ہیں، جہاں سے 'گلوبل وژن' نامی سہ ماہی جرنل نکلتا ہے، انھوں نے اسلامیات کو بحث وتحقیق کا موضوع بنایا ہے، Prophet Mohammad and His Companions کے نام سے انھوں نے سیرت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہؓ پر ایک جامع کتاب تصنیف کی ہے، اس کتاب میں سیرت نبوی پر (۲۱ رصفحات میں) مختلف عناوین کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔

ہندوستان کے اہلِ علم کا اعتراف

خود ہندوستان کے اہل علم نے بھی اس بات کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ اسلام کی اشاعت جبر و دباؤ سے نہیں اخلاق اور اعلیٰ تعلیمات سے ہوئی ہے۔

عام طور پر جو تاثر دیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی میں ہونے والی جنگوں میں زبردست کشت وخوں ہوا اور بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوئیں، جناب این، کے، سنگھ پرزور الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> دس سالہ زندگی کی ان تمام جنگوں میں صرف ڈھائی سو غیر مسلموں کا قتل ہوا، جب کہ مسلمان اس سے بھی کم کام آئے، ان چند موتوں کے طفیل پورے خطۂ عرب سے، جو لاکھوں مربع میل پر محیط ہے، انارکی اور بدکرداریوں کا خاتمہ ہوگیا، دس سال کی ان حقیر کوششوں

> کے نتیجے میں پورا جزیرۂ عرب اور عراق و فلسطین کے جنوبی حصے نے بخوشی اسلام قبول کرلیا۔ (ص:۱۷)

عدل وانصاف، اسلام کی پیش کردہ ایک عظیم قدر ہے، اس کی تحسین کرتے ہوئے این، کے، سنگھ صاحب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں :

> انھوں نے تعصب سے خالی عدل کا تصور پیش کیا، جس کے نتیجہ میں ریاست کا حکمراں بھی عام شہری کی مانند تصور کیا جانے لگا، اس ریاست میں مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ مسلم حکومتوں کی غیر مسلم رعایا کو قانون سازی اور تہذیبی اُمور میں مکمل آزادی حاصل تھی۔ (ص:۲۱)

ہندوستان کے ادباء میں منشی پریم چند (۱۸۸۵ء-۱۹۳۶ء) ایک مشہور نام ہے، انھیں اُردو، ہندی دونوں زبانوں پر عبور تھا، انھیں افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، ہفت روزہ پرتاپ، دسمبر ۱۹۲۵ء میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اس کی تلخیص 'اسلامی تہذیب' کے نام سے 'مدھر سندیش سنگم' سے شائع ہوئی ہے، اس میں انھوں نے تہذیب کے تین نمونوں (عدل وانصاف، مساوات، اُخوت) سے بحث کی ہے اور ان میں اسلام کی امتیازی شان کو نمایاں کیا ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے ذریعہ اپنی بات کو مدلل کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> عرفات کے پہاڑ پر حضرت محمد ﷺ کی زبان سے جس حیات بخش پیغام کی بارش ہوئی تھی وہ ہمیشہ اسلامی زندگی کے لئے آب حیات کا کام کرتی رہے گی، اس پیغام کا جوہر کیا تھا؟ عدل وانصاف اس کے ایک ایک لفظ سے صدائے عدل و انصاف گونج رہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے مومنو! میری باتیں سنو اور اسے سمجھو، تمہیں معلوم ہو کہ سب ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، تمہاری ایک ہی برادری ہے، ایک بھائی کی چیز دوسرے بھائی پر کبھی حلال

نہیں ہوسکتی، جب تک کہ وہ خوشی کے ساتھ نہ دے دی جائے، ناانصافی مت کرو، اس سے ہمیشہ بچتے رہو" اس پیغامِ جاوداں میں اسلام کی روح پوشیدہ ہے، اسلام کی بنیاد عدل پر مبنی ہے، وہاں بادشاہ اور فقیر، امیر اور غریب کے لئے فقط ایک انصاف ہے، کسی کے ساتھ رعایت نہیں، کسی کی طرف داری نہیں۔ (ص:۶-۷)

ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ اسلام میں عوام الناس کے لئے جتنی قوتِ کشش ہے، وہ کسی اور میں نہیں ہے، جب نماز پڑھتے وقت ایک مہتر خود کو شہر کے بڑے سے بڑے رئیس کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا پاتا ہے تو کیا اس کے دل میں احساسِ فخر کی ترنگیں نہ اُٹھنے لگتی ہوں گی؟ اس کے برعکس ہندو سماج نے جن لوگوں کو پست بنا دیا ہے، ان کو کنویں کی منڈیر پر بھی نہیں چڑھنے دیتے، انھیں مندروں میں داخل نہیں ہونے دیتے، یہ اپنے سے ملانے کی نہیں، اپنے سے الگ کرنے کی علامتیں ہیں۔ (ص:۱۴)

جناب راجندر نارائن لال (ولادت: ۱۹۱۶ء) کا تعلق بھرت پور (راجستھان) سے ہے؛ البتہ ان کی تعلیم وتربیت وارانسی (یو، پی) میں ہوئی؛ کیونس کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد کاشی ہندو یونیورسٹی بنارس سے ۱۹۴۰ء میں قدیم ہندوستانی تاریخ اور سنسکرت میں ایم، اے کی ڈگری حاصل کی، انھیں شروع ہی سے مذہب سے لگاؤ تھا، امن وشانتی کی تلاش میں انھوں نے ہندو مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا، انھوں نے ہندی میں "اسلام، ایک سویم سدھ ایشوریہ جیون ویوستھا" (اسلام—ایک خدائی نظام حیات) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں انھوں نے ابتدا میں بدھ ازم، عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے، پھر اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا نہایت مدلل انداز میں ازالہ کیا ہے؛ اسلام کا تعارف کراتے ہوئے ابتدا میں پیغمبر اسلام کی سیرتِ طیبہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی جانب سے عفو عام کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب راجندر لال نے لکھا ہے:

> اسلام لانے کے بعد جو کایا پلٹ ہوئی، وہ گویا اس کی تاریخی حیاتِ نو ہے، سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ محمد ﷺ کی قیادت میں فتح مکہ کے وقت ایک شخص کی بھی جان نہیں گئی (سوائے دو تین نہایت سرکش لوگوں کے) اور پیغمبر اور ان کے پیروؤں نے اپنے اپنے دشمنوں کے مظالم کا بدلہ وانتقام لئے بغیر انھیں چھوڑ دیا، تاریخ میں جنگ کے بعد فاتحین کے ذریعہ مفتوحین کو اس طرح اجتماعی طور پر معافی دینے کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کے برعکس دیگر دھارمک پرانوں کے قصوں میں اوتاروں اور دیوتاؤں کے ذریعہ سے مخالفین کے خوف ناک قتل عام کا تذکرہ مذکور ہے۔ (ص:۱۳-۲۲)

اللہ کے رسول ﷺ نے اشاعتِ اسلام کے لئے کتنی جدوجہد کی اور اس راہ میں کتنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب راجندر لال فرماتے ہیں:

> بے سہارا اور یتیم کی حیثیت میں پلے، زندگی بھر دنیاوی تعلیم سے محروم؛ لیکن علم الٰہی کے زیور سے آراستہ و پیراستہ، محمد ﷺ مظالم سہتے ہوئے خود ظالموں کے لئے بھی دُعا مانگتے رہے، وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں حکم خداوندی کے تحت دفاعی جنگ کرتے ہیں اور مکمل فتح یابی حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے پیروؤں کے اوپر شدید مظالم ڈھانے والوں کو اجتماعی طور پر معاف کر دیتے ہیں، آپ نے اپنی زندگی ہی میں راکشس کہلانے کے لائق عربوں کو نیک وصالح بنا دیا، آپ ﷺ کے بعد ایک صدی کے اندر دنیا کے

> وسیع و عریض خطہ پر اسلام کی عظمت کا سکہ جم گیا اور آج بھی سب سے زیادہ مقبول اور عالم گیر مذہب اسلام ہی ہے، اس سے حضرت محمد ﷺ اور اسلام کی عظمت از خود ثابت ہے، آپ ﷺ مظالم کو سہتے ہوئے صبر و تحمل کے ساتھ توفیق الٰہی کے ذریعہ سعی کرتے رہے اور عظیم کشمکشوں و تصادم کے درمیان کامیاب ہوئے، آپ ﷺ کا مشن تھا دینِ حق کے طور پر "اسلام"، اگر سائنس کے اُصول "جہد للبقاء" (Struggle for Existance) اور "بقائے اصلح" (Survival of the Fittest) صحیح ہیں اور یہ اُصول حقیقت میں سائنٹفک اُصول ہیں تو ان اُصولوں پر شخصی لحاظ سے اور رسول خدا کی حیثیت سے حضرت محمد ﷺ کھرے اُترتے ہیں اور دین کی حیثیت سے اسلام ہی ہے، جو ان اُصولوں پر کھرا ثابت ہوتا ہے۔ (ص: ۳۳-۳۴)

سوامی لکشمی شنکراچاریہ کی ولادت (۱۹۵۳ء) کانپور کے ایک برہمن خاندان میں ہوئی، سوامی جی نے کانپور اور الہ آباد سے تعلیم حاصل کی، مگر کچھ عرصہ کے بعد مادیت کو چھوڑ کر روحانیت کی طرف مائل ہو گئے، اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر انھوں نے 'اسلامک آتنک واد کا اتہاس' نامی کتاب لکھی، جس کا انگریزی ترجمہ The History of Islamic Terrorism کے نام سے شائع ہوا، بعد میں سوامی جی کچھ مسلمانوں کے رابطے میں آئے، جنھوں نے انھیں بتایا کہ اسلام کی حقیقت جاننے کے لئے قرآن کا مطالعہ براہ راست یا کسی ترجمہ کی مدد سے کرنا چاہئے، اس سے پہلے اس ذاتِ گرامی کا مطالعہ بھی ضروری ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا، سوامی جی نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا، ہندی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور ایک کتابِ سیرت حاصل کی، ان کا مطالعہ کرتے ہی

سوامی جی کی کایا پلٹ گئی اور اسلام کے بارے میں پھیلائے گئے تمام اعتراضات کافور ہو گئے، انھوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے سابقہ خیالات کے لئے ایک نئی کتاب تیار کریں، ان کی یہ نئی کتاب ہندی میں 'اسلام — آتنک واد یا آدرش' اور اُردو میں 'اسلام — دہشت گردی یا ایک مثالی دین' کے نام سے شائع ہوئی، سوامی جی نے اپنی موخر الذکر کتاب کے پیش لفظ میں اپنی فکری روداد سفر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

> میں اللہ سے، پیغمبر حضرت محمد ﷺ سے اور سبھی مسلمان بھائیوں سے علی الاعلان معافی مانگتا ہوں اور لاعلمی میں لکھے ہوئے یا بولے ہوئے الفاظ کو واپس لیتا ہوں، عوام سے میری اپیل ہے کہ 'اسلامی دہشت گردی کی تاریخ' نامی میری کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اسے صفر سمجھیں۔ (ص:۱۱)

غزواتِ نبوی کے بارے میں سوامی جی کا تبصرہ ملاحظہ ہو :

> حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ پاک کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے پایا کہ پیغمبر محمد نے توحید کی سچائی کو قائم کرنے کے لئے انتہائی مصائب جھیلے، مکہ کے کافر دین حق کی راہ میں روڑے ڈالنے کے لئے آپ ﷺ کو اور اور آپ کی پیش کردہ سچائی کی راہ پر چلنے والے مسلمانوں کو مسلسل تیرہ سالوں تک ہر طرح سے ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے رہے اور ذلیل کرتے رہے، اس ظلم عظیم کے بعد بھی محمد ﷺ نے صبر کا دامن تھامے رکھا، یہاں تک کہ ان کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا؛ لیکن مکہ کے مشرک قریش نے محمد ﷺ کا اور مسلمانوں کا پیچھا یہاں بھی نہیں چھوڑا، جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو اپنی اور مسلمانوں کی اور سب سے بڑھ کر حق کی حفاظت کے لئے مجبور ہو

کر محمد ﷺ کو لڑنا پڑا، اس طرح محمد ﷺ پر اور مسلمانوں پر لڑائی تھوپی گئی، ان ہی حالات میں حق کی حفاظت کے لئے جہاد (یعنی دفاعِ نفس اور دین کی حفاظت کے لئے مقدس جنگ) کی آیتیں اور باطل پرست ظالم کافروں و مشرکوں کو سزا دینے والی آیتیں اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر آسمان سے نازل ہوئیں، پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ سے لڑی گئی جنگیں پیش قدمی کے طور پر نہ ہو کر ظالمانہ حملوں اور دہشت گردی سے بچاؤ کے لئے دفاعی جنگیں ہیں؛ کیوں کہ ظالموں کے ساتھ ایسا سلوک کئے بغیر امن کا قیام نہیں ہو سکتا تھا۔ (ص:۲۵)

• • •

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تعدد ازدواج ☆

جس درخت پر پھل ہوتے ہیں اسی پر پتھر بھی پھینکے جاتے ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے داغ زندگی اور روشن تعلیمات نے انسانیت کو کچھ اس طرح متاثر کیا کہ بہت کم عرصہ میں اسلام مکہ سے نکل کر ایشیاء، افریقہ، یورپ اور پوری دنیا میں پہنچ گیا؛ چنانچہ اس وقت ماننے والوں کی تعداد کے اعتبار سے بھی اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اگرچہ کہ عیسائی دنیا عیسائیت کو سب سے بڑا مذہب مانتی ہے؛ لیکن سچائی یہ ہے کہ حقیقی عیسائیت جس کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم دی تھی، دنیا سے مٹ چکی ہے، اسلام کی اس مقبولیت کی وجہ سے بڑی تعداد میں دین حق کے حاسدین بھی پیدا ہوئے اور انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انگلی اُٹھانے کی کوشش کی، خاص کر صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغربی دنیا نے اس کو اپنی مہم بنالیا۔

انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ سب سے زیادہ جس بات کا پروپیگنڈہ کیا، وہ آپ کا تعدد ازدواج ہے، یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مصلحتوں کے تحت متعدد نکاح فرمایا، ازواج مطہرات کی مجموعی تعداد گیارہ ہے اور بیک وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں تو نو بیویاں رہی ہیں، اسلام سے عناد رکھنے والے لوگ اس کو بنیاد بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک شہوت پرست انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے، اس سلسلے میں ہمیں تین نکات پیش نظر رکھنے چاہئے :

(۱) دنیا کے دیگر مذاہب کے پیشواؤں نے کیا صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا؟ یا ان کے حرم میں بھی متعدد عورتیں رہی ہیں؟

☆ یہ تحریر اس حقیر کے قلم سے ہے، مگر اس کا آخری حصہ ''دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی مصلحت'' رفیق مکرم حضرت مولانا نور الحق رحمانی زید مجدہ (استاذ معہد تدریب القضاء، پٹنہ) کے مقالہ بعنوان: ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کثرت ازدواج'' سے ماخوذ ہے، جو انھوں نے ''بین الاقوامی سیرت سیمینار'' المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے لئے راقم الحروف کی گذارش پر لکھا تھا۔ (رحمانی)

(۲) کسی شخص کی نیت کو سمجھنے کے لئے اس کے مزاج اور اس کے حالات کی بھی بڑی اہمیت ہے، اس سے اس کے عمل کا مقصد متعین کیا جاسکتا ہے، اس پہلو سے سیرت نبوی ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے؟

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مختلف نکاح فرمائے ہیں، ان کی حکمت و مصلحت کیا تھی؟

ہندو بزرگوں کے یہاں تعدد ازدواج

دیگر مذہبی پیشواؤں کی زندگی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ زیادہ بڑے پیمانے پر تعدد ازدواج کا عمل ملتا ہے؛ چنانچہ :

ہندو مذہب کی ایک اہم شخصیت ''واسودیو'' کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں کا بیان ہے کہ :

- بھگوان واسودیو کی سولہ ہزار ایک سو ایک رانیاں ہوئیں، ستیہ بھاماں، جالوتی، جاروہاسی وغیرہ، آٹھ رانیاں مشہور ہوئیں۔(۱)
- گیتا کے مرکزی کردار شری کرشن جی کی آٹھ بیویاں تھیں، جن میں رُکمنی، کلندی، متروندا، نگر جتی، ستیہ بھاما، لکشانا، جموتی اور بھندرا ہیں، اس کے علاوہ جنھیں کرشن نے نرکسر نامی شخص کی قید سے آزاد کیا تھا۔
- اس طرح کرشن جی کے والد کی سولہ بیویاں تھیں۔

ایک مشہور رشی کشیپ کی بھی تیرہ بیویاں تھیں۔(۲)

- شری رام چندر جی کے والد مہاراجہ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں: کوشلیا: جو رام چندر جی کی والدہ ہیں، سمترا: جو لکشمن کی والدہ ہیں

---

(۱) مہابھارت انش: ۴/۱۵۔

(۲) مہابھارت انوساشن پروہ، باب: ۴۸۔

اور کیکئی: جو بھرت کی والدہ ہیں، راجہ دشرتھ کی یہ تین بیویاں تو مشہور ہیں؛ لیکن بالمیکی رامائن کے مطابق ان کی بیویوں کی تعداد ۳۵۰ تھی۔

● اسی طرح راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں، ایک: کنتی جن کی اولاد میں ارجن ہیں اور مادری، جن کی اولاد سے سہدیو ہیں۔(۱)

ہندو مذہب کی بزرگ شخصیتوں کے یہاں کثرت ازدواج کی وجہ سے ان کے ماننے والوں میں بھی اس کا رواج تھا؛ چنانچہ اودے پور میں سنگرام سنگھ اور اس کی اکیس رانیوں کا مقبرہ موجود ہے، جو ۱۷۳۳ء میں راجہ کے ساتھ ستی ہوگئی تھیں۔

یہودی مذہب

اب آیئے دوسرے قدیم ترین مذہب یہودیت کی طرف تو :

● حضرت ابراہیم جن کی نسل سے بنی اسرائیل بھی ہیں اور بنو اسماعیل یعنی عرب بھی، اور یہودی، عیسائی، مسلمان سب ان پر ایمان رکھتے ہیں، تورات میں ان کی تین بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ایک: حضرت سارہ(۲)، دوسرے: حضرت ہاجرہ، جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے(۳)، تیسرے: حضرت قطورہ۔(۴)

● حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھی چار بیویوں کا ذکر تورات میں ملتا ہے: ''لیاہ اور ان کی کنیز زلفہ اور راخل اور ان کی کنیز بلہاہ''۔(۵)

---

(۱) رحمۃ للعالمین: ۲/۱۲۸، ہندو مذہب سے متعلق بیشتر معلومات ڈاکٹر شائستہ پروین کی تالیف: ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' سے ماخوذ ہے۔

(۲) تمدن ہند: ۲۹۹۔

(۳) پیدائش: ۱۱:۲۹۔

(۴) پیدائش: ۳۵: ۱، ۲۔

(۵) پیدائش: ۲۹، ۳۰۔

● بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی چھ بیویوں، اجینوعم (Ahinoam)، معکہ (Maachah)، ابجیل (Abigail)، ابیطال (Abital)، میکل بنت ساؤل (Michal)، حجیت (Haggith) کے تو نام ذکر کئے گئے ہیں؛(۱) لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی سو بیویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔(۲)

● حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ ان کی سات سو بیویاں اور تین سو حرمیں (باندیاں) تھیں۔(۳)

● خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں: صفورہ، حبیشہ، منت قینی اور منت حباب،(۴) اور ان کے لئے بلاتحدید تعدد ازدواج کی اجازت تھی۔(۵)

عرب جاہلیت میں

اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی غیر محدود تعدد ازدواج کی اجازت تھی، غیلان ثقفیؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ چار بیویاں رکھو اور بقیہ کو علاحدہ کردو: ''أمسک أربعا وفارق سائرھن''۔(۶)

اسی طرح نوفل بن معاویہؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی پانچ بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ چار بیویاں رکھیں اور باقی کو علاحدہ کردیں،(۷) اسی طرح ابوداؤد میں حارث بن قیس سے روایت ہے کہ میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے چار کو رکھو اور چار کو چھوڑ دو: ''اختر منھن أربعاً''۔(۸)

---

(۱) گنتی: ۲۷: ۸۔ (۲) سلاطین: ۳: ۱۱۔ (۳) سلاطین: ۱: ۱۱: ۳۔

(۴) قاضیون: ۱۶: ۱: ۴۔ (۵) کتاب استثناء: ۲۱/ ۱۰ تا ۱۳۔

(۶) صحیح ابن حبان، عن ابن عمرؓ، باب نکاح الکفار، حدیث نمبر: ۴۱۵۷۔

(۷) مفاتیح الغیب: ۵/ ۲۴، تفسیر سورہ نساء: ۳۔

(۸) سنن ابی داؤد، باب فی من أسلم وعندہ نساء اکثر من اربع الخ، حدیث نمبر: ۲۲۴۱، عن وہب الأسدی۔

اگر عرب کے معاشرہ میں اس کا رواج نہ ہوتا تو اہل مکہ ضرور اس پر اعتراض کرتے اور حدیث وسیرت کی کتابوں میں اس کا ذکر آتا، یا ان کی تردید میں قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوتی۔

غرض کہ دنیا کے بیشتر مذہبی پیشواؤں نے متعدد نکاح کئے ہیں، اگر سنگھ پریوار کے لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے حیاتِ طیبہ کو تعدد ازدواج کی طرح نشانہ بناتے ہیں تو دراصل وہ اپنے مذہبی پیشواؤں اور مقدس شخصیتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، جن کے یہاں تعدد ازدواج کا عمل پیغمبر اسلام ﷺ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

قرائن کی روشنی میں اس الزام کا جائزہ

اب اگر قرائن کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیا جائے تو تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں :

(۱) انسان کے اندر داعیہ شہوت سب سے بڑھا ہوا ہوتا ہے، نوجوانی اور اس کے بعد جوانی کے زمانہ میں، پچاس سال کی عمر کے بعد جذبات میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے، اگر آپ ﷺ کا متعدد نکاح کرنا شہوت کی بنیاد پر ہوتا تو آپ ﷺ نے اس عمر میں متعدد نکاح کئے ہوتے ؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ۲۵ سال تک کی عمر آپ نے تجرد کی حالت میں گذاری، پھر حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح ہوا، پچاس سال کی عمر تک وہی آپ کے نکاح میں رہی، ان کی وفات کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہؓ آپ کے نکاح میں آئی اور ۵۴ سال کی عمر ہونے تک تنہا وہی آپ کے نکاح میں رہی گویا چھبیس سے ۵۴ سال تک صرف ایک ہی آپ کے نکاح میں رہی، اگر نعوذ باللہ آپ ﷺ شہوت ہوتے تو اس عمر میں آپ کی زیادہ بیویاں ہوتیں ؛ لیکن جو اصل زمانہ شباب ہے، اس میں آپ نے صرف ایک بیوی پر اکتفا فرمایا۔

اُمت کے عام افراد کو چار نکاح تک کی اجازت دی گئی ہے، یہ اجازت ہندو دھرم میں بھی برہمنوں کو حاصل ہے اور یہودی مذہب میں بھی کسی تحدید کے بغیر تعدد ازدواج کی اجازت

ہے، اگر ہم حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی پر غور کریں تو ۵۸ سال کی عمر تک آپ کے نکاح میں صرف چار بیویاں تھیں :

۱- حضرت عائشہ بنت ابوبکرؓ۔

۲- حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ۔

۳- حضرت زینب بن خزیمہؓ۔

۴- حضرت اُم سلمہؓ۔

آگے جو پانچ سال کا عرصہ ہے بقیہ پانچ نکاح آپ نے عمر مبارک کے ۵۹ ویں اور ۶۰ ویں سال میں فرمایا، یہ ازواج مطہرات تھیں :

۱- حضرت زینب بن جحشؓ۔

۲- حضرت جویریہؓ۔

۳- حضرت اُم حبیبہ بنت ابی سفیانؓ۔

۴- حضرت صفیہ بن حی بن اخطبؓ۔

۵- حضرت میمونہ بنت حارثؓ۔

۶۰ سال کے بعد آپ ﷺ نے کوئی نیا نکاح نہیں فرمایا، یہاں تک کہ عمر کے ۶۳ ویں سال میں آپ کی وفات ہوگئی۔

غرض کہ جو اصل شباب کی عمر تھی، اس میں آپ ﷺ نے ایک ہی بیوی پر اکتفا فرمایا، ادھیڑ عمر کا جو زمانہ ہوتا ہے اس وقت تک آپ کے نکاح میں چار ازواج سے زیادہ نہیں تھیں، جو زمانہ بڑھاپے کا تھا، اس میں آپ ﷺ نے پانچ نکاح فرمایا، اگر آپ ﷺ نعوذ باللہ شہوانی جذبات کے تحت نکاح کرتے تو یا تو تعدد ازواج کا واقعہ پہلے مرحلہ میں یعنی ۵۳ سال کی عمر تک پیش آتا، یا زیادہ سے ۵۸ سال تک نہ کہ عمر کے بالکل آخر مرحلہ میں جو عمومی طور پر بڑھاپے کی عمر ہوتی ہے۔

(۲) جو شخص جنسی لذت اندوزی کے لئے نکاح کرے گا وہ اپنے لئے کنواری لڑکیوں

کا انتخاب کرے گا نہ کہ بیوہ اور مطلقہ کا، رسول ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے سوائے حضرت عائشہؓ سبھی یا تو بیوہ تھیں یا مطلقہ تھیں ؛ بلکہ بعض تو وہ تھیں جو کئی شوہروں سے گذر کر آپ کے نکاح میں آئی تھیں، جیسے حضرت زینب بنت خزیمہ جن سے آپ کا چوتھا نکاح ہوا، کیا کوئی شہوت پرست مرد اپنی رفاقت کے لئے ایسی خواتین کا انتخاب کرے گا؟

(۳) جب آپ ﷺ نے مکہ میں دعوتِ اسلام کا آغاز کیا اور اہل مکہ آپ کے اُسوۂ حسن اور آپ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر ایمان لانے لگے، تو روساء مکہ کا ایک گروہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ آپ کو اس دعوت سے باز رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے آپ کے سامنے حکومت و دولت کی پیشکش تو کی ہی، ایک پیشکش یہ بھی رکھی کہ اگر آپ مکہ کی کسی خوبصورت لڑکی سے نکاح کرنا چاہتے ہوں تو آپ کی یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی ؛ لیکن آپ نے انکار فرمایا، (۱) اگر پیغمبر اسلام ﷺ کا مزاج یہی ہوتا جو معاندین کہتے ہیں تو آپ نے ان کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔

(۴) آپ ﷺ کی تعلیمات میں عفت وعصمت اور پاکیزگی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، عورتوں کو پردہ کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دی گئی ہے، آپ ﷺ نے کبھی کسی اجنبی عورت سے مصافحہ نہیں فرمایا، آپ مردوں سے بیعت لیتے ہوئے مصافحہ فرماتے تھے اور عورتوں سے زبانی بیعت پر اکتفا فرماتے تھے، آپ نے عورت کے غیر محرم کے ساتھ تنہائی اور میل جول کو شدت سے منع فرمایا، ہر جگہ صنفی اختلاط کو روکنے کی ترغیب دی، مسجد میں نمازیوں کی صفیں اس طرح بنوائیں کہ پہلے مرد، پھر بچے اور آخر میں عورتیں اور جب مسجد سے جائیں تو پہلے عورتیں نکل جائیں، اخیر میں مرد، جو شخص عفت و پاکیزگی کو اس قدر اہمیت دیتا ہو اور اس کے مخالف مواقع کا نہایت احتیاط کے ساتھ سد باب کرتا ہو، کیا وہ شہوت پرست ہوسکتا ہے؟

غرض کہ واقعاتی شہادتیں بھی اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ آپ کے تعدد ازواج کا شہوت پرستی اور لذت طلبی سے کوئی تعلق نہیں۔

---

(۱) الرحیق المختوم: ۱۴۰۔

تعدد ازدواج کی مصلحتیں

رسول اللہ ﷺ کا متعدد نکاح کرنا مختلف ملی اور سماجی مصلحت کے تحت تھا، ایک عمومی مصلحت یہ تھی کہ گھریلو زندگی سے متعلق آپ ﷺ کی تعلیمات ازواج مطہرات کے ذریعہ اُمت تک پہنچے، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں شوہر بیوی کے لئے مثالی زندگی کے جو نمونے ملتے ہیں کسی اور مذہبی شخصیت میں نہیں ملتے، اگر ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو وہ ان کے درمیان کس طرح عدل وانصاف کا ثبوت دے؟ اور سبھوں کی دلداری کا خیال رکھے؟ سفر کی رفاقت کے لئے وہ کیسے کسی بیوی کا انتخاب کرے؟ سوتیلے بچے اور بچیوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہو؟ نبیوں کے ساتھ سوتیلی ماؤں کو کس طرح رہنا چاہئے؟ خلوت کی زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ رات کی تنہائی میں کی جانے والی عبادتیں کس مقدار اور معیار کے ساتھ ادا کی جائیں؟ تنگ دستی اور فاقہ مستی کی حالت میں کس طرح وقت گذارا جائے؟ اگر بیویوں کو کچھ ناراضگی ہو جائے تو اس پر شوہر کا کیا ردعمل ہو اور خود شوہر کو کسی بات سے تکلیف ہو تو وہ کس طرح اس کا اظہار کرے؟ اسی طرح خواتین کے لئے پاکی اور ناپاکی اور ان سے متعلق دیگر مسائل کی رہنمائی، یہ ساری تعلیمات خواتین ہی کے ذریعہ اُمت تک پہنچ سکتی تھی، اس لئے آپ ﷺ نے مختلف خواتین سے نکاح کیا جو الگ الگ خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت کو ایسی جامعیت حاصل ہے کہ جیسے مردوں کے لئے زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کی گئی ہے، اسی طرح عورتوں کے لئے بھی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں ہے جس میں آپ ﷺ کی رہنمائی نہ ہو، خاص کر اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا علم تفسیر، حدیث، فقہ وفتاویٰ میں بہت نمایاں حصہ ہے، اکابر صحابہ بہت سے مسائل حال کرنے کے لئے حضرت عائشہؓ سے رُجوع کیا کرتے تھے، جن لوگوں سے سب سے زیادہ حدیثیں منقول ہیں ان کو مکثرین کہتے ہیں مکثرین میں دوسرا نمبر حضرت عائشہؓ کا ہے؛ چنانچہ مشہور محدث علامہ ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں :

لو جمع علم عائشة علم جميع النساء ، لكان علم عائشة أفضل ۔

حضرت عائشہؓ کے علم کا جملہ خواتین کے علم سے تقابل کیا جائے تو عائشہؓ کا علم سب سے بڑھا ہوگا۔

اس کے علاوہ مختلف دعوتی، اصلاحی اور سیاسی مقاصد کے لئے آپ نے مختلف نکاح کیا، صدیق محترم حضرت مولانا نورالحق رحمانی زیدمجدہ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ان کی تحریر نقل کی جاتی ہے :

دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی مصلحت

ان شادیوں کا سب سے بڑا مقصد عورتوں کی اصلاح، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے درمیان احکام شریعت کی تبلیغ تھا، حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کی حیثیت سے قیامت تک کے انسانوں کے لئے نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا تھا، آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ اپنی تعلیم وتربیت سے ایک ایسی مقدس جماعت تیار کریں جو اپنے مثالی اخلاق وکردار کے لحاظ سے پوری انسانیت کے لئے نمونہ ہو اور ہر دور ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ رہتی دنیا تک ان کی پیروی کرتے رہیں اور ابتداءً جس قوم کی تعلیم وتربیت آپ کے سپرد کی گئی تھی وہ ان پڑھ اور تہذیب وتمدن سے قطعاً ناآشنا تھی، ایسی وحشی، ناخواندہ اور گنوار قوم کو پیغمبرانہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ مہذب اور شائستہ بنانا اور دنیا کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کرنا تھا، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے اسی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔ (الجمعۃ:۲)

(اللہ) ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں اان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کی زندگی

بناتا اور سنوارتا ہے اور اللہ کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے؛
حالاں کہ وہ لوگ اس سے قبل کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے تھے۔

مرد و عورت انسانی معاشرہ کے دو اہم ستون ہیں ، کسی بھی معاشرہ کی مکمل اصلاح عورتوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر نہیں ہوسکتی ،تنہا مردوں کی تعلیم و تربیت ، پورے معاشرہ کی اصلاح کی ضامن نہیں ہوسکتی اور عورتوں کی مکمل اصلاح عورتوں ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ عورتیں زیادہ تر عورتوں ہی کا اثر قبول کرتی ہیں ، عام طور پر عورتوں میں جو بھی سدھار یا بگاڑ رونما ہوتا ہے، وہ عورتوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے؛اس لئے عورتوں کی اصلاح و تربیت کے لئے عورتیں ہی زیادہ مناسب ہوسکتی ہیں، اور معاشرتی اصلاح کے لئے مردوں سے زیادہ عورتوں کی تربیت ضروری ہے؛اس لئے کہ بچے ان ہی کی گود میں پرورش پاتے ہیں، ماں اگر اچھی اور تربیت یافتہ ہوگی تو اس کے بچے بھی شائستہ اور مہذب ہوں گے اور بچوں کی اصلاح و تربیت سے آئندہ نسل کی اصلاح ممکن ہے،اس مقصد کے لئے ضرورت تھی کہ آپ ﷺ مختلف عمروں اور مختلف صلاحیتوں کی حامل متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لائیں اور اس طرح براہ راست ان کی تربیت فرما کر عورتوں کی اصلاح کے لئے ان کو تیار کریں،اور ظاہر ہے کہ عرب کے تمام قبائل کے درمیان عورتوں کی اصلاح و تربیت کا کام تنہا کسی ایک عورت سے انجام نہیں پاسکتا تھا،خصوصاً آنحضور ﷺ کی حیات مبارک کے آخری دور میں جب کہ جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے ؛اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مختلف عمروں اور صلاحیتوں کی حامل خواتین کو متفرق قبائل عرب سے چن کر اپنی زوجیت میں جمع فرمایا اور ان کی مکمل تربیت فرما کر انھیں عورتوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اور ان کی تربیت کا ذریعہ بنایا، جن سے آپ ﷺ کی زندگی میں بھی اور آپ کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی عورتوں میں احکام شریعت کی تبلیغ واشاعت ہوئی اور ان کی اصلاح و تربیت کا مقدس فریضہ انجام پایا؛ چنانچہ عورتوں سے متعلق مخصوص مسائل مثلاً طہارت، حیض ونفاس، جنابت، حمل، ولادت، رضاعت، حضانت (بچوں کی پرورش و پرداخت)وغیرہ کے مسائل زیادہ تر ان ہی کے واسطے سے مرتب اور مدون ہوئے۔

بہر حال حیات طیبہ کے آخری دور میں ازواج مطہرات کی تعداد میں اضافہ اسی دعوتی، اصلاحی اور تربیتی مقصد کے تحت تھا اور شاید اسی مقصد کے پیش نظر آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا؛ تاکہ وہ پیغمبر ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد اُمت اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم وتربیت کے لئے پوری طرح یکسو اور فارغ رہ سکیں اور نئی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں اس اہم دینی فریضہ کی ادائیگی میں مزاحم اور مانع نہ بنیں، ظاہر ہے کہ اتنا اہم اور عظیم الشان کام ایک دو عورتوں کے ذریعہ انجام نہیں پاسکتا تھا: اس کے لئے عورتوں کی ایک جماعت درکار تھی، ہجرت کے بعد آپ ﷺ نے جو متعدد شادیاں کیں، ان کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔

سیاسی حکمت

رشتۂ نکاح ہر زمانہ میں افراد واقوام اور مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے درمیان باہمی روابط کو مستحکم کرنے اور نفرت وعداوت کو ختم کرنے کا ذریعہ رہا ہے؛ اس لئے مختلف زمانوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ قوموں کے سربراہوں اور ممالک کے حکمرانوں نے رشتۂ مصاہرت کے ذریعہ اپنے وزیروں اور محکوم قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کئے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی متعدد شادیوں میں بھی دیگر مصالح کے ساتھ یہ مصلحت کارفرما ہی؛ چنانچہ آنحضور ﷺ نے اپنے پہلے دونوں خلیفہ اور وزیر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لئے ان کی بیٹیوں حضرت عائشہؓ وحضرت حفصہؓ سے نکاح کیا اور اسی مقصد کے تحت آپ ﷺ نے اپنی دوسری اور تیسری بیٹی حضرت رقیہؓ اور اُم کلثومؓ کا نکاح یکے بعد دیگر اپنے تیسرے خلیفہ اور وزیر حضرت عثمانؓ کے ساتھ کردیا، اسی طرح آپ نے سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی شادی اپنے چوتھے خلیفہ اور وزیر حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ کردی، اس طرح مصاہرت کے اس مبارک رشتہ نے پیغمبر اسلام کو اپنے بڑے اور اسلام کی طرف سبقت کرنے والے اصحاب کے ساتھ جوڑ دیا۔

مشرک اور یہود قبائل کی خواتین سے نکاح کا اثر

اسی طرح اسلام دشمن قبائل کی مخالفتوں کو ختم کرنے اور اسلام کے تئیں ان کی پالیسی کو نرم کرنے کے لئے بھی آپ نے بعض شادیاں کیں، کیوں کہ عرب کے دستور اور قدیم روایات کے مطابق جو شخص کسی قبیلہ کی خاتون سے نکاح کرتا وہ صرف اس منکوحہ کے خاندان ہی کا نہیں؛ بلکہ پورے قبیلہ کا داماد سمجھا جاتا تھا اور داماد سے لڑنا ان کے نزدیک بڑی ہی شرم و عار کی بات تھی۔

چنانچہ ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت اُم حبیبہؓ بنت ابی سفیان سے شادی کی جو آپ پر پیشگی ایمان لانے والوں میں تھیں، یہ اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں، وہاں شوہر کے انتقال کے بعد بے سہارا تھیں، آپ نے انھیں پیغام نکاح بھیجا، شاہ حبش نجاشی کے توسط سے یہ نکاح ہوا اور انھوں نے محفوظ طریقہ پر مدینہ بھیج دیا، حضرت ابوسفیان اس وقت مشرکین کے قائد اعظم اور اسلام کے کٹر مخالف تھے، مگر اس نکاح کے بعد وہ بالکل نرم پڑ گئے اور پھر کبھی اسلام کے خلاف میدانِ میں نہیں آئے، اس رشتہ پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد فتح مکہ کے موقع پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

یہودی قبائل بڑی تعداد میں مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں آباد تھے، وہ اسلام کے کٹر دشمن تھے اور آئے دن اسلام کے خلاف کوئی نہ کوئی سازش رچا کرتے تھے، ان کی شرارت اور عہد شکنی کی وجہ سے آپ نے ان کے بعض قبائل کو مدینہ سے جلا وطن کیا تھا، مگر ان کی اسلام دشمنی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، غزوۂ خیبر کے قیدیوں میں حضرت صفیہؓ باندی کی حیثیت سے آپ کے قبضہ میں آئیں، آپ نے انھیں آزاد فرما کر ان سے نکاح کر لیا، سیاسی طور پر اس کا یہ فائدہ ہوا کہ قوم یہود کی دشمنی کا زور ٹوٹ گیا، جب کہ اس سے قبل اسلام اور کفر کے درمیان ہونے والی ہر جنگ میں انھوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا اور ہر لڑائی میں وہ علانیہ یا در پردہ مشرکین کے ساتھ رہے تھے۔

حضرت میمونہؓ سے شادی کا فائدہ

اسی طرح بعض قبائل کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں بعض شادیوں کا بڑا اچھا اثر پڑا،

۷ ہجری میں مشرکین کے ساتھ معاہدہ کی رُو سے جب آنحضورﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ معظمہ عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے اور تین دنوں وہاں قیام فرمایا تو ان کی ایمانی، روحانی اور اخلاقی حالت سے متاثر ہوکر کچھ مشرکین نے شرک سے توبہ کرکے اسلام قبول کرلیا، انھیں اسلام قبول کرنے والیوں میں ایک مبارک ذات حضرت میمونہؓ بنت حارث کی تھی، جو آپﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی سالی تھیں اور بیوہ تھیں، حضرت عباسؓ نے جو اُن کے ذمہ دار تھے، ان سے نکاح کی پیشکش کی، آنحضورﷺ نے اپنی پیغمبرانہ فراست سے محسوس کرلیا کہ یہ شادی بابرکت اور دُوررس نتائج کی حامل ہوگی، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ آپ کا اندازہ بالکل صحیح تھا، اس نکاح سے اگر ایک طرف قریش کی اس معزز خاتون کی تعظیم وتکریم ہوئی تو دوسری طرف اس خاندان کی حمایت آپ کے ساتھ ہوگئی اور اس خاندان کے متعدد بااثر افراد حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، جن میں حضرت میمونہؓ کے بھانجے حضرت خالد بن ولیدؓ اور اس خاندان کے ایک معزز فرد حضرت عمرو بن العاصؓ (فاتح مصر) اور کعبہ شریف کے متولی اور کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہؓ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس نکاح کا دوسرا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ اس نے نجد میں اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ ہموار کردی؛ کیوں کہ حضرت میمونہؓ کی ایک بہن ایک نجدی سردار کے نکاح میں تھیں، اس قرابت کے نتیجہ میں رؤسائے نجد اسلام اور پیغمبر اسلام سے قریب ہوئے اور رفتہ رفتہ پورا نجد اسلام کی آغوش میں آگیا، جب کہ یہی اہل نجد تھے جو متعدد بار عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تھے اور ستر مبلغین اسلام کو دھوکہ دے کر قتل کیا تھا۔

حضرت جویریہؓ سے شادی کا فائدہ

غزوۂ بنی مصطلق کے بعد اس قبیلے کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی حضرت جویریہؓ آپ کے نکاح میں آئیں، غزوۂ خندق کے بعد رسول اللہﷺ کو یہ اطلاع پہنچی کہ قبیلہ بنی مصطلق اپنے سردار کی قیادت میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، ان کے حملہ سے قبل رسول اللہﷺ اپنے سو اصحاب کے ساتھ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوئے، مریسیع نامی چشمہ

یا تالاب کے پاس یہ جنگ ہوئی، اسی لئے اسے غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے، اس لڑائی میں اس قبیلے کو شکست ہوئی، ان کے دس افراد مارے گئے اور سو گھرانے گرفتار ہوئے، ان گرفتار ہونے والوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جن کے شوہر مسافع بن صفوان مصطلقی اس غزوہ میں مارے گئے اور والد حارث بن ابی ضرارہ میدان چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئے، جب رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت (جو بڑی مقدار میں حاصل ہوا تھا) اور قیدیوں کو مجاہدین کے درمیان تقسیم فرمایا تو یہ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ آئیں، انھوں نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو کتابت پر راضی کرلیا کہ کچھ رقم لے کر انھیں آزاد کردیں، وہ رقم کی فراہمی کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے اپنی حالت کا تذکرہ کر کے مدد کی خواستگار ہوئیں، بالآخر بات یہ طے ہوئی کہ آپ ان کی طرف سے بدل کتابت ادا کر کے ان سے نکاح فرمالیں اور اس طرح وہ مسلمان ہوکر حرم نبوت میں داخل ہوگئیں، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جب مسلمانوں کو اس نکاح کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس قبیلے کے تمام قیدیوں کو یہ کہہ کر آزاد کردیا کہ اب یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار ہوگئے؛ لہٰذا انھیں غلام بنائے رکھنا مناسب نہیں، حضرت عائشہؓ ان کے بارے میں فرماتی ہیں:

> قالت: فلقد أعتق بتزويجه إياها مائة أهل بيت من بني المصطلق، فما أعلم امرأة أعظم بركة على قومها منها۔ (۱)
>
> یعنی رسول اللہ ﷺ کے جویریہ سے نکاح کرلینے سے بنی مصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بابرکت ثابت ہوئی ہو۔

پس اس شادی کا مقصد حضرت جویریہؓ کو جو اپنی قوم کے سردار کی بیٹی تھیں، غلامی کے ذلت سے نکال کر شرف و عزت عطا کرنا اور اس قبیلہ کو اسلام کی طرف مائل کرنا تھا، الحمدللہ

(۱) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر: ۱۵۹/۴۔

اس شادی سے یہ دونوں ہی مقاصد پورے ہوئے، مزید فائدہ یہ ہوا کہ یہ قبیلہ ڈاکہ زنی میں بھی مشہور تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے قزاقی چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کرلی۔

سماجی مصلحت

مکہ معظمہ میں جب مسلمانوں کے ساتھ مشرکین کی زیادتی حد سے آگے بڑھ گئی اوران کی ایذا رسانی ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور مدینہ منورہ میں آکر پناہ لی؛ لیکن یہاں بھی دشمنوں نے انھیں چین سے رہنے نہیں دیا اور چھیر چھاڑ اور جنگ وجدال کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کردیا، تعداد کی قلت، معاشی بدحالی اور سامان جنگ کی قلت کے باوجود مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں اُترنا پڑا، متعدد خوفناک لڑائیاں ہوئیں جن میں اسلام کے جانباز مجاہدین کام آئے، دین کی راہ میں ان کی زبردست قربانیاں تھیں، پھر ان کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی کفالت کا مسئلہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے ان مشکلات کا حل تلاش کیا اور اپنے بہت سے اصحاب کو آمادہ کرکے ایسی بہت سی بیواؤں کا ان سے نکاح کردیا اور خود بھی ایسی متعدد بیواؤں سے نکاح کیا جن کے شوہر جہاد میں شہید ہوئے تھے اور وہ معمر تھیں؛ کیوں کہ آپ کی ذات ایسے لوگوں کے لئے سہارا تھی، جن کا کوئی سہارا نہ ہو، اس سلسلے میں حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت حفصہؓ کا نام لیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں کے شوہر حضرت ابوسلمہؓ اور خنیس بن حذافہؓ غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے تھے، پھر یہی ان کی شہادت کا سبب بنا، اسی طرح حضرت زینبؓ بنت خزیمہ کے سابق شوہر حضرت عبداللہ بن جحشؓ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے رمضان ۳ھ میں ان سے نکاح کیا، یہ ایک دینی ضرورت اور سماجی مصلحت ہے، جس کی خاطر آپ نے یہ نکاح فرمایا، یہ آپ کی ایمانی بصیرت، انسانی ہمدردی وخیرخواہی اور اخلاق وکردار کی بلندی کی دلیل ہے نہ کہ شہوت پرستی کی۔

تشریعی اور قانونی حکمت

رسول اللہ ﷺ کی بعض شادیوں کا مقصد زمانۂ جاہلیت میں پھیلی ہوئی بعض بدعات

اور غلط رسوم ورواج کا ازالہ تھا، عرب معاشرہ میں غلاموں کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، آزاد ہونے کے بعد بھی انھیں سماج میں عزت کا مقام حاصل نہ ہوتا، اسلام عدل ومساوات کا مذہب ہے، وہ آزادی وغلامی، حسب ونسب، مال وزر، جاہ واقتدار یا کسی بھی مادی فرق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں، وہ اس طرح کے تمام بے جا تفرقوں کو مٹانے اور لوگوں کے درمیان عدل ومساوات قائم کرنے کے لئے آیا ہے، اس سلسلے میں اس نے جو سنہرے اُصول دیئے ہیں وہ یہ ہیں :

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا؛ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے، نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی کالے کو گورے پر، نہ کسی گورے کو کالے پر مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں اہل علم کے درمیان رسم تبنیت کا رواج تھا، لوگ دوسروں کی اولاد کو گود لے کر صلبی اولاد بنالیتے تھے اور اسے وراثت، نکاح، طلاق، حرمت مصاہرت اور زندگی کے دوسرے تمام معاملات میں حقیقی فرزند کا درجہ دیتے؛ چنانچہ منھ بولے بیٹے کی منکوحہ فرضی باپ کے لئے حقیقی بہو کی طرح حرام سمجھی جاتی، اسی طرح فرضی باپ کی بیوی متبنیٰ کے لئے ماں کی طرح حرام قرار پاتی، ظاہر ہے کہ اس فرضی رشتے کی اسلام کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں ہے، ضرورت تھی کہ اس غلط رسم کو مٹانے کے لئے کوئی موثر قدم اُٹھایا جائے؛ کیوں کہ اس رسم بد کی جڑیں عرب معاشرہ میں بڑی مستحکم تھیں، حضرت زیدؓ کے ساتھ حضرت

زینبؓ کے نکاح سے آزادی اور غلام کا بے جا فرق مٹا، پھر حضرت زیدؓ کے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد حکم الٰہی سے رسول اللہ ﷺ کے حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے کی وجہ سے رسم تبنیت کا خاتمہ ہوا، اس طرح اس مبارک نکاح سے دونوں بدعتوں اور جاہلانہ عادتوں کا خاتمہ ہوا، اس سلسلے میں سورۂ احزاب کی درج ذیل آیت نازل ہوئی :

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ ۔ (الاحزاب:۳۷)

پھر جب زید نے اس سے (یعنی زینب سے) حاجت پوری کرلی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کردیا؛ تاکہ مسلمانوں کو اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے سلسلے میں کوئی حرج باقی نہ رہے۔

جنگوں میں قید ہو کر آنے والی معزز خواتین کی عزت و ناموس کی حفاظت

رسول اللہ ﷺ کے تعدد ازدواج کی حکمتوں اور مصلحتوں میں سے ایک اہم حکمت یہ بھی تھی کہ بعض وہ معزز خواتین جو اپنے قبیلہ اور قوم کے سرداروں کی بیٹیاں تھیں اور مختلف غزوات میں مسلم مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہو کر آئیں تھیں، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے اور غلامی کی ذلت سے انھیں بچایا جائے؛ چنانچہ ایسی متعدد خواتین کو آزاد فرما کر آپ ﷺ نے اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا، مثلاً حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ جن کا ذکر اس سے قبل آیا، اس نکاح سے ایک طرف ان خواتین کی دل بستگی اور عزت افزائی ہوئی تو دوسری طرف ان کے اقارب اور قبیلہ کے لوگوں کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ مسلمان ہوگئے۔



حضرت عائشہؓ سے نکاح ☆

اُم المومنین عائشہ بنت ابی بکر صدیقؓ، رسول اکرم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ اور اُمت کی سب سے بڑی خاتون فقیہ ہیں، آپ کی والدہ: اُم رومان بنت عامر ہیں، آپ نے براہ راست رسول اکرم ﷺ کے علم کا ایک بڑا ذخیرہ نقل کیا، اپنے والد ابو بکر نیز عمر، فاطمہ، سعد، حمزہ بن عمرو اسلمی اور جذامہ بنت وہب سے آپ نے حدیث روایت کی ہے۔(۱)

علم وفضل اور حدیث وفقہ میں امتیاز

ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں :

لو جمع علم عائشة إلى علم جميع النساء ، لكان علم عائشة أفضل ـ (۲)

حضرت عائشہ کے علم کا، جملہ خواتین کے علم سے تقابل کیا جائے تو عائشہؓ کا علم سب سے بڑھا ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور سرعتِ حفظ کی دولت سے نوازا تھا، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں :

لم يكن في الأمم مثل عائشة في حفظها وعلمها وفصاحتها وعقلها ـ

☆ یہ تحریر عزیز مکرم مولانا اشرف عباس قاسمی (استاذ: دارالعلوم دیوبند، یوپی) کی ہے، جو انھوں نے راقم الحروف کی دعوت پر المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے تحت منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیرت سیمینار ۲۰۱۶ء میں پیش کیا تھا، راقم الحروف نے اس کو کسی قدر مختصر کر دیا ہے۔(رحمانی)

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۳۵۔ (۲) سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۴۱۔

سابقہ اُمتوں میں بھی حضرت عائشہؓ کی طرح حفظ وضبط، علم وفصاحت اور عقل میں کوئی خاتون نہیں تھی۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں :

ما رأيت أحدا أعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر من عائشة۔

فقہ میں، طب میں اور شعر میں حضرت عائشہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

حافظ ذہبی کہتے ہیں :

افقه نساء الامة على الاطلاق ، ولا أعلم في أمة محمد ، بل ولا في النساء مطلقاً امرأةً أعلم منها۔

اُمت کی خواتین میں بلاکسی استثناء کے سب سے بڑی فقیہ ہیں اور اس اُمت بلکہ دنیا جہاں کی خواتین میں مجھے ایسی خاتون نظر نہیں آتی، جو علم وفضل میں آپ سے بڑھی ہوئی ہو۔

آپ نے جو احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد حافظ ذہبی کے بہ قول دو ہزار دوسودس (۲۲۱۰) ہے، جن میں سے ایک سوستر احادیث کی تخریج امام بخاری ومسلم نے مشترکہ طور پر کررکھی ہے، جب کہ ۵۴ میں بخاری اور ۶۹ میں مسلم منفرد ہیں، (۱) اس حساب سے بخاری میں آپ کی دوسو اٹھائیس اور مسلم میں دوسو بتیس روایتیں ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی زوجیت میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قسمت کا ستارہ اس وقت اُوجِ ثریا پر پہنچ گیا، جب وہ دنیا کے سب سے پاکباز انسان، محسن انسانیت ﷺ سے منسوب ہوئیں، رسول اکرم ﷺ کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، بہ وقت نکاح آپ کی عمر ۲۵ اور حضرت خدیجہ کی ۴۰ برس کی تھی، حضرت خدیجہؓ نہایت غمگسار اور اطاعت شعار بیوی

(۱) سیر أعلام النبلاء: ۲/۱۳۹۔

تھیں، ہجرت سے تین سال قبل نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجہ کی وفات سے آپ کو بڑا رنج ہوا، جاں نثار صحابہ نے اس کیفیت کو محسوس کر کے آپ کو نکاح ثانی کا مشورہ دیا؛ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ کے پاس آ کر عرض کیا کہ آپ دوسرا نکاح کر لیں، آپ نے فرمایا: کس سے؟ خولہ نے کہا: بیوہ اور کنواری دونوں طرح کی لڑکیاں موجود ہیں، جس کو پسند فرمائیں اس کے متعلق گفتگو کی جائے، فرمایا: وہ کون ہیں؟ خولہؓ نے کہا: بیوہ تو سودہ بنت زمعہ ہیں اور کنواری ابوبکر کی لڑکی عائشہ، ارشاد ہوا: بہتر ہے تم اس کی نسبت گفتگو کرو۔

حضرت خولہؓ رسول اکرم ﷺ کی مرضی پا کر حضرت ابوبکرؓ کے گھر آئیں اور ان سے تذکرہ کیا، جاہلیت میں دستور تھا کہ جس طرح سگے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز نہیں، عرب اپنے منھ بولے بھائیوں کی اولاد سے بھی شادی نہیں کرتے تھے، اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: عائشہ تو آنحضرت ﷺ کی بھتیجی ہے، آپ سے نکاح کیوں کر ہو سکتا ہے؟ حضرت خولہ نے آ کر آنحضرت ﷺ سے استفسار کیا، آپ نے فرمایا: ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں اور اس قسم کے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز ہے، حضرت ابوبکرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے قبول کر لیا۔

لیکن اس سے پہلے حضرت عائشہؓ جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں، اس لئے ان سے بھی پوچھنا ضروری تھا، حضرت ابوبکرؓ نے جبیر سے جا کر پوچھا کہ تم نے عائشہ کی نسبت اپنے بیٹے سے کی تھی، اب کیا کہتے ہو؟ جبیر نے اپنی بیوی سے پوچھا، جبیر کا خاندان ابھی اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا، اس کی بیوی نے کہا: اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آ گئی تو ہمارا بچہ بد دین ہو جائے گا، ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ (۱)

نکاح اور رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور بہ وقت رخصتی نو سال کی تھی، دوسرا قول یہ ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۱۸ سال تھی؛ لیکن اہل تحقیق کے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ (۲)

(۱) مسند احمد: ۶/۲۱۱، سیرت عائشہ: ۲۴۔

(۱) بخاری، باب تزویج النبی عائشة وقدومها المدینة وبنائها بها: ۳۸۹۴۔

اس پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک نو سالہ لڑکی کیسے کسی مرد کے قابل ہو سکتی ہے؟ اور وہ بھی ایسے مرد کے جس کی عمر پچاس سے متجاوز ہو؟

اِس عمر میں نکاح کا رواج تھا

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل نکاح ایک معاشرتی عمل؛ بلکہ معاشرتی ضرورت ہے، اس لئے نکاح میں ہر جگہ کے معاشرے، وہاں کی تہذیب اور عرف و عادت کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس تناظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ جس معاشرے کا حصہ، اس میں کم سنی میں نکاح قطعاً معیوب نہیں تھا؛ بلکہ متعارف اور رائج تھا؛ چنانچہ :

(۱) حضرت قدامہ بن مظعونؓ نے اپنے لڑکے کا حضرت زبیرؓ کی نومولود لڑکی سے اسی دن نکاح پڑھا دیا، جس دن وہ پیدا ہوئی۔(۱)

(۲) خود آنحضرت ﷺ نے حضرت اُم سلمہؓ کے کم سن لڑکے سلمہ کا نکاح حضرت حمزہؓ کی نابالغ لڑکی سے کیا تھا، (۲) بلکہ ترکمانی فرماتے ہیں: ''و زوج غير واحد من الصحابة ابنته الصغيرة''۔(۳)

بلکہ نو، دس سال کی عمر اس زمانے اور اس معاشرے میں وہ عمر تھی، جس میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو سکتے تھے؛ چنانچہ بخاری شریف میں حسن ابن صالح کا قول نقل کیا گیا ہے :

> أدركت جارةً لنا جدةً بنت احدى وعشرين سنة ۔ (۴)
> ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھیں جو اکیس سال کی عمر میں دادی بن گئی تھی۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس جدہ کا نکاح صغر سنی میں ہوا تھا اور صرف دس سال کی عمر میں اس نے بچہ جنا تھا، اور یہی صورت حال اس کی بیٹی کی بھی رہی۔

---

(۱) مرقات: ۳/۲۱۷۔ (۲) احکام القرآن رازی: ۲/۵۵۔

(۳) ترکمانی علی البیہقی: ۱/۷۶،۷۹۔ (۴) بخاری، باب بلوغ الصبیان وشہادتہم، کتاب الشہادات۔

(۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھی ایک خاتون کو دیکھا ہے جو نو سال کی عمر میں بالغ ہوگئی تھی اور دس سال کی عمر میں اس کے یہاں بیٹی کا تولد ہوا۔(۱)

اسی لئے فقہاء نے بھی رخصتی کے لئے کسی خاص عمر کی تحدید نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کا مدار عورت کی طاقت اور جسمانی ساخت پر ہے؛ چنانچہ ہدایہ میں ہے :

أكثر المشائخ على أنه لاعدة للسن في هذا الباب ، وإنما العدة للطاقة إن كانت ضخمة سمينة تطيق الرجال ، ولا يخاف عليها المرض من ذلك ، كان للزوج أن يدخل بها وإن لم تبلغ تسع سنين۔

اکثر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ لڑکی سے جماع کے سلسلہ میں عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ طاقت وقوت کا اعتبار ہے، اگر بھاری بھرکم اور موٹی ہو، مردوں کو برداشت کر لیتی ہو اور صنفی تعلق کی وجہ سے مرض کا اندیشہ نہ ہو تو شوہر صحبت کر سکتا ہے اگر چہ وہ نو سال کی بھی نہ ہو۔

اور خود حضرت عائشہؓ کے نکاح میں بھی یہ اہم حقیقت ملحوظ تھی؛ چنانچہ ان کا عقد اگر چہ چھ سال کی عمر میں ہوگیا تھا؛ لیکن رخصتی کے لئے مزید تین سال انتظار کیا گیا، اور اس دوران ان کی والدہ ان کی صحبت کا خاص خیال رکھتی تھیں اور مختلف غذاؤوں کے ذریعے تدبیر کرتی تھیں کہ جسم کسی قدر فربہ ہو جائے؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں :

أرادت أمي ان تسمنني لدخولي على رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم أقبل عليها بشيئ مما تريد حتى اطعمتني القثاء بالرطب ، فسمنت عليه كأحسن السمن۔ (۲)

---

(۱) دیکھئے: فتح الباری: ۵/۳۱۲۔ (۲) ابوداؤد، ابن ماجہ۔

میری والدہ رُخصتی سے قبل مجھے فربہ کرنے کی تدبیریں کیا کرتی تھیں؛
لیکن ان کی تدابیر نا کام ہو جاتی تھیں، ہاں جب انھوں نے مجھے
ککڑی اور کھجور ملا کر کھلایا تو میں موٹی ہو گئی۔

اس لئے اس عرب معاشرے کو ہمارے اس معاشرے پر قیاس کرنا فضول ہے، جس میں کمسن لڑکیوں سے نکاح کو معاشرتی جرم سمجھا جاتا ہے۔

عرب معاشرے میں آج بھی یہ قابل قبول ہے

بلکہ آج بھی عرب معاشرہ اس کو قبول کئے ہوئے ہے؛ چنانچہ العربیۃ نیٹ نے ۱ر نومبر ۲۰۱۰ء کو ایک رپورٹ شائع کی تھی جس کا عنوان ہی تھا: ''صغیرات یفضلن کبار السن والمتزوجین'' (کم عمر لڑکیاں معمر اور شادی شدہ مردوں کو ترجیح دے رہی ہیں)، اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ذہنی سکون اور مالی منفعت کی خاطر بہت سی عرب لڑکیاں کبیر السن مردوں کو ترجیح دیتی ہیں، مثال کے طور پر ایک سولہ سالہ طالبہ کہہ رہی ہے کہ اسے اس پر اطمینان اور مسرت ہے کہ اس کا نکاح ایک چھیاسٹھ سالہ مرد سے ہونے جارہا ہے، ۲۰ سالہ ''حفان'' کا کہنا ہے کہ اس کی پانچ بہنیں ہیں، اور پانچوں کا نکاح شادی شدہ مردوں سے ہوا ہے اور وہ پانچوں آسودگی اور عافیت کی زندگی گزار رہی ہیں۔(۱)

حضرت عائشہؓ سے نکاح کے بارے میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ :

- حضرت عائشہؓ سے نکاح کا مشورہ سب سے پہلے ایک قریشی خاتون حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ ﷺ کو دیا تھا، اگر کمسنی کا نکاح معاشرتی اعتبار سے معیوب ہوتا تو یقیناً وہ خاتون کبھی آپ ﷺ کو اس کا مشورہ نہیں دیتیں۔
- اگر یہ بات معتبر ہوتی تو نہ ہی حضرت عائشہؓ کے والد حضرت ابوبکرؓ اس کے لئے تیار ہوتے نہ ان کی والدہ اُم رومانؓ کبھی اس کے لئے آمادہ ہوتیں۔

---

(۱) دیکھئے: wwwalarbiya.net۔

● نیز مخالفین کو بھی ایک موقع ہاتھ آجاتا اور وہ آپ کی شخصیت کو داغدار کرنے اور آپ کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے؛ لیکن سب کو معلوم ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

● حضرت عائشہؓ اس سے پہلے جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں، بیٹے کی ماں کی طرف سے رشتے کا انکار کئے جانے کے بعد ہی حضرت ابو بکرؓ نے آپ ﷺ سے رشتہ منظور کیا تھا۔

موسم کا اثر

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کمسنی کے نکاح کو معاشرتی طور پر قبول عام حاصل ہونے میں وہاں کی آب وہوا کا بھی بڑا دخل ہے، جس کے نتیجہ میں لڑکیاں جلد مردوں کے قابل ہو جایا کرتی ہیں، خاص کر ایسی لڑکیاں جن میں ذہنی نشوونما کی صلاحیت ہوتی ہے، قامت اور جسم کے اعتبار سے بھی وہ جلد بڑھتی ہیں۔(۱)

حضرت عائشہؓ کا تاثر

اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہؓ اس نکاح کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کبھی اس نکاح پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا؛ بلکہ وہ اس کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھتی تھیں، ان کا ایقان تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت بیوی ہیں، اور کیوں نہ ہو جب کہ شوہر دنیا کے سب سے بہترین انسان، رحمت دو عالم ﷺ ملے تھے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اس شادی کو انتہائی مبارک خیال کرتی تھیں، آپ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی، اس لئے آپ شوال ہی کے مہینہ میں اس قسم کی تقریبوں کو پسند کرتی تھیں، اور کہتی تھیں کہ" میری شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی اور شوہر کے معاملہ میں مجھ سے خوش قسمت کون عوت ہوگی؟"۔(۲)

حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری اور آپ کی مسرت کے حصول

---

(۱) سیرت عائشہ:۲۵۔ (۲) صحیح بخاری، مسلم کتاب النکاح۔

میں شب و روز کوشاں رہتیں، اگر ذرا بھی آپ کے چہرے پر حزن وملال کا اثر نظر آتا، بے قرار ہو جاتیں، رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کا اتنا خیال تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالتی نہ تھیں، ایک دفعہ عبداللہ بن زبیرؓ سے خفا ہو کر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھی تھیں؛ لیکن جب آنحضرت ﷺ کے ننھیالی لوگوں نے سفارش کی تو انکار کرتے نہ بنا، آپ ﷺ کے دوستوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتی تھیں، اور ان کی کوئی بات بھی رد نہیں کرتی تھیں، یہ انتہاء محبت اسی بیوی سے ملتی ہے جو اپنے شوہر کو دل وجان سے چاہتی ہو۔

علم کی اشاعت

حضرت عائشہؓ سے کم سنی میں نکاح کی متعدد مصلحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا نصف حصہ جو عام نگاہوں سے اوجھل تھا وہ اُمت کے سامنے آ گیا اور علم ومعرفت کے اعتبار سے مسلمانوں کو زبردست نفع پہنچا۔

چنانچہ علمی حیثیت سے حضرت عائشہؓ کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف آپ ﷺ کی پاک بیویوں پر اور نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر؛ بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہ رضی اللہ علیہم پر فوقیت حاصل تھی، ترمذی میں حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے :

ما أشكل علينا أصحاب محمد صلى الله وسلم حديث قط فسألنا عائشة إلا وجدنا عندها منه علما۔

ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی نہیں پیش آئی کہ جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ اہم معلومات ہم کو نہ ملی ہوں۔

عطا ابن ابی رباح تابعیؒ جن کو متعدد صحابہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، کہتے ہیں :

كانت عائشة أفقه الناس و أعلم الناس و أحسن رأيا في العامة۔

حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں۔

حفظ حدیث اور سنن نبوی ﷺ کی اشاعت کا فرض گو دیگر ازواج مطہرات بھی ادا کرتی تھیں، تاہم حضرت عائشہؓ کے رتبہ کو ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچی، محمود بن لبیدؒ کا بیان ہے :

کان أزواج النبی صلی الله علیه وسلم یحفظن من حدیث النبی صلی الله علیه وسلم کثیرا ولا مثلا لعائشة و أم سلمة۔

ازواج مطہرات، بہت سی حدیثیں زبانی یاد رکھا کرتی تھیں ؛ لیکن حضرت عائشہؓ اور اُم سلمہؓ کے برابر نہیں۔

امام زہریؒ کی شہادت ہے :

لو جمع علم الناس کلهم وعلم أزواج النبی صلی الله علیه وسلم فکانت عائشة او سعهم علما۔

اگر تمام مردوں کا اور اُمہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جاتا، تو حضرت عائشہؓ کا علم ان میں سب سے وسیع ہوتا۔

کم سنی میں نکاح، مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس نکاح کے متعلق سب سے زیادہ شکوک و شبہات مستشرقین اور عالم نصرانیت نے پیدا کیے ہیں ؛ حالاں کہ اگر ہم نصرانیت کی اندرون خانہ تلاشی لیں تو یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ مسیحی مصادر، مثلاً انسائیکلو پیڈیا آف کیتھولو جیک کے مطابق حضرت مریم علیہا السلام کا نکاح جس وقت یوسف نجار سے ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال اور یوسف نجار کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی۔(۱)

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بات غلط ہے ؛ لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ عیسائی چرچ اس کم سنی اور زوجین کی عمر میں کافی فرق کے باوجود، نکاح کو مناسب خیال کر رہا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عمر کی شادی اس وقت کی ثقافت تھی، جو صرف عربوں میں نہیں ؛ بلکہ پورے عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔

---

(۱) دیکھیے: www.newadvent.org۔

اسی طرح یہودی بڑی تعداد میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے، اور آپ پر لعن طعن کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے؛ لیکن کسی روایت سے ثابت نہیں ہے کہ اس نکاح پر یہودیوں نے کبھی بھی تنقید کی ہو، یہ صاف اور صریح دلیل ہے کہ اس طرح کا نکاح اس وقت کے یہودی معاشرے میں بھی قابل قبول تھا۔

کم سنی کی شادی اور ہندو مذہبی کتابیں

آج کل سنگھ پریوار کے لوگ بھی اس مسئلہ کو افسانہ بنا کر پیش کرتے ہیں، کاش کہ وہ اپنے مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے، حقیقت یہ ہے کہ مختلف ہندو بزرگوں کے ہاں ہمیں مختلف عمر میں شادی کے واقعات ملتے ہیں، خود رامائن اور پُرانوں کے مطابق شادی کے وقت رام جی کی عمر بارہ سے پندرہ برس اور سیتا جی کی عمر محض چھ برس تھی، رامائن میں سیتا جی کہتی ہیں :

> جب ہماری شادی کو بارہ برس گزر گئے، اس وقت میرے شوہر کی عمر پچیس اور میری عمر اُٹھارہ برس تھی۔(۱)

رامائن میں کئی شہادتیں ہیں جس سے سیتا اور رام کی کم عمر میں ہی شادی کی تصدیق ہوتی ہے، اسی طرح مہا بھارت کے مطابق راجہ ابھی منیو سولہ سال کی عمر میں شہید ہوا تھا اور اس وقت اس کی بیوی اُترا حاملہ تھیں، کچھ اسی طرح کی بات ایک برہما پران میں ایک خاتون وِستی سے منقول ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو تہذیب میں کم عمری میں ہی شادی کرنا عام دستور تھا، وِستی اپنے والد سے کہتی ہیں :

- اس سے پہلے کہ لڑکی شرم کے معنی سمجھنے کے قابل ہوجائے، مٹی میں کھیلنے کودنے کی عمر کے اندر ہی بیاہ کردینا چاہئے۔(۲)
- چار سے دس برس کی عمر کے اندر ہی باپ کو اپنی لڑکی کا بیاہ کسی

---

(۱) رامائن، ارنیہ کانڈ، سرگ : ۴۷، اشلوک : ۱۱، ۱۰، ۴۔

(۲) برہما پُران، اشلوک : ۱۴۔

> صاحب علم، معروف جوان اور اچھے خاندان کے لڑکے سے کر دینی
> چاہیئے، جو باپ اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کرتا، وہ جہنم میں جائے گا۔(۱)

گوتم دھرم سوتر سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے :

> بلوغت کو پہنچنے سے قبل ہی لڑکی بیاہ دینی چاہیئے، جو شخص (یعنی لڑکی کا
> سرپرست) ایسا نہیں کرتا، وہ گناہگار ہوگا، حتیٰ کہ بعض (علماء) کے
> مطابق لڑکی کپڑے پہننے (کی عمر) سے پہلے ہی بیاہ دینی چاہیئے۔(۲)

نیز منو سمرتی کے مصنف مشورہ دیتے ہیں کہ شادی کے وقت لڑکی اور لڑکے کی عمر میں زیادہ فرق ہونا چاہیئے، منو جی کہتے ہیں :

> تیس سال کا مرد بارہ سال کی لڑکی سے شادی کرے، جو اسے خوش
> رکھ سکے، یا چوبیس سال کا مرد آٹھ سالہ لڑکی سے شادی کرے، تاہم
> دوسرے فرائض حائل نہ ہوں تو اسے جلد شادی کر لینی چاہیئے۔(۳)

گویا بہتر ہے کہ لڑکی کی شادی ۱۲ سال اور ۸ سال سے بھی کم میں کر دینی چاہیئے۔

یورپی معاشرے میں کم سنی کے نکاح کا تصور

ایک تحقیق کے مطابق انیسویں صدی کے اوائل تک یورپی ممالک میں دس سال کی عمر میں شادی کا رواج معروف اور رائج رہا ہے۔(۴)

اسی طرح واشنگٹن پوسٹ میں سارہ بوڈمین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں وہ مان رہی ہیں کہ اس دور میں میں بھی مغربی دنیا میں نو سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔(۵)

---

(۱) برہما پران، ادھیائے: ۱۶۵، اشلوک: ۷۔

(۲) گوتم دھرم سوتر، ادھیائے: ۱۸، اشلوک: ۲۱ تا ۲۳۔

(۳) منو دھرم شاستر، باب: ۹، اشلوک: ۹۴۔

(۴) دیکھئے وکی پیڈیا کی سائٹ: wiki\Ages of consent۔

(۵) دیکھئے: واشنگٹن پوسٹ: ۱۰ / مئی ۲۰۰۶ء۔

اسی طرح بی بی سی کی سائٹ پر ایک رپورٹ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اسپین سے تعلق رکھنے والی ایک کمسن بچی نے اپنا پہلا بچہ محض دس سال کی عمر میں جنم دیا ہے اور اس کا خاندان اس پر بے انتہا مسرور ہے ؛ بلکہ اس کی دادی کو بلاوجہ اس واقعہ کو میڈیا میں اہمیت دیئے جانے پر سخت تعجب ہے؛ کیوں کہ یہ اس معاشرہ کے لئے عام سی بات ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ عقلاً یا عرفاً کسی بھی طرح یہ نکاح، قابل مذمت نہیں ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شریعت کم سنی میں نکاح کی دعوت دے رہی ہے؛ لیکن اگر خاص مصالح کے پیش نظر طرفین کی رضامندی سے اس طرح کے نکاح کی نوبت آتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔



حضرت زینبؓ سے نکاح ☆

آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد اپنی حیات طیبہ کے آخری مرحلہ میں مختلف دینی، اصلاحی، دعوتی اور سیاسی واجتماعی اغراض کے تحت متعدد نکاح فرمائے، حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کا مقصد زمانہ جاہلیت میں پھیلی ہوئی ایک غلط رسم اور ناروا رواج کا خاتمہ تھا، اس کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل موضوعات پر گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

(۱) حضرت زینبؓ، اوران کا خاندانی پس منظر۔

(۲) حضرت زید بن حارثہؓ کا رسول اللہ ﷺ سے تعلق۔

(۳) حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ سے نکاح۔

(۴) حضرت زینبؓ سے علاحدگی کے اسباب۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس کی حکمت ومصلحت۔

(۶) حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس سلسلے میں اعدائے اسلام کے شبہات۔

حضرت زینبؓ اوران کا خاندانی پس منظر

امّ المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کا تعلق قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تھا، ماں کا نام اُمیمہ بنت عبدالمطلب تھا جو رسول اللہ ﷺ کی حقیقی پھوپھی تھیں، اس لحاظ سے حضرت زینبؓ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، حضرت زینبؓ ان خوش قسمت لوگوں میں سے

☆ یہ تحریر عزیزی مفتی شوکت ثنا قاسمی سلمہ کی ہے، جو انھوں نے اس حقیر کی دعوت پر المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے تحت منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیرت سیمینار کے لئے لکھی تھی، جو سیمینار کے مضامین کے مجموعہ کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، یہاں بعض تبدیلیوں کے ساتھ اسی کو شامل کیا جارہا ہے اوراخیر میں خلاصہ کلام کے عنوان سے اس حقیر کی تحریر کا اضافہ ہے۔

تھیں جنھیں بالکل ابتدائی دور میں ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا، آپ کے نبی بنائے جانے کے تیرہویں سال اپنے اہل خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئیں، وہ نہایت دین دار، پرہیز گار، حق گو اور صدقہ وخیرات کرنے والی خاتون تھیں، ان کی عبادت و زہد کا اعتراف خود رسول اللہ ﷺ کو تھا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ مہاجرین کی ایک جماعت میں مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، حضرت زینبؓ بھی اس موقع پر موجود تھیں، انھوں نے کوئی ایسی بات کہی، جو حضرت عمر فاروقؓ کو ناگوار گزری، انھوں نے ذرا تلخ لہجے میں حضرت زینبؓ کو دخل دینے سے منع کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمر! ان سے کچھ نہ کہو، یہ اوّاہ یعنی بڑی عبادت گزار اور اللہ سے ڈرنے والی ہیں''۔(۱)

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کے متعلق فرمایا: ''میں نے دین کے معاملے میں زینب سے بہتر، اللہ سے ڈرنے والی، سچی بات کرنے والی، صلہ رحمی کرنے والی اور امانت داری وصدقہ کرنے میں بڑھ کر نہیں دیکھا''۔(۲)

کچھ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگادی تھی، حضرت زینبؓ کی حقیقی بہن حمنہ بنت جحشؓ بھی اس سلسلہ میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھیں؛ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ سے حضرت عائشہؓ کے متعلق استفسار کیا تو اس کے باوجود کہ سوکن ہونے کے لحاظ سے حضرت عائشہؓ سے ان کی چشمک رہا کرتی تھی، انھوں نے صاف صاف کہہ دیا: ''میں عائشہ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں پاتی''۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا: ''تم میں سے مجھ سے سب پہلے وہ ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا'' لمبے ہاتھ سے حضور ﷺ کی مراد فیاضی تھی، حضرت زینبؓ بے حد فیاض اور مخیّر تھیں؛ چنانچہ اس پیشین گوئی کا وہ مصداق ثابت ہوئیں اور حضور ﷺ کی تمام ازواج میں سب سے پہلے انھوں نے ہی وفات پائی، حضرت زینبؓ

(۱) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۱۵۴۔ (۲) اسد الغابۃ: ۷/۱۲۶۔

خود اپنی قوت بازو سے روزی کماتی تھیں، وہ چمڑوں کو صاف کرنے (دباغت) کا فن جانتی تھیں، اس سے جو آمدنی ہوتی تھی، اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتی تھیں۔(۱)

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام اُمہات المومنین کے لئے خطیر وظیفہ مقرر کر دیا تھا، حضرت زینبؓ یہ وظیفہ پاتے ہی حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں، ایک دفعہ سالانہ وظیفہ ملا تو اسے اپنے رشتہ داروں اور یتیموں میں تقسیم کر کے دُعا فرمائی: ''اے اللہ! آئندہ یہ مال مجھ کو نہ ملے؛ کیوں کہ یہ بڑا فتنہ ہے'' حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''زینب بہت خیرات کرنے والی خاتون ہیں'' پھر مزید ایک ہزار درہم حضرت زینبؓ کی خدمت میں بھیجے، انھوں نے وہ بھی فوراً خیرات کر دیئے۔

ان کا انتقال حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت ۲۰ ہجری میں ہوا، اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی حضرت عمرؓ نے ہی نماز جنازہ پڑھائی، ان کے انتقال سے مدینہ کے فقرا، اور مساکین میں حشر برپا ہو گیا؛ کیوں کہ وہ ان کی مربی و دستگیر تھیں، وفات کے وقت سوائے ایک مکان کے کوئی ترکہ نہ چھوڑا، سب کچھ اپنی زندگی میں راہ خدا میں لٹا چکی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے ان کی وفات کے موقع پر فرمایا:

> وہ نیک بخت عبادت گزار خاتون چلی گئیں اور یتیموں اور بیواؤں کو بے چین چھوڑ کر گئیں۔(۲)

حضرت زید بن حارثہؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق

آپ کا نام زید، کنیت ابو اسامہ، اور لقب حِب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تھا، والد کا نام حارثہ اور والدہ کا نام سعدی بنت ثعلبہ تھا، حضرت زیدؓ کے والد حارثہ بنی قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے، جو یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ تھا، ان کی والدہ سعدی بنت ثعلبہ بنی معن سے تھیں، جو قبیلہ طے کی ایک شاخ تھی، وہ ایک مرتبہ اپنے کم عمر بچے حضرت زیدؓ کو ساتھ لے کر اپنے میکہ گئیں،

(۱) طبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/۸۸۔ (۲) اسد الغابۃ: ۷/۱۲۶، تفصیل کے لئے دیکھئے: اسد الغابۃ: ۷/۱۲۶، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۱۵۳، طبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/۸۰۔

اسی اثناء میں بنوقین کے سوار جو غارت گری سے واپس آرہے تھے، اس نونہال کو خیمہ کے سامنے سے اُٹھالائے اور غلام بنا کر عکاظ کے بازار میں فروخت کے لئے پیش کیا، کم عمر بچہ کی قسمت تھی؛ چنانچہ حکیم بن حزام نے چارسو درہم میں خرید کر اپنی پھوپھی اُم المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کی خدمت میں پیش کیا، جن کی وساطت سے سرورِ دوعالم ﷺ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت زیدؓ کے والد حارثہ بن شرجیل کو قدرۃً اپنے لختِ جگر کے گم ہوجانے کا شدید غم ہوا، سیرت نگاروں نے حارثہ بن شرجیل کے ان اشعار کو نقل کیا ہے، جوانھوں نے حضرت زید کی جدائی میں کہے تھے، یہ اس رنج واندوہ پر شاہد عدل ہیں، (۱) اس حادثے کو کئی برس گزر گئے، شرجیل ایک دن اپنے گھر میں بیٹے کی یاد میں غمگین بیٹھے تھے کہ ان کے رشتہ داروں میں سے کچھ لوگ ان سے ملنے آئے، یہ لوگ حج کر کے لوٹے تھے، انھوں نے حارثہ بن شرجیل کو مکہ میں زید کی موجودگی کی اطلاع دی تو تعجب سے ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور بولے: رب کعبہ کی قسم، کیا میرا ہی نورِ نظر تھا؟ ان لوگوں نے جب تفصیل کے ساتھ حلیہ، جائے قیام اور مربی کے حالات بیان کئے تو اسی وقت اپنے بھائی کعب بن شرجیل کو ہمراہ لے کر مکہ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور حضرت سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر بصد منت ولجاجت عرض کیا: ''اے ابن عبداللہ! اے ابن عبدالمطلب! اے اپنی قوم کے رئیس زادہ! تم اہل حرم اور اس کے مجاور ہو، مصیبت زدوں کی دستگیری کرتے ہو، قیدیوں کو کھانا دیتے ہو، ہم آپ کی خدمت میں اس غرض سے آئے ہیں کہ ہمارے لڑکے کو آزاد کر کے ہم پر احسان کیجئے، آپ سے درخواست ہے کہ آپ جس قدر رقم چاہیں لے لیں، مگر میرے بیٹے کو آزاد کردیں، میری آنکھیں اس کا پیارا چہرہ دیکھنے کو ترس رہی ہیں'' آپ نے پوچھا وہ کون ہے؟ کہا: زید بن حارثہؓ! آنحضرت ﷺ نے حضرت زید کا نام سنا تو کچھ سوچ میں پڑ گئے، پھر ارشاد فرمایا: کیا اس کے علاوہ آپ کے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں؟ حارثہ نے جواب دیا: نہیں اے مہربان

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: طبقات الکبریٰ: ۳/۲۹۔

سردار! ہم تو بیٹے کو منہ مانگی قیمت پر لینے آئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں زید کو با اختیار دیتا ہوں، اگر وہ آپ کو پہچان لے اور آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے تو اسے بخوشی لے جایئے، مجھے اس کے بدلے ایک درہم بھی لینا گوارہ نہیں؛ لیکن اگر وہ مجھے ترجیح دے تو خدا کی قسم! میں ایسا نہیں ہوں کہ اپنے ترجیح دینے والے پر کسی کو ترجیح دوں، حارثہ اور اس کے بھائی کعب ایک ساتھ بولے: ''اے شریف زادے! اس سے بڑھ کر اور اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟ آپ نے تو حق اور انصاف سے بڑھ کر بات کی ہے'' حضرت زیدؓ بلائے گئے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟ عرض کیا: جی ہاں! یہ میرے باپ اور چچا ہیں'' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''زید تم مجھے بھی پہچانتے ہو، میرا خاندان بھی تمہیں معلوم ہے، میں نے جو شفقت و محبت کا معاملہ تم سے رکھا ہے، اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو، فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے، تم پر کوئی زبردستی نہیں، تم چاہو تو خوشی کے ساتھ اپنے باپ کے ساتھ جا سکتے ہو، چاہو تو یہاں بھی ٹھہر سکتے ہو، تم پر کوئی زور وزبردستی نہیں''۔

حضرت زیدؓ کو آپ کی غلامی میں جو پیار ملا تھا، اس پر صدہا آزادیاں نثار کی جا سکتی ہیں، حضرت زید کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی، بولے میں ایسا نہیں ہوں جو حضور ﷺ پر کسی کو ترجیح دوں، آپ ہی میرے ماں باپ ہیں، اور میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، زید کی بات میں محبت کا ایک سمندر تھا جو ان کے جملوں سے امڈ رہا تھا، باپ اور چچا کے لئے یہ سب کچھ ناقابل تصور اور ناقابل یقین تھا، باپ نہ جانے کب سے بیٹے کی محبت کا چراغ سینے میں جلائے، اسے وادی وادی تلاش کر رہا تھا؛ لیکن بیٹے کا جواب سن کر حیرت اور دکھ سے بولا: ''اے زید تم پر افسوس! آزادی، باپ، چچا اور خاندان پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو؟ خدا کی قسم، تمہاری تلاش میں کونسا ایسا پتھر ہوگا، جو میں نے نہ اُلٹا ہوگا؟ اور اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم ان صاحب کو نہیں چھوڑ سکتے، اپنے باپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتے!'' حضرت زید نے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا: اے والد محترم! آپ نے درست فرمایا؛ لیکن مجھے اس ذات پاک میں ایسی خوبیاں نظر آئی ہیں کہ میں ان پر کسی کو کبھی ترجیح نہیں دے سکتا، میں نے ان کے اندر جو کمالات

اورخوبیاں دیکھی ہیں، اس کے بعد یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں انھیں چھوڑ دوں' ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

حضرت زیدؓ نے اپنی غیر متزلزل وفاشعاری سے آقائے شفیق کے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو مشتعل کر دیا، آنحضرت ﷺ نے خانہ کعبہ میں مقام حجر کے پاس ان کو لے کر اعلان فرمایا کہ زید آج سے میرا بیٹا ہے، میں اس کا وارث ہوں گا، وہ میرا وارث ہوگا، اس اعلان نے زید کے باپ اور چچا دونوں کے تنگ سینے کو کھول دیا، ان کے اترے ہوئے چہروں اور مایوس آنکھوں میں ایک دم سے نئی زندگی اور نئی چمک پیدا ہوگئی؛ اگرچہ والد کو بیٹے کی جدائی گوارا نہیں تھی؛ تاہم اپنے لختِ جگر کو ایک شفیق ومعزز باپ کی آغوشِ محبت میں دیکھ کر اطمینان ہوگیا، حارثہ سوچ رہے تھے کہ مجھے تو بیٹے کی عزت اور بہتری سے غرض ہے، اس کی خوشی عزیز ہے، اگر وہ یہاں خوش ہے تو میری خوشی بیٹے کی خوشی کے ساتھ ہے، انھوں نے بھی اس فیصلے کو وہیں کھڑے ہو کر قبول کرنے کا اعلان کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے انھیں اجازت دی کہ جب چاہیں یہاں آکر اپنے بیٹے سے مل سکتے ہیں اور آپ نے زید کو بھی نصیحت کی کہ وہ اپنے والدین سے ملاقات کے لئے جایا کرے، یہ اس دور کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر نہیں بنائے گئے تھے، زید کو یہ علم نہ تھا کہ جس ہستی کو وہ اپنے والدین پر ترجیح دے رہے ہیں، ایک دن ان کے سر پر نبوت کا تاج ہوگا۔

اس اعلان کے بعد حضرت زیدؓ حضرت ﷺ ہی کے انتساب کے ساتھ زید بن محمد کہلانے لگے، یہاں تک کہ جب اسلام کا زمانہ آیا اور قرآن پاک نے حکم دیا کہ کسی بھی شخص کو نسبی باپ کی نسبت ہی سے پکارا جائے، تو وہ پھر حارثہ کی نسبت سے زید بن حارثہ مشہور ہوئے۔(۱)

قبولِ اسلام

حضرت زید بن حارثہؓ آٹھ سال کی عمر میں گرفتار ہوئے تھے، سات سال حضرت خدیجہؓ

---

(۱) طبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۹، اسد الغابہ: ۲/ ۳۵۰، الاصابہ فی تمیز الصحابہ: ۲/ ۴۹۴، تہذیب التہذیب: ۳/ ۴۰۱، الاستیعاب: ۲/ ۵۴۔

کے پاس رہے، پندرہ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے جانے کے وقت آپ کی عمر تیس سال تھی، گویا کہ بعثت سے پہلے آپ کی تربیت میں پندرہ سال کا عرصہ گذر چکا تھا؛ چنانچہ بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر سب سے پہلے جن حضرات نے لبیک کہا تھا، ان میں حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی تھے، غلاموں میں سب سے پہلے وہی ایمان لائے تھے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح

مکہ مکرمہ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں ہی خاندان کے ایک فرد کی طرح رہا کرتے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھائی چارہ کرادیا، ان دونوں میں اس قدر محبت ہوگئی تھی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غزوات میں تشریف لے جاتے تھے تو ان ہی کو اپنا وصی (متروک کا نگراں) بنا کر جاتے تھے، جب مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو پہلے ہی مدینہ بھیج دیا اور وہ اُسید بن حضیر انصاری رضی اللہ عنہ جو قبیلہ عبدالاشہل کے سردار کے یہاں ٹھہرائے گئے، کچھ دنوں بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ تشریف لے آئے تو اسید رضی اللہ عنہ بن حضیر کو ان کا اسلامی بھائی قرار دیا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو علاحدہ کرنے میں یہ حکمت تھی کہ لوگ انھیں ایک آزاد اور خود مختار شخص کی حیثیت سے پہچانیں، ان کی اسی حیثیت کو مزید مستحکم اور مؤکد کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور اہم اقدام کیا، یہ اقدام حضرت زید رضی اللہ عنہ کے عزت و شرف کو بڑھانے کے لئے اہم سنگ میل رکھتا تھا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر پیغامِ نکاح بھیجا، عرب معاشرہ میں چوں کہ غلاموں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور آزاد ہونے کے بعد بھی انھیں سماج میں عزت و وقار کا مقام حاصل نہ ہوتا تھا؛ اس لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی اور لوگوں کو یہ رشتہ بالکل پسند نہیں آیا کہ قریش جیسے معزز اور اعلیٰ خاندان کی معزز خاتون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپی زاد بہن کو آپ کے آزاد کردہ غلام کی زوجیت میں دیا جائے، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی یہ آیت نازل فرمائی:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَ رَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ۔ (الاحزاب:۳۶)

جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمادیں، تو کسی مومن مرد و عورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس آیت کے نازل کے بعد حضرت زینب بنت جحش ؓ اور ان کے خاندان کے لوگ اس نکاح کے لئے تیار ہو گئے، اور حضرت زید ؓ کا نکاح زینب بنت جحش ؓ سے ہو گیا، یہ اسلام کا معجزہ تھا کہ اس نے سابق غلام حضرت زید ؓ کو جو عرب معاشرہ میں کسی بھی عرب خاتون کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے تھے، انھیں قریش کے نہایت اعلیٰ خاندان کی معزز خاتون حضرت زینب بنت جحش ؓ کا کفو (ہمسر) بنادیا، یہ نکاح اس معاشرے کو اسلامی اقدار سکھلانے کی ایک اہم کڑی تھی، لوگ حیرت سے گفتگو کرتے تھے کہ ''ایک قریشی خاندان کی عورت کو ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ بیاہ دیا گیا''۔

حضرت زینب ؓ سے علاحدگی کے اسباب

حضرت زینب ؓ نے نکاح سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا: ''یا رسول اللہ! میں زید کو اپنے لئے پسند نہیں کرتی''، لیکن حضور ﷺ اس نکاح میں بہتری سمجھتے تھے؛ اس لئے آپ ﷺ نے سیدہ زینب بنت جحش ؓ کو بطور خاص اس شادی کے لئے آمادہ کیا تھا، وہ آمادہ ہو گئیں، مگر ان کے ذہن میں یہ بات بہرکیف تھی کہ ان کی شادی ایک آزاد کردہ غلام سے ہو رہی ہے، ایک تو خاندانی شرف کا تفاوت بہت تھا، دوسرے دونوں میاں بیوی میں مزاج کا بھی بہت فرق نکلا، زینب بنت جحش ؓ ایک اونچے خاندان کی باوقار خاتون تھیں، وہ حساس بھی تھیں اور رکھ رکھاؤ والی بھی، دوسری طرف زید ؓ ایک حساس، خوددار اور منکسر المزاج انسان تھے، وہ نبی اکرم ﷺ کی دلداریوں کے باوجود اپنے دورِ غلامی کو نہیں بھولے تھے، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے زینب ؓ کو اصرار کر کے شادی پر آمادہ

کیا ہے، اس پس منظر میں حضرت زینبؓ اگر اپنے فطری مزاج کے مطابق کبھی ذرا سپاٹ رویہ دکھاتیں تو زیدؓ اسے انھیں معنوں میں لیتے کہ میری اہلیہ مجھ پر اپنی خاندانی برتری جتانا چاہتی ہیں، ان دونوں کے درمیان کچھ ہی دنوں کے بعد ازدواجی تعلقات کشیدہ ہوگئے، حضرت زیدؓ اکثر رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور کہتے کہ زینبؓ اس تعلق سے خوش نہیں ہیں، وہ اس کا اظہار تند و تیز لہجے میں کرتی ہیں، حضور ﷺ نے پہلے تو انھیں سمجھایا، کبھی نرم لہجے میں کبھی سخت لہجے میں، اور انھیں اللہ سے ڈرنے اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنی بیوی سے نباہ کرتے رہنے کا حکم دیا، حضرت زیدؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کچھ دنوں گزارہ کیا؛ لیکن جب انھوں نے پوری طرح محسوس کرلیا کہ طبیعت کے اختلاف اور ذوق و مزاج کی ناہمواری کی وجہ سے دونوں کی زندگی خوشگوار نہیں گزر سکتی اور نہ ہی نکاح کے مقاصد پورے ہوسکتے ہیں۔

تو ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور اپنا فیصلہ سنا دیا کہ میں زینبؓ کو طلاق دینا چاہتا ہوں! حضور ﷺ نے زیدؓ کو روکا اور سمجھانے کی کوشش کہ وہ زینب کو طلاق نہ دیں، اور یہ طلاق کے لیے ان کی بتائی ہوئی وجہ کافی نہیں ہے، آپ ﷺ کی یہ بات سن کر حضرت زیدؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر آپ مجھے اللہ کا حکم پہنچا رہے ہیں کہ میں طلاق نہ دوں تو میں سر تسلیم خم کر دیتا ہوں؛ لیکن اگر آپ ﷺ یہ بات ایک مشفق سرپرست اور بزرگ کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں تو میری گزارش ہے کہ ''اب یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہوگیا ہے، میں مزید صبر نہیں کرسکتا ہوں'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بتایا کہ وہ یہ بات اللہ کے رسول کی حیثیت سے نہیں؛ بلکہ ایک مشفق سرپرست کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں، تو حضرت زیدؓ نے عرض کیا: تو مجھے میرے فیصلوں اور ارادوں میں آزاد رہنے دیں، میں زینبؓ کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتا، یہ حضرت زیدؓ کا آخری فیصلہ تھا، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ زور دیتے تو جبر اور زبردستی کی حد شروع ہو جاتی؛ اس لئے آپ ﷺ خاموش ہوگئے، اور حضرت زیدؓ نے ایک سال کے بعد حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔

یہ واقعہ حضرت زینبؓ اور ان کے اہل خاندان کے لئے بہت بڑا حادثہ تھا، وہ لوگ تو پہلے ہی سے اس رشتے کے لئے تیار نہ تھے، محض اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بنیاد پر انھوں نے اس کو قبول کرلیا تھا، اور اب طلاق کی ذلت اس قریشی خاتون اور ان کے اہل خاندان کے لئے مزید تکلیف کا باعث، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بھی حضرت زیدؓ کا یہ اقدام کئی وجوہ سے پریشانی کا باعث بن گیا، ایک اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس اعلیٰ مقصد کے لئے یہ رشتہ کرایا تھا، وہ مقصد اس طلاق سے مجروح ہوا تھا، دوسری وجہ یہ کہ حضرت زینبؓ، جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصرار پر رشتے کو قبول کیا تھا، ان کی حیثیت عرفی کو بڑا نقصان پہنچا، ان کا غم دہرا ہوگیا، پہلے انھوں نے منافقین کے یہ طعنے سنے کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں اور اب ان کو یہ سننا پڑا کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ ہیں۔(۱)

اس سب معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت زیدؓ کو بہت حد تک بری الذمہ سمجھتے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا، ایک حساس اور خوددار انسان ہونے کے ناتے کیا، یہی وجہ تھی کہ اس سب کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کوئی شکایت نہ کی؛ البتہ اس نکاح سے شریعت کا جو بنیادی مقصود و مطلوب تھا، وہ حاصل ہوگیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس کی حکمت و مصلحت

حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی بڑھی تھیں اور آپ کے ہی مشورہ پر حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی ہوئی تھیں، جو اُن کے نزدیک ان کی شان کے خلاف تھا، اب جب کہ طلاق کے صدمے سے دوچار تھیں تو ان کی دلداری کی واحد شکل یہ باقی رہ گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو خود نکاح میں لے لیں، اور ایک بے جا رسم کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی بھی یہی تھی؛ لیکن ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔

یوں تو حضرت زینبؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح کی اور بھی مصلحتیں تھیں؛ لیکن ان میں سے دو مصلحتیں بہت اہم تھیں :

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الباری: تفسیر سورہ احزاب، تدبر قرآن: ۶/ ۲۲۸، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تعدد ازدواج۔

(۱) عرب کے معاشرہ میں غلاموں کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، ان کے آزاد ہونے کے بعد بھی سماج میں ان کو نیچا اور حقیر ہی باور کیا جاتا تھا، عرب میں ایک تو ویسے بھی ذات پات کا تصور لوگوں کے دل و دماغ میں رچا بسا ہوا تھا، جس کو تعلیم و ترقی کے اس دور میں بھی ہم ہندو سماج میں دیکھ سکتے ہیں، یہ کیفیت اسلام سے پہلے عربوں میں بھی تھی، قریش کو عرب میں اسی طرح پیدائشی طور پر باعزت سمجھا جاتا تھا، جیسے ہندوستان کے معاشرہ میں برہمنوں کو سمجھا جاتا ہے، غلام آزاد کرنے کے بعد بھی اس لائق نہیں سمجھا جاتا تھا کہ کسی معزز خاندان کی لڑکی سے اس کی شادی ہو، اس ماحول میں اسلام نے انسانی مساوات کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ کسی خاص خاندان، نسل، علاقہ اور زبان سے تعلق کی وجہ سے کوئی بڑا یا کوئی چھوٹا نہیں ہوتا، اپنے کردار اور اخلاق کی وجہ سے انسان بڑا یا چھوٹا ہوتا ہے :

ألا لا فضل لعربي على عجمي ، ولا لعجمي على عربي ،
ولا لأحمر على أسود ، ولا لأسود على أحمر إلا بالتقوى ،
إن اکرمکم عند الله أتقاکم ۔ (۱)

آگاہ ہو جاؤ! کسی عربی کو غیر عربی پر اور غیر عربی کو عربی پر، نیز کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، ہاں فضیلت تقویٰ کی بنیاد پر ہے، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو۔

اکثر نظریہ جب تک عمل کے سانچے میں ڈھل نہیں جاتا ہے اس کو قوت اور قبولیت حاصل نہیں ہوتی، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر کے غلاموں کو عزت و احترام دینے کی ایک عملی مثال پیش فرمائی، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد قریش کی متعدد لڑکیاں آزاد کردہ غلاموں سے بیاہی گئیں اور غلاموں کی تحقیر کا جو تصور لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا، اس کا ازالہ ہو گیا۔

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۴۸۹، شعب الایمان، حدیث نمبر: ۴۷۷۴۔

(۲) دور جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کو زندگی کے تمام معاملات واحکام میں حقیقی فرزند کا مقام دیا جاتا تھا، اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا پسندیدہ دین اور تنہا راہ نجات قرار دیا اور تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کر کے ایک صالح اور برتر نظام زندگی کی حیثیت سے قیامت تک کے انسانوں کے لئے روئے زمین پر برپا کیا، اس کے پیش نظر ایسی تمام غلط روایات اور باطل رسوم ورواج کو ختم کرنا بھی تھا؛ لیکن چوں کہ عرب معاشرہ میں اس کی جڑیں بڑی گہرائی میں پیوست تھیں اور بہت وسیع پیمانہ پر اس کا رواج تھا، اس لئے محض قولی ہدایت کے ذریعہ لوگوں کے ذہن سے اس کی قباحت وشناعت کو نکالنا اور اس رسم کو بالکلیہ طور پر ختم کرنا مشکل تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ خود اپنے حبیب اور رسول ﷺ کے ذریعہ اس کا خاتمہ کریں؛ چنانچہ اس نے وحی کے ذریعہ اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے سابق غلام اور متبنیٰ حضرت زیدؓ کی منکوحہ اور مطلقہ زینبؓ سے نکاح کر کے اس رسم جاہلیت کا ازالہ فرمائیں، اور اسلام کے پاکیزہ اور سنہرے فطری اُصولوں کو فروغ دیں؛ تاکہ پھر اس کے بعد کسی کو اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کرنے میں کوئی تامل اور تردد باقی نہ رہے؛ لیکن آپ ﷺ کو اس کا اندیشہ تھا کہ منافقین اس پر نکتہ چینی کریں گے کہ ''محمد ﷺ نے اپنی بہو سے نکاح کرلیا'' اس بناء پر آپ ﷺ کو اس میں تامل ہو رہا تھا، اور آپ ﷺ اس سلسلے میں فوری قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے، حتیٰ کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ آپ ﷺ لوگوں سے ڈر رہے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اللہ سے ڈریں۔(۱)

اور حکم الٰہی کے مطابق یہ مبارک رشتہ انجام پا گیا ارشاد باری ہے :

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللهِ مَفْعُولًا ۔ (الاحزاب:۳۷)

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ اور تعدد ازدواج: ۳۰-۳۱۔

اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے، جس پر اللہ نے انعام کیا
اور آپ نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے
ڈر، اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپا رہے تھے جسے اللہ تعالیٰ
ظاہر فرمانے والا تھا، اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے اور آپ کو یہ
سزاوار ہے کہ اللہ سے ڈریں، پھر جب زید اس سے اپنی حاجت
پوری کر چکا تو ہم نے اس عورت کا آپ سے نکاح کر دیا؛ تاکہ
مسلمانوں پر اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی
تنگی نہ رہے جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم پورا
ہونے ہی والا تھا۔

غرض کہ اس نکاح کا مقصد دورِ جاہلیت کی اسی قدیم رسم کو ختم کرنا تھا۔

رہ گئی وہ روایتیں جو اہل یورپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کے سلسلے میں نقل کی ہیں اور سیرت نبوی کے سورج سے زیادہ روشن دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ سب بے اصل ہیں، مفسرین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معتبر روایتوں کے ساتھ ساتھ ضعیف و نامعتبر روایات کو بھی نقل کرتے چلے جاتے ہیں؛ لیکن جن اہل علم نے اِن روایات کو نقل کیا ہے، انھوں نے ہی اِن کو ضعیف و نامعتبر بھی قرار دیا ہے، اس لئے اِن سے استدلال درست نہیں۔

خلاصۂ کلام

(۱) حاصل یہ ہے کہ حضرت زینبؓ سے پہلے حضرت زیدؓ کا نکاح اور ان کے طلاق دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو اہم ترین شرعی مصلحتوں کی بنا پر ہوا:

(الف) عرب شادی بیاہ میں ذات پات کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور یہ تصور ان کے یہاں اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ قریشی غیر قریشی، عربی اور عجمی، آزاد، غلام اور آزاد شدہ غلام کے درمیان ایک طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی تھی، اسلام نے جس مساوات کی تعلیم دی ہے، اس کے لئے اس تصور پر ضرب کاری لگانا ضروری تھا اور کسی غلط رواج کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ

اس کو زبان سے بھی بُرا کہا جائے اور قوم کا مقتدیٰ اپنے عمل کے ذریعہ اس رواج کا غلط ہونا ثابت کردے، اس حیثیت سے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور شخصیت نہیں ہوسکتی تھی؛ چنانچہ آپ نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کردیا، مسلم معاشرہ پر ہمیشہ کے لئے اس کا گہرا اثر پڑا؛ چنانچہ امام زین العابدین بن علی بن حسینؒ نے حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد اپنی والدہ کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے کردیا، اور آپ کو جو باندی مالِ غنیمت میں ملی تھی جس کا نام غزالہ تھا، ان کو آزاد کر کے ان سے خود نکاح کرلیا؛ بنو اُمیہ میں جاہلیت کا تفاخر کی بوخو بہت بعد تک باقی رہی؛ چنانچہ ولید بن عبد الملک نے ان کو دونوں باتوں پر طعنہ دیا، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کیا ہے، حضور ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا اور اپنے آزاد کردہ غلام سے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح کیا، اس کے علاوہ حضرت مقداد بن اسودؓ کا نکاح حضرت ضباعہ بنت زبیرؓ سے، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کا نکاح فاطمہ بنت ولیدؓ سے اور حضرت بلالؓ کا نکاح حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی بہن سے اسی طریقہ پر ہوا، (۱) یہ خواتین قریش کے معزز قبائل سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کا نکاح آزاد کردہ غلاموں سے ہوا۔

(ب) زمانۂ جاہلیت میں لے پالک کی قدیم رسم آرہی تھی، لاولد، اولادِ نرینہ سے محروم اور خوبصورت صحت منداولاد کے طلب گار حضرات کسی کے بچہ کو گود لے لیتے تھے، اس کو تمام حقوق میں حقیقی اولاد کا درجہ دیا جاتا تھا، یہ بات انصاف اور قانونِ فطرت کے خلاف تھی، انصاف کے خلاف اس لئے تھی کہ اس کی وجہ سے باپ کی جائیداد میں حقیقی اولاد کا حصہ کم ہوجاتا تھا اور خلافِ فطرت اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اور والدین کے رشتہ کا ایک فطری نظام قائم فرمایا ہے، جو ایک مرد وعورت کے صنفی تعلق سے اور عورت کے حمل وولادت کی تکلیف برداشت کرنے سے وجود میں آتا ہے، منھ کے بول کے ذریعہ اولاد اور والدین کا رشتہ قائم ہوجانا فطرت کے اس قانون کے خلاف ہے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۴؍۱۸۷۔

یہ دونوں باطل تصورات حضرت زینبؓ کے پہلے حضرت زیدؓ کے نکاح میں جانے اور پھر رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آنے سے پاش پاش ہوگئے۔

(ا) حضرت زینبؓ سے متعلق جو روایتیں مخالفین کی طرف سے نقل کی جاتی ہیں، ان کو اہل فن نے ضعیف اور نامعتبر قرار دیا ہے اور جب کسی کی نقل کی ہوئی روایت سے استدلال کیا جائے تو یہ ضروری ہے کہ خود اس کے مقرر کردہ اُصول کو بھی اہمیت دی جائے اور محدثین کے اُصول پر یہ روایتیں ضعیف و نامعتبر ہیں۔ (فتح الباری لابن حجر: ۸/ ۵۲۴)

(۳) کسی بات کے معتبر اور نامعتبر ہونے کو پرکھنے میں خارجی قرائن کی بھی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے، اس واقعہ میں مختلف قرائن ہیں جو اس روایت کے غیر معتبر ہونے کو واضح کررہے ہیں :

(الف) حضرت زینب بنت جحشؓ آپ ﷺ کے لئے کوئی اجنبی خاتون نہیں تھیں، آپ نے ان کو بچپن سے جوانی تک دیکھا، جب آپ سے نکاح ہوا تو ان کی عمر ۳۶ سال تھی، (سیرت النبی: ۲/ ۲۳۲، علامہ شبلی نعمانیؒ) اور اس وقت تک پردہ کا حکم نافذ نہیں ہوا تھا؛ اس لئے یہ کہنا کہ حضور ﷺ نے ان کو دیکھا اور نعوذ باللہ ان کے حُسن پر فریفتہ ہوگئے، ناقابل فہم ہے، آپ نے حضرت زیدؓ سے نکاح سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ان کو بارہا دیکھا ہوگا؛ بلکہ جب حضرت زیدؓ اور ان کے تعلقات خراب ہوئے تو آپ نے کئی بار ان کو سمجھایا اور اس رشتہ کو باقی رکھنے کی ترغیب دی اور اس سلسلہ میں آپ کی ان سے ملاقات ہوئی۔

(ب) حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا رشتہ آپ ہی نے کرایا تھا، حضرت زینبؓ اور ان کے گھر کے لوگوں کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا؛ البتہ ان کی خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان کو اپنے نکاح میں لائیں، اگر آپ ان سے نکاح کرنا چاہتے تو اسی وقت نکاح کرلیتے، ۳۶ سال کی عمر تو حسن و جمال کے ڈھلنے کی عمر ہوتی ہے، آپ اگر ان کے حسن و جمال سے متاثر ہوتے تو آپ حضرت زیدؓ کے بجائے پہلے ہی اپنے نکاح میں قبول فرمالیئے ہوتے۔

(ج) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ کے گھر میں اپنے قریشی النسل

ہونے اور حضرت زیدؓ کے آزاد شدہ غلام ہونے کا احساس برابر موجود تھا؛ چنانچہ حضرت زینبؓ کی دلداری کے لئے آپ نے اپنی ازواج اور صاحبزادیوں سے زیادہ مہر حضرت زینب کا مقرر کیا، (الروضۃ الفیحاء فی اعلام النساء: ۵۲) حضرت زینبؓ کے دل میں خاندانی برتری کے احساس کے تحت بار بار حضرت زیدؓ سے ناچاقی پیدا ہوتی رہتی تھی اور حضرت زیدؓ چاہتے تھے کہ وہ انھیں طلاق دے دیں؛ لیکن آپ نے حضرت زید کو منع کیا اور حضرت زینبؓ کو سمجھا کر اس رشتہ کو باقی رکھنے کی پوری کوشش فرمائی، اگر آپ کی طبیعت ان کی طرف راغب ہوتی تو آپ اس طرح کی کوششیں کیوں کرتے؟

(د) مدینہ میں منافقین اور یہود دونوں اسلام کے بدترین دشمن تھے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو بدنام کرنے کے لئے بروقت کوشاں رہتے تھے، اگر حضرت زینبؓ سے نکاح میں اس طرح کی بات کا دخل ہوتا جو یہ حضرات نقل کرتے ہیں تو وہ ہرگز اس موقع کو ضائع نہ ہونے دیتے اور پھر قرآن مجید ان کے اس اعتراض کا جواب دیتا؛ لیکن کہیں یہ بات نہیں آئی کہ ان لوگوں نے آپ ﷺ پر اس سلسلہ میں کوئی الزام لگایا ہو، ہاں اگر کسی بات کا چرچا ہوا تو وہ ہے متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کا، جس کو عرب بہت بُرا سمجھتے تھے، اسی لئے قرآن مجید میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

(۴) حضرت زینبؓ سے آپ کے نکاح کے سیاق میں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جو بات تمہارے دل میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر کے رہیں گے، تم لوگوں سے ڈرتے ہو اور اللہ زیادہ اس لائق ہیں کہ ان سے ڈرا جائے'' (احزاب: ۳۷) کا منشاء یہ نہیں ہے کہ حضرت زینبؓ پر آپ کا دل آگیا ہے جس کو آپ چھپا رہے ہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ لوگ کہیں گے کہ آپ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے، اس لئے آپ ڈر رہے ہیں اور اس بات کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں؛ حالاں کہ اللہ تعالیٰ متبنیٰ کی رسم کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ زینبؓ سے نکاح کر لیں؛ چنانچہ آگے ارشاد ہے: ''زَوَّجْنٰکَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ''۔ (الاحزاب: ۳۷)

(۵) یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے بھی میل نہیں کھاتی، مکہ میں آپ کو پیشکش کی گئی کہ مکہ میں آپ کی نظر میں جو حسین ترین خاتون ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان سے رشتہ کر دیا جائے؛ بشرطیکہ آپ اسلام کی دعوت سے باز آجائیں؛ لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا، مدینہ میں بھی آپ چاہتے تو وہاں کی حسین ترین لڑکی کو اس کے سرپرست سعادت سمجھ کر آپ کے نکاح میں دیتے؛ لیکن آپ نے کبھی حسن و جمال کی بنیاد پر اپنے نکاح کے لئے کسی خاتون کا انتخاب نہیں کیا؛ اس لئے یہ بات آپ کے مزاج اور آپ کی پاکیزہ زندگی کے ریکارڈ کے تحت بھی بعید از قیاس ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسن سے متاثر ہو کر دوسرے کی منکوحہ سے نکاح کے خواہشمند ہو جائیں۔

غرض کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہے اور خارجی قرائن و واقعاتی شہادتیں بھی اس کے برخلاف ہیں۔



پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علماء اہل کتاب

مغربی اہل علم نے پیغمبر اسلام کی نبوت سے انکار کے لئے بڑی ناکام کوششیں کی ہیں اور اس کے لئے علم واستدلال کے ہتھیار بھی بار بار بدلے ہیں، کبھی آپ کی تعلیمات کو حالات کے تحت اندر سے اُٹھنے والا رد عمل اور کبھی مرض و بیماری کا نتیجہ قرار دیا، اور کبھی اہل کتاب علماء سے اور بالخصوص سفر شام میں راہبوں سے ملاقات اور ان سے استفادہ کا ثمرہ ٹھہرایا؛ چوں کہ یہ آخری صورت ان کو نسبتاً زیادہ قرین قیاس محسوس ہوئی؛ اس لئے عموماً ان حضرات نے اس کو ایک ناقابل تردید علمی تحقیق کا رنگ دے کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

وہ مستشرق علماء —— جو اسلام کے بارے میں ایک حد تک منصف مزاج مانے جاتے ہیں —— بھی آپ کی تعلیمات کو اہل کتاب علماء سے تاثر کا نتیجہ قرار دینے سے نہیں چوکتے، مثلاً ڈاکٹر ڈربیر ان علماء میں ہیں، جن کو معتدل اور اسلام کے بارے میں مہذب اور نسبتاً انصاف پسند سمجھا جاتا ہے؛ لیکن وہ بھی اسلام کو عیسائیت کا ''نسطوری فرقہ'' قرار دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں :

> بُحَیرِیٰ راہب نے بُصریٰ کی خانقاہ میں حضرت محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم کی اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک حرف بہ حرف کہہ سنائی، یہ ان ہی ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کلیسائے مشرق کی بت پرستانہ رسموں کی طرف سے عموماً اور اوثان واصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی، جس کو کوئی قوت مٹا نہ سکی اور بحیرہ راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس

عجیب و غریب زندگی کے دوران جس کے کارناموں نے دنیا کو محو
حیرت کر دیا، حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا؛ بلکہ ہمیشہ مسیح
ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا، آپ کے نا تربیت یافتہ ؛ لیکن
مستعد اور اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی ؛ بلکہ
فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا، اور یہ وہ اتالیق تھے،
جنھیں ارسطو کے جانشین اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے
کے لحاظ سے اپنی ذات پر ناز تھا اور بجا ناز تھا، بعد میں آپ کے طرز
عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں کے مذہبی
عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا؛ چنانچہ اس ارادت و محبت کا
جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے، آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے،
اس سے بڑھ کر اور ثبوت اس انس و عقیدت کا کیا ہوگا کہ آپ نے
اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقائد کی توسیع و اشاعت کے لئے
وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے
ان کے علمی مشائی اُصول اختیار کر لئے اور نہایت سرگرمی سے ان کی
اشاعت میں حصہ لیا۔

جب حضرت محمد ﷺ سن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے
اور بھی سفر کئے، یہ خیال کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ان موقعوں پر
آپ نسطوری خانقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز مکینوں سے —
جنھیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا — ضرور ملے ہوں گے۔(۱)

بحیری راہب سے ملاقات

ان راہبوں سے ملاقات کے واقعات کو کس طرح رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے، اس کا

(۱) معرکہ مذہب و سائنس: ۱۰۱تا۱۰۹ (مترجم: مولوی عبد الحق صاحب)۔

اندازہ اصل واقعہ سے ہوگا، سیرت کی اکثر کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے بعد حضرت ابوطالب نے شام کا تجارتی سفر فرمایا، پیغمبر اسلام ﷺ کے اصرار پر کم عمری کے باوجود حضرت ابوطالب نے آپ کو ساتھ لے لیا، اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ لوگوں نے سات سال کہا ہے، (۱) بعض روایتوں میں عمر مبارک بارہ سال ذکر کی گئی ہے یہی رائے طبریؒ کی ہے، بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اس وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی، سہیلیؒ نے اسی کو ترجیح دیا ہے اور طبریؒ نے یہی رائے ابن شہابؒ سے نقل کی ہے۔(۲)

صحاح ستہ میں اس واقعہ کو صرف امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، ترمذی کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ قافلہ قریش میں شامل ہوکر شام گئے، راستہ میں ایک راہب کی خانقاہ (صومعہ) ملی، حضرت ابوطالب نے اسی خانقاہ کے قریب رختِ سفر کھولا، یہ راہب جو اس سے پہلے کبھی قافلہ عرب کے خیر مقدم کے لئے نہیں نکلا تھا، خلاف توقع ان حضرات کے پاس آیا، رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا! ''یہ تمام عالم کے سردار اور پروردگار عالم کے رسول ہیں، خدا نے ان کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' شیوخ قریش نے دریافت کیا تمہیں یہ کیوں کر معلوم ہوا؟ اس نے کہا: میں نے تمام درختوں اور پتھروں کو آپ کو سجدہ کرتے ہوئے پایا ہے اور یہ دونوں کسی نبی ہی کو سجدہ کرتے ہیں، نیز میں نے آپ کے مونڈھے پر ختم نبوت دیکھی ہے۔

راہب اتنی گفتگو کے بعد لوٹ گیا اور ان حضرات کی ضیافت کی تیاری کرنے لگا؛ چنانچہ لوگ کھانے پر آگئے اور آپ کو اونٹیوں میں چھوڑ دیا، راہب نے آپ کو بلوایا، آپ تشریف لائے تو اس طرح کہ ایک بادل آپ پر سایہ فگن تھا، درخت کی سایہ دار جگہ لوگوں نے پہلے ہی سے سنبھال رکھی تھی، آپ بے سایہ جگہ پر تشریف فرما ہوئے؛ لیکن ہوا یہ کہ درخت کا

---

(۱) تاریخ ابن خلدون، بقیۃ المجلد الثانی: ۴۔

(۲) تاریخ طبری: ۱/۴۵۶، الروض الانف: ۱/۲۰۶۔

سایہ آپ کی طرف جھک آیا؛ چنانچہ راہب نے حضرت ابوطالب کو سمجھایا کہ آپ کا ان کو روم لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اہل روم ان کو پہچان لیں گے اور قتل کردیں گے، یہاں تک کہ حضرت ابوطالب نے آپ کو واپس کردیا، حضرت بلالؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے ساتھ کردیا، نیز خود راہب نے بھی کچھ سامانِ سفر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔(۱)

خیال رہے کہ حضرت ابوطالب آپ کو شام لے گئے اور اپنے ساتھ ہی واپس لائے،(۲) طبقات ابن سعد کی روایت میں صرف آپ کی بحیری راہب سے ملاقات کا ذکر ہے،(۳) خود بحیری راہب کے بارے میں بعض اہل سیرت کہتے ہیں کہ وہ ایک یہودی عالم تھا(۴) اور اکثر اہل سیرت کی رائے ہے کہ وہ ایک عیسائی عالم تھے اور اس خانقاہ میں عیسائی کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا،(۵) اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ بحیری کہاں سکونت پذیر تھا؟ بعض کہتے ہیں کہ مقامِ کُفر کا تھا، جو بُصری سے چھ میل کی دوری پر ہے، اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ سرزمین شام کے ایک گاؤں بلقاء کا،(۶) بعض روایت میں یہ بات بھی آئی ہے کہ کچھ اہل روم اسی وقت آپ کی تلاش میں اس خانقاہ کو پہنچ گئے ؛لیکن راہب کے سمجھانے پر وہ لوگ آپ پر کسی زیادتی سے باز رہے اور ان لوگوں نے بیعت کرلی، یہ بات مبہم ہے کہ انھوں نے کس سے بیعت کی، راہب سے یا آپ سے؟ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو امن دینے پر راہب سے بیعت کی ہوگی،(۷) اسی طرح کے بعض اور اختلافات اور تضادات بھی اس واقعہ کی روایت میں موجود ہیں۔

---

(۱) امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے: ہذا حدیث غریب لانعرفہ الا من ہذا الوجہ، کتاب المناقب، باب ماجاء فی بدء النبوۃ۔

(۲) عیون الاثر: ۲/۷۵، صفۃ الصفوہ: ۱/۶۹۔

(۳) طبقات بن سعد: ۱/۱۲۰۔

(۴) صفۃ الصفوہ: ۱/۶۶۔

(۵) الوفاء: ۱۲۸۔

(۶) سیرت حلبیہ: ۱/۱۹۵۔

(۷) سیرت حلبیہ: ۱/۱۹۶۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقت حال کو سمجھنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں، اول یہ کہ خود یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے کس درجہ مستند اور قابل اعتبار ہے؟ دوسرے: پیغمبر اسلام کی مذکورہ راہب کے ساتھ یہ ملاقات کتنے وقت کی تھی؟ اور کیا آپ کی عمر اس بات کی متحمل تھی کہ آپ مذہب کے مابعد الطبیعی تصورات اور فلسفۂ الہیات کو سمجھ سکیں؟

روایات پر ایک ناقدانہ نظر

اس واقعہ میں متعدد ایسی باتیں موجود ہیں، جو اس روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام ذہبی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ مجھے اس کے موضوع یعنی من گھڑت ہونے کا خیال ہوتا ہے، (۱) مثلاً حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے، اس طرح اس واقعہ کے وقت ان کی عمر سات سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال قرار پاتی ہے یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ اتنے طویل سفر پر اور وہ بھی حفاظتی اقدام کے تحت ابو طالب نے آپ سے بھی کم عمر لڑکے کو آپ کے ساتھ بھیج دیا ہو، نیز حضرت بلالؓ کا آپ کے ساتھ آنا تو اور بھی عجوبہ ہے! اس لئے کہ اس واقعہ کے تیس سال کے بعد حضرت ابو بکر نے حضرت بلالؓ کو اُمیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کیا؛ اس لئے اس سفر میں حضرت بلالؓ کی حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ رفاقت اور حضرت ابو بکرؓ کا حضرت بلالؓ کو بھیجنا نا قابل قیاس ہے: اسی لئے ابن سید الناسؒ نے لکھا ہے کہ سند کے صحیح ہونے کے باوجود اس روایت کا متن قابل اعتماد نہیں۔ (۲)

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ آپ کی واپسی کے نا قابل قیاس ہونے کے علاوہ ایک خامی اس میں یہ بھی ہے کہ بادل کے آپ پر سایہ فگن ہونے کا جو ذکر اس روایت میں ہے، وہ دوسری صحیح روایات میں موجود نہیں ہے، نیز یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی مرسل ہے اور حضرت ابو موسیٰ سنہ ۷ ھ میں مدینہ تشریف لائے ہیں،

(۱) قال الذہبی فی الحدیث: اظنہ موضوعا، سیرت حلبیہ: ۱/۱۷۹۔

(۲) ومع ذالک ففی متنہ نکارۃ، عیون الاثر: ۱/۵۶۔

اس طرح جس راوی نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، وہ خود اس کا چشم دید نہیں ہے،(۱) جہاں تک اس روایت کے مرسل ہونے کی بات ہے، جس پر علامہ شبلیؒ نے بھی کلام کیا ہے تو یہ کوئی قوی وجہ ضعف نہیں ہے؛ کیوں کہ صحابہ کی مرسل روایات بالاتفاق معتبر ہیں؛ لیکن روایت کے مضمون میں — راویوں کا اختلاف واضطراب، بعض ناقابل قیاس اُمور کا ذکر، خود آپ سے اس واقعہ کا منقول نہ ہونا، محمد بن اسحاق اور واقدی جیسے متکلم فیہ راویوں سے اس واقعہ کا مروی ہونا اور اس بات کا احتمال پایا جانا کہ شاید اس واقعہ کی سند کسی غیر مسلم راوی پر منتہی ہوتی ہو، راہب کا کہنا کہ شجر وحجر سجدہ کر رہے تھے اور رفقاءِ سفر کا اس کو محسوس نہ کر پانا، یہ مختلف باتیں ہیں — جو اس روایت کی صحت کو مشکوک کر دیتی ہیں۔

اس ملاقات کا عرصہ

کتب سیرت میں جتنی روایات اس واقعہ کے بارے میں، وہ سب اس بات پر شاہد ہیں کہ بحیریٰ راہب سے آپ ﷺ کی ملاقات ایک پہر سے زیادہ کی نہ تھی، ایک وقت راہب مذکور نے قافلہ کی ضیافت کی، قافلہ کی آمد اور کھانے کے وقت راہب کی آپ سے اور اہل قافلہ سے مختصر سی گفتگو ہوئی، اس گفتگو کا خلاصہ محض اتنا تھا کہ فضل خداوندی سے آپ کو نبوت ملنے والی ہے، آپ کی عمر اس وقت بارہ سال اور زیادہ صحیح روایت کے مطابق صرف نو سال کی تھی، اتنی کم عمر میں کسی گہری فکر وتصور اور اعلیٰ دینی واخلاقی تعلیمات نیز تاریخی قصص وواقعات کی حفاظت ناقابل تصور ہے؛ اس لئے کوئی بھی معقول اور منصف مزاج شخص اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتا کہ کم سنی کے زمانہ میں اتنے کم وقت کی مختصر ملاقات میں آپ نے بحیریٰ راہب سے ایسا مذہبی اور علمی استفادہ کیا ہوگا کہ ان ہی تعلیمات پر آپ ﷺ نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھی۔

نسطورا سے ملاقات

پیغمبر اسلام ﷺ کا دوسرا سفر شام اس وقت ہوا، جب کہ عمر مبارک پچیس سال تھی،(۲)

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۲/۲۸۵۔ (۲) صفۃ الصفوہ: ۱/۷۱۔

یہ سفر آپ نے حضرت خدیجہؓ کی خواہش پر اور ان ہی کا مال لے کر تجارت کی غرض سے کیا تھا، اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی آپ کے ساتھ تھا، اس موقع سے نسطورا نامی راہب سے آپ کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے، روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ اس راہب کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ایک درخت کے نیچے بیٹھے، راہب نے آپ کی اس نشست سے اندازہ کیا کہ آپ نبی ہیں؛ اس لئے کہ بقول اس کے اس درخت کے نیچے ہمیشہ انبیاء ہی بیٹھا کئے ہیں ''ما نزل تحت هذه الشجرة قط إلا نبي''، (۱) ابن کثیرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میسرہ نے اس سفر میں دو فرشتوں کو بھی دیکھا، جو آپ پر سایہ فگن رہتے تھے اور دھوپ سے آپ کو بچایا کرتے تھے، بعض روایات میں ہے کہ ان فرشتوں کا مشاہدہ خود اس راہب نے کیا تھا، (۲) تاہم اس موقع سے اہل سیر صرف اسی قدر صراحت کرتے ہیں کہ راہب نے میسرہ کو بتایا کہ آپ کو نبی ہونا چاہئے، نیز اس نے میسرہ سے پوچھا: کیا آپ کی آنکھ میں سرخی بھی رہتی ہے؟ میسرہ نے کہا: ہاں، آپ کی آنکھ ہمیشہ سرخ رہتی ہے، اس پر راہب نے کہا: ''نعم لا تفارقه''، ہاں یہ نبی ہیں، کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑنا، (۳) سیرت کی کسی کتاب میں اس موقع سے آپ کے اور نسطورا کے درمیان گفتگو اور تبادلہ خیال کا ذکر نہیں ملتا۔

روایت کی فنی حیثیت

ایک تو اس کی سند میں بعض ایسے راوی آئے ہیں، جن کا مقبول ہونا محدثین اور علماء رجال کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، دوسرے: اس روایت کے مضمون میں بھی بعض ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں، جو اس روایت کی صحت کو مشکوک کر دیتی ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ یہ ایسا درخت ہے جس کے نیچے نبی ہی بیٹھا کئے ہیں، دو ایسی باتوں کو شامل ہے، جو عادۃً ناممکنات میں سے ہیں، ایک یہ کہ اس درخت کی عمر اتنی طویل رہی ہو کہ کم سے کم حضرت مسیح سے لے کر آپ کے

---

(۱) سیرت ابن ہشام مع الروض: ۱/ ۲۱۳، البدایہ والنہایہ: ۲/ ۲۹۴۔

(۲) البدایہ والنہایہ: ۲/ ۲۹۴۔

(۳) عیون الاثر: ۱/ ۶۱۔

زمانہ تک وہ قائم رہا ہو، دوسرے: اس صحرائی علاقہ میں جہاں کہ سایہ دار جگہ کی بڑی کمی ہوتی ہے، کوئی راہگیر اس درخت کے نیچے بیٹھا ہی نہ ہو، ابن ہشامؒ کے شارح سہیلیؒ نے گو اس مسئلہ میں تاویل وتوجیہ کی راہ اختیار کی ہے؛ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو بھی مضمون حدیث میں اس سقم کا احساس ہے :

والشجرة لا تعمر فی العادة هذا العمر الطویل حتی یدری أنه لم ینزل تحتها إلا عیسی أو غیره من الأنبیاء و یبعد فی العادة ایضا أن تکون شجرة تخلو من أن ینزل تحتها أحد۔ (۱)

دوسرے: نسطورا اور بحیریٰ راہبوں سے ملاقات کی دونوں روایتوں سے جو مکمل تصویر ابھر کر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان راہبوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے خود آپ اور عرب کے متعدد شیوخ ورؤساء اور تجار بھی مستقبل میں آپ کے نبی بنائے جانے سے واقف ہو چکے تھے، میسرہ کے ذریعہ حضرت خدیجہؓ بھی اس سے آگاہ ہو چکی تھیں اور ان ہی بشارتوں اور برکات کو دیکھ کر انھوں نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا تھا، یہ ایک ایسی غیر معمولی خبر تھی، جو یقیناً اس بات کی مقتضی ہے کہ اہل مکہ میں اس نے ایک تعجب انگیز اور معروف خبر کی حیثیت سے حاصل کرلی ہوتی اور وہ آپ کی نبوت کے لئے چشم براہ ہوتے؛ لیکن سیرت کے واقعات اس کے عین برعکس ہیں، آپ جب نبی بنائے جاتے ہیں تو خود آپ کے لئے یہ ایک گھبرا دینے والی بات ہوتی ہے؛ خود قرآن ناطق ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے تک آپ کو اس کا کوئی تصور بھی نہ تھا کہ آپ اس منصب پر سرفراز ہونے والے ہیں: ''وما کنت ترجوا أن یلقی إلیک الکتاب''۔(۲)

پھر جب آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کو ماجرا سناتے ہیں تو وہ آپ کو دلاسا ضرور دلاتی ہیں اور آپ کے اخلاق کریمانہ اور کمزوروں اور یتیموں کے ساتھ آپ کے سلوک مشفقانہ کا ذکر ضرور کرتی ہیں، مگر اس مژدہ نبوت کو یاد نہیں کرتیں اور اپنے ایک بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس

---

(۱) الروض: ۱/۲۱۱۔ (۲) القصص: ۸۶۔

جاتی ہیں، جو عیسائی عالم تھے، حضرت ورقہ آپ کی نبوت کو سمجھ گئے، مگر آپ کے نبوت سے سرفرازی پر وہ انداز اختیار کرتے ہیں، جو کسی غیر متوقع واقعہ کے پیش آنے پر ہوتا ہے، اہل مکہ کے سامنے آپ جب اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں تو ان کے لئے بھی یہ ایک ناقابل یقین اور یکسر نامانوس خبر ہوتی ہے، یہاں تک کہ حضرت ابوطالب جن کے ساتھ آپ نے سفر فرمایا تھا، ان کو بھی راہب کا واقعہ یاد نہیں آتا اور وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہ پہلو اس روایت کے مضمون کی صحت کو کس درجہ مشکوک کردیتا ہے؟ وہ محتاج اظہار نہیں؛ لیکن خود ان روایتوں میں نسطورا راہب سے جس ملاقات کا ذکر ہے، اس میں راہب اور پیغمبر اسلام کے درمیان کسی گفتگو کا ذکر نہیں ہے، نہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور میسرہ کا ایک دو دن بھی یہاں قیام رہا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اس موقع سے اس امر کی قطعاً کوئی نشاندہی نہیں ہوتی کہ آپ کا اتنے وقت کے لئے اس خانقاہ کے پاس قیام رہا ہو کہ مذہبی موضوعات پر آپ نے ان سے تبادلہ خیال کیا ہو۔

دوسرے قرائن

ان حقائق کے علاوہ جو اوپر مذکور ہوئے، تین نکات خاص طور پر قابل غور ہیں: اول یہ کہ پیغمبر اسلام کے دعوئ نبوت اور ان کے اِن اسفار کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ دوسرے: جو شخص اتنا ذہین ہو کہ وہ چند لمحات کی مختصر ملاقات کے ذریعہ اتنے بلند مذہبی افکار کی تخلیق کرسکتا ہو، اس کو ضرور اس امر سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ وہ کیا تدریجی طریقہ اختیار کرے، جس سے اس کے دعویٰ کو قبول عام حاصل ہو، کیا پیغمبر اسلام ﷺ کے عمل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے؟ تیسرے: آپ کی تعلیمات اور ان راہبوں کی تعلیمات میں کس درجہ مماثلت ہے؟

تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ بحیریٰ راہب سے آپ کی ملاقات ۱۲ رسال اور نسطورا سے ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی، اس دوسرے سفر سے واپسی کے ساتھ ہی مکہ کی ایک سرمایہ دار اور شریف خاتون حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح ہوتا ہے، اگر آپ کی تعلیمات ان راہبوں

سے استفادہ پر مبنی ہوتیں، تو ضرور تھا کہ اس سفر سے واپسی کے ساتھ ہی آپ نے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی ہوتی اور حضرت خدیجہؓ سے ازدواجی رشتہ کی بنا پر جو معاشی خوش حالی اور فراغ دستی حاصل ہوئی تھی، اس کا استعمال کرتے ہوئے آپ نے اپنی دعوت کو مقبول بنانے کی سعی کی ہوتی، ان اسفار کے بعد ۲۸ اور ۱۵ سال تک مکمل خاموشی، مذہبی مسائل اور عقائد ورسوم پر سکوت اور اتنا عرصہ گذرنے اور ۴۰ سال عمر ہونے کے بعد اچانک دعویٔ نبوت اس بات کو غلط ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ان حضرات سے کوئی مذہبی اثر قبول کیا تھا، ان راہبوں کے مذہبی افکار وتصورات نے اگر آپ کے دل ودماغ پر اس درجہ گہری چھاپ ڈالی ہوتی تو فطری طور پر آپ بار بار ان سے ملاقات کی کوشش کرتے، یا ان سے ملاقات کے متمنی اور آرزومند ہوتے، مگر آپ کی سیرت میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا؛ بلکہ آپ کبھی ان کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لائے۔

آپ کا دعویٔ نبوت اگر نعوذ باللہ امر الٰہی کے بجائے داخلی انفعال کا نتیجہ ہوتا، تو اس کے لئے آپ نے کمال ذہانت کے ساتھ ایک منصوبہ مرتب کیا ہوتا، اس منصوبہ میں چند باتیں ضرور شامل ہوتیں، اول یہ کہ آپ اپنے مشن کا آغاز کسی ایسی بات سے کرتے جو عربوں کے لئے قابل قبول ہو اور نقطہ اشتراک کا درجہ رکھتی ہو، مثلاً قریش یا عربوں کی قومیت کے احساس کو آپ پروان چڑھاتے، یا کم سے کم عقیدہ کی بجائے اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے اور سماجی ناانصافی کے خاتمہ کی تحریک چلاتے، یہ وہ باتیں تھیں جو اختلاف اور ٹکراؤ کے بغیر عربوں کو ایران وروم کے مقابلہ میں آپ کے زیر قیادت جمع کرسکتی تھیں، مگر آپ نے ان سب کو چھوڑ کر اپنے دعویٔ نبوت کا آغاز عقیدہ توحید سے کیا، جو ان کے صدیوں پرانے تصورات اور زندگی کے تمام اُصولوں کی اساس پر ضرب کاری کا درجہ رکھتا تھا، دوسرے: آپ نے عام مصلحین کے انداز پر تدریج کی راہ اختیار نہیں کی کہ آہستہ آہستہ قوم میں قبولیت کی صلاحیت پیدا کی جائے، پھر ان کے سامنے اپنے مشن کا لب لباب رکھا جائے؛ بلکہ آپ نے مکمل خاموشی کے بعد ان کو اپنے قدیم عقائد وتصورات سے مکمل بغاوت کی دعوت دی، تیسرے: آپ کے دعویٔ

نبوت کے بعد سال دو سال نہیں ؛ بلکہ پورے ۱۳ سال مکہ میں اس طرح گذرے کہ اس میں ہر آنے والا دن پچھلے دن کے مقابلہ سخت ہوتا گیا اور آپ کے مشن کی کامیابی بظاہر موہوم ہوتی چلی گئی ، اگر آپ کے دعویٰ کی پشت پر زبردست اعتماد ویقین کی قوت اور ایمان کی کیفیت نہ ہوتی اور وہ محض کسی دوسرے سے لی ہوئی فکر یا رواو نار وا داخلی جذبات کا نتیجہ ہوتی ،تو اس موقع پر آپ کا دو میں سے کوئی ایک رویہ ہونا چاہئے تھا ، یا تو ابتلاؤں اور آزمائشوں اور اہل مکہ کی طرف سے مایوس کن ردعمل کی وجہ سے آپ اپنی تحریک کو ختم کر دیتے ، یا ''لو'' اور ''دو'' کی پالیسی اختیار کر کے اہل مکہ کے لئے اسلام کو قابلِ قبول بناتے ، جیسا کہ عیسائیوں نے یونانیوں میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لئے کیا ؛ بلکہ یونان کو اپنے افکار دیئے کم اور ان کے عقائد وتصورات قبول کئے زیادہ ، یہاں تک کہ حضرت مسیح کی پیش کی ہوئی توحید کی جگہ سینٹ پال کی تثلیث نے لے لی ، جو یونانیوں میں پہلے سے موجود عقیدہ تثلیث کی معمولی سی بدلی ہوئی شکل تھی۔

اہل مکہ کا سکوت

ان کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے عقیدہ نے اہل مکہ کے قلوب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو آگ لگادی تھی ، وہ اس درجہ تیز اور شعلہ ریز تھی کہ یہ اسلام پر اعتراض کے لئے ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے تھے اور قرآن کو کبھی شاعری ، کبھی معمولی قصہ کہانی ، اور کبھی سحر وجادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے ، اور چوں کہ خود ان کے دل اس پروپیگنڈہ کے خلافِ حقیقت ہونے پر مطمئن تھے ؛ اس لئے بار بار ان کو اپنے اعتراضات اور اشکالات کو بدلنا پڑتا تھا ، مکہ میں بعض یہودی اور عیسائی غلام موجود تھے ؛ غالباً وہ لوگوں کو تورات وغیرہ کے بعض واقعات بھی کبھی کبھی سنایا کرتے تھے ، رازیؒ قرطبیؒ اور زمخشریؒ نے اس سلسلہ میں تین غلاموں حویطب بن عبدالعزیٰ کے غلام عداس ، علاء بن حضرمی کے غلام یسار اور ابوفکیہہ رومی کا ذکر کیا ہے ، جو آپ کے دعویٰ نبوت کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی نسبت سے قبول اسلام کے بعد آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے ، اہل مکہ میں سے نضر بن حارث نے اس واقعہ کو لے کر یہ پروپگنڈا بھی کرنے کی سعی کی کہ آپ

ان ہی اہل کتاب سے سیکھ کر قرآن مجید کی تصنیف فرماتے ہیں، (۱) مگر یہ اعتراض اس درجہ غلط اورنا قابل قبول تھا کہ خود اہل مکہ نے اس کو قبول نہیں کیا اور لوگوں نے آپ کو ساحر و مجنون وغیرہ تو کہا اور مسحور بھی قرار دیا، مگر اس اعتراض کو نہیں دہرایا۔

غرض کہ اس کے باوجود کہ اہل مکہ آپ پر اعتراض کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، انھوں نے ان راہبوں سے ملاقات کو اپنے اعتراض کی بنیاد نہیں بنایا اور قرآن کو ان کی تعلیمات کا نتیجہ قرار نہیں دیا، غالباً وہ موجودہ زمانہ کے ''منصف مزاج'' مغربی علماء سے زیادہ حقیقت پسند تھے، اور اگر اس عہد کے مستشرقین نادانستہ اس طرح کے اعتراض کررہے ہیں تو ان سے زیادہ اصحاب دانش بھی کہ وہ اس بات کا بخوبی شعور رکھتے تھے کہ کسی فکر کا اس درجہ گہرا اثر قبول کرنے کے بعد (جس نے اس کو گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا سے باغی بنا دیا ہو) پندرہ بیس سال کی طویل مدت اظہار خیال سے باز نہیں رہا جا سکتا۔

اسلامی تعلیمات اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ

اب میں تیسرے نکتہ کی طرف آتا ہوں، کوئی تحریک کسی اور تحریک اور اس کے لٹریچر سے تاثر کے نتیجہ میں اُبھری ہو تو چند باتیں ضرور پائی جائیں گی، اول: یہ کہ دونوں کے تصورات میں قابل لحاظ حد تک یکسانیت ہو، دوسرے: واقعات کے بیان میں دونوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہو، تیسرے: ایک لٹریچر جو دوسرے لٹریچر سے ماخوذ ہو، وہ پہلے لٹریچر کی تلخیص تو ہو سکتا ہے؛ لیکن وہ اس کے بیان کئے ہوئے تاریخی حقائق میں اضافہ نہیں کرسکتا۔

اب غور کیجئے کہ عیسائیت اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں کس قدر تفاوت ہے؟ اسلام میں اعتقادات کی اساس توحید ہے اور عیسائیت میں تثلیث، اسلام میں جزا و سزا کا مدار صرف اعمال صالحہ پر ہے، جس کا حساب قیامت کے بعد ہوگا، عیسائیت میں جزا و سزا کے تصورات کا ایک اہم رکن کفارہ کا عقیدہ ہے، اسلام خدا کے لئے توالد و تناسل کے عقیدہ کا سخت مخالف ہے، عیسائیت کی اساس حضرت مسیح کو خدا کا فرزند تسلیم کرنے پر ہے۔

(۱) مفاتیح الغیب: ۲۴؍۵۰، کشاف: ۳؍۸۸، الجامع لاحکام القرآن: ۷؍۳۔

قرآن مجید میں بہت سے واقعات ایسے ضرور ہیں کہ بائبل میں بھی ان ذکر موجود ہے اور ایسا ہونا فطری تھا؛ اس لئے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے؛ لیکن چوں کہ بائبل انسانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس کے بہت سے مضامین میں خدا ناترس لوگوں نے تحریف کردی تھی؛ اس لئے ایسے مواقع پر قرآن، بائبل کے بیان سے اختلاف کرتا ہے، مثلاً: گوسالہ پرستی کے واقعہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بری قرار دیتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات طیبہ پر جو غبار ڈالا گیا تھا، اس کو صاف کرتا ہے، حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کی تردید کرتا ہے ،حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک پاکیزہ اور پاکباز پیغمبر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس طرح کے بہت سے مضامین ہیں کہ ان میں بائبل اور قرآن مجید کے بیان میں اختلاف نمایاں ہے۔

قرآن مجید بعض ایسے تاریخی حقائق سے بھی پردہ اُٹھاتا ہے کہ بائبل ان کے بارے میں خاموش ہے، مثلاً سورہ بقرہ کے شروع میں گائے والا واقعہ، اصحاب کہف کا واقعہ اور احسن القصص حضرت یوسف علیہ السلام کی مفصل عبرت خیز داستان وغیرہ ، یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر اسلام کی نبوت اور آپ کی تعلیمات میں سوائے وحی الٰہی کے کوئی اور محرک اور موثر کارفرما نہیں تھا، مگر افسوس کہ علماء مغرب کھلے دلوں پیغمبر اسلام کی نبوت کی صداقت پر غور کرنے اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی بحث وتحقیق کی پوری بنیاد ہی اس مفروضہ پر اُٹھاتے ہیں کہ آپ نبی نہیں تھے اور پھر اس حقیقت ناشناسی کو ''حقیقت'' اور جھوٹ ''کو سچ'' ثابت کرنے کے لئے ایسے دوراز کار، اور ناقابل فہم اسباب ووجوہ بیان کرتے ہیں کہ عقل ودانش خندہ زن اور جبین انصاف عرق آلود ہوئے بغیر نہ رہے۔

مگر اہل ایمان کے لئے یہی انکار عین زیادت ایمان اور کمال ایقان کا باعث ہے، اہل علم کی طرف سے ایسی حقیقت ناشناسی ان کو یقین دلاتی ہے کہ علم کے باوجود گمراہی کی جو اطلاع قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کے معاصر اہل کتاب کے بارے میں دی تھی، مسلمان ہمیشہ اس کی صداقت وواقعیت کا بچشم سر مشاہدہ کرسکتے ہیں :

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ۔ (الجاثیہ:۲۳)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہود

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر علی العموم اہل مغرب نے جو اعتراضات کئے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے ساتھ جو غیر منصفانہ اور غیر انسانی سلوک اختیار کیا تھا، پھر اور اس کی دلیل میں بنو قینقاع اور بنو نضیر سے جنگ اور ان کی جلاوطنی، نیز بنو قریظہ کی سزائے موت کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اولاً قوم یہود کی تاریخ اور ان کی عادات و اخلاق پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈال لی جائے، جس سے ان کے قومی مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اندازہ ہو سکے گا کہ اپنے سماج اور پڑوسی کے ساتھ ان کا رویہ کس طرح کا ہوتا ہے؟ دوسرے: اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ مدینہ میں جو یہود آباد تھے، وہ یہاں کس طرح آئے اور اپنے عرب پڑوسیوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ رہا؟ تیسرے: مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ کی نوبت کن حالات میں آئی؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اقدام کیا، وہ اخلاق، مذہب اور مہذب قانونِ جنگ کی رو سے صحیح تھا یا غلط اور منصفانہ تھا یا غیر منصفانہ؟

تاریخِ یہود کے مآخذ

غالب گمان ہے کہ ''یہود'' کی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے ''یہوداہ'' کی طرف ہے، یہود کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کے سوا کوئی اور مستند اور قابلِ بھروسہ ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے، تاہم ان کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ خود بائبل کا عہدِ عتیق ہے، جو یہود کے نزدیک وحی الٰہی ہے اور اپنی صحیح روح کے ساتھ محفوظ ہے، اس کے بعد دوسرا ذریعہ تورات کی شرح اور یہودی قانون کی سب سے اہم کتاب ''تالمود'' ہے،

تیسرا ذریعہ بائبل کے ''عہدِ جدید'' کا حصہ ہے، جو حضرت مسیح کے دور میں یہودی اخلاقیات کا نمونہ پیش کرتی ہے، چوتھا اور سب سے مستند ماخذ ''قرآن مجید'' ہے، جس میں جستہ جستہ بنی اسرائیل کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، ہم تو قرآن کو ''وحی الٰہی'' مانتے ہی ہیں؛ لیکن اس سے صرف نظر کر کے خالص تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک اہم ذریعہ ہے؛ کیوں کہ یہود کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور پڑھا گیا؛ لیکن یہودیوں کو اس سے انکار اور تردید کی ہمت نہیں ہوئی۔

انبیاء کے ساتھ سلوک

بائبل کے ادنیٰ مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہود شروع سے تین قومی بیماریوں میں مبتلا رہے ہیں :

(۱) انبیاء اور رسولوں کے ساتھ گستاخی اور بدسلوکی۔

(۲) اعتقادی بگاڑ۔

(۳) اخلاقی وسماجی پستی۔

انبیاء کے ساتھ بدسلوکی اور معاندانہ رویہ کا صرف بائبل میں اس کثرت سے ذکر ہے کہ ان سب کو اکٹھا کر دیا جائے تو ایک کتاب ہو جائے، یہاں بائبل کے دونوں حصوں سے چند نمونے ذکر کئے جاتے ہیں، تورات میں ہے :

- انھوں نے خداوند کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اُڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں کی ہنسی اُڑائی، یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔(۱)
- تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی طرح تمہارے نبیوں کو کھا گئی۔(۲)

---

(۱) تواریخ:۳۶:۱۶۔ (۲) یرمیاہ:۲:۳۰۔

● وہ نافرمان ہو کر تجھ سے باغی ہوئے اور انھوں نے تیری شریعت کو پیٹھ پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو اُن کے خلاف گواہی دیتے تھے؛ تاکہ ان کو تیری طرف پھرا لائیں، قتل کیا اور انھوں نے غصہ دلانے کے لئے بڑے بڑے کام کیے۔(۱)

ایک دو نمونے عہد جدید سے بھی ملاحظہ ہوں :

● اے گردن کشو! تمہارے دل اور کان دونوں نامختون، تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو، جیسے تمہارے باپ دادا کرتے تھے، ویسے ہی تم بھی کرتے ہو، نبیوں میں سے کس کو تمہارے باپ دادا نے نہیں ستایا؟ انھوں نے تو اس راست باز کے آنے کی پیش خبری دینے والوں کو قتل کیا اور اب تم اس کے پکڑنے والے اور قاتل ہوئے۔(۲)

● اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو، اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اس کے شریک نہ ہوتے، اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھردو، اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟ اس لئے دیکھو، میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل اور مصلوب کرو گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے۔(۳)

---

(۱) نحمیاہ:۹:۲۶۔ (۲) اعمال:۷:۵۱،۵۲۔

(۳) متی:۲۳:۲۹،۳۵۔

یہود کی سرزمین مقدس یروشلم کو ان الفاظ میں مخاطب کیا گیا :

● اے یروشلم ! اے یروشلم ! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، ان کو سنگسار کرتا ہے۔(۱)

یہود بنیادی طور پر حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان ہی کی شریعت کے متبع ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی نے ان کو فرعون اور اہل مصر کی غلامی سے نجات دلائی اور آزادی کی زندگی عطا فرمائی ؛ اس لئے ان سے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ کے احترام وتعظیم کی توقع کی جاسکتی ہے ؛ لیکن خود حضرت موسیٰ کی شان میں قدم قدم پر اس قوم نے جو گستاخی اور بدسلوکی کی، وہ سامانِ عبرت ہے ! —— اہل مصر کی غلامی کی زندگی سے نجات کے لئے بنی اسرائیل ایک نہیں دو نبیوں —— حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) —— کے ساتھ بحر قلزم کی طرف رواں ہیں اور سر کی آنکھوں سے مصر میں حضرت موسیٰ کے معجزات وبرکات اور پیغمبر وقت کے ساتھ فساد وعداوت کی بنا پر قبطیوں پر خدا کے عذاب کا مشاہدہ کر چکے ہیں، مگر جونہی فرعون کا لشکر تعاقب میں آتا ہے، پائے ثبات میں تزلزل آجاتا ہے اور اپنے نبی سے اس طور مخاطب ہوتے ہیں :

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں، جو تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے، تو نے یہ ہم سے کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا، کیا ہم تجھ سے مصر میں بھی یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں ؛ کیوں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔(۲)

بحر قلزم عبور کرتے ہوئے خدا کی اس نشانی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لئے سمندر کے بیچوں بیچ راہِ نجات بنتی ہے اور وہی راستہ فرعون اور اس کی قوم کے لئے ہلاکت وتباہی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، سمندر عبور ہو چکا ہے اور بنی اسرائیل تین دنوں سے

(۱) متی : ۲۳ : ۳۷۔ (۲) خروج : ۱۴ : ۱۱، ۱۲۔

بیابانِ شور میں ہیں، پانی کا کوئی چشمہ تین دنوں سے میسر نہیں آیا ہے، ایک چشمہ ملا تو وہ بھی کڑوے پانی کا، قوم کی فطرت پھر رنگ لائی اور بائبل کی زبان میں ''وہ لوگ موسیٰ پر بڑبڑا کر کہنے لگے کہ ہم کیا پئیں؟'' (۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے پانی کا مسئلہ حل ہوا؛ لیکن کھانے پینے کی چیزوں کی کمی بنی اسرائیل کے لئے اب بھی قابلِ برداشت نہ تھی؛ اس لئے ہوا یوں کہ اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے :

> کاش، کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملکِ مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے، جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر روٹی کھاتے تھے؛ کیوں کہ تم تو ہم کو اس لئے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو۔ (۲)

حضرت زکریا علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے جب ان کو نصیحت کی اور خدا کی طرف بلایا تو عین عبادت گاہ میں ان کو سنگسار کر دیا، (۳) تورات کا بیان ہے :

> ● تب خدا کی روح یہویدع کاہن کے بیٹے زکریاہ پر نازل ہوئی، سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا: خدا یوں فرماتا ہے کہ تم کیوں خداوند کے حکموں سے باہر جاتے ہو کہ یوں خوش حال نہیں رہ سکتے؛ چوں کہ تم نے خداوند کو چھوڑ دیا ہے، اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا، تب انھوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کرایا۔ (۴)

---

(۱) خروج ۱۶: ۲۴۔

(۲) خروج: ۱۶: ۲، ۳۔

(۳) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بدبختوں نے آپ کو آرے سے دولخت کر دیا تھا، (المقاصد الحسنۃ: ۱/ ۶۰۲، قرطبی: ۱۰/ ۲۱۹) تاہم سنگسار کرنے کے تو گویا یہود اقراری مجرم ہیں۔

(۴) تواریخ ۲۴: ۲۰، ۲۱۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نبوت پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے تھے، مگر ان کے پیغمبر ہونے پر یقین کے باوجود ہوا یوں کہ ایک ادنیٰ رقاصہ ہیرودیس کی خواہش پر پہلے تو باندھ کر آپ کو قید خانہ میں رکھا اور پھر جب بادشاہ کی سال گرہ کے موقع سے جشن رقص و سرود منعقد ہوا، اور اس رقاصہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے حاضرین اور خود بادشاہ کا دل جیت لیا تو حکم ہوا کہ آدھی سلطنت تک جو چاہے مانگ لے، یہ طلب گار ہوئی کہ حضرت یحییٰ کا سر ابھی ایک طشت میں میرے سامنے پیش ہو؛ چنانچہ ایک رقاصہ کی خواہش کے احترام میں ایک پیغمبرِ وقت کا سر قلم کیا گیا اور ایک تھال میں رکھ کر اس بدبخت کے سامنے پیش کیا گیا۔(۱)

عاموس نامی بزرگ جن کو توارت کے بیان کے مطابق نبوت ملی تھی، جب نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے کھڑے ہوئے، تو شاہ اسرائیل ''یربعام'' کو خود علماء یہود نے ان کے خلاف بہکایا اور نوبت یہ آئی کہ آپ کو ملک بدر کر دیا گیا اور یہاں دعوتِ دین کی اجازت نہیں دی گئی۔(۲)

حضرت مسیح پر ان ہی یہودی علماء نے ناحق مقدمہ کیا، بائبل کے بیان کے مطابق ان کو باندھ کر حاکمِ وقت پیلاطس کے پاس لے گئے، آپ پر تھوکا، کوڑے لگوائے، سرکنڈے سے مارا، تمسخر کیا، یہ عید کا دن تھا، بالآخر حاکم نے پھانسی کا فیصلہ کیا؛ چوں کہ اس کو حضرت مسیح کی بے گناہی کا اندازہ تھا؛ اس لئے آخری بار پھر فقیہانِ یہود کی خوشامد کی کہ آج کے دن ایک مجرم کی سزائے موت معاف کی جاسکتی ہے، کہو تو مسیح کی جان بخشی کر دی جائے، ورنہ ''براتا'' ڈاکو کی، علمائے یہود نے اس نبی برحق کے مقابلہ ڈاکو کو معاف کر دیا، حاکم نے اب بھی ان سے عفو و درگذر کی خواہش کی، مگر یہ کسی طور تیار نہ ہوئے، انجیل کا بیان ہے :

> جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا؛ بلکہ اُلٹا بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا: میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں، تم جانو، سب لوگوں نے جواب

---

(۱) ملاحظہ ہو: مرقس: ۶: ۱۷-۱۹۔ (۲) عاموس: ۷: ۱۲-۱۵۔

> میں کہا: اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر، اس پر اس نے براتبا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا کہ مصلوب ہو۔(۱)

اس طرح گویا یہود نے اپنے گمان کے مطابق حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھا دیا۔(۲)

> حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے ان محسنوں میں ہیں، جن کے اندر خدا نے نبوت اور حکومت کو جمع کر دیا تھا، تورات نے خود آپ کی بڑی توصیف کی ہے۔(۳)

حضرت داؤد علیہ السلام کی فرماں روائی کی وجہ سے یہود آپ کے خلاف کوئی اور سازش نہ کر سکے تو تورات کے محرفین نے ایک بدترین تہمت ہی آپ پر لگا دی کہ:

> شام کے وقت داؤد اپنی پلنگ پر سے اُٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر سے اس ایک عورت کو دیکھا، جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی، اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلایا اور وہ اس کے بعد آئی اور اس نے اس سے صحبت کی، پھر وہ اپنے گھر چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوئی۔(۴)

---

(۱) متی: ۲۷، ۲۴ ـ ۲۷۔

(۲) یہ یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ہے، یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے، مگر اس اضافہ کے ساتھ کہ حضرت مسیح مدفون ہوئے اور تین دنوں کے بعد آسمان پر اُٹھا لئے گئے، قرآن کے نزول تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا، قرآن مجید نے اس قضیہ کی سچائی بیان کی کہ جس شخص کو پھانسی دی گئی، وہ مسیح نہ تھے؛ بلکہ آپ کی مخبری کرنے یا گرفتار کرنے کی نیت سے آنے والا شخص تھا، وہ قدرتِ خداوندی سے بالکل مسیح کا ہم صورت کر دیا گیا اور صلیب پر چڑھا دیا گیا، آپ کو اس سے قبل ہی جسم و روح کے ساتھ اُٹھا لیا گیا تھا، قرب قیامت میں پھر آپ کا نزول ہوگا، یہ بات گو عجیب معلوم ہوتی ہے، مگر آپ کی پیدائش اور وجود کا کون سا مرحلہ ہے، جو معجزہ نہ ہو اور انسان کی عقلِ کوتاہ کے لئے باعث تعجب نہ ہو، واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر!

(۳) دیکھئے: سموئیل، باب: ۷۔

(۴) سموئیل: ۱۱، ۲، ۵۔

تورات میں یہ بھی ہے کہ حضرت داوٴد علیہ السلام نے پہلے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے :

"حتی اوریاہ" کو میدانِ جنگ سے بلوایا؛ تاکہ وہ اپنی بیوی سے ہم بستر ہو اور حمل کا الزام ان پر نہ رہے؛ لیکن جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ نہ سویا تو ایک تدبیر کر کے اس کو قتل کرا دیا۔(۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے عظیم الشان اور انصاف پرور فرماں رواؤں میں ہیں اور منصب نبوت پر سرفراز ہیں، آپ ہی نے حکم خداوندی سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر فرمائی؛ چنانچہ تورات میں آپ کی بہت مدح وتوصیف کی گئی ہے؛(۲) لیکن ان ہی پیغمبر کے متعلق یہود نے یہ افسانہ طرازی کی کہ آپ اجنبی عورتوں سے صحبت کرنے لگے اور جب آپ بوڑھے ہوئے تو بیویوں نے آپ کے دل کو "غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا" (۳) گویا— نعوذ باللہ— آپ شرک میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ہارون علیہ السلام جن کو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت سے مشرف فرمایا اور دعوت توحید میں شریک کیا، خود ان پر بھی شرک وبت پرستی کی تہمت لگانے سے نہ چوکے اور کہا کہ انھوں نے ہی زیورات جمع کر کے سونے کی گائے بنائی اور لوگوں کو اس کی پرستش کی دعوت دی۔(۴)

افسوس کہ اس قوم کی جسارت نے صرف معاصر انبیاء ہی کو ہدف نہ بنایا؛ بلکہ انبیاء ماقبل کے بارے میں بھی بہتان تراشی کی اور ان کی پاک زندگیوں کو داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، حضرت نوح علیہ السلام پر تہمت دھری کہ آپ نے شراب پی اور برہنہ ہو گئے، (۵)

---

(۱) دیکھئے: ۲ سموئیل، باب: ۱۱:۳۔

(۲) ملاحظہ ہو: سلاطین: ۱/۲:۶۔

(۳) دیکھئے: سلاطین: ۱/۱۱:۳،۴۔

(۴) خروج: ۳۲:۱،۳۔

(۵) تکوین: ۲۰،۲۱۔

حضرت لوط علیہ السلام پر خود اپنی دو صاحبزادیوں کے ساتھ زنا اور اس کے ذریعہ دو بچوں ''موآب'' اور ''بنی عمی'' کی پیدائش کی تہمت باندھی ، (۱) —— یہ چند نمونے ہیں انبیاء اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ قومِ یہود کے برتاؤ اور سلوک کے ، جو مختلف عہد اور زمانہ سے متعلق ہیں اور جس سے یہ بات واضح ہے کہ انبیاء کے ساتھ بدسلوکی اور گستاخی اس قوم کے مزاج میں داخل ہے ، اگر ایک ایسی قوم کسی غیر اسرائیلی نبی کے ساتھ گستاخی کرے اور اپنی قومی بداطواری کو روا رکھے تو ہرگز تعجب نہ ہونا چاہئے۔

اعتقادی بگاڑ

یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ یہود میں انبیاء و رسل کی کثرت کے باوجود اعتقادی بگاڑ ہر دور میں قائم رہا اور شرک و بت پرستی کے خلاف ہر نبی اور مصلح کو آواز اُٹھانی پڑی ، جائے حیرت ہے کہ بنی اسرائیل ابھی فراعنہ مصر کے طوقِ غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اور بحر قلزم عبور کر کے بیابانِ شور میں پہنچے ہیں ، مصر میں قدم قدم پر خدا کی نشانیاں دیکھ چکے ہیں ، پھر بحر قلزم عبور کرتے ہوئے ''رب اعلیٰ'' ہونے کا دعویٰ کرنے والے فرعون کی ہلاکت و تباہی ابھی آنکھوں میں ہے ، یہ ساری آیاتُ اللہ ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کو ثابت کرے اور شرک کے ابطال کے لئے کافی و وافی ہے ، مگر عین اس وقت جب شریعتِ الٰہی سے سرفرازی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جبلِ طور پر طلبی ہوتی ہے تو اسی خانہ بدوشی کی

(۱) پیدائش : ۱۹ : ۳۰ ، ۳۷ ، انبیاء کرام کی ذات انسانیت میں سب سے بالاتر ہوتی ہے ، وہ معصوم ہوتے ہیں اور من جانب اللہ گناہوں سے ان کی حفاظت ہوتی ہے ، ان کی طرف ایسے شرمناک گناہوں کی ازراہ نقل نسبت کرتے ہوئے بھی ایک صاحب ایمان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ؛ لیکن یہاں ان کا ذکر محض اتمام حجت کے لئے ہے ، ورنہ ہم مسلمان ان انبیاء کو ان تہمتوں سے یکسر بری اور بہت ہی اعلیٰ و ارفع یقین کرتے ہیں ، فدٰہم روحی وابی وامی —— قرآن پاک نے اپنا ایک وصف ''مصدقاً لما بین یدیہ'' بتایا ہے کہ یہ پچھلوں کا تصدیق کرتا ہے ، پس یہ قرآن کی شانِ تصدیق ہے کہ بائبل نے پیغمبروں پر جو جو تہمتیں لگائیں ، قرآن پاک نے ان کی نفی کی اور ان کی برأت و پاکیزگی کی ایسی شہادت دی کہ آپ ﷺ پر ایمان رکھنے کے باوجود تمام انبیاء و رسل پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

حالت میں ایک ایک کا زیور جمع کیا جاتا ہے اور سونے کی ایک گائے بنائی جاتی ہے، پھر اس کی پرستش کی جاتی ہے اور اسی پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔(۱)

خدا کی طرف سے اس جرم کی پاداش میں حکم ہوا :

> تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک گھوم کر سارے لشکر میں اپنے بھائیوں اور اپنے ساتھیوں اور اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو؛ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے۔(۲)

کم سے کم قوم نے اس مواخذۂ خداوندی ہی کو یاد رکھا ہوتا، مگر ایسا بھی نہ ہوسکا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی نفسیات کو سامنے رکھ کر پہلے ہی ارشاد فرما دیا تھا :

- دیکھ تو اپنے باپ دادا کے ساتھ ہو جائے گا اور یہ لوگ اُٹھ کر اسی ملک کے اجنبی دیوتاؤں میں جن کے بیچ وہ جا کر رہیں گے، زنا کار ہو جائیں گے، اور مجھ کو چھوڑ دیں گے اور اس عہد کو جو میں نے ان کے ساتھ باندھا ہے، توڑ ڈالیں گے۔(۳)
- حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشع کو بھی یہی نصیحت کرنی پڑی کہ اب تم اجنبی معبودوں کو جو تمہارے درمیان ہیں، دور کرو اور اپنے دل کو خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف مائل کرو۔(۴)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شرک بنی اسرائیل میں جڑ پکڑتا چلا گیا، بائبل میں یرمیاہ نبی کے الہامات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں مشرک قوموں اور یہودیوں میں ادنیٰ فرق بھی باقی نہ رہ گیا تھا اور یہودی علماء اور پیشوا بھی اس میں مبتلا تھے، ارشاد ہوتا ہے :

> اور جان لے کہ یہ برا اور نہایت بے جا کام ہے کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو ترک کیا اور تجھ کو میرا خوف نہیں، ...... ہاں، ہر ایک

---

(۱) دیکھئے: خروج: ۳۲: ۱، ۵۔ (۲) خروج: ۳۲: ۲۶، ۲۷۔

(۳) استثناء: ۳۱: ۱۶۔ (۴) یشوع: ۲۴: ۲۳۔

اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے تو بدکاری کے لئے لیٹ گئی ...... تو تو تیز رو اونٹنی کے مانند ہے، جو ادھر ادھر دوڑتی ہے، مادہ گورخر کی مانند جو بیابان کی عادی ہے، جو شہوت کے جوش میں ہوا کو سونگھتی ہے، (۱) ...... جس طرح چور پکڑا جانے پر رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانہ رسوا ہوا، وہ اور اس کے بادشاہ اور امراء اور کاہن اور نبی، (۲) جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تم نے مجھے جنم دیا؛ کیوں کہ انھوں نے میری طرف منھ نہ کیا؛ بلکہ پیٹھ کی۔ (۳)

حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے یہودی مملکت دو حصوں میں منقسم تھی اور ایک اسرائیل اور دوسری یہودیہ سے موسوم تھی، یہ دونوں ہی اپنی بت پرستی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے کوشاں تھے —— یرمیاہ کے صحیفہ میں اس طرح خطاب کیا گیا ہے :

کیا تو نے دیکھا، برگشتہ اسرائیل نے کیا کیا ہے، وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری کی، اور جب یہ سب کچھ کر چکی تو میں نے کہا: وہ میری طرف واپس آئے گی، پر وہ نہ آئی ...... جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دیدی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا تو

(۱) بائبل کی یہ اور اس طرح کی عبارتوں میں بدکاری سے مراد بت پرستی ہے، گویا شرک کو ''زنا'' قرار دیا گیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی ایک حدیث میں شرک کی شناعت کو زنا سے سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ ایک غیرت مند شوہر کو اپنی بیوی کی بد چلنی پر جتنی غیرت آتی ہے، خدا کو اپنے بندوں کے مبتلائے شرک ہونے پر اس سے زیادہ غیرت آتی ہے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۸۱۹۳)

(۲) یہاں ''نبی'' سے جھوٹے مدعیانِ نبوت مراد ہیں، بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایسے مدعیانِ نبوت کی بھی کثرت تھی اور چوں کہ سلسلہ نبوت باقی تھا؛ اس لئے ان کی شناخت بھی مشکل تھی۔

(۳) یرمیاہ: ۲: ۱۹، ۲۷۔

بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری؛ بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی، اور ایسا ہوا کہ اس نے اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زنا کاری کی۔(۱)

بنی اسرائیل کی مشرکانہ حرکتوں نے کہیں کہیں طرز تخاطب میں بہت شدت کا رنگ پیدا کر دیا ہے، تورات کا بیان ہے :

تو نے بہت سے یاروں کے ساتھ بدکاری کی ہے..... پہاڑوں کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھا اور دیکھ، کون سی جگہ ہے جہاں تو نے بدکاری نہیں کی ...... تیری پیشانی فاحشہ کی ہے اور تجھے شرم نہیں آتی۔(۲)

اخلاقی بگاڑ

یہود کی تاریخ اور ان کے صحائف پر نظر ڈالی جائے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برائیاں بھی پوری طرح ان کے اندر سرایت کر چکی تھیں، تورات کے عہد عتیق میں اس کثرت سے بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کا ذکر ہے کہ ان کا احاطہ آسان نہیں، حزقی ایل نبی کے ایک خطاب میں ان کا اجمالی ذکر موجود ہے، فرماتے ہیں :

خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے شہر تو اپنے اندر خون ریزی کرتا ہے ــــ اور تو اپنے واسطے بتوں کو اپنے ناپاک کرنے کے لئے بناتا ہے ــــ تیرے اندر انھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا ہے، تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا، تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور بیواؤں پر ستم کیا ہے، تو نے میری پاک چیزوں کو ناچیز جانا

---

(۱) یرمیاہ: ۳: ۲-۱۰۔

(۲) یرمیاہ: ۳۰۔

اور میرے سبتوں، (۱) کو ناپاک کیا، تیرے اندر وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں اور تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں، تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں، تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی، تجھ میں انھوں نے اس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی، مباشرت کی، کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی اور کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی اور کسی نے اپنی بہن ــــ اپنے باپ کی بیٹی کو ــــ تیرے اندر رسوا کیا، تیرے اندر انھوں نے خون ریزی کے لئے رشوت خواری کی، تو نے بیاج اور سود لیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا۔(۲)

یسعیاہ قوم یہود کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

خطا کار گروہ، بدکاری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداریوں کی نسل، مکار اولاد۔(۳)

زنا کا ایسا عموم تھا کہ پیشوایانِ مذہب کے لڑکے عبادت کے لئے آنے والی عورتوں سے ہم آغوشی کرتے۔(۴)

اخلاقی سطح اس درجہ گر چکی تھی کہ کسی کے یہاں مہمان آتا تو لوگ فعل خلافِ فطرت کے لئے ٹوٹ پڑتے، ایک ایسے ہی واقعہ میں آخر نو وارد مہمان کو اپنی حرم کو اوباشوں کے حوالہ کرنا پڑا اور یہ اوباش بائبل کے الفاظ میں :

---

(۱) ہفتہ کے دن کو "سبت" کہتے ہیں، بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ دن عبادت کے لئے مخصوص تھا اور کسب معاش کی اجازت نہ تھی، مگر بنی اسرائیل اس کی پروانہ کرتے تھے، بعض کھل کر اس حکم کی بے حرمتی کرتے، اور بعض اس کے لئے حیلے اختیار کرتے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق اسی جرم میں ایک گروہ بنی اسرائیل کی صورتیں مسخ کر دی گئی تھیں۔

(۲) حزقی ایل: ۲۲: ۳، ۱۲۔ (۳) یسعیاہ: ۱: ۴۔ (۴) سموئیل: ۲: ۲۲۔

● ساری رات صبح تک اس کے ساتھ بدذاتی کرتے رہے،

اور جب دن نکلنے لگا تو اس کو چھوڑ دیا۔(۱)

غالباً یہی اخلاقی برائی تھی، جس کی بنا پر بنی اسرائیل نے بعض انبیاء اور ان کی اولاد کی طرف ایسی گھناؤنی اخلاقی برائیوں کی نسبت کی کہ طبع سلیم کسی طور اس کو گوارا نہیں کرتی، یہاں تک کہ ''یہوداہ'' جن کی طرف یہود اپنا انتساب کرتے ہیں، ان کو بھی نہیں بخشا گیا، کہ انھوں نے اپنی بہو سے زنا کیا تھا۔(۲)

بائبل اور تالمود کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی اعتبار سے زنا، معاشی اعتبار سے سود اور مذہبی اعتبار سے مصنوعی مذہبیت ـــــ جس کو حضرت مسیح نے ''اونٹوں کے نگلنے اور مچھروں کے چھاننے'' سے تعبیر فرمایا ہے ـــــ قوم یہود کا خاص مزاج ہے۔

یہود، حجاز و یمن میں

یہودیوں کی سرگرمیوں کا اصل مرکز مصر و فلسطین رہا ہے، مصر و فلسطین کے سرسبز و شاداب علاقوں کو چھوڑ کر حجاز کے بیابان میں یہود کیوں کر آئے اور یثرب میں کس طرح آباد ہوئے؟ اس سلسلہ میں مؤرخین سے دو طرح کی روایتیں منقول ہیں: ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں قوم عمالقہ کے کچھ لوگ حجاز کے علاقہ میں آباد تھے، ان کی سرکوبی کے لئے بنی اسرائیل کے ایک قافلہ کو آپ نے یہاں روانہ کیا، ان حضرات نے عمالقہ کا خاتمہ کرنے کے بعد ان کے ایک خوبرو شاہزادہ کی جان بخشی کر دی اور اس کو ساتھ لے کر شام پہنچے، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو چکا تھا؛ چنانچہ بنی سرائیل نے اِن لوگوں کے اس جرم کو اتنا سنگین تصور کیا کہ ان کو وہاں بسنے کی اجازت بھی نہ دی (فلا نؤویکم)، ناچار یہ حجاز کو واپس آ گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، یہ ابوالفرج اصبہانی کی روایت ہے جو اغانی میں نقل کی گئی ہے، مگر محققین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، سہیلی کا بیان ہے: ''لا احسب هذا صحيحاً'' (۳)

---

(۱) قضاۃ:۲:۲۵۔ (۲) پیدائش:۳۸:۱۸۔ (۳) الروض الانف:۲/۱۶۔

— یہ بات دو وجوہ کے تحت قرین قیاس نہیں، اول: اس لئے کہ بنی اسرائیل کی عمالقہ سے جنگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں ہوئی ہی نہیں؛ بلکہ آپ کے جانشین یوشع علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے، دوسرے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عمالقہ کے علاقہ حجاز میں فرماں روائی کے دور میں خاصا فرق ہے۔

دوسری رائے ہے کہ بخت نصر نے جب فلسطین وشام کے علاقہ پر قبضہ کیا، پوری اسرائیلی مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور چن چن کر یہودیوں کا قتل عام کیا، اس وقت یہودیوں کے ایک گروہ نے خیبر و مدینہ وغیرہ کی پناہ لی اور وہیں کے ہو رہے، (۱) یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے، اور عین ممکن ہے کہ یہودیوں کے اس علاقہ کے انتخاب کی وجہ یہ ہو کہ مشرکین عرب مذہبا بخت نصر سے قریب تھے اور اس لئے اس کی ہلاکت سامانیوں سے مامون تھے۔

پھر مدینہ ہی سے یہودیت ''یمن'' کے علاقہ میں پہونچی، یمن کا ایک بادشاہ حجاز کی طرف سے گذرا اور مدینہ بھی آیا، بعض دوست قبائل نے بادشاہ سے یہودیوں کی بدسلوکی اور دوسرے باشندگان شہر کے ساتھ ان کے نامناسب رویہ کی شکایت کی؛ چنانچہ بادشاہ نے احد کے سامنے پڑاؤ کیا، یہود کو طلب کیا اور تین سو پچاس افراد کو باندھ کر قتل کرڈالا، (قتل منهم ثلاث مائة و خمسين رجلا صبرا) اس موقع سے ایک یہودی بزرگ نے بڑی منت سماجت کی اور بادشاہ کا دل ایسا جیتا کہ کایا پلٹ گئی اور خود بادشاہ نے یہودیت قبول کر لی۔ (۲)

اب یہودیت یمن کا سرکاری مذہب بن گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں میں یہودیت نے ایک طاقتور شکل اختیار کر لی، گو یہودیت یمن میں حارث بن عمرو (جد امراء القیس) کے واسطہ سے پہنچی؛ لیکن ''ذونواس'' کے عہد حکومت میں اس کو ایسا رسوخ حاصل ہو گیا کہ ایک عیسائی راہب اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے چند خدا پرستوں کو علانیہ نذر آتش کر دیا گیا، جن کا قرآن نے ''اصحاب الاخدود'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (۳)

---

(۱) الروض الانف: ۱۶/۲۔ (۲) بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب: ۲/ ۲۴۰۔
(۳) بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب: ۲/ ۲۴۰۔

یہ بات قریب قریب تاریخی مسلّمات میں ہے کہ انصار مدینہ سے پہلے ہی یہودیوں نے مدینہ میں توطن اختیار کیا تھا، انصار جو اصل میں ''یمن'' کے علاقہ میں آباد تھے، مشہور سیلاب (سیل العرم) کی تباہی کے بعد مدینہ آئے، (۱) اس کا نتیجہ تھا کہ یہود کو مدینہ میں ایک طرح کی بالادستی حاصل تھی اور معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی ہر اعتبار سے ان کو اونچا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جن اخلاقی کمزوریوں کا بار بار تورات نے ذکر کیا ہے، ہر چند کہ تاریخ کا سینہ ان کو محفوظ نہ رکھ سکا، مگر یہاں بھی وہ اپنے اسی مزاج و مذاق کے ساتھ فروکش رہے؛ چنانچہ ''فطیون'' نامی یہود کا رئیس اعظم اس بے شرمی پر اُترا ہوا تھا کہ اوس وخزرج یا خود یہود کی کسی لڑکی کا نکاح ہوتا تو شوہر سے یکجائی سے پہلے یہ شخص اس کے ساتھ شب باشی کرتا، پھر وہ اپنے اصل شوہر کے پاس جاتی، یہ ایسا معمول بن چکا تھا کہ غالباً اس کی قباحت اور شناعت بھی باشندگان شہر کے ذہن سے رخصت ہو چکی تھی، مگر عرب کی نسلی غیرت رنگ لائی اور خزرج کے مالک بن عجلان نامی ایک شخص کی غیرت مند بہن نے خواتین یثرب کی آبرو کے اس غارت گر کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مالک کی بہن کا نکاح ہوا، وہ قوم کی مجلس سے اس بے حجابانہ انداز سے گذری کہ اپنے کپڑے پنڈلیوں سے اوپر اُٹھا رکھے تھے، مالک کو یہ ناگوار گذرا اور بہن پر خفگی ظاہر کی، بہن اسی موقع کی منتظر تھی، اس نے کہا: یہ کیا ہوا؟ اس سے بڑھ کر تو وہ مرحلہ ہوگا کہ میں اپنے شوہر کی بجائے ''رئیس شہر'' کے ساتھ شب بسری کروں گی، بہن نے بھائی کے تارِ دل کو صحیح وقت پر چھیڑا تھا؛ چنانچہ مالک ایک خاموش تدبیر کے ذریعہ عورتوں کے ساتھ خود بھی زنانہ لباس میں حجرہ خلوت میں جا گھسا اور اس بے شرم انسان کو پایہ انجام تک پہنچا کر شام کو راہ فرار اختیار کی، نیز شاہ غسان کے ایک ذی اثر مصاحب —— جو خود بھی خزرجی تھا —— ابوجُبَیلہ سے یہ داستان کہہ سنائی اور کہا کہ اب حجاز واپسی کی ہمت نہیں؛ چنانچہ ابوجبیلہ مالک کے ساتھ یثرب آیا، سرداران یہود کو جمع کیا اور ایک ایک کا سر قلم کر دیا، اس واقعہ کے بعد پانسہ پلٹ چکا تھا اور اب مدینہ پر سیاسی غلبہ اوس وخزرج کو حاصل ہو گیا۔ (۲)

(۱) الروض الانف: ۲/۱۶۔ (۲) الکامل لابن اثیر: ۱/۲۷۶، ذکر غلبۃ الانصار علی المدینۃ۔

مگر ان سب کے باوجود یہود نے اوس وخزرج کو باہم لڑا کر سیاسی اعتبار سے اور سود خواری نیز زرخیز نخلستانوں پر قبضہ کے ذریعہ معاشی اعتبار سے بتدریج پھر اپنا ایک مقام بنالیا تھا اور آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے لوگ مذہبی اعتبار سے بھی ان کو قدر واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ عورتیں نذر مانتی تھیں کہ ان کے بچے زندہ رہ گئے تو انھیں یہودی بنائیں گی :

وكان من نساءهم من تنذر إذا ولدت إن عاش ولدها أن تهوده ؛ لأن اليهود عندهم كانوا أهل علم وكتاب ۔ (۱)

اگر چہ کہ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے، جو بنی اسرائیل تک محدود ہے، تبلیغی ودعوتی مذہب نہیں، پھر بھی قبائل اوس وخزرج میں بہت سے لوگوں نے بطور خود یہودیت اختیار کرلی تھی ؛ چنانچہ ابن ہشام نے اسلام کی مخالفت میں سرگرم جن روساء یہود کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر قبائل عرب سے تعلق رکھتے تھے ۔ (۲)

یہود اور مسلمانانِ مدینہ

یہود چوں کہ ایک الہامی مذہب کے حامل تھے اور فی الجملہ توحید کے قائل تھے؛ اس لئے فطری طور پر پیغمبر اسلام ﷺ بمقابلہ مشرکین کے اہل کتاب —— یہود ونصاری —— کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے : چنانچہ شریعت نے کتابی عورت سے نکاح اور ان کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا ہے، (المائدۃ : ۵) یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے بھی اس کو مسنون قرار دیا، یہودی نعش کے گذرنے پر آپ ﷺ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے توجہ دلائی کہ یہ یہودی کی نعش ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ بھی انسان ہے، مدینہ آنے کے بعد جب تک قبلہ کے متعلق صریح حکم نازل نہ ہو گیا اور آپ ﷺ کے اجتہاد پر موقوف رہا، آپ ﷺ نے بیت المقدس کو

---

(۱) الروض الانف : ۲/ ۲۴۔

(۲) ملاحظہ ہو، سیرت ابن ہشام : ۲/ ۲۴۔

قبلہ بنایا، مدینہ میں یہود کے مدرسہ ''بیت المدراس'' کو آپ ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے،(۱) ایک اسی پر موقوف نہیں، حدیث میں ہے کہ جن باتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم آپ ﷺ کو نہیں دیا جاتا، آپ ان میں اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے :

كان يحب موافقة أهل الكتاب في مالم يؤمر فيه بشئي ۔ (۲)

اسی کا اثر تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ نے جو بین قومی معاہدہ تحریر فرمایا، اس میں مسلمانوں اور مدینہ کے دوسرے قبائل کے ساتھ یہود کو بھی صراحتاً شریک رکھا، یہاں اس وثیقہ کے بعض فقروں کا نقل کیا جانا مناسب ہوگا :

وأن اليهود ينفقون مع المؤمنين ما داموا محاربين ، وأن يهود بني عوف أمة مع المؤمنين ، لليهود دينهم وللمسلمين دينهم مواليهم وانفسهم ، إلا من ظلم وأثم ، فإنه لا يوتغ إلا نفسه ۔(۳)

پھر آپ ﷺ نے انصار اور یہود کے ہر خاندان بنونجار، بنوعوف، بنوحارث، بنواوس، بنوقیلہ کا ایک ایک کر کے ذکر فرمایا اور ان کو اس عہد میں شامل فرمایا، اس معاہدہ نے مسلمان اور یہود دونوں فریق پر نہ صرف امن اور بقاء باہم کی ذمہ داری رکھ دی؛ بلکہ مدینہ کی حفاظت اور اس کی حفاظت میں ایک دوسرے کی مدد واعانت کے بھی وہ پابند ہوگئے، اس کا تقاضا تھا کہ یہود سچے دل سے اس معاہدہ پر قائم رہتے اور توحید وحق کے اس پودے کو پروان چڑھنے دیتے، مگر یہ حد درجہ افسوس ناک بات ہے کہ پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ مخاصمت، تضحیک اور ایذاء رسانی کی ان کی پرانی عادت نے پھر انگڑائی لی اور انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا تھا، کسی

---

(۱) اسباب الواحدی:۸۵۔

(۲) بخاری کتاب اللباس، حدیث نمبر:۵۵۷۳۔

(۳) سیرت بن ہشام:۱؍۵۰۳۔

فرق کے بغیر پھر ان کو دہرانا شروع کیا، جس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے، جو یہودیوں سے متعلق خاص واقعات کی وجہ سے نازل ہوئی ہیں، یا ان احادیث سے جن میں یہودیوں کی اخلاقی حالت کا ذکر ہے، ان کے اس رویہ کا گہرا تعلق ان کے ایمان اور اعتقادات تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ اگر آخرت میں ان کو عذاب ہوا بھی تو چند دنوں ہوگا، ان کا خیال تھا کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے، ہر ہزار سال کے بدلے آخرت میں صرف ایک دن کا یعنی سات دنوں کا عذاب ہوگا: ''لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً''۔(۱)

اللہ کی نشانیوں کے ساتھ تضحیک کا حال یہ تھا کہ کہتے کہ آپ پر ایمان ہم اس لئے نہ لائیں گے کہ وحی لے کر جبرئیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں، جبرئیل علیہ السلام سے ہماری پرانی دشمنی اور میکائیل علیہ السلام سے دوستی ہے، (۲) اپنے بارے میں اس درجہ خوش فہم تھے کہ کہتے تھے ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں: ''نحن أبناء الله وأحباؤه'' (۳) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا پرانا مذاقِ شرک مشرکین عرب اور نصرانیوں کی محبت سے پھر عود کر آیا تھا؛ چنانچہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ حضرت عزیر کو ''ابن اللہ'' (خدا کا بیٹا) قرار دیتے تھے، قرآن کے اس بیان کی دو طرح تائید ہوتی ہے، ایک تو یہودیوں کی پوری تاریخ جس میں ہر زمانہ میں شرک کا اثر موجود ہے، دوسرے: قرآن کے اس علانیہ اظہار پر یہود کی خاموشی اور ان کا احتجاج نہ کرنا، عربی زبان میں ''راعنا'' کے معنی ہیں، ہماری طرف توجہ کیجئے، صحابہؓ اپنی طرف آپ کی توجہ کے طلب گار ہوتے تو اسی کلمہ کے ذریعہ درخواست کرتے، عبرانی زبان میں یہ لفظ بُرے مفہوم میں آتا ہے؛ چنانچہ آپ کی مجلس میں آتے تو ''راعنا'' کہتے اور مضحکہ آمیز ہنسی ہنستے، حضرت سعد بن عبادہؓ نے جو اُن کی زبان سے کسی قدر واقف تھے، اس کا احساس کیا اور یہودیوں سے ان کی اس تعبیر پر ناگواری ظاہر کی۔(۴)

---

(۱) البقرۃ:۸۰، اسباب النزول للسیوطی:۱۴۔ (۲) بقرہ:۹۷، ۹۸، اسباب النزول للواحدی:۳۶۔
(۳) اسباب النزول للواحدی:۸۹۔ (۴) اسباب النزول للواحدی:۴۰۔

علامہ بغویؒ نے سعد بن عبادہ کی بجائے سعد بن معاذؓ کا ذکر کیا ہے؛(۱) چنانچہ بالآخر آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور صحابہؓ کو بھی ایسی ذو معنین تعبیر اختیار کرنے کی بجائے ''انظرنا'' (میری طرف توجہ فرمایئے!) کہنے کا حکم فرمایا گیا،(۲) یہ حضور ﷺ سے ملتے تو ''السلام علیکم'' کی جگہ ایک بددُعائیہ کلمہ ''السام علیکم'' (تم پر موت ہو) کہتے اور لفظی اشتباہ سے دھوکہ دیتے، آپ کمالِ حلم کے ساتھ صبر فرماتے اور 'وعلیکم' کہنے پر اکتفا کرتے، حضرت عائشہؓ کے سامنے ایک یہودی نے اسی طرح کہا تو آخر آپ تاب نہ لاسکیں اور برا بھلا کہا۔(۳)

آپ نے ہمیشہ یہود کو سنجیدہ طور پر اسلام کی دعوت دینے کی کوشش کی، غزوہ بدر کے بعد آپ ﷺ نے تلقین کی کہ اہل مکہ کے انکار وکفر کی وجہ سے خدا کا ان پر جو عتاب ہوا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے؛ اس لئے تم اسلام قبول کرلو، مگر ان حضرات نے کوئی سنجیدہ جواب دینے کی بجائے کہا کہ ایک ناتجربہ کار اور جنگ سے ناآشنا قوم پر فتح مندی تم کو غرور میں مبتلا نہ کردے،(۴) ایک اور موقع پر جب علماء یہود سے آپ کی گفتگو ہوئی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں دین ابراہیمی پر ہوں تو انھوں نے ایسا جواب دیا جو یکسر عقل اور واقعات کے خلاف تھا، یعنی یہ کہ ابراہیم بھی یہودی تھے۔(۵)

ہر وقت اس بات کے درپے رہتے تھے کہ انصار ومہاجرین اور انصار کے قبائل اوس وخزرج میں کسی طرح دوبارہ جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی شاس بن قیس اوس وخزرج کی جنگ کے رجزیہ اشعار سنا کر بالآخر فضاء کو گرم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور فریقین کی طرف سے اسلحہ تک نکل آئے، آپ کی بروقت سعی وکوشش اور نصیحت نے اس آگ کو خاکستر کردیا۔(۶)

---

(۱) تفسیر بغوی:۱/۱۳۲۔ (۲) البقرۃ:۱۰۴۔

(۳) ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی الذمی، حدیث نمبر:۲۷۰۱۔

(۴) مختصر ابن کثیر:۱/۲۶۸۔ (۵) اسباب النزول للواحدی:۸۵۔

(۶) اسباب النزول:۹۹۔

خدا کو تسلیم کرنے کے باوجود خدا کے ساتھ بھی ان کی جسارت حیرت انگیز تھی، قرآن میں ایک موقع پر لطیف پیرایہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ "خدا کے بندے خدا کو قرض دیں" یعنی خدا کے بندوں کی مدد کریں، یہ انفاق کی طرف توجہ دلانے کے لئے ایک ایسی لطیف تعبیر ہے کہ اصحاب دانش کو اس پر وجد آجائے، مگر ایک یہودی عالم "فنحاص بن عازوراء" نے اسی کو خدا کے ساتھ گستاخی کی اساس بنالیا اور کہنے لگا: خدا غریب و محتاج ہے اور ہم غنی ہیں کہ اس کو ہمارے قرض کی حاجت ہے؟ حضرت ابوبکرؓ آخر جوش حق میں اس کو برداشت نہ کر سکے اور اس کو طمانچہ رسید کر ہی دیا۔(۱)

اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے، تورات میں آخری نبی کے سلسلہ میں جو علامتیں ذکر کی گئی ہیں، ان کو چھپاتے ان کی غلط تعبیر کرتے اور یہ سب محض اس لئے کہ عوام کے نذر و نیاز کے دروازے ان پر بند نہ ہو جائیں۔(۲)

اس سازش کی بھی سعی کی گئی کہ کچھ یہود پہلے مصنوعی طور پر اسلام قبول کریں اور پھر مرتد ہو کر یہودیت کی طرف واپس آجائیں؛ تا کہ دوسروں کو معلوم ہو کہ یہ دین حق نہیں ہے،(۳) ستم ظریفی کی انتہاء یہ ہے کہ بمقابلہ پیغمبر اسلام کے مشرکین کا ساتھ دیتے اور ان کے دین کو اسلام سے فائق و برتر قرار دیتے،(۴) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر تعجب کا کوئی موقع نہیں کہ یہ ان کی مشرکانہ نفسیات کے عین مطابق تھا، حقیر و خسیس مقاصد کے لئے احکام الٰہی میں تحریف ان کے لئے معمولی بات تھی، مدینہ تشریف آوری کے بعد بارگاہ نبوی میں یہودیوں کے زنا کا ایک مقدمہ خود ان کی طرف سے فیصلہ کے لئے پیش ہوا، آپ ﷺ نے ان سے تورات کا حکم دریافت فرمایا تو کمال خیانت کے ساتھ علماء یہود نے رجم کے حکم کو ہاتھ سے ڈھک لیا، مگر ایک یہودی عالم (جو اَب دامن اسلام میں آچکے تھے) موجود تھے؛ انھوں نے بروقت ٹوکا اور ان کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔(۵)

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۴؍۲۹۴، اسباب النزول: ۱۱۲۔ (۲) دیکھئے: اسباب النزول: ۹۲۔
(۳) اسباب النزول للواحدی: ۹۴، للسیوطی: ۵۷۔ (۴) البدایہ والنہایہ: ۴؍۹۴۔
(۵) اسباب النزول للواحدی: ۱۹۰، تفسیر کبیر: ۱۱؍۲۳۶۔

مالی لین دین میں سود اور سود کے معاملہ میں قساوت قلبی اور غرباء کا استحصال ان کا خاص فن تھا، معمولی چیزوں کے لئے معصوم بچوں کا قتل کر دیتے اور ان کا زیور چھین لیتے، یہودیوں کی اخلاقی گراوٹ کا یہ حال ہمیں کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے جس سے زیادہ محفوظ کوئی اور ماخذِ تاریخ ہمارے پاس موجود نہیں ہے، اس کے ساتھ کتاب وسنت کے بیان کردہ مواد کی تائید اسرائیل کی پوری تاریخ میں موجود ہیں، جو خود بائبل کے بیانات سے ثابت ہے اوران کے وہ مذہبی اُصول وقواعد ہیں، جن کا ''تلمود'' میں ذکر کیا گیا ہے، ان سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہود کا کیا کچھ رویہ تھا؟

یہی وہ حالات تھے، جن میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان چار جنگیں ہوئی ہیں، غزوہ بنو قینقاع، بنونضیر، بنو قریظہ اور خیبر — اور خاص طور پر دو اہم روساء — کعب ابن اشرف اور سلام بن ابی الحقیق — قتل کئے گئے ہیں؛ چنانچہ اب ان میں سے ایک ایک پر علاحدہ گفتگو کی جاتی ہے :

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف، یہودیوں کا ممتاز سردار تھا، اس کی ماں بنونضیر کی تھی اور باپ کا تعلق ایک عرب قبیلہ بنوطیؒ سے تھا۔(۱)

عرب اور یہود سے دوطرفہ رشتہ داری نے یقیناً اس کی حیثیت میں اضافہ کیا ہوگا، اہل سیَر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مال دار بھی تھا، قد وقامت کے لحاظ سے بھی وجیہ تھا، شعر وسخن میں درک رکھتا تھا اور قادر الکلام شاعر تھا، دولت کا یہ حال تھا کہ مختلف علمائے یہود کا اس کے یہاں سے وظیفہ مقرر تھا اور وہ اس وظیفہ خواری کی قیمت اس طرح ادا کرتے کہ ان علماء کو اس کی ہر صحیح اور غلط کی تائید کرنی ہوتی تھی، آپ ﷺ کی آمد کے بعد اس نے ایک دفعہ اپنے وظیفہ خوار علماء سے آپ کے دعویٰ نبوت کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے آپ کی صداقت کی شہادت دی، کعب کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی اور ان کو خالی ہاتھ لوٹا دیا، آخر اس حرص نے ان علماء اَحبار کو کذب بیانی پر آمادہ کیا اور آپ کی تکذیب کے بعد ہی ان کو مقررہ وظیفہ مل سکا۔(۲)

---

(۱) الدرر لابن عبدالبر: ۱۵۰۔ (۲) زرقانی علی المواهب: ۲/۹۔

افسوس کہ اپنی دولت وثروت کے علاوہ شعر گوئی کی قوت کا استعمال بھی یہ ہمیشہ حق کے خلاف ہی کیا کرتا تھا، مسلمان خواتین پر عشقیہ اشعار کہتا کہ ان کو اذیت پہنچے، خود حضرت عباسؓ کی زوجہ اُم فضلؓ کے بارے میں اہل سِیَر نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے :

أراحل أنت لم ترحل لمنعبته
وتارك أنت أم الفضل بالحرم (۱)

غزوہ بدر کی فتح کے بعد جب آپ نے مدینہ خوشخبری بھیجی اور روساء قریش کے قتل کی اطلاع سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی، کعب بن اشرف کے لئے اس سے زیادہ کوئی اطلاع باعث رنج نہ تھی، اس نے کہا اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو زمین کا اندرون (یعنی قبر) زمین کی پشت سے بہتر ہے: ''لبطن الارض خير من ظهرها'' (۲) اس نے اپنے اشعار میں خود پیغمبر اسلام ﷺ کی بھی ہجو کی اور اسی پر اکتفاء نہ کیا؛ بلکہ غزوہ بدر کے بعد اہل مکہ کو اشتعال دلانے، ان کی آتشِ انتقام کو بھڑکانے اور مسلمانوں کے خلاف نئے جوش وخروش کے ساتھ صف آراء کرنے کی غرض سے مکہ کا سفر کیا اور نہایت جذباتی اور اشتعال انگیز مرثیے کہے اور سنا سنا کر عربوں کی روایتی غیرت کو بھڑکایا۔ (۳)

ابن ہشام نے کعب کے بعض مراثی کا ذکر کیا ہے، اس کے ایک مرثیہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

طحنت رحى بدر لمهلك اهله
ولمثل بدر تستهل و تدمع (۴)

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ عرب کے اس عہد کی شاعری کو آج کل کی شاعری پر قیاس نہ کرنا چاہئے، اس زمانہ میں شعر ہی سب سے بڑا موثر ذریعہ تشہیر تھا اور کسی قادر الکلام شاعر کا ایک شعر کسی شخص کی کردار کشی کے لئے اسی طرح کافی ہوتا تھا، جیسا کہ ہمارے دور میں

---

(۱) الروض الانف: ۲/۱۲۳۔ (۲) زرقانی: ۲/۱۰۔
(۳) طبقات ابن سعد: ۲/۲۱، القسم الاول۔ (۴) ابن ہشام: ۲/۱۲۳۔

صحافتی ذرائع سے شائع ہونے والی خبریں یا الیکٹرک میڈیا کی فیک نیوزیں؛ چنانچہ کعب کی یہ ریشہ دوانی ضائع نہ گئی اور شاید اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اس چھوٹی سی عسکری قوت کو ایک ہی سال بعد مکہ کی ایک زبردست فوجی طاقت سے میدان اُحد میں نبرد آزما ہونا پڑا۔

ان اسباب کے علاوہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کعب نے بعض یہودیوں کو تیار کیا تھا کہ وہ آپ کو دعوت ولیمہ دیں اور اسی موقع سے آپ کا کام تمام کر دیا جائے، (۱) اور یہود کا آپ کے ساتھ جو رویہ تھا، اس کے تحت اس طرح کا اقدام قطعاً خلاف توقع اور ناقابل قیاس نہیں ہے۔

یہ عہد شکنی، مسلمان عورتوں کی بے آبروئی، آپ ﷺ کی ہجو، اہل مکہ کے ساتھ ساز باز اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کے باوجود اس پر کوئی اقدام نہ کرنا مدینہ کی چھوٹی سی مسلم آبادی کے تحفظ کے لئے زبردست خطرہ بن سکتا تھا؛ چنانچہ کعب کی مدینہ واپسی کے بعد آپ کی زبان مبارک سے یہ فقرہ نکلا :

اللّٰھم اُکفنی ابن الاشرف بما شئت
فی اعلانہ الشر و قولہ الاشعار (۲)

خداوندا! تو کعب بن اشرف کے علانیہ شر کی تشہیر اور شعر
گوئی کے مقابلہ اپنی مشیت کے مطابق کافی ہو جا!

بعض مخلص صحابہ جن میں محمد بن مسلمہؓ پیش پیش تھے، اس مہم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت حسن تدبیر کے ساتھ اس مہم کو پایہ انجام تک پہنچایا اور کعب بن اشرف کو واصل جہنم کیا، اگر چہ کہ اس واقعہ کی تفصیل ذکر کرنی اس وقت مقصود نہیں ہے؛ لیکن اس واقعہ کا ایک پہلو ایسا ہے کہ جس سے کعب کی اخلاقی حیثیت واضح ہوتی ہے، محمد بن مسلمہ قرض مانگنے کے بہانے اپنے ساتھیوں کو لے کر کعب کے پاس گئے اور ایک ایسا مبہم جملہ استعمال کیا، جس سے بظاہر آپ ﷺ کی مخالفت معلوم ہوتی تھی؛ تا کہ کعب کو مطمئن کیا جا سکے۔

---

(۱) زرقانی علی المواہب: ۲/۱۱۔ (۲) طبقات ابن سعد: ۲/۲۱، القسم الاول۔

اس موقع سے قرض کے لئے کعب نے سامان قرض کے طور پر سب سے پہلے جو چیز طلب کی، وہ یہ تھی کہ قرض خواہ اپنی عورتوں کو اس کے حوالہ کردیں، ان حضرات نے حسن تدبیر سے اس مطالبہ کو رد کردیا اور کہا کہ تم عرب کے خوبصورت ترین آدمی ہو، ہمیں خود اپنی عورتوں پر اطمینان نہیں، (۱) خراسانی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ تم خوبصورت آدمی ہو اور عورتوں کے دلدادہ ہو، ''أنت رجل حسان یحب النساء'' (۲) اس سے کعب کی اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے، خراسانی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا واقعہ نہ تھا؛ بلکہ کعب کی عیاشی لوگوں میں معروف و مسلم تھی، ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر کوئی بھی صاحبِ انصاف اندازہ کرسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ اقدام کس قدر منصفانہ اور واجبی تھا!

سلّام بن ابی الحقیق

جن یہودیوں کو خاص طور پر قتل کرایا گیا، ان میں سے ایک سلام بن ابی الحقیق بھی ہے، جو ابورافع کے نام سے معروف تھا، غزوۂ خندق کی آگ جن لوگوں نے بھڑکائی تھی اور مسلمانوں کے خلاف عرب کی پوری قوت کو یکجا کردیا تھا، ان میں کعب بن اشرف کے بعد دوسری نمایاں شخصیت اسی سلام بن ابی الحقیق کی تھی، بنوقریظہ کی مہم کے بعد سلام کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا، جو اس وقت خیبر میں مقیم تھا اور جس سے اس امر کا خطرہ درپیش تھا کہ وہ جنگ بنوقریظہ کا انتقام لینے کی غرض سے مہم جوئی کرے اور مشرکین اور یہودیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے۔

ان ہی حالات کے پیش نظر قبیلہ خزرج کی شاخ بنوسلمہ کے لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کے قتل میں پیش قدمی کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دی؛ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس مہم میں کسی بچہ یا عورت کا خون نہ ہونے پائے؛ چنانچہ ایک پانچ نفری قافلہ اس ارادہ سے خیبر گیا اور اس نے پیغمبر ﷺ کی ہدایت کا پورا پورا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس مہم کو انجام دیا اور سوائے ابورافع کے کسی اور پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ (۳)

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/۲۳۔ (۲) زرقانی علی المواہب: ۲/۱۲۔
(۳) البدایہ والنہایہ: ۴/۱۳۷۔

غور کیا جائے تو مسلمانوں کا یہ اقدام بالکل واجبی اور مبنی بر انصاف تھا، غزوہ خندق کی آگ لگانے میں قائدانہ کردار ادا کر کے ابورافع نے اپنے لئے قتل کا مکمل جواز پیدا کر دیا تھا، پھر پچھلے تجربات کی روشنی میں یہ سوچنا بالکل قرین قیاس تھا کہ ایسے لوگوں کو اگر فرصت مل جائے تو یہ اس کو ضائع کئے بغیر کسی دوسری جنگ کی تیاری میں صرف کریں گے اور مدینہ کی اسلامی مملکت کی صیانت و سلامتی کے لئے زبردست خطرہ بن کر ابھریں گے۔

بنوقَینُقاع

یہودیوں میں ایک اہم قبیلہ ''بنوقینقاع'' کا تھا، زرگری اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا، (۱) اس قبیلہ میں لڑنے والوں کی تعداد چھ سو تھی، (۲) یہودیوں کے دوسرے قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ کا ان سے نباہ نہ ہوتا تھا اور آپ کی تشریف آوری سے قبل ہی ''جنگ بُعاث'' ہو چکی تھی، جس میں اوس کے ساتھ مل کر بنونضیر و بنوقریظہ نے بنوقینقاع کے ساتھ بڑا بے دردانہ سلوک روا رکھا تھا، (۳) مسلمانوں کی پہلی جنگ اسی قبیلہ بنوقینقاع سے ہوئی۔

بنوقینقاع سے جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مصنفین نے اس کی وجہ بنوقینقاع کی طرف سے معاہدہ شکنی کو قرار دیا ہے، (۴) لیکن اس عہد شکنی کی تفصیل نہیں ملتی کہ اس سے غزوہ بدر میں مسلمانوں کا عدم تعاون مراد ہے، یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی ہے، اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس عہد شکنی کی کوئی اور صورت بھی پیش آئی ہوگی؛ کیوں کہ مسلمانوں سے تعاون کا ہاتھ کھینچنے میں تمام یہود شریک تھے، پھر محض اسی ایک قبیلہ کو عہد شکنی کی سزا دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی ایسا پیش آیا، جو اس جنگ کا باعث ہو گیا، ایک انصاری خاتون بنوقینقاع کے بازار میں اپنا سامان فروخت کرنے گئی، انھوں نے چہرہ پر نقاب ڈالا ہوا تھا، بنوقینقاع کے نوجوانوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا چہرہ کھول دیں، مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئیں؛ لیکن وہ جس زرگر کی دوکان پر تھیں، اس نے پیچھے سے ان کا کپڑا اوپر کی طرف کو

(۱) زاد المعاد: ۷۹/۲۔ (۲) زاد المعاد: ۷۹/۲۔

(۳) تاریخ الیہود فی العرب: ۹۔ (۴) ملاحظہ ہو: الدرر فی اختصار المغازی والسیر: ۱۴۹۔

کا نٹے سے اس طرح باندھ دیا کہ ان کو احساس بھی نہ ہوسکا، اب جو وہ اٹھیں تو جسم بے پردہ ہو گیا اور نوجوان استہزاء کرنے لگے، اس بے ہودہ حرکت پر اس نے مسلمانوں کو آواز دی؛ چنانچہ ایک مسلمان نے اس بے ہودہ شخص کو قتل کر دیا اور یہود نے اس کی مدد کی اور قاتل کو شہید کر دیا، ایک پیغمبر خدا جس نے مسلمان عورت کے چہرے کو بھی غیر محرم مرد کے لئے حرام کر دیا ہو، اس پر اس بے ہودہ واقعہ کا جو اثر ہوا ہوگا، وہ ظاہر ہے، مگر روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے پھر بھی صبر وتحمل کا مظاہرہ فرمایا اور نصح وموعظت کی راہ اختیار کی۔

بنوقینقاع کے قبیلہ آئے اور ان کو دعوت دی، خدا سے ڈرایا، بنوقینقاع کے لئے قبول کرنے اور نہ کرنے کی راہیں کھلی تھیں اور وہ مسلمان مقتول کے قصاص یا خون بہا پر معاملہ طے کر کے معاہدہ کو باقی رکھ سکتے تھے، مگر انھوں نے خود ہی تصادم کی راہ اختیار کی اور کہنے لگے کہ فنون حرب سے ناواقف اہل مکہ پر فتح کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ، ہم تمہیں بتادیں گے کہ ہم مرد ہیں: ''أما واللہ لو حاربتنا لعلمت أن حربنا لیس کحربهم و إنا لنحن الناس''۔(۱)

گویا خود ان حضرات نے طبل جنگ بجا دیا، مسلمانوں نے فوج کشی کی اور بنوقینقاع کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، ۱۵؍ دنوں (۱۵؍ شوال تا یکم ذیقعدہ) کے محاصرہ کے بعد بنوقینقاع نے ہتھیار ڈال دیئے اور آپ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے، آپ نے خود ان کے حلیف عبداللہ بن ابی کے مشورہ پر ان کو جلاوطن کر دیا، پس حقیقت یہ ہے کہ بنوقینقاع اپنی عہد شکنی، غیر اخلاقی طرز عمل اور جنگ میں پہل کی وجہ سے اس سے زیادہ سخت سزا کے مستحق تھے، مگر آپ ﷺ نے اسی پر اکتفا فرمایا۔

بنونضیر

عمرو بن اُمیہ ضمری نے منشاء نبوی کے خلاف بنوعامر کے دو افراد کو قتل کر دیا، رسول اللہ ﷺ پر یہ بات گراں گذری؛ کیوں کہ آپ اس وقت تک کسی کے خلاف طاقت کا استعمال

(۱) الدرر: ۱۵۰۔

مناسب نہیں سمجھتے تھے، جب تک کوئی اسلام اور مسلمانوں سے کھلے ہوئے تصادم کی راہ اختیار نہ کرے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کی دیت ادا کروں گا: ''قد قتلت قتیلین لَأُدِيَنَّهُمَا''۔(۱)

بنونضیر کا مسلمانوں سے حلیفانہ معاہدہ تھا، اس کے پیش آپ ﷺ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی رفاقت میں بنونضیر تشریف لے گئے اور ان سے دیت کی ادائے گی میں مدد کی خواہش کی، ان لوگوں نے آپ سے بظاہر پورے توقیر و احترام کا معاملہ کیا؛ مگر باطن آپ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کی اس طرح سازش کی کہ عین اسی فصیل پر ایک شخص چڑھ کر پتھر کی چٹان گرادے، جس سے متصل آپ ﷺ تشریف فرما تھے، اس کے لئے عمرو بن جحاش بن کعب نامی ایک شخص تیار بھی ہوگیا، (۲) بعض لوگ جن کو حضور ﷺ کی پیغمبرانہ حیثیت کا ادراک تھا اور جن کے ضمیر میں زندگی اور شرافت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، اس سے منع بھی کیا، اہل سیَر نے اسی حیثیت سے سلاّم بن مِشکَم کا ذکر کیا ہے، (۳) ادھر رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوگئی، آپ خاموشی سے اُٹھے اور اس طرح چلے آئے کہ اپنے رفقاء کو بھی اطلاع نہ کی، یہی اس وقت قرین مصلحت تھا، ادھر آپ آئے اور اُدھر سازش کرنے والوں کے پیروں سے زمین نکل گئی۔

بنونضیر کی اس سازش کے سلسلہ میں مسلمانوں کے لئے یہ کافی ہے کہ قرآن مجید خود اس پر شاہد (المائدہ:۵) اور آپ ﷺ کی زبان حق ترجمان اس پر ناطق ہے، مگر اس سے قطع نظر بھی اس پر یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں، اول یہ کہ جب آپ نے بنونضیر کو اسی جرم کی پاداش میں شہر بدری کا حکم دیا تو کہیں اس کا ذکر نہیں کہ انھوں نے اس الزام کی تردید کی ہو، اہل سیر سے یہ بات بعید ہے کہ ایسی کوئی بات ہو اور وہ اس کا بالکل ذکر نہ کریں، ہاں یہ ممکن تھا کہ اگر ان کی

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱۸۶/۲۔

(۲) الدرر: ۱۷۴۔

(۳) طبقات بن سعد: ۴۰/۲، القسم الاول۔

طرف سے تردید ہوئی ہوتی تو وہ اس کا ذکر کرتے اور ان کی تکذیب بھی کرتے —— دوسرے: بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود اس طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے؛ چنانچہ غزوۂ بنو قریظہ کے موقع سے ایک یہودی خاتون محض اس لئے قتل کی گئی کہ اس نے خلاد بن سوید کو ٹھیک اسی طرح شہید کر دیا تھا۔(۱)

یہ تو ایک خاص واقعہ تھا، بعض دوسرے حالات بھی ایسے تھے کہ مدینہ کی اس اسلامی مملکت کی سالمیت کے لئے بنونضیر کو یہاں سے جلاوطن کیا جانا ضروری تھی؛ کیوں کہ یہ کفار مکہ کے لئے جاسوسی کا فریضہ انجام دیتے تھے اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر بھڑکاتے تھے، موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے: ''كانوا قد دسو إلى قريش في قتال رسول الله فحضوهم على القتال و دلوهم على العورة''۔(۲)

بنونضیر کے اس معاندانہ طرز عمل نے آپ کے لئے ان کے خلاف فوج کشی کا پورا پورا جواز پیدا کر دیا تھا، مگر آپ نے اب بھی نرم خوئی کو راہ دیا اور ان کو دس دنوں کی مہلت دی کہ شہر چھوڑ دیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں، (۳) مگر راس المنافقین عبد اللہ بن ابی کا ہاتھ ان کی پشت پر تھا، اس نے کہلا بھیجا کہ میرے ساتھ دو معزز آدمی ہیں اور بنوقریظہ بھی تمہاری مدد کو تیار ہیں، تم جنگ کی راہ اختیار کرو۔(۴)

چنانچہ اب آپ کے لئے فوج کشی کے سوا کوئی اور راہ نہ رہ گئی، آپ نے قلعہ بنونضیر کا چھ شب و روز محاصرہ کیا، بالآخر بنونضیر نے خود درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے اور اونٹ پر جتنا سامان لے جایا سکے، ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے، آپ نے اسے منظور فرمایا اور پوری آزادی کے ساتھ ان کو اسلحہ کے سوا تمام سامان لے جانے کی اجازت دی، یہاں تک کہ مکان توڑ توڑ کر وہ سامان بھی ساتھ اُٹھا لے گئے۔(۵)

---

(۱) عیون الاثر: ۲/ ۷۳۔ (۲) عیون الاثر: ۲/ ۴۸۔
(۳) طبقات ابن سعد: ۲/ ۴۱۔ (۴) ابن ہشام: ۲/ ۱۲۱۔
(۵) عیون الاثر: ۲/ ۴۹۔

بنونضیر کی اشتعال انگیز روش اور مسلمانوں کے تحمل کا انداز اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات اپنے قلعہ سے اس شان و بان اور آب و تاب سے نکلے جیسے کوئی فتح مند فوج فاتحانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، نہ چہرے پر ندامت ہے، نہ اپنی سرزمین سے فراق کا بظاہر غم، مطربائیں ساتھ ہیں اور نغمہ و سرود اور شہنائیاں سامعہ نوازی میں مصروف، (۱) بعض انصار کی اولاد نے بھی یہودیت قبول کر لی تھی، جو اس قافلہ کے ساتھ تھے، انصار نے ان کو جبراً روکنا چاہا، مگر اسلام کی رواداری ملاحظہ کی جائے کہ اس دباؤ کو بھی منع کیا گیا اور جبراً مسلمان کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کو بھی پسند نہیں کیا گیا اور آیت قرآنی نازل ہوئی: "لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"۔ (البقرۃ: ۲)

میرا خیال ہے کہ اہل انصاف اس بات کا اعتراف کریں گے کہ یہاں بھی بنونضیر کے سازشی سرداروں تک کو بخش دینا اور کفار مکہ کے جاسوس اور منافقین کی پس پردہ مدد کے باوجود صرف ان سے حسبِ خواہش جلا وطنی کو منظور کر لینا بھی پیغمبر اسلام کی طبعی شفقت اور رحم دلی کا نتیجہ تھا؛ مگر افسوس کہ یہود نے اب بھی سبق نہ لیا اور ان ہی سردارانِ بنونضیر نے مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے پورے عرب کو ان کے خلاف غزوۂ احزاب میں اکٹھا کر دیا۔

بنو قریظہ

مدینہ میں اب یہودیوں کا ایک قبیلہ ہی باقی رہ گیا تھا، مسلمانوں اور ان کے درمیان دو بارہ معاہدہ کی تجدید بھی ہوئی تھی اور مسلمان اس پر قائم رہے؛ مگر ہوا یوں کہ بنونضیر نے جان بخشی کا صلہ یہ دیا کہ ایک وفد لے کر مکہ پہنچ گئے، اس وفد میں بنونضیر کے سردار سلام بن ابی الحقیق، حُیی بن اخطب، کنانہ بن ربیع اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے، انھوں نے اپنی تائید وحمایت کے مکمل اظہار کے ساتھ اہل مکہ کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ (۲)

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/ ۷۶۔ (۲) ابن ھشام: ۲/ ۱۸۷۔

جب اہل مکہ تیار ہو گئے تو بنو غطفان کے پاس گئے، ان کو بھی تیار کیا، (۱) اور یہ بھی وعدہ کیا کہ خیبر کے نخلستانوں کی کھجور کے نصف حصے ہر سال تمہیں ادا کیا کریں گے، اس طرح ابوسفیان کی زیرِ کمان اعداء اسلام کا دس ہزار کا اسلحہ و آہن میں غرق لشکر کرۂ ارض میں حق و توحید کی چھوٹی سی بستی مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھدوائی اور اس میں آپ ﷺ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی، (۲) خواتین و بچوں کو مدینہ کے بعض محفوظ قلعوں میں رکھ دیا گیا اور تین ہزار مسلمان مجاہدین خندق کے اس پار صف آراء ہو گئے، (۳) حی بن اخطب بنو قریظہ گیا اور ان کو بھی شریک جنگ ہونے کی دعوت دی، اول تو ان لوگوں نے انکار کیا، مگر حُی کے اصرار پر یہ بھی قریش اور بنو غطفان کے ساتھ ہو لئے۔ (۴)

آنحضور ﷺ نے جب اس کی تحقیق کے لئے حضرت سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا تو ان لوگوں نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا اور کسی معاہدہ کے ہونے ہی کا انکار کر دیا؛ حالاں کہ ان پر پیغمبر اسلام کا یہ احسان تھا کہ آپ کی آمد سے پہلے بنو نضیر کے مقابلہ ان کی حیثیت کمتر شمار کی جاتی تھی اور ان کا خوں بہا ان کے مقابلہ نصف ہوتا تھا، آپ ﷺ نے دونوں کی دیت برابر قرار دی۔ (۵)

خواتین کو جن قلعوں میں محفوظ کیا گیا تھا، وہ بنو قریظہ سے بہت قریب تھے اور مردوں میں صرف حسان بن ثابت اس قلعہ میں تھے، بنو قریظہ کی نیت اسی قلعہ پر خراب ہو رہی تھی، رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کہتی ہیں کہ یہودیوں کے ایک دس نفری گروہ نے قلعہ پر تیر اندازی شروع کر دی اور ان میں کا ایک شخص عین قلعہ کے دروازہ پر آ گیا اور قلعہ کے گرد

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/۷۴۔

(۲) طبقات ابن سعد: ۲/۷۴۔

(۳) البدایہ النہایہ: ۴/۱۰۲۔

(۴) ابن ہشام: ۲/۱۸۹۔

(۵) ابوداؤد، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس، حدیث نمبر: ۴۴۹۶۔

چکر لگانے لگا، ادھر آنحضور ﷺ اور صحابہ مصروف معرکہ ہیں، حضرت حسانؓ اپنی علالت اور بوڑھاپے کی وجہ سے اس لائق نہیں تھے کہ دشمن کی سرکوبی کے لئے نکل سکیں؛ چنانچہ حضرت صفیہؓ خود نکلیں اور ایک ستون (عمود) سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ دشمن خدا وہیں ڈھیر ہوگیا اور اس کا سر کاٹ کر یہود کی طرف پھینک دیا، اس واقعہ نے ان کی ہمت پست کر دی اور کہنے لگے کہ محمد ﷺ نے اپنے لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا ہے۔(۱)

بنوقریظہ کے خطرہ سے آپ نے یہ تدبیر بھی فرمائی کہ سو، تین سو آدمیوں کے رسالے کبھی سلمہ بن اسلم اور کبھی زید بن حارثہ کے زیر کمان ان قلعوں کے قریب روانہ کرتے کہ وہ زور سے نعرہ تکبیر لگائیں؛ تاکہ بنوقریظہ کی ہمت بڑھنے نہ پائے،(۲) اگر اس طرح کی تدبیر نہ کی جاتی اور حضرت صفیہؓ والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید یہ قلعہ بنوقریظہ کی زد سے بچ نہ سکتا، غور کیجئے کہ مسلمانوں کے لئے یہ کس قدر نازک موقع ہے، بیس ہزار دشمنوں کے مسلح آہن لشکر نے پورے ساز و سامان اور اسباب و وسائل کے ساتھ مدینہ کا محاصرہ کر رکھا ہے، ان کے پاس کھانے پینے کی اشیاء اور حمل و نقل کی کمی نہیں، عرب کے بڑے بڑے سورماان کے ساتھ تیار ہیں، پڑوس کی آبادیوں نے پیمانِ وفا توڑ دیئے ہیں، مسلمانوں کے درمیان بھی منافقین کا ایک گروہ مسلمانوں کی ہمت شکنی پر کمربستہ ہے اور عین موقع جنگ پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی یہ مختصری آبادی صرف تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ہے، ہتھیاروں کی کمی ہے، فاقہ مستی کی آزمائش بھی دوش بدوش ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہیں، رسد بند ہے، باہر سے کسی کمک کی توقع نہیں، خواتین اور معصوم بچے ایک علاحدہ قلعہ میں محصور ہیں، جن کی حفاظت کا کوئی معقول نظم نہیں ہے، پڑوس میں بنوقریظہ ہیں، جن سے ہمہ دم ان معصوموں کا تحفظ خطرہ میں ہے، صورت حال یہ ہے کہ لوگ قضاء حاجت کے لئے نکلنے کی ہمت نہیں پاتے، پیغمبر اسلام کو جس نماز سے عشق ہے، جو بحالت ہوش و حواس کبھی قضاء نہ ہوئی، دشمنوں کی یلغار سے ایک نہیں چار نمازیں قضاء ہو جاتی ہیں، عین اسی حالت میں ایک غیبی مدد ظاہر ہوتی ہے اور حضرت نُعیم

(۱) ابن ہشام ۲: ر۱۹۳۔ (۲) طبقات بن سعد: ۲ / ۴۸۔

بن مسعودؓ کو ہدایت ربانی سے سرفراز کیا جاتا ہے، ان کی حسنِ تدبیر اور منجانب اللہ طوفان اور آندھی کے باعث آخر یہ محاصرہ — جو تقریباً ۲۴ دنوں سے جاری تھا — ٹوٹتا ہے۔

خدا کی مدد اور نصرت ساتھ نہ ہوتی تو مدینہ کی اس مختصر سی آبادی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور حق کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو جاتا، ظاہر ہے یہ سب کچھ بنونضیر کے جلاوطن اور بنو قریظہ کے معاہد یہودیوں کی فتنہ سامانی اور ریشہ دوانی کا نتیجہ تھا، اس آزمائش سے گذرنے کے بعد ایک طرف عرب کے مشرک قبائل کی کمرہمت ٹوٹ کر رہ گئی، دوسری طرف بنوقریظہ پر حجت تمام ہوگئی۔

اب مسلمانوں کے سامنے اپنے تحفظ کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ آستین کے اس سانپ سے نجات حاصل کر لی جائے؛ چنانچہ اہل مکہ اور بنوغطفان کی واپسی اور غزوۂ خندق کے ختم ہوتے ہی آپ ﷺ نے بنوقریظہ کی طرف کوچ کیا، حضرت علیؓ جھنڈا لے کر قلعہ کی فصیل کے قریب پہنچے تو یہودیوں نے علانیہ آپ کی جناب میں گستاخی کی اور کچھ اس طرح کے کلمات کہے کہ حضرت علیؓ باوجود آپ کے استفسار کے زبان پر نہ لاسکے، (۱) یہ محاصرہ ۲۵ دنوں تک جاری رہا، اس درمیان سردارِ قبیلہ کعب بن اسد نے یہودیوں کے سامنے تین صورتیں رکھیں، جن میں سے پہلا نکتہ یہ تھا۔

> تابع هذا الرجل ونصدقه فوالله لقد تبين لكم أنه لنبي مرسل وأنه للذي تجدونه في كتابكم فتأمنون على دماءكم وأبناءكم ونساءكم۔
>
> ہم اس شخص کی پیروی کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں، خدا کی قسم! تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ نبی ورسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو، اس طرح تم اپنی جان و مال اور اولاد وخواتین پر امن حاصل کرلو گے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۱۹/۴۔

مگر یہود کے لئے ہدایت مقدر نہ تھی، انھوں نے کہا کہ ہم تورات کو نہ چھوڑیں گے اور نہ اس کے احکام کو بدلیں گے :

لا نفارق حکم التوراۃ أبدا ولا نستبدل به غیره ۔ (۱)

آخر مجبور ہوکر بنوقریظہ سپر انداز ہوئے اور خود انھوں نے سعد بن معاذؓ کو حکم بنایا، سعد بن معاذؓ کا قبیلہ بنوقریظہ کا حلیف تھا، اس لئے بنوقریظہ کو ان سے عدل و رعایت کی زیادہ اُمید رہی ہوگی، بہر حال حضرت سعدؓ نے اپنے فیصلہ سے پہلے ایک بار پھر فریقین سے توثیق کرالی کہ وہ ان کی تحکیم پر راضی ہیں، (۲) اس کے بعد ہی اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا کہ جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے، عورتیں اور بچے قید کئے جائیں اور سامان و اسباب تقسیم کر دیئے جائیں ۔ (۳)

چنانچہ چار سو جوان جنگجو قتل کے لئے گرفتار کئے گئے، (۴) جو لوگ بنوقریظہ میں بدعہدی سے بچے رہے، ان سے عین معرکہ جنگ میں بھی درگذر کیا گیا؛ چنانچہ عمرو بن سعد قرظی محاصرہ کے درمیان ہی نکلے، انھوں نے ایک شب خاص مسجد نبوی میں گذاری اور چلے گئے، مسلمانوں نے ان سے کچھ نہ کہا، (۵) عورتوں میں صرف بنانہ قریظہ نامی ایک خاتون پر سزائے موت جاری ہوئی، جس نے خلاد بن سوید پر چکی کا پاٹ اوپر سے گراکر مار ڈالا تھا، آپ نے ان بد ترین دشمنوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی نہ چھوڑی، رات میں ان کو قید رکھا گیا اور ان کے کھانے کے لئے کھجوروں کا نظم کیا گیا، ایک ساتھ ایک کے سامنے دوسرے پر سزائے موت جاری نہ کی گئی کہ یہ زیادہ ایذاء کا باعث ہوتی، ایک ساتھ دو چار آدمی لائے جاتے اور یکبارگی قتل کئے جاتے ۔ (۶)

---

(۱) عیون الاثر: ۲/۶۹ ۔ (۲) الدرر فی اختصار المغازی والسیر: ۱۹۲ ۔

(۳) صحیح مسلم، باب جواز قتال من نقض العہد، کتاب الجہاد والسیر ۔

(۴) روایات اس سلسلہ میں مختلف ہیں اور چار سو تا نو سو کی تعداد آئی ہے، مگر یہ عموماً تاریخی روایات ہیں، صحاح میں چار ہی سو کا ذکر ہے، ابن ہشام نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے (۲/۱۲۶، السہیلی) ابن حجر نے تاویل کی ہے کہ مجموعی گرفتاری زیادہ افراد کی ہوئی ہوگی اور مقتولین کی تعداد چار سو ہوگی ۔

(۵) عیون الاثر: ۲/۷۸، البدایہ والنہایہ: ۴/۱۳۶ ۔ (۶) طبقات ابن سعد: ۲/۵۴ ۔

بعض لوگوں کے لئے شخصی سفارش کی گئی، آپ نے ان کی معافی کو منظور کرلیا، ایک صحابی نے جن پر زبیر بن باطا قرظی کے کچھ احسانات تھے، زبیر کے لئے جان بخشی کی درخواست کی، آپ نے منظور فرمائی، زبیر نے کہا: اولاد وعیال کے بغیر بقیہ زندگی کا کیا لطف؟ آپ ﷺ نے بال بچوں کی سپردگی بھی قبول کی، پھر زبیر نے مال واسباب کی بھی خواہش کی، آپ نے اسے بھی قبول فرمایا، مگر اس نے کعب بن یسار، حی بن اخطب اور عزال بن سموال رئیسان بنوقریظہ کے قتل کی اطلاع سنی تو قتل ہو جانے کی خواہش کی، اس طرح وہ بھی قتل ہوا، (۱)
بنوقریظہ کے ان چارسو نفوس پر سزائے موت جاری کئے جانے کو اکثر مستشرقین اہل علم نے آپ کا ظلم قرار دیا ہے؛ لیکن اگر انصاف کے ساتھ چند نکات کو سامنے رکھا جائے تو کوئی صاحب انصاف آپ ﷺ کے اقدام کے درست ہونے میں شک نہیں کرسکتا۔

اول: بنوقریظہ کے سلسلہ میں تین ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو جلا وطن کردیا جائے، مگر مسلمان بنونضیر کی جلاوطنی کا مزا چکھ چکے تھے اور دیکھ چکے تھے کہ کس طرح انھوں نے احسان مند ہونے کی بجائے پورے عرب کو اسلام کے خلاف لاکھڑا کیا، اب مزید اس کا تجربہ اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوتا، دوسری صورت یہ تھی کہ ان سبھوں کو غلام بنادیا جاتا، مگر یہ صورت پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ہوتی، مدینہ میں پہلے ہی سے منافقین موجود تھے، جو اندر سے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے میں مصروف رہتے تھے اور یہ طبقہ مسلمانوں کا تابع اور ان کا احسان مند تو ہرگز نہیں ہوتا؛ البتہ نت نئی سازشوں کا سرچشمہ اور منبع بن جاتا، ان کے بغض وعناد کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ حی بن اخطب قتل سے پہلے آپ ﷺ کو علانیہ کہتا ہے کہ مجھے تمہاری عداوت پر کوئی ملامت وافسوس اب بھی نہیں ''أما واللہ مالمت نفسی عداوتک'' (۲) اب تیسری صورت یہی تھی کہ ان پر سزائے موت جاری کی جائے؛ تاکہ ان کے فتنہ سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھا جاسکے، پس یہ عین مبنی بر انصاف سزا تھی اور مسلمان اس اقدام پر مجبور تھے۔

---

(۱) عیون الاثر: ۲/۷۴۔ (۲) عیون الاثر: ۲/۷۳۔

دوم : بنو قریظہ کی جنگ میں شرکت مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا درجہ رکھتی ہے ؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے لئے بھی مدینہ کے باشندہ کی حیثیت سے فرمانروا اور رہبر تھے ، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات بھی آپ کے پاس فیصلہ کے لئے لایا کرتے تھے اور بغاوت کی سزا دنیا کے ہر قانون میں سزائے موت ہے ، بعض منصف مزاج مستشرقین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ، سر اسٹینلی لین پول کا بیان ہے۔

> یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا ، وہ بھی ایک محاصرہ کے دوران ، جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستہ سے گذری ، اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں ، جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں ، انھیں ایک غدار قبیلہ کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کئے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہئے ۔(۱)

سوم : یہ فیصلہ خود ان کے تسلیم شدہ حَکَم کا تھا ، پیغمبر اسلام کا نہ تھا اور حَکَم کے ذریعہ جو فیصلہ ہو ، اس کا ذمہ دار اُصولی طور پر خود وہ فریق ہوتا ہے ، جس نے اس تحکیم کو قبول کیا ہو۔

چہارم : یہ فیصلہ خود ان کی مذہبی کتاب ، تورات کے عین مطابق تھا ، تورات کا بیان ہے :

> جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا ، اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گذار بن کر تیری خدمت کریں ، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے ؛ بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرے خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا ؛ لیکن عورتوں اور بال بچوں نیز چوپایوں اور شہر کے سب مال

(۱) نبی رحمت : ۱ / ۲۷۰۔

اور لوٹ اور تم اس دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے دی ہو، کھانا۔(۱)

چنانچہ بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل مختلف مواقع پر اسی حکم کے مطابق عمل کرتے رہے، (۲) بنوقریظہ کے اس انجام نے خود مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے منافقین کی قوت بھی توڑ دی اور اہل مکہ اور مدینہ کے معاندین اسلام کے درمیان جو ربط تھا اور جو مختلف جنگی مہمات اور حوادث کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا، وہ ربط بھی باقی نہ رہا اور پھر اہل مکہ سے جنگ کی نوبت نہ آئی؛ بلکہ کسی کشت وخون کے بغیر حرم مکہ چند ہی سالوں میں مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

غزوۂ خیبر

یہود سے مسلمانوں کا آخری معرکہ غزوۂ خیبر کے موقع سے ہوا، خیبر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر تھا، جہاں عالیشان قلعے، زرخیز کھیت اور سرسبز وشاداب نخلستان تھے، (۳) مضبوط اور مستحکم قلعوں میں دس ہزار جنگجو موجود تھے، (۴) اور مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے مسلمانوں کے بدترین دشمن عبداللہ بن ابی بن سلول سے بھی ان کا خفیہ ربط برابر قائم تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع سے بھی اس نے یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ تم مسلمانوں سے ڈرو نہیں اور مقابلہ کرو، مسلمان تعداد میں بھی کم ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی تمہارے مقابلہ میں تھوڑا ہے، (۵) خیبر کے یہودیوں نے بڑی تعداد میں اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ منجنیق، دبابے، زرہیں اور تلوار جمع کر رکھا تھا؛ (۶) چنانچہ صرف دو قلعوں ''وطیح اور سلالم'' ہی میں مسلمانوں کو سو زرہیں، چار سو تلواریں، ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی تیر وکمان حاصل

(۱) استثناء: ۲۰، ۱۰، ۱۵۔
(۲) گنتی: ۳۱، ۷، ۱۰۔
(۳) السیرۃ الحلبیہ: ۲/۷۲۶، غزوہ خیبر۔
(۴) السیرۃ الحلبیہ: ۲/۷۳۰۔
(۵) السیرۃ الحلبیہ: ۷۳۰۔
(۶) السیرۃ الحلبیہ: ۲/۷۴۴۔

ہوئے، (۱) سرمایہ جو جنگ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے، وافر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا اور اس کو دفینوں کی صورت میں وہ محفوظ کئے ہوئے تھے، (۲) بنونضیر کے جلاوطن قائدین حی بن اخطب اور فرزندان ابوالحقیق جن کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے پرانی عداوت تھی، بھی وہیں فروکش تھے، (۳) بنوغطفان جیسے طاقتور اور مضبوط قبیلہ سے یہود نے دفاعی معاہدہ بھی کر رکھا تھا؛ چنانچہ غزوہ خیبر کے موقع سے بنوغطفان بھی یہود کی مدد کے لئے نکل آئے تھے، مگر اپنے داخلی حالات اور خلفشار کی وجہ سے ان کو اس کی ہمت نہ ہوسکی، (۴) اس طرح مسلمانان مدینہ دوطرف سے دشمنوں کے نرغہ میں تھے، ایک طرف کفار مکہ تھے اور دوسری طرف یہود خیبر۔

یہودیوں کی یہ عددی قوت، اسلحہ کا ذخیرہ، سرمایہ کی بہتات، منافقین اور اعداء اسلام سے ان کا خفیہ ربط، بنوغطفان سے دفاعی اتحاد، سرداران بنونضیر کی اسلام سے قدیم عداوت، مضبوط و مستحکم قلعے اور غذائی اشیاء کے معاملہ میں خود کفایتی اور ان کے قدیم سازشی مزاج ومذاق نے بجا طور مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب تھے کہ پھر کہیں یہ صورت حال کسی نئے غزوہ خندق کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب اہل مکہ کی طرف سے ایک گونہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے چودہ سو پیادہ اور دو سو سوار سپاہیوں کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا، (۵) خیبر کے قریب پہنچے تو وہ دُعا فرمائی جو مزاج نبوت اور کسی سپہ سالار کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے کہ :

اللّٰھم رب السماوات وما اظللن ورب الارضین وما
اقللن ورب الشیاطین وما اضللن ورب الریاح وما
اذرین فانا نسئلک خیر ھذہ القریہ وخیر ما فیھا
ونعوذ بک من شرھا وشر اُھلھا وشر ما فیھا۔ (۶)

---

(۱) سیرت حلبیہ: ۲/۷۴۵۔ (۲) البدایہ والنہایہ: ۳/۱۹۲۔
(۳) البدایہ: ۳/۱۹۲، ذکر قصہ صفیہ۔ (۴) الروض الانف: ۴/۴۰۔
(۵) تاریخ ابن خلدون بقیۃ المجلد الثانی: ۳۸۔ (۶) ابن ہشام: ۴/۴۰۔

> خداوندا! آسمانوں کے پروردگار اور ان تمام چیزوں کے جن پر آسمان سایہ فگن ہے، زمین اور ان تمام چیزوں کے رب جن کو زمین نے اُٹھا رکھا ہے، شیاطین کے رب اور ان تمام لوگوں کے جن کو شیاطین نے گمراہ کیا ہے، ہواؤں کے رب اور جن کو ہوائیں اُڑاتی ہیں، ہم آپ سے اس جگہ کے اور یہاں کے خیر کے طالب اور یہاں کے شر، یہاں کے باشندوں کے شر اور یہاں کی تمام چیزوں کے شر سے پناہ کے خواہاں ہیں۔

ہر چند کہ لشکرِ اسلام شب ہی میں اپنی منزل کو پہنچ چکا تھا، مگر آپ ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق رات میں حملہ نہ کیا اور صبح کا انتظار فرمایا، (۱) عین معرکہ جنگ میں بھی امانت و دیانت کا اس درجہ پاس رکھا کہ یہود کا ایک غلام بکروں کے ایک گلہ کے ساتھ خدمتِ اقدس میں آیا اور مشرف بہ ایمان ہوا تو فرمایا کہ بکریاں قلعہ کی جانب ہنکا دی جائیں؛ تاکہ وہ اپنے مالک کے پاس چلی جائیں، (۲) یہود کے اکثر قلعے بذریعہ جنگ اور دو قلعے بذریعہ صلح فتح ہوئے، قموص نامی قلعہ فتح ہوا، تو اس میں حضرت صفیہؓ اور ان کی چچازاد بہن قید ہوئیں، حضرت بلالؓ ان دونوں کو لے کر مقتولین یہود کے پاس سے گذرے، حضرت صفیہؓ کی بہن نعشوں کو دیکھ کر رونے لگیں، حضور ﷺ کو حضرت بلالؓ کا یہ عمل پسند نہ آیا اور تنبیہ فرمائی کہ تم خواتین کو ان کے مرد مقتولوں کے سامنے سے لے کر گذرتے ہو، کیا تمہارے اندر رحم نہیں ہے؟ (۳)

اہل خیبر سے آپ کا معاہدہ طے پایا کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے؛ البتہ وہ یہاں سے چلے جائیں؛ لیکن پھر اہل خیبر نے خواہش کی کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے اور وہ خیبر کی پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے، آپ نے ان کی اس خواہش کو بھی مان لیا؛ البتہ یہ بات واضح فرما دی کہ جب کبھی آپ مناسب سمجھیں گے، ان کو شہر بدر کر دینے کے حقدار ہوں گے۔ (۴)

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/۱۸۳۔ (۲) حوالہ سابق: ۱۹۱، عیون الاثر: ۲/۱۸۳، اسلام رائی الغنم۔
(۳) ابن ہشام: ۴/۴۳، مع الروض۔ (۴) تاریخ طبری: ۲/۸۔

جب آپ یہودیوں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو سلاّم بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بکری پکائی اور دست کے حصہ میں جو آپ ﷺ کو زیادہ مرغوب تھا، اچھی طرح زہر پیوست کر دیا اور خدمت اقدس میں پیش کیا، لقمہ منھ میں رکھتے ہی آپ نے اس کا احساس فرمایا؛ البتہ حضرت بشرؓ بن براء بن معرور نے تناول فرمایا اور اسی کے اثر سے جاں بحق ہوئے، زینب نے جرم کا اقرار کیا؛ تاہم آپ کی رحمتِ بے کراں نے اب بھی عفو سے کام لیا، مگر جب حضرت بشر کی وفات ہو گئی تو یہ عورت قصاص میں قتل کی گئی، وفات تک آپ ﷺ پر اس زہر کا اثر تھا۔(۱)

عین اس موقع پر بھی آپ نے درجات و مراتب کی پاسداری فرمائی، حضرت صفیہ سردار بنو نضیر حُیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، حضرت دِحیہ ایک باندی کے خواستگار ہوئے تو آپ نے حضرت صفیہؓ کو ان کے حوالہ فرما دیا، مگر بعض صحابہؓ نے عرض کیا: یہ بنو قریظہ و بنو نضیر کی ملکہ ہیں (سیدۃ بنی قریظہ و بنی نضیر) اور آپ ﷺ کے لئے مناسب ہیں، آپ نے ان کے درجہ و منزلت کا پاس رکھا اور باندی بھی نہ بنایا؛ بلکہ آزاد کر کے اپنے حرم نکاح میں داخل فرمایا۔(۲)

حضرت صفیہؓ کا خود اپنا بیان ہے کہ جب میں آپ کے عقد میں آئی تو آپ سے زیادہ کوئی شخص میری نگاہ میں ناپسندیدہ نہ تھا کہ میرے باپ، شوہر اور قوم کے لوگ اس جنگ میں کام آئے تھے، مگر آپ نے معذرت خواہی فرمائی اور وضاحت کی کہ تمہاری قوم نے میرے ساتھ یہ یہ سلوک کیا، حضور ﷺ نے کچھ اس طرح معذرت فرمائی کہ اسی نشست میں میرا رنج جاتا رہا اور یہ کیفیت ہوئی کہ اب آپ سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہیں تھا، (۳) یہ محبت آمیز سلوک آپ ﷺ کا ایک ایسی خاتون کے ساتھ تھا، جس کی قوم دمِ آخر تک آپ کی ہلاکت کی درپے رہی۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۴/۴۴۔

(۲) البدایہ والنہایہ: ۴/۱۹۷۔

(۳) السیرۃ الحلبیہ: ۲/۷۴۸۔

قلعہ جات وَطیح وسُلالم میں مسلمانوں کے ہاتھ جو سر و سامان آیا، اس میں تورات کے صحائف بھی تھے، مسلمانوں نے ان کی کوئی بے حرمتی نہ کی، اور جب یہود نے آپ سے ان کو واپس کرنے کی درخواست کی تو آپ نے ان کی واپسی کا حکم فرمایا، (۱) —— پیغمبر اسلام کے اس فراخدلانہ سلوک کا ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے :

> اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی صحیفوں کا رسول اللہ (ﷺ) کے دین میں کس درجہ احترام تھا، آپ کی اس رواداری اور فراخدلی کا یہودیوں پر بڑا اثر پڑا، وہ آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ آپ نے ان مقدس صحیفوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا، جن سے ان کی بے حرمتی لازم آتی ہو، اس کے مقابلہ میں ان کو یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ جب رومیوں نے یروشلم کو سنہ ۷۰ قبل مسیح میں فتح کیا تو انھوں نے ان کے مقدس صحیفوں کو آگ لگادی اور ان کو اپنے پاؤں سے روندا، اسی طرح متعصب نصرانیوں نے اندلس میں یہود پر مظالم کے دوران توریت کے صحیفے نذر آتش کئے، یہ وہ عظیم فرق ہے جو اُن فاتحین (جن کا ابھی اوپر ذکر گذرا ہے) اور اسلام کے نبی کے درمیان ہمیں نظر آتا ہے۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ خیبر کی یہ مہم پیغمبر اسلام کے لئے ناگزیر ہوگئی تھی، حی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع جیسے سرداران یہود جو غزوہ خندق کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے اور تمام عرب کو اسلام کے خلاف صف بستہ کرنے میں قیادت کر چکے تھے، خیبر میں موجود تھے، جزیرۃ العرب کی سرزمین اسلام کے لئے اس وقت تک ہموار نہ ہوسکتی تھی جب تک کہ ایک طرف یہود کی

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ: ۵؍۱۴۳۔

(۲) تاریخ الیہود فی بلاد العرب: ۱۷۰، بحوالہ: نبی رحمت: ۲؍۴۲۳۔

اور دوسرے طرف اہل مکہ کی طاقت ٹوٹ نہ جاتی، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیبر کی مہم سر ہوئی اور آئندہ ہی سال مکہ فتح ہو گیا اور پھر اس کے بعد پورے عرب نے اسلام کے سامنے اپنے فکر و عقیدہ اور قلب و ضمیر کی سپر ڈال دی، مگر اس غزوہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے خلاف یہودیوں کی قدم قدم پر معاندانہ روش کے باوجود بارگاہ نبوی کی باران نبوت سے وہ اب بھی محروم نہیں ہیں، اس کا ان واقعات کے علاوہ جو اوپر مذکور ہوئے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تمام قلعہ جات کے فتح کئے جانے کے باوجود یہود کی دس ہزار سپاہ میں سے صرف ۹۳ مارے گئے، (۱) جب کہ ۲۰ سے زیادہ مسلمان سرخروئے شہادت ہوئے، (۲) اگر اس حسن سلوک کا تقابل یورپ میں ہونے والے یہودیوں کے قتل عام اور نسل کشی نیز مذہبی تعصب و تنگ نظری اور جور و استبداد سے کیا جائے تو مستشرقین خود مغربی اقوام کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں گے:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے



(۱) عیون الاثر لابن سید الناس: ۲ / ۱۸۳، عدد من قتل من الیہود۔

(۲) تاریخ ابن خلدون، بقیۃ المجلد الثانی: ۳۹۔

اسلام پر بے جا اعتراضات

قانونِ شریعت سے متعلق

شریعتِ اسلامی میں سزائیں

شریعت میں جرائم پر جو سزائیں دی جاتی ہیں، وہ بنیادی طور پر تین قسم کی ہیں :

(الف) حدود۔ (ب) قصاص۔ (ج) تعزیر۔

جن جرائم کی سزا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے متعین ہے اور ان جرائم کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، یعنی اگر اس کا مقدمہ قاضی کے یہاں چلا جائے تو وہ ان کی متعینہ سزائیں نافذ کرنے کا پابند ہے، جو لوگ اس جرم سے متاثر ہوں، ان کے معاف کرنے سے بھی وہ جرم معاف نہیں ہوگا، ان کو حدود کہتے ہیں، حدود بحیثیت مجموعی چھ جرائم پر ہیں :

(۱) حدِ زنا: اگر شادی شدہ مرد و عورت اس کے مرتکب ہوں تو اس کی سزا سنگسار کرنا ہے، اور زنا کے مرتکب ہونے والے مرد و عورت یا ان میں سے ایک غیر شادی شدہ ہوں تو جو بھی غیر شادی شدہ ہوں ان کی سزا سو کوڑے ہے، ان میں سے کوڑا لگانے کا ذکر خود قرآن مجید میں ہے، (النور:۲) اور رجم (سنگسار) کرنے کا ذکر حدیث میں ہے۔(۱)

(۲) حدِ سرقہ: چوری کی سزا گٹوں تک ایک ہاتھ کاٹنا ہے، یہ سزا بھی قرآن مجید سے ثابت ہے۔(المائدۃ:۳۸)

(۳) حدِ قذف: پاکدامن پر تہمت لگانے کی سزا، اسّی کوڑے ہے۔(النور:۴)

(۴) رہزنی (حرابہ) کی سزا: رہزنی اور ڈکیتی کی چار سزائیں ذکر کی گئی ہیں :

(الف) قتل کر دینا۔

(ب) پھانسی پہ چڑھانا۔

(ج) مختلف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا۔

(د) جلاوطن کر دینا۔(المائدۃ:۳۳)

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر:۶۸۲۹۔

چوں کہ ڈکیتی میں مختلف قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اسی لحاظ سے مجرم کو یہ سزائیں دی جائے گی۔

(۵) شراب نوشی: خلافتِ راشدہ میں صحابہ کے اجتہاد سے اس کی سزا مقرر کی گئی ہے، جو بعض فقہاء کے نزدیک اَسّی کوڑے اور بعض کے نزدیک چالیس کوڑے ہے۔

(۶) ارتداد: مسلم ملک کا مسلمان باشندہ اسلام کو چھوڑ کر کفر قبول کر لے اور اس سے تائب ہونے کو تیار نہیں ہو تو اس کو ارتداد کی سزا دی جائے گی جو قتل ہے، اس سزا کا ثبوت بھی حدیث سے ہے۔(۱)

ان سزاؤں کی تفصیلات حدیثوں میں آئی ہے اور فقہاء نے ان کو تفصیل سے مرتب کیا ہے۔

قتل یا جزوی جسمانی نقصان کے بدلہ مجرم پر اسی فعل کو دھرایا جائے؛ اس کو قصاص کہتے ہیں، جیسے مقتول کے عوض قاتل کو قتل کر دیا جائے، ہاتھ کاٹنے والوں کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، قصاص حقوق الناس میں شامل ہے؛ لہٰذا اگر مقتول کے ورثہ قاتل کو معاف کر دیں یا جس شخص کو جزوی نقصان پہنچانے کے بجائے اس کی مقررہ دیت لے لے یا اس کے بدلہ مال کی کسی خاص تعداد پر راضی ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، قانونِ قصاص کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ حکم شریعت موسوی میں بھی تھا۔

جن غلطیوں کے لئے کوئی مقرر سزا نہیں ہے، خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی سے ہو یا بندوں کے حقوق میں کوتاہی سے ہو، وہ غلطی بظاہر بڑی ہو یا چھوٹی، جان سے متعلق ہو یا مال سے یا عزت وآبرو سے، اس غلطی سے کسی خاص شخص کا حق متاثر ہوا ہو یا عوامی یا اجتماعی حقوق متاثر ہوا ہو، اس میں شریعت کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی کی ہو یا حکومت کی ہدایات کو توڑا ہو؛ البتہ قرآن وحدیث میں اس جرم کے لئے کوئی سزا متعین نہ کی گئی ہو تو اس کو "تعزیر" کہتے ہیں، یہ سزا حکومت بھی مقرر کر سکتی ہے اور عدالت بھی متعین کر سکتی ہے، نیز قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے سماج بھی سزا دے سکتا ہے۔

(۱) بخاری، کتاب الدیات باب قتل النفس۔

ان میں سے زیادہ تر حدود یعنی پہلی قسم کی سزاؤں پر اعتراض کیا جاتا ہے اور ان کو انسانیت سوز قرار دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں چند نکات کو پیش نظر رکھنا چاہیے :

۱- پہلی قابل غور چیز یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد ایک آدمی پر سب سے بڑا فریضہ جس کو افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے، جو انسان پر تقریباً تمام حالات میں واجب ہے اور دن بھر میں متعدد بار واجب ہے، ''نماز'' ہے، نماز ایمان کے بعد شریعت کے تمام احکام سے زیادہ اہم ہے؛ لیکن تارک نماز کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی سزا متعین نہیں کی گئی، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تارکِ صلاۃ کو کسی بھی صورت میں قتل نہیں کیا جائے گا؛ اگر آپ اس پس منظر میں حدود کی فہرست پر غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ اسلام نے جن غلطیوں پر زیادہ سخت سزائیں دی گئی ہیں، وہ سب کے سب ایسے جرائم ہیں جن میں نہ صرف یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حلال وحرام کی دیوار منہدم کرتا ہے؛ بلکہ انسانی حقوق کو بھی پامال کررہا ہوتا ہے، قتل وخون کے ذریعہ وہ آدمی کی زندگی سے کھیلتا ہے، زنا کے ذریعہ اس کی عصمت وآبرو پامال کرتا ہے، چوری کے ذریعہ اس کے مال واسباب پر ہاتھ ڈالتا ہے، اتہام اور الزام تراشی کے ذریعہ اس کی عزت وآبرو کو مجروح کرتا ہے اور شراب پی کر وہ اپنے دماغ پر ایسا نشہ چڑھالیتا ہے کہ اس کو اپنے بھائی کے حقوق، جان ومال، عزت وآبرو، غرض کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں رہتی، پس ان جرائم کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کا جذبہ تو کارفرما ہے ہی، ان سے بندوں کے حقوق بھی مجروح ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ تمام جرائم متعدی ہیں، اگر ان پر پوری طرح روک نہ لگائی جائے تو ان کا نقصان افراد سے بڑھ کر جماعت اور گھر سے بڑھ کر پورے سماج اور سوسائٹی پر پڑے گا اور یہ ایک گھر کی آگ پوری انسانیت اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

کیوں کہ جرم کو روکنے کے چار محرکات ہیں، اول: طبعی شرافت، دوسرے: قانون کا خوف، تیسرے، ماحول، چوتھے: آخرت میں جواب دہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی

فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے: ’’کل ولد یولد علی الفطرۃ‘‘ (۱) انسان بہر حال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم و جور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اُسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہو جاتی ہیں اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں، جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا مؤثر ذریعہ ’قانون‘ ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے۔

جرم کو روکنے کا تیسرا ذریعہ ’ماحول‘ ہے، نیک لوگوں کا ماحول اور ان کی صحبت انسان کو گناہ سے بچانے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے اچھے لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے: ’’كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ‘‘۔ (التوبۃ: ۱۱۹)

گناہ سے باز رکھنے کا چوتھا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اُجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے؛ لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہنچ سکتا، آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکالے گا اور نئے نئے راستے تلاش کر لے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوفِ خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

---

(۱) بخاری: ۱۲۹۶، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔

اس وقت دنیا میں الحاد اور مذہب کے انکار، یا مذہب کو عبادت گاہوں تک محدود کر دینے کا جو رجحان پیدا ہوا ہے، اس کی وجہ سے نہ آخرت کا خوف ہے، نہ صالح ماحول ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب انسان کا ذہن مجرمانہ بن جاتا ہے تو اس کی فطرت سلیمہ کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ اس کو ظلم و زیادتی سے روک نہیں پاتی، ایسے لوگوں کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے: ''قانون کے ذریعہ سرزنش کرنا''، اسی لئے دنیا کے تمام ملکوں میں اور تاریخ انسانی کی تمام مہذب سلطنتوں میں جرائم کے لئے سزا کے قانون مرتب کئے گئے ہیں اور اسے ضروری سمجھا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مجرم کو سخت سزا دی جائے یا نرم؟ اور جسمانی سزا دی جائے یا صرف جیل کی سزا؟ گزشتہ ادوار میں زیادہ تر جسمانی سزا دی جاتی تھی، نیز دنیا کے تقریباً تمام ہی مذاہب میں سزا سماج کی اصلاح کے لئے سخت سزائیں رکھی گئی ہیں، اس سلسلہ میں بطور مثال زنا کی سزا کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جس کو ہر مذہب میں جرم سمجھا گیا ہے، اور دوسرے جرائم کے مقابلہ اس کی سزا سخت رکھی گئی ہے؛ چنانچہ گوتم دھرم سوتر'' میں زنا کی سزائیں اس طرح ذکر کی گئی ہیں :

- جو شخص اپنے بزرگ کی بیوی سے زنا کرے اسے تپتے ہوئے لوہے کے بستر پر لٹا دینا چاہئے، دہکتے ہوئے ستون سے باندھ دینا چاہئے اور اس کا عضو تناسل اور خصیے کاٹ کر اس کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں، وہ اسے ہاتھ میں لے کر جنوب مغرب کی طرف چلے؛ تا آں کہ وہ گر جائے، وہ اس (گناہ) سے مرنے کے بعد پاک ہو جائے گا۔(۱)

منو دھرم شاستر میں ہے :

- دوسروں کی بیوی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے والے کو

(۱) گوتم دھرم سوتر: ادھیائے: ۲۳، اشلوک: ۸-۱۲۔

بادشاہ ایسی سزا دے گا کہ جسم پر نشان بن جائے، یہ نشانِ دہشت ہوگا، بعدازاں اسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔(۱)

● کسی دوشیزہ کی مزاحمت کے باوجود جرم کا ارتکاب کرنے والا فوری جسمانی سزا کا مستحق ہے؛ لیکن اگر کوئی اپنی ہم ذات دوشیزہ کی رضامندی سے حظ اُٹھاتا ہے تو جسمانی سزا کا حکم نہیں۔(۲)

● اگر کوئی مرد کسی دوشیزہ کو زبردستی آلودہ کرتا ہے تو اس کی انگلیوں میں سے دو فوراً کاٹ دی جائیں گی اور وہ چھ سو پن جرمانہ دے گا۔(۳)

منو دھرم شاستر میں اگرچہ زنا کو کسی حد تک برا سمجھا گیا ہے، مگر زنا اور اس کی سزا میں ذات پات کے نظام کو ملحوظ ضرور رکھا گیا ہے، اس کی مثال یہ اشلوک ہیں :

کسی اونچی ذات کے مرد کی طرف راغب ہونے والی عورت پر کوئی جرمانہ نہ ہوگا؛ لیکن جو نچلی ذات کے مرد کی طرف مائل ہوتی ہے اسے گھر میں پابند کیا جائے گا، اونچی ذات کی عورت سے مباشرت کرنے والا نچلی ذات کا مرد جسمانی سزا کا مستحق ہوگا۔(۴)

لیکن اسی معاملے پر گوتم اپنی دھرم سوتر میں سخت سزا سناتے ہیں :

بادشاہ کو چاہئے کہ نچلی ذات کے مرد سے زنا کرنے والی عورت پر سرعام کتے چھوڑ دے اور اس مرد کو مار دیا جائے یا اسی طرح سزا دی جائے۔(۵)

---

(۱) منوشاستر، باب:۸، اشلوک:۳۴۵۔

(۲) منوشاستر، باب:۸، اشلوک:۳۵۶۔

(۳) منوشاستر، باب:۸، اشلوک:۳۵۹۔

(۴) منوشاستر، باب:۸، اشلوک:۳۵۹-۳۶۰۔

(۵) گوتم دھرم سوتر، ادھیائے: ۲۳، اشلوک: ۱۴-۱۶۔

وسشتھ سوتر کے مصنف اس بارے میں یہ سزا سناتے ہیں :

اگر شودر برہمن عورت سے مباشرت کرے تو اسے ویرنا گھاس سے باندھ کر آگ میں ڈال دینا چاہئے، اور برہمن عورت کا سر مونڈھ کر، اس پر گھی لگا کر، اسے کالے گدھے پر بٹھا کر سڑک پر برہنہ گھمانا چاہئے، اسی طرح وہ پاک ہوسکتی ہے۔(۱)

یہودی مذہب میں بھی شادی شدہ عورت سے زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے؛ چنانچہ تورات میں ہے :

اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں، یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی، اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک سے باہر نکال کر لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں، لڑکی کو اس لئے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے چلائی اور مرد کو اس لئے کہ اس نے اپنے ہمسایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا، یوں تو ایسی برائی اپنے درمیان سے دفع کرنا۔(۲)

تورات میں مذکور اس سزا کا ذکر انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بھی نقل کیا گیا ہے؛ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں :

اے استاد! یہ عورت زنا میں عین بدفعلی کے وقت پکڑی گئی ہے، توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔(۳)

---

(۱) وسشتھ دھرم سوتر، ادھیائے: ۲۱، اشلوک: ۱۔

(۲) استثناء: ۲۲: ۲۲-۲۳۔

(۳) یوحنا: ۸: ۴، ۵۔

اور اگر کسی کنواری لڑکی سے زنا کا مرتکب ہو تو اس کی الگ سزا ہے :

> اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو جس کی نسبت نہ ہوئی ہو، پھسلا کر اس سے مباشرت کرے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے بیاہ کرے؛ لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق اسے نقدی دے۔(۱)

اور غیر منکوحہ باندی سے زنا کی سزا تو ہے، مگر اس کی سزا قتل نہیں ہے :

> اگر کوئی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ اس کا کوئی فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو تو ان دونوں کو سزا ملے؛ لیکن وہ جان سے مارے نہ جائیں؛ اس لئے کہ وہ عورت آزاد نہ تھی۔(۲)

چوری کی سزا اسلام میں تو ہاتھ کاٹنا ہے؛ لیکن یہودی مذہب میں اس سے بھی سخت ہے، جس کا اندازہ تورات کے اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے :

> اگر کوئی شخص اپنے اسرائیلی بھائیوں میں سے کسی کو غلام بنائے یا بیچنے کی نیت سے چراتا ہوا پکڑا جائے تو وہ چور مار ڈالا جائے، یوں تو ایسی برائی اپنے درمیان سے دفع کرنا۔(۳)

ہندو مذہب میں زنا کے علاوہ دوسرے جرائم کے لئے بھی سخت سزا ہے اور افسوس کہ یہ سزائیں بھی امتیاز اور نابرابری پر مبنی ہیں، اس سلسلہ میں منوسمرتی کے چند قوانین کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے :

> ● اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ''گناہگار'' کہہ کر پکارے، یا کوئی گالی دے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دیا جائے؛ کیوں کہ اس کی پیدائش پاؤں کے درمیان سے ہوئی ہے۔(۸:۲۰۰)

---

(۱) خروج:۲۲:۱۶-۱۷۔ (۲) احبار:۱۹:۲۰۔ (۳) استثناء:۲۴:۷۔

- اگر کوئی شودر برہمن کی ذات کا نام لے کر برہمن کو کچھ کہے تو جلتی ہوئی دس انگلی کے برابر ایک لوہے کی سلاخ اس شودر کے منھ میں ڈال دینی چاہئے۔(۸:۲۷۱)
- اگر کوئی شودر فخر کی وجہ سے برہمنوں کو نصیحت کرنے کی کوشش کرے تو اس کی جسارت و گستاخی کے لئے راجہ کو چاہئے کہ اس کے منھ میں اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈلوا دے۔(۸:۲۷۲)
- اگر کوئی نیچ ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات کے ساتھ ایک آسن پر بیٹھ جائے تو راجہ اس کی کمر دبوا دے، یا اس کو ملک سے نکال دے، یا اس کی سرین کا گوشت اُتار لے۔(۸:۲۸۱)
- اگر غرور کی وجہ سے کوئی شودر برہمن کی چوٹی، پاؤں، داڑھی، گردن یا فوطے پکڑ لے تو راجہ طے کرے اور اس کے دونوں ہاتھ کٹوا دے۔(۲:۲۸۳)

اسلام نے بھی سخت قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے؛ کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے، محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا؛ بلکہ اعداد و شمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا، اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد و شمار کے مطابق اس سال چوری کے ۱۹۳۷ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ کیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے، اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا، اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں،

سعودی عرب میں ۱۹۷۴ء تک چوری کے صرف بارہ ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ موثر ہیں، محض قید کی سزا اس درجہ جرم کو روکنے میں مفید نہیں ہے۔

ان سخت سزاؤں کے ساتھ شریعت میں دو خصوصی احکام دیئے گئے: ایک یہ کہ ان کو ثابت کرنے کا طریقہ سخت رکھا گیا ہے، اسلام میں پہلے سے یہ اُصول ہے کہ عادل گواہوں کی گواہی قبول کی جائے، عادل سے ایسا شخص مراد ہے جس سے جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو، عام مقدمات میں اگر ایک مرد کے ساتھ دو خاتون گواہان موجود ہوں تو ان کو کافی سمجھا گیا ہے؛ لیکن حدود و قصاص میں دو مرد گواہوں کی گواہی لازم ہے، زنا کی سزا چوں کہ بہت سخت ہے؛ اس لئے اس میں چار ایسے مرد گواہ ہونے چاہئیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے زنا کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو، بعض معاملات میں بالواسطہ گواہی کافی سمجھی گئی، یعنی گواہ کہے کہ میرے سامنے فلاں شخص نے کہا ہے تو گواہی معتبر ہوگی، بعض معاملات میں تسامع یعنی شہرت کی بنا پر بھی گواہی قبول کی جاتی ہے، جیسے کوئی شخص خود نکاح کی مجلس میں نہیں ہو؛ لیکن کہے کہ ہمارے محلہ اور گاؤں میں مشہور ہے کہ یہ میاں بیوی ہیں، تو یہ گواہی بھی معتبر ہے؛ لیکن حدود و قصاص میں ایسی گواہی کا اعتبار نہیں، اسی طرح بعض مقدمات میں قرائن اور قیاس کو بھی قابل قبول سمجھا گیا ہے؛ لیکن ان مقدمات میں ان کا اعتبار نہیں؛ غرض کہ جن جرائم کی سزائیں سخت ہیں ان میں طریقہ ثبوت کو اتنا سخت رکھا گیا ہے کہ ان کو ثابت کرنا آسان نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر مقدمہ ثابت ہو پائے، تو ملزم پوری طرح سزا سے آزاد ہو جائے گا؛ بلکہ عدالت اس کی مناسب حال تعزیر کرے گی۔

دوسرے ان معاملات میں ملزم کو شبہ کا فائدہ دیا جائے گا، اور اہم بات یہ ہے کہ حدود کے باب میں شبہ کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا گیا ہے، مثلاً: اگر ایک مرد نے کسی عورت سے

صحبت کرلی اور وہ کہتا ہے کہ میں نے سمجھا تھا کہ وہ میری بیوی ہے تو اس کو تعزیر تو کی جائے گی؛ لیکن اس پر حد شرعی نہیں نافذ کی جائے گی، یا جیسے مرد و عورت نے ایک دوسرے کہا: ہم نے آپس میں نکاح کرلیا: حالاں کہ کوئی گواہ نہیں تھا تو اگر چہ جمہور کے نزدیک یہ زنا ہوا؛ لیکن مالکیہ کے نزدیک چوں کہ ایجاب وقبول کے وقت گواہ کا ہونا ضروری نہیں، بعد میں گواہ بنایا جاسکتا ہے؛ اس لئے اگر اس کے بعد وہ دونوں آپس میں صنفی تعلق قائم کرلیں تو ان پر حد جاری نہیں ہوگی، اسی طرح اگر کوئی شخص باغ میں سے کوئی پھل یا کھلی ہوئی دُکان میں سے کوئی مال چوری کرلے، یعنی جس چیز کی حفاظت کا نظم نہیں کیا گیا ہو، اس کو لے لے، یا ایسی کوئی چیز لے لے جو اجتماعی ملکیت ہو جیسے عوامی جگہ پر لگے ہوئے نَل کو لے کر چلا جائے تو چوں کہ اس میں کچھ نہ کچھ حصہ اس چوری کرنے والے کی ملکیت کا بھی ہے، اس لئے اس پر چوری کی حد جاری نہیں ہوگی۔

غرض کہ شریعت نے جن جرائم کی سخت سزائیں مقرر کی ہیں، ان میں ملزم کو زیادہ سے زیادہ شبہ کا فائدہ دیا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب شدید قحط پڑا تو آپؓ نے اس وقت چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنا) کو موقوف کردیا، (۱) آپ کا خیال تھا کہ اس وقت جو لوگ چوری کررہے ہیں، وہ بھوک اور فاقہ کشی کی وجہ سے اضطرار کی حالت میں ہیں، اور حالت اضطرار کے احکام حالتِ اختیار سے الگ ہوتے ہیں۔

تیسرے: اسلام جہاں جرائم پر سخت سزائیں دیتا ہے، وہیں انسان کے لئے ایسا ماحول تیار کرتا ہے کہ اس کے لئے جرم سے بچنا آسان ہو، اسلام نے زنا کی سخت سزا رکھی ہے؛ لیکن شریعت اسلامی کی رُو سے پردہ واجب ہے، اجنبی اور غیر محرم عورت کا اختلاط جائز نہیں، وہ فحش فلموں پر اور لٹریچر پر پابندی لگاتا ہے، ایسی چیزیں نہ بیچنے کی اجازت ہوگی اور نہ چھاپنے کی، نہ شراب کی دُکانیں ہوں گی نہ تفریحی کلب ہوں گے، ظاہر ہے جب زنا پر اُکسانے والی چیزیں نہیں ہوں گی تو زنا کے واقعات بھی کم ہوجائیں گے اور شاذ و نادر ہی زنا کی سزا نافذ

---

(۱) کتاب الأموال للقاسم: ۶۶۹، حدیث نمبر: ۱۷۶۱۔

کرنے کی نوبت آئے گی؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ کی دس سالہ زندگی میں زنا کے صرف تین کیس آئے اور وہ بھی ملزم کے اقرار سے ثابت ہوئے نہ کہ گواہی سے، جہاں بُرائی کے تمام مواقع مہیا کئے گئے ہوں؛ بلکہ بُرائی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو اور عورتوں کو زنا کا لائسنس دیا جاتا ہو، اس ماحول کے لئے یہ سزا ہے ہی نہیں، ایسے ماحول میں یہ سزا یقیناً ظلم ہے؛ لیکن اسلام جس پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے، اس میں یہ سزا یقیناً منصفانہ اور حق بجانب ہے۔

موجودہ دور میں یہ عجیب بات ہے کہ جس مظلوم کے ساتھ ظلم روا رکھا جاتا ہے، اس سے ہمدردی نہیں کی جاتی اور مجرم کے ساتھ ہمدردی کی جاتی ہے، کوشش کی جاتی ہے کہ یا تو مجرم کو سزا ہی نہیں ملے، اور ملے بھی تو جرم کے اعتبار سے نہایت معمولی؛ حالاں کہ مجرم کے ساتھ ہمدردی مظلوم کے ساتھ ظلم ہے؛ اس لئے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو مغربی ممالک میں بہ مقابلہ مسلم ملکوں کے جرائم کی تعداد بہت بڑھی ہوئی ہے، فیشن ماسٹر نامی ایک ویب سائٹ ہے جو دنیا بھر کے ممالک کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے، اس کے بیان کے مطابق دنیا کے چند بڑے ممالک میں جرائم کی شرح کا تناسب اس طرح ہے :

امریکہ اور سعودی عرب میں

جرائم کے معاملہ میں امریکہ کا رینک ۷۹ ہے، اس کے بالمقابل سعودی عرب کا رینک ۳۰ ہے، یعنی دوگنے سے بھی زیادہ ہے، نشہ آور ادویات کے استعمال میں بھی امریکہ سعودی عرب سے ۴۶ گنا زیادہ ہے، ڈکیتی کی واردات بھی سعودی عرب کے مقابلہ امریکہ پانچ گنا زیادہ ہے، مجموعی جرائم کے لحاظ سے دیکھیں تو امریکہ میں سعودیہ کے مقابلہ ۱۴۴ گنا زیادہ جرم ہوتا ہے۔

برطانیہ اور عرب امارات

برطانیہ میں چوری کی وارداتیں عرب امارات سے تین گنا زیادہ ہیں، مسلح ڈکیتیاں بھی تین گنا زیادہ ہیں؛ البتہ کرپشن میں عرب امارات برطانیہ سے آگے ہے، کار چھیننے کی واردات

برطانیہ میں ۹۱ رفیصد زیادہ ہے، اسی طرح نقب زنی کی واردات بھی تین گنا زیادہ ہے، نشہ آور ادویات کا استعمال بھی عرب امارات سے تین گنا زیادہ ہے۔

فرانس اور ملیشیاء میں

فرانس میں نقب زنی کی واردات ملیشیاء سے ۷ رگنا زیادہ ہے، جرائم کا تناسب ۵۰ رفیصد زیادہ ہے، نشہ آور ادویات کا استعمال ملیشیاء سے دوگنا زیادہ ہے، سزائیں ملنے کا تناسب ملیشیاء میں فرانس سے دو فیصد زیادہ ہے، مجموعی جرائم فرانس میں ملیشیاء سے ۲۳ رگنا زیادہ ہیں، مسلح واردات ملیشیاء کے مقابلہ میں ۲۱ رگنا زیادہ ہے، قتل کی واردات فرانس میں ۱۳ رگنا زیادہ ہے، ہر ہزار میں دھوکہ دہی کی وارادات فرانس میں ملیشیاء سے ۲۸ رگنا زیادہ ہے۔(۱)



(1) https://www.mationmaster.com/country_infolcompare/Uniteel-arale-Eminates/Uniteel-kngdom/Crime#2014.

گوشت خوری، مذہب اور قانونِ فطرت کی روشنی میں!

اسلام نے جہاں انسان کو اپنے کرم سے سرفراز فرمایا، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمتِ بے کراں سے مالا مال کیا ہے، اسلام سے پہلے عربوں کے گزر بسر کا ذریعہ بھی جانور تھے، ان کا دُودھ غذا کا کام دیتا تھا، ان کی پشت سواری اور بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ان کی تجارت کا دارومدار ان ہی سواریوں پر تھا، ان کے چمڑوں سے بھی مختلف کام لئے جاتے تھے؛ لیکن ان سب کے باوجود جانوروں کے ساتھ ان کا سلوک بڑا بے رحمانہ تھا، آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا، جانور کے منھ پر مارنے کی ممانعت کی، (۱) لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس درندگی کو روکا، (۲) جانور کی خوراک اور ضروریات کی رعایت کرنے کا بھی حکم دیا، ایک اُونٹ کو دیکھا کہ اس کا پیٹ پشت سے لگ ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، (۳) آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر سرسبز و شاداب موسم میں سفر کرو تو آہستہ چلاؤ اور جانور کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دو، اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ، (۴) آپ ﷺ نے اس بات کی بھی تلقین کی کہ جو جانور جس کام کے لئے ہے، اس سے وہی کام لو؛ اس لئے آپ ﷺ نے جانور کو منبر (اسٹیج) بنانے سے منع فرمایا، (۵) مطلب یہ ہے کہ جانور کو اسٹیج کے طور پر استعمال نہ کیا جائے؛ کیوں کہ رُکی ہوئی حالت میں بوجھ کا احساس بڑھ جاتا ہے، چلتی ہوئی حالت میں کم ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۶۴۔

(۲) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۶۲۔

(۳) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۴۸۔

(۴) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۶۹۔

(۵) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۶۹۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخرت کا ثواب وعذاب جانوروں کے ساتھ اچھے اور بُرے سلوک سے بھی متعلق ہے، قیامت کے دن ایک عورت محض اس لئے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ خود کھائے اور دوڑ دھوپ کر اپنی ضرورت پوری کرے، (۱) اور ایک شخص اس بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دُور کی ہوگی اور اسے پانی پلایا ہوگا، (۲) آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتیوں میں سے چرند و پرند جو کھالیں، اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔(۳)

اسلام نے گوشت خوری کو لازم تو نہیں کیا ہے، مگر اس کی اجازت ضرور دی ہے؛ لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے، کسی صاحب نے ایک گوریا پکڑ رکھی تھی اور اس کی ماں بے قرار تھی، آپ ﷺ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلاضرورت ایک گوریا کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے؛(۴) اسی لئے جو چیزیں انسانی کام نہیں آتیں، آپ ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ھُدھُد وغیرہ کے مارنے کی آپ ﷺ نے صراحتاً ممانعت فرمائی، (۵) کسی جاندار کے جلانے کو آپ ﷺ نے شدت سے روکا ہے، ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولہا سلگایا، جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ ﷺ نے چولہا بجھانے کا حکم دیا، (۶) خود حدیث میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے، جن کے حکم سے چیونٹیاں جلائی گئی تھیں، اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔(۷)

---

(۱) بخاری، باب فضل سقی الماء، حدیث نمبر: ۲۳۶۵۔
(۲) بخاری، باب فضل سقی الماء، حدیث نمبر: ۲۳۶۳۔
(۳) صحیح بخاری، باب فضل الزرع والغرس، حدیث نمبر: ۲۳۲۰۔
(۴) السنن الکبریٰ للنسائی، باب من قتل عصفورا بغیر حقها، حدیث نمبر: ۴۵۱۹۔
(۵) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۵۷۲۸۔
(۶) سنن ابی داؤد، باب فی قتل الذر، حدیث نمبر: ۵۲۶۸۔
(۷) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۲۴۱۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے، اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دُنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی حقیقت یہ ہے کہ سوائے ''جین مذہب'' کے، تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود تھا، بودھ مذہب میں بھی گوشت کھایا جاتا تھا، بعد میں انھوں نے اہنسا کا تقاضا سمجھا کہ گوشت خوری ترک کردی جائے، اس لئے منع کردیا گیا، آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے؛ لیکن یہ محض اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے، رگ وید میں ہے :

> اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینسیں پکائیں۔ (۱)
>
> یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (۲)

منو جی نے مختلف مواقع پر نہ صرف گوشت کھانے کی اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے اور جو شخص اس سے انکار کرے اس کو اگلے جنم میں سزا کا مستحق قرار دیا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

- گوشت خور روزانہ شکار کرتا اور گوشت کھاتا ہے، اور یہ کوئی گناہ نہیں اس لئے کہ کھانے والے اور کھائے جانے والے دونوں کو خالق نے (اسی مقصد کے لئے) پیدا کیا ہے۔ (منو، باب:۵، اشلوک:۳۰)
- ایک شخص جو گوشت خوری سے انکار کرتا ہے، مرنے کے بعد اکیس جنم تک جانور کے روپ میں رہتا ہے۔ (منو، باب:۵، اشلوک:۴۵)

---

(۱) رگ وید:۶/۱۱-۱۷۔ (۲) یجر وید، ادھیائے:۲۰/۷۸۔

منو جی یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اگر جانور قربانی کے لئے ذبح کیا جائے، تو یہ قتل کرنا نہیں ہے :

> خود سوئمبھو نے جانوروں کو قربانی کے لئے پیدا کیا، یگیہ کل (عالم) کی بھلائی کے لئے ہیں؛ چنانچہ (جانوروں کا) یگیہ کی غرض سے ذبح کرنا قتل کرنا نہیں ہے۔(۱)

منوسمرتی میں کہا گیا ہے :

> مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیئے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔(۲)

یہ مضمون مہابھارت میں بھی موجود ہے؛ چنانچہ مہابھارت میں یدھشٹر اور بھیشم کا مکالمہ اس طرح نقل کیا گیا ہے :

> یدھشٹر نے کہا: اے مہاشکتی شالی! مجھے بتا کہ وہ کیا چیز ہے جسے اگر اپنے پرکھوں کی روحوں کو بھینٹ کروں تو وہ کبھی ختم نہ ہو، وہ کیا بھینٹ ہے جو ہمیشہ باقی رہ جائے؟ وہ کیا ہے جو لافانی ہو جائے؟
> بھیشم نے کہا: میری بات سن! اے یدھشٹر! وہ نذر کیا ہیں جو کوئی شخص شردھا میں چڑھائے اور جو شردھا کے لئے اچھی ہوں اور وہ کیا پھل ہیں جو ہر ایک کے ساتھ جوڑے جائیں، تل اور چاول اور جو اور ماش اور پانی اور جڑیں اور پھل، اگر انھیں شردھا میں نذر کیا جائے تو اے بادشاہ! تیرے پرکھوں کی آتمائیں دو مہینے تک خوش رہیں گی، (بھیڑ کے) گوشت کی قربانی انھیں تین مہینوں تک اور خرگوش کی قربانی چار مہینوں تک خوش رکھے گی، بکری کے گوشت کی قربانی سے

(۱) منو، باب:۵، اشلوک:۳۹۔ (۲) منوسمرتی، ادھیائے:۳/۲۶۸۔

وہ پانچ مہینوں تک، سور کے گوشت سے چھ مہینوں تک خوش رہیں گے، اور پرندوں کے گوشت انھیں سات مہینوں تک خوش رکھے گا، ایک ہرن کا گوشت جسے پریشاتا کہتے ہیں اور گوایا کا گوشت دس مہینے تک اور بھینس کے گوشت کی قربانی انھیں گیارہ مہینے تک خوش رکھے گی، یہ کہا جاتا ہے کہ شردھا پردی کی گئی گائے کے گوشت کی قربانی ایک سال تک باقی رہتی ہے، قربانی کے گوشت کی بھینٹ ایک سال تک باقی رہتی ہے، قربانی کے گوشت کے ساتھ اتنا گھی ملایا جائے کہ وہ تیرہ پرکھوں کی آتماؤں کو بارہ برس تک خوش رکھ سکے۔ (مہابھارت، انوساشن بھیروا، تیرہویں کتاب، ادھیائے: ۸۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانہ تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا، اور ڈاکٹر تاراچند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

جس ذات نے انسانوں کو اور دنیا کی تمام چیزوں کو پیدا فرمایا ہے اس نے بھی ہمارے وجود میں فطرت کے اشارے رکھے ہیں جو بتاتے ہیں کہ انسان کے لئے گوشت خوری کی اجازت ہونی چاہئے؛ کیوں کہ :

(الف) بعض جانداروں کے اندر صرف ایسے دانت رکھے گئے ہیں جو نباتات کو چبانے کے کام آتے ہیں، جیسے گائے، بیل وغیرہ، ان کے منہ میں نوکدار دانت نہیں ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی خوراک نباتات ہے، بعض جانور وہ ہیں جن کے سارے دانت نوکدار ہیں، جس سے گوشت کھایا جاسکتا ہے، جیسے شیر، بھیڑیا، کتا وغیرہ، یہ اس بات کی علامت ہے کہ گوشت وغیرہ ہی ان کی خوراک ہے، انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دونوں طرح کے دانت پائے جاتے ہیں، وہ بھی جن سے نباتات کھائے جائیں اور وہ بھی جن کے ذریعہ گوشت کو خوراک بنایا جائے؛ اس میں یقیناً قدرت کا اشارہ ہے کہ انسان کو لحمی اور غیر لحمی دونوں طرح کی غذا استعمال کرنی چاہئے۔

(ب) جاندار مخلوقات کے جسم میں ایک عضو 'معدہ' رکھا گیا ہے، جس کا کام خوراک کو ہضم کرنا ہے، سبزی خور جانور جب گوشت کھالے تو معدہ اس کو ہضم نہیں کرتا، گوشت خور جانور سبزی کو منہ ہی نہیں لگاتا؛ لیکن انسان کے معدہ میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ لحمی اور غیر لحمی دونوں طرح کی غذاؤں کو ہضم کرتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قدرت نے انسان کو لحمی اور غیر لحمی دونوں طرح کی غذاؤں کا ضرورت مند بنایا ہے۔

(ج) انسانی جسم میں جو توانائیاں مطلوب ہیں، وہ صرف نباتاتی غذاؤں سے حاصل نہیں ہو پاتیں؛ بلکہ ان کے لئے لحمی غذاؤں کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اگر وہ غذا کی شکل میں لحمیات کا استعمال نہیں کرتے تو دوا کی شکل میں ان کا استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؛ اس لئے انسان کا گوشت خور ہونا صرف ایک خواہش نہیں ہے؛ بلکہ یہ فطرت کی آواز ہے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنے یعنی ''جیوہتیا'' کا باعث بنتا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے، غور کریں کہ کیا اس جیوہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے، آپ جب پانی یا دُودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اُتارتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبانِ حال سے پروانہ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے ہوں، ان کا خاتمہ کردیں، پس جیوہتیا کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہوسکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں، خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے، سوامی دیانند جی نے ''آواگون'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں، جن میں ایک نباتات بھی

ہے، یہ نباتات میں زندگی پائے جانے کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہو تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، غرض کہ اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہے۔

بعض سبزی خور کہتے ہیں کہ پودے تکلیف محسوس نہیں کرتے، اس لئے پودوں کو ختم کرنے کا جرم جانوروں کو ختم کرنے سے کمتر جرم ہے، اس سلسلہ میں مشہور دانشور ڈاکٹر ذاکر نائیک کا بیان بہت چشم کشا ہے، لکھتے ہیں کہ :

> آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ پودے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں، تاہم ان کی چیخ پکار انسان نہیں سن سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے کان ان آوازوں کو نہیں سن سکتے جو سماعت کی حدود (20 ہرٹز تا 20000 ہرٹز) سے باہر ہوں، کوئی آواز اس رینج سے زیادہ ہو یا کم تو وہ انسانی کان میں نہیں آتی، کتے 40000 ہرٹز تک کی آواز سن سکتے ہیں؛ لہٰذا ایسی آوازیں جن کی مقدار (Frequency) 20000 ہرٹز سے زیادہ اور 40000 ہرٹز سے کم ہو، اُنھیں صرف کتے سن سکتے ہیں انسان نہیں، کتے اپنے آقا کی سیٹی کی آواز پہچانتے ہیں اور اس کی طرف چلے آتے ہیں، ایک امریکی کسان نے تحقیق کی اور اس نے ایسا آلہ ایجاد کیا جو پودوں کی چیخ پکار کو اس طرح تبدیل کر دیتا ہے کہ اسے انسان سُن سکے، اس کے ذریعہ سے وہ فوراً یہ محسوس کرنے کے قابل ہوگیا کہ پودا کب پانی کے لئے چیخ رہا تھا، جدید تحقیقات نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ پودے خوشی اور غم کو بھی محسوس کرتے ہیں اور چلا بھی سکتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ پودے صرف دو یا تین حواس رکھتے ہیں؛ جب کہ جانوروں کے پانچ حواس ہوتے ہیں، اس لئے پودوں کو ختم کرنا جانوروں کو ختم کرنے سے کم

درجے کا جرم ہے؛ لیکن یہ درست نہیں، فرض کریں آپ کا بھائی پیدائشی گونگا اور بہرہ ہو اور اس کے دو حواس دوسرے انسانوں کی نسبت کم ہوں، وہ بڑا ہو جائے اور کوئی اس کو قتل کر دے، تو کیا آپ منصف سے کہیں گے کہ اسے کم سزا دیں؛ کیوں کہ آپ کا بھائی دو حواس کم رکھتا ہے؟ جی نہیں! اس کے برعکس آپ کہیں گے کہ اس نے معصوم کو قتل کیا ہے، اس لئے منصف کو چاہئے کہ اسے زیادہ سزا دے۔

اللہ تعالیٰ کا نظام کچھ ایسا ہے کہ جانوروں میں شرح پیدائش انسانوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے، اگر یہ تعداد کنٹرول سے باہر ہو جائے تو اس سے نہ صرف انسانی آبادی کو بلکہ خود جانوروں کو بہت نقصان ہوتا ہے، یہ راستوں میں ٹریفک کے نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں، یہ ہری بھری کھیتیوں کو کھا جاتے ہیں اور جب ان کو ضرورت کے مطابق غذا فراہم نہیں ہوتی ہے تو بیمار پڑتے ہیں اور کوئی ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا نہیں ہوتا، یہاں تک کہ بہت سارے جانور پلاسٹک کی تھیلیاں کھا لیتے ہیں اور سخت تکلیف کے ساتھ ان کی موت ہوتی ہے، یہ محض فرضی باتیں نہیں ہیں؛ بلکہ دن رات مشاہدہ میں آتی ہیں، ٹریفک نظام میں خلل، کھیتیوں کی بربادی اور جب جانور دودھ دینے کے لائق باقی نہ رہے تو اس کی غذا سے محرومی، ان گوشالوں میں دیکھی جا سکتی ہے جو بظاہر گائے کو آرام پہنچانے کے لئے بنائے گئے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ ان کے لئے تکلیف کا، بھکمری کا اور اذیت ناک موت کا سبب بن جاتے ہیں۔



پردہ، عقل وفطرت کی روشنی میں !

اسلام کے معاشرتی قوانین پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان میں ایک مشہور اعتراض پردہ سے متعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کو پردہ کا حکم دے کر ان کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی گئی ہے اور اس سے ان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے، اس اعتراض کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے :

(۱) کیا پردہ کا حکم صرف عورتوں کے لئے ہے؟

(۲) کیا پردہ کا مقصد عورتوں کی اہانت وتذلیل ہے یا اس سے ان کی حفاظت مقصود ہے؟

(۳) کیا پردہ عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ ہے اور زندگی کی دوڑ میں ان کے لئے مواقع کو کم کر دیتا ہے؟

پردہ کا حکم مردوں کیلئے بھی

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اول تو پردہ کا حکم صرف عورت کے لئے نہیں ہے، دوسرے: تمام عورتوں کو پردہ کے سلسلے میں مساوی احکام نہیں دیئے گئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ پردہ کا حکم مردوں کے لئے بھی ہے، مردوں کے حق میں لازمی حکم یہ ہے کہ ناف سے لے کر ٹخنہ تک کا حصہ چھپایا جائے؛ چنانچہ فقہاء نے بھی اس کو واجب قرار دیا ہے: ''ستر العورة واجب علی کل حال'' (۱) ''حصۂ ستر کا چھپانا واجب ہے''، ''عورة الرجل ما بین سرته الیٰ رکبتیه'' (۲) ''مرد کا حصۂ ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے''۔

---

(۱) المبسوط للسرخسی: ۲/۵۹۔ (۲) المبسوط للسرخسی: ۱۰/۱۴۶۔

یہ تو مردوں کے لئے ستر کا لازمی حکم ہے؛ لیکن مستحب طریقہ یہ ہے کہ گردن سے کمر تک کا حصہ بھی چھپا ہوا ہو؛ اس لئے کہ اس طرح نماز پڑھنے کو منع کیا گیا ہے کہ انسان کے بازو کھلے ہوئے ہوں؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے دو کپڑوں کا استعمال فرماتے تھے، ایک: تہبند جو کمر کے نیچے کے حصہ کو ڈھانک لے، دوسرے: وہ کپڑا جس سے اس سے اوپر کا حصہ چھپ جائے، ایک بار آپ ﷺ نے صرف تہبند میں نماز پڑھی تو دیکھنے والے صحابی کے لئے یہ بات حیرت کا باعث ہوگئی، آپ ﷺ نے ان کا استعجاب دور کرنے کے لئے فرمایا: کیا میری اُمت کے تمام لوگوں کے پاس دو چادریں ہوں گی؟ (۱) مقصد یہ تھا کہ اُمت میں ایسے غریب افراد بھی ہو سکتے ہیں، جن کو دو چادریں میسر نہ ہوں، ان کے پاس ایک ہی چادر ہو، ایسی صورت میں وہ نماز سے محروم نہ ہو جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ عام طور پر کمر سے نیچے اور کمر سے اوپر دونوں حصے چھپائے جاتے تھے، عربوں کا جبہ اسی روایت کا تسلسل ہے، جس کو مرد استعمال کرتے ہیں، اور جو گردن سے پاؤں تک پورے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح مردوں کے لباس میں کسی ایسی چیز کو بھی شامل رکھا گیا ہے، جو سر کو چھپانے والی ہو، جیسے: ٹوپی یا عمامہ، مگر یہ استحباب کے درجہ میں ہے، ضروری نہیں ہے۔ (۲)

عورتوں کے لئے پردہ کا علاحدہ حکم ہے اور اس میں پردہ کی زیادہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) مَحرم کے لئے چہرہ، ہاتھ، بازو، گردن سے متصل حصہ، پنڈلی اور پیٹھ ستر میں شامل نہیں ہے، جسم کے باقی حصہ کا ستر ضروری ہے، (۳) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محرم کے سامنے خواتین ان تمام اعضاء کو کھول کر رکھیں؛ بلکہ منشاء یہ ہے کہ اصل میں تو چہرہ اور ہاتھ محرم کے سامنے کھولنا چاہئے؛ لیکن اگر یہ اعضاء بھی کھل جائیں یا معمولی ضرورت کی بناء پر کھولے جائیں تو اس کی گنجائش ہے۔ (۴)

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۶۲۸۷۔ (۲) عمدۃ القاری: ۲/ ۳۸۲۔
(۳) تکملۃ البحر الرائق: ۸/ ۲۲۱۔ (۴) المبسوط للسرخسی: ۱۰/ ۱۴۹۔

(ب) ایسے غیر محرم جن سے بار بار سامنا ہونے کی نوبت آتی ہو، جیسے ہندوستانی معاشرہ میں ایک ہی گھر میں دو بھائیوں یا دو بہنوں کی اولاد کا قیام ہوتا ہے اور چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد بھائی بہنوں میں مکمل پردہ دشوار ہوتا ہے، تو اس صورت میں چہرہ اور ہتھیلی کے بقدر ہاتھ نیز پاؤں کھلے رکھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ فتح مکہ کے موقع سے آپ کی چچازاد بہن حضرت اُم ہانی بنت ابی طالبؓ آپ کے سامنے ہوئی ہیں، (۱) یا حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ آپ کے سامنے ہوتی رہی ہیں، (۲) مگر یہ حکم اسی وقت ہے جب کہ ان کے ایک دوسرے کے سامنے آنے میں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، فتنہ سے مراد ہے: گناہ میں مبتلا ہو جانے کا شدید اندیشہ، (۳) چنانچہ فقہاء حنفیہ نے لکھا ہے :

خوف الفتنة أي الضرر بها أو الشهورة والمعنیٰ تمنع من الكشف لخوف أن يرى الرجال وجهها فتقع الفتنة۔ (۴)

(ج) جو عورتیں عمر دراز ہوں، یعنی ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی ہو، پردہ کے معاملہ میں ان کا حکم مردوں کے لئے محرم عورتوں کا سا ہے۔ (۵)

(د) عورت کے لئے عورت سے پردہ اسی قدر ہے، جتنا مرد کا حصہ ستر ہے۔ (۶)

دو صورتیں ایسی ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کا حکم یکساں ہے، ایک: ازدواجی رشتہ، اس میں نہ شوہر کے لئے بیوی سے ستر ضروری ہے اور نہ بیوی کے لئے شوہر سے؛ البتہ شوہر و بیوی کے لئے بھی بہتر ہے کہ بلا وجہ ایک دوسرے کے سامنے اپنے صنفی اعضاء کو نہ کھولیں، یہ حیاء کے خلاف ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا :

إذا أتى أحدكم أهله فليستتر ولا يتجرد تجرد العيرين۔ (۷)

---

(۱) حاشیہ علی مسند احمد: ۴۴/ ۴۵۵۔ (۲) سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۸۱۸۔
(۳) رد المحتار: ۱/ ۴۰۶۔ (۴) رد المحتار: ۱/ ۴۰۶۔
(۵) ہدایہ: ۴/ ۳۶۸۔ (۶) تکملۃ البحر الرائق: ۸/ ۲۱۹۔ (۷) ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۹۲۱۔

جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے، تب بھی (ممکن حد تک) ستر کا لحاظ رکھے، گدھوں کی طرح بالکل ننگا نہ ہو جائے۔

دوسرا موقع ہے ضرورت کا، ضرورت دو طرح کی ہے، ایک وہ جو زندگی کے عام مسائل میں پیش آتی ہو، اس میں چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے؛ رسول اللہ ﷺ سے بہت سی صحابیات ملاقات کیا کرتی تھیں اور مسائل دریافت کرتی تھیں، خود حضور ﷺ کا حضرت ام سلیطؓ اور حضرت بریرہؓ کے یہاں جانا ثابت ہے، (۱) حج کے موقع سے ایک خثعمی خاتون نے آپ سے مسئلہ دریافت کیا، جب حضرت فضل بن عباسؓ آپ کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے، آپ ﷺ نے ان کا چہرہ موڑ دیا، (۲) ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر عورت کے لئے چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے، یہاں تک کہ اس کی اجازت بعض ایسے سخت ضرورت کے مواقع پر بھی ہے، جب کسی فریق میں شہوت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو؛ اسی لئے مخطوبہ کو دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے، نیز فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عورت گواہ یا مدعی یا مدعی علیہا ہو تو قاضی اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے، چاہے شہوت کا اندیشہ ہو، (۳) عہد صحابہ میں بھی اس طرح کے آثار موجود ہیں۔

غرض کہ پردہ کے احکام مردوں کے لئے بھی ہیں اور عورتوں کے لئے بھی؛ البتہ اس کے حدود الگ الگ ہیں؛ اسی طرح مردوں اور عورتوں دونوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ غضِ بصر سے کام لیں، یعنی دوسرے فریق کو تاکنے، جھانکنے، نظر جمانے اور لذت اندوز ہونے کے لئے صنف مخالف کو دیکھنے سے بچیں، اور قرآن نے جہاں نگاہ کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے، وہاں عورتوں سے پہلے مردوں کو خطاب کیا گیا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ،

---

(۱) عمدۃ القاری: ۱۴/۱۶۸، نیز دیکھئے: سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۲۳۱۔

(۲) مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۱۸۔ (۳) ہدایہ: ۴/۳۶۸-۳۶۹۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (النور: ۳۰-۳۱)

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے صاف ستھرا طریقہ ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، یقیناً اللہ کو ان سب کی خبر ہے، اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش وآرائش کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو کھلا رہتا ہے، اور اپنے گریبانوں پر دوپٹے ڈال لیا کریں، ہاں، اپنے شوہر، والد، خسر، بیٹے، شوہر کے بیٹے، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، اپنی عورتوں، باندیوں، شہوت نہ رکھنے والے مرد خادم، یا عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ناواقف بچوں کے سامنے اپنی زیب وزینت ظاہر کرسکتی ہیں، نیز (زمین پر) اس طرح زور سے پاؤں نہ ماریں کہ ان کا پوشیدہ بناؤ سنگار ظاہر ہو جائے، اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کے سامنے توبہ کرو؛ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔

پردہ اور دیگر مذاہب

پردہ کی حدود مردوں کے مقابلہ عورتوں کے لئے زیادہ کیوں رکھی گئی؟ یہ بالکل واضح ہے اور فطرت کی آواز ہے، اللہ تعالیٰ نے تخلیقی طور پر عورتوں کے اندر مردوں کے مقابلہ زیادہ کشش رکھی ہے؛ اسی لئے دنیا کے تمام ہی مذاہب میں اس کی رعایت ہے، ہندو مذہب میں سیتا جی کو ایک آئیڈیل خاتون مانا گیا ہے، جنھوں نے دشمنوں کے بیچ رہ کر بھی اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کی اور اپنی آبرو پر کوئی دھبہ لگنے نہیں دیا، سیتا جی کے بارے میں ہندو مذہبی مآخذ میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ جب شری رام جی کے بھائی لکشمن کو کہا گیا کہ وہ سیتا جی کا چہرہ دیکھ کر ان کو پہچانیں تو انھوں نے کہا کہ میں نے کبھی اپنی بھاوج کے قدموں سے اوپر نگاہ نہیں اُٹھائی اور ان کا چہرہ نہیں دیکھا؛ چنانچہ انھوں نے سیتا جی کے پازیب دیکھ کر ان کو پہچانا؛ اسی لئے عام طور پر ہندو بھائیوں کے یہاں دیویوں کی تصویر اس طرح بنائی جاتی ہے کہ ان کا سارا بدن سوائے چہرہ کے ڈھکا ہوتا ہے اور سر پر آنچل ہوتا ہے، ہندوؤں کے بہت سے خاندانوں، خاص کر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں عورتوں کے گھونگھٹ لٹکانے کا قدیم رواج رہا ہے، اور بہت سی جگہوں پر آج بھی موجود ہے، یہ گھونگھٹ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ سر، چہرہ اور سینہ کا حصہ اچھی طرح چھپ جاتا ہے؛ بلکہ ہندو دھرم کی بنیادی کتاب وید میں پردہ کا بہت واضح حکم ملتا ہے:

> چوں کہ برہم (خدا) نے تمھیں عورت بنایا ہے: اس لئے اپنی نظر میں نیچی رکھو اوپر نہیں، اپنے پیروں کو سمیٹے ہوئے رکھو، اور ایسا لباس پہنو کہ کوئی تمہارا جسم دیکھ نہ سکے۔(۱)

توراۃ کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی مذہب میں بھی عورتوں کے لئے پردہ کا حکم تھا، عیسائیوں کے یہاں حضرت مریم علیہا السلام کی شخصیت آئیڈیل اور نمونہ ہے،

---

(۱) رگ وید: ۸/۱۹-۳۳۔

ان کی تصویریں بھی اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ سوائے چہرہ کے پورا جسم چھپا رہتا ہے، آج بھی چرچ کی راہبات سوائے چہرہ کے پورے جسم کو چھپانے والا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتی ہیں، جن مغربی ملکوں میں برقعہ یا حجاب پر پابندی لگائی گئی ہے، وہاں بھی ننوں کو اپنا بدن ڈھانک کر رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، راہبات کے لئے تو سر چھپانا ان کے یہاں واجب ہے ہی؛ لیکن اس کے علاوہ بعض عیسائی فرقوں جیسے : آمیش اور مینونایت کے نزدیک عورت کے لئے سر چھپانا ضروری ہے؛ بلکہ ۱۹۱۷ء تک کیتھولک چرچوں میں عورتوں کے لئے سر چھپانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔(۱)

غرض کہ یہودی اور عیسائی مذہب میں بھی پردہ کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کے احکام یکساں نہیں ہیں؛ اسی لئے تورات نے عورت کو مرد کا اور مرد کو عورت کا لباس پہننے سے منع کیا ہے؛ چنانچہ تورات میں ہے :

> عورت مرد کا لباس نہ پہنے اور نہ مرد عورت کی پوشاک پہنے؛ کیوں کہ جو ایسے کام کرتا ہے، وہ خداوند کے نزدیک مکروہ ہے۔(۲)

یہودیوں کے یہاں یہودی علماء کے اجتہاد و استنباط سے جو فقہی کتاب مرتب ہوئی ہے اور جس کو پوری دنیا کے یہودی مسائلِ زندگی کے لئے معتبر مانتے ہیں، وہ "تلمود" ہے، اس کتاب میں خاص طور پر عورت کے بال سے متعلق بحث گئی ہے؛ چنانچہ مایر شلر (Mayer Schiller) نے نقل کیا ہے :

> فقہاء یہود کا اس بات پر اجماع ہے کہ شادی شدہ یہودی عورت سڑک پر سر کے پورے بال نہیں کھول سکتی...... کوئی بھی نص یا فقیہ کا معتبر قول نہیں ہے، جو شادی شدہ عورت کو عام مقامات پر پورے بال کھلے رکھنے کی اجازت دیتا ہو۔(۳)

---

(۱) دیکھئے: وکی پیڈیا، مادہ: غطاء الرأس فی المسیحیۃ۔ (۲) استثناء ۲۱:۵۔

(۳) نیٹ سے: M. Schiller op cit : 104-405

یہ جو بات کہی گئی ہے کہ پورے سر کے بال کھلے رکھنے کی ممانعت پر اجماع ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ یہودیوں کے بعض فرقے جیسے سفاردیم اور بعض علماء جیسے موشی فائنسٹاین (Moshe Feinstein) جو امریکہ کے یہودیوں کے درمیان مقبول عالم ہیں؛ کی رائے ہے کہ عورت سر کے اگلے حصے سے صرف انگشت کے بقدر بال کھلا رکھ سکتی ہے :

G Ellinson, Women and Mitzvot The Modest Way, A Guide to the Rallrinic Saurces, Jerusalem Feldheim Pullishers 1992, P:122123.

بعض علماء یہود سے منقول ہے کہ شادی شدہ عورت کو سر چھپانا چاہئے؛ یعنی غیر شادی شدہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے؛ مگر یہ متفق علیہ قول نہیں ہے؛ چنانچہ بعض یہودی علماء جیسے موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے :

> اسرائیلی عورتوں کے لئے کھلے سر بازار جانا جائز نہیں ہے، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔(۱)

بعض علماء نے اس یہودی قانون کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ جن حضرات نے غیر شادی شدہ عورت کو سر کھلا رکھنے کی اجازت دی ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ نابالغ لڑکیوں کے لئے سر چھپانا ضروری نہیں ہے؛ چنانچہ تلمود میں سر چھپانے کے احکام اس طرح بیان کئے گئے ہیں :

> مرد کبھی اپنے سر چھپا بھی سکتے ہیں اور کبھی کھلا بھی رکھ سکتے ہیں؛ لیکن عورتیں ہمیشہ اپنا سر چھپائیں گی، اور نابالغ بچیاں سر نہ چھپائیں۔

Gillion Beattie Women and Marriage in Paul and his Early Interpreters,, New york: Continuum International Publishing. (۲)

---

(۱) Maimonieles:21/17 (۲) Group 2005 P : 44

اسی بناء پر یہودی علماء نے کہا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو کھلے سر اپنے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھے تو وہ کافر (Bodless) ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ اس کو طلاق دیدے۔(۱)

بلکہ بال چھپانے کے حکم میں علماء یہود کے نزدیک اتنی سختی ہے کہ ان کے بعض فرقے شادی کے موقع سے دُلہن کے بال منڈا دیتے ہیں؛ کیوں کہ شادی کے موقع سے بال کو چھپا کر رکھنا دشوار ہوتا ہے، اسپین، یوکرین اور فلسطین کے مذہبی یہودی خاندانوں میں رواج ہے کہ وہ بال منڈا کر سر پر کوئی کپڑا لپیٹ لیتی ہیں، بعض یہودی علماء نے بھی اس نامعقول عرف کی پوری قوت کے ساتھ تائید کی ہے۔(۲)

جب بال کے سلسلے میں اس درجہ سخت احکام ہیں تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جسم کے دوسرے اعضاء کا لوگوں کے سامنے کھولنا بھی ان کے نزدیک جائز نہیں ہوگا؛ چنانچہ تلمود کے ایک بڑے عالم Ravad of Pasqiures کہتے ہیں :

> عورت کی کسی بھی جگہ کو دیکھنا ممنوع ہے، چاہے چھوٹی انگلی ہو یا پھر بال ہی کیوں نہ ہو۔
>
> Cited in Hidelushei ha Rashba, Berakhuted N.M. Harbits, Jerusalem, 1979, Quated by, Shmuel Her feld op, cit. (۳)

تلمود میں ایک یہودی عالم ششت کی بات نقل کی گئی ہے :

> اگر کوئی شخص عورت کی چھوٹی انگلی کو بھی گھورتا ہے تو گویا اس نے اس کی شرمگاہ کو گھور کر دیکھا۔(۴)

---

(۱) Alvin Schmidt op cit P : 13ا

(۲) دیکھئے: منقول از نیٹ: M. Schiller,op,cit pp. 101,102

(۳) منقول از: نیٹ۔

(۴) Berachoth:24a منقول از نیٹ۔

بلکہ یہودی مذہب میں چہرہ کو شامل کرتے ہوئے عورت کے مکمل پردہ کا تصور پایا جاتا ہے؛ چنانچہ ڈاکٹر Menachem M Brayer نے اپنی کتاب "عبرانی ادب میں یہودی عورتیں" میں لکھا ہے :

> یہودی خواتین کا طریقہ تھا کہ وہ سر ڈھک کر باہر نکلتی تھیں اور بعض دفعہ ایک آنکھ کو چھوڑ کر پورا چہرہ بھی ڈھانکے ہوئے ہوتی تھیں۔(۱)

ایک بڑے یہودی عالم اور تورات کے مفسر دانیال تومیسی نے بعض یہودی علماء پر سخت تنقید کی ہے کہ انھوں نے یہودی عورت کو یہودی مرد کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت دی تھی :

> Solo Wittmayer Baron, A Social and Religious History of the Jews, New York, Columbia. (۲)

ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودیوں کے یہاں پردہ کے قریب قریب وہی احکام ہیں، جو مسلمانوں کے یہاں ہیں۔

حفاظت نہ کہ قید

قانونِ فطرت بھی ہمیں بتاتا ہے کہ جو چیزیں عام، غیر اہم اور کشش سے خالی ہوں، ان کے لئے حفاظت وصیانت کا اہتمام درکار نہیں ہوتا، یا کم اہتمام کافی ہو جاتا ہے، اور جو چیزیں قیمتی، اہم اور وجہِ کشش ہوں، ان کی حفاظت کے لئے قدرت کی طرف سے تدبیریں کی گئی ہیں، پتھر کی چٹانیں بے غبار حالت میں ہر جگہ مل جائیں گی؛ لیکن سونے کی کان پتھر کی طرح کھلے عام دستیاب نہیں؛ بلکہ پتھر اور دوسرے زمینی اجزاء کے تہہ در تہہ غلاف میں سونے کے ذرات چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان کی تلاش بھی مشکل ہے اور تلاش کے بعد ان کو نکالنا بھی دشوار، پانی میں سیپ اور اس جیسی کتنی ہی چیزیں تالابوں، ندیوں اور دریاؤں کے کنارے وافر مقدار میں دستیاب ہیں؛ لیکن موتی کو صدف کے مضبوط غلاف میں چھپا کر رکھا گیا ہے، جو تلاشِ بسیار کے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔

---

(۱) Menachem m.brayer.op.cit.p.239، نیٹ سے۔

(۲) University press 1967 4th, Printing : 3/299، نیٹ سے۔

انسان خود اپنے جسم میں بھی قدرت کی اس تقسیم کو دیکھ سکتا ہے، انسان کے ہاتھ پاؤں تو کھلے ہوئے ہیں؛ لیکن اس کے ''دل'' کو لچکدار ہڈیوں کے پنجرے میں اور ''دماغ'' کو تہہ در تہہ کھوپڑی کے خول میں رکھا گیا ہے، انسان کے چہرہ کو جن اعضاء سے سجایا گیا ہے، ان میں سب سے نازک عضو انسان کی آنکھ ہے، اللہ نے اس پر پلکوں کی حفاظتی دیوار بنا دی ہے، اور اس پر ایسے بال لگا دیئے ہیں جو آنکھوں کو کیڑوں مکوڑوں کے داخل ہونے سے بچا سکیں، عورت کا وجود بھی یقیناً ایک پرکشش وجود ہے، جو تاریخ میں بعض بڑی لڑائیوں کا باعث بنا ہے تو کیا ان کی خصوصی حفاظت وصیانت مطلوب نہیں ہے اور ان کو سماج کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ان کے ساتھ زیادتی نہیں ہے؟

عجیب بات ہے کہ جو لوگ پردہ کو عورتوں کی توہین قرار دیتے ہیں، وہی اپنی دولت کی حفاظت میں اس نسخہ کا استعمال کرتے ہیں، آپ گھر کی تعمیر کے لئے اینٹ، پتھر اور لوہا، لکڑی لاتے ہیں تو اسے گھر کے باہر ڈال دیتے ہیں؛ لیکن اگر سونا خرید کر لائیں، ہیرے جواہرات خرید کریں اور بینک سے پیسے نکال کر لائیں تو اسے اس طرح نہیں چھوڑتے؛ بلکہ اسے گھر کے اندر، اور برآمدہ میں نہیں کمرہ میں، اور صرف کمرہ میں نہیں الماری میں؛ بلکہ ہو سکے تو الماری کے اندر موجود لاکر میں اس احتیاط سے رکھتے ہیں کہ لاکر کو بھی مقفل کر دیتے ہیں، الماری کو بھی، اور گھر سے باہر جائیں تو کمرہ کے دروازہ کو بھی اور باہر کے گیٹ کو بھی، کیا یہ سونے، جواہرات اور روپیوں کی توہین اور ناقدری ہے؟ یا اس کی اہمیت کا احساس ہے؟؟ ملک کا عام شہری تنِ تنہا دن ہو یا رات، ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد ورفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ کوئی محافظ ہے اور نہ بندوق بردار سیکوریٹی گارڈ؛ لیکن ملک کا صدر، وزیر اعظم یا دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کو کس قدر حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے، اس کی قیام گاہ ہو یا سواری، ہر جگہ کئی کئی مرحلوں میں تحفظ کا انتظام ہوتا ہے، کیا یہ ان عہدہ داروں کے لئے قید ہے یا سیکوریٹی؟ حقیقت یہ ہے کہ پردہ عورتوں کا وقار، اس کی عزت اور قدردانی ہے اور اس کے ذریعہ حریص نگاہوں سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ مردوں نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے عورتوں کو بے پردہ کر دیا اور اپنے آپ کو چھپائے رکھا، کھیل کا میدان ہو، فلم کی تصویر کشی ہو، ائیر لائنز کا عملہ ہو، استقبالیہ پر بیٹھنے والے ملازمین ہوں یا اسکول اور تجارت گاہوں کے یونیفارم ہوں، مرد خود تو پورا لباس پہنتا ہے، جو عموماً ڈھیلا ڈھالا بھی ہوتا ہے، اور عورتوں کو ایسا لباس پہناتا ہے، جس کے بعد وہ نیم برہنہ نظر آتی ہے، اور کپڑے بھی اتنے چست ہوتے ہیں کہ جسم کا ایک ایک اَنگ نمایاں ہو جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ کپڑے بھی اتنے باریک کہ جسم کی رنگت جھلکنے لگے، کیا یہ عورت کی توہین اور تجارتی اغراض کے لئے ان کا استحصال نہیں ہے، کیا کوئی غیرت مند مرد اپنی ماں، اپنی بیٹی اور اپنی بیوی کے لئے یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں لوگوں کے درمیان نکلے اور لوگ اس سے لذتِ دید حاصل کریں؟؟

جہاں کہیں برہنگی اور بے پردگی کو رواج دیا گیا ہے، وہاں باہمی رضامندی سے بغیر شادی کے مرد وعورت کے تعلق پر کوئی پابندی نہیں ہے، پھر بھی عورتیں بڑی تعداد میں مردوں کی زیادتی اور جبر کا شکار ہوئی ہیں، F.B.I کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں صرف ۱۹۹۰ء میں روزانہ عصمت دری کے اوسطاً ۱۷۵۶ مقدمات درج ہوئے، بعد کی ایک اور رپورٹ کے مطابق امریکہ میں روزانہ تقریباً ۱۹۰۰ کے اوسط سے عصمت دری کے واقعات پیش آئے ہیں، (۱) بے پردگی، عریانیت اور اختلاط کی وجہ سے مغربی ممالک میں کیا صورت حال ہے؟ اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ۲۰۱۴ء میں یوروپی یونین کے بنیادی حقوق کے ادارے کے سروے نتائج کے مطابق یونین میں شامل ممالک میں تقریباً ایک تہائی خواتین ۱۵ ر برس کی عمر سے جسمانی یا جنسی تشدد کا شکار رہی ہیں، یہ تعداد چھ کروڑ بیس لاکھ کے لگ بھگ بنتی ہے، سروے میں کہا گیا ہے کہ یہ اس موضوع پر لیا جانے والا اب تک کا سب سے بڑا جائزہ ہے اور اس کے لئے ۴۲ ر ہزار خواتین کے انٹرویو کئے گئے۔ (۲)

---

(۱) اسلام پر چالیس اعتراضات، ڈاکٹر ذاکر نائک: ۸۵۔

(۲) دیکھئے: http:11www.bbc.com/urdu/2014/03/140305eu.women-violence-reportzs

اب ایک نظر امریکہ کی صورت حال پر ڈالئے ، ایک تازہ سروے میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ہر ۱۶؍ میں ایک امریکی خاتون کا پہلا جنسی تجربہ زبردستی کا تھا، امریکہ میں خواتین کی تعداد ۱۶؍ کروڑ سے زائد ہے، اس حساب سے ایک کروڑ خواتین زنا بالجبر کا شکار ہوئی ہیں، ۷؍ فیصد خواتین کا کہنا تھا کہ انہیں ۱۵؍ سال کی عمر میں ریپ کا نشانہ بنایا گیا اور وہ مرد عمر میں ان سے کئی سال بڑا تھا، فوج سب سے زیادہ ڈسپلن کی پابند سمجھی جاتی ہے؛ لیکن مرد فوجی بھی اپنی ساتھی خاتون فوجی کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کرتے ہیں؛ چنانچہ امریکی ڈپارٹمنٹ آف ڈیفنس کی ۲۰۱۷ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۶ء میں امریکی فوج میں جنسی زیادتی کے ۶۱۸۲ کیسس فائل ہوئے، یہ ۲۰۱۲ء کے مقابلے میں تقریباً دوگنا ہیں، جب ۳۶۰۴ کیسس رپورٹ کئے گئے تھے، پنٹاگون کی رپورٹ کے مطابق امریکی فوجی خواتین دشمن کے حملوں میں ہلاکت کی نسبت ساتھیوں اور افسران سے ریپ کے خطرے کی زیادہ شکار ہیں، حد تو یہ ہے کہ سیاستداں خواتین بھی اپنے مرد سیاستداں ساتھیوں کی طرف سے اس قسم کی زیادتی کا شکار ہوتی رہتی ہیں، اور اس کی رپورٹیں بھی موجود ہیں۔

خود ہمارے ملک بھارت کی صورت حال یہ ہے کہ جرائم کے اعداد وشمار یکجا کرنے والے سرکاری ادارہ ’’نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو (این، سی، آر، بی)‘‘ کی رپورٹ ۲۰۱۸ء کے مطابق بھارت میں اوسطاً ہر روز ۹۱؍ خواتین کے خلاف جنسی زیادتی کی شکایت درج کرائی گئی ہے، یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ امریکہ ہو یا یورپ ، یا بھارت ، یہاں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ بالغ مرد وعورت کے درمیان باہمی رضامندی سے جنسی فعل کی ممانعت نہیں ہے؛ اس لئے یہ جرم میں شامل نہیں ہے، نیز جنسی جرائم کے زیادہ تر واقعات عورتیں شرم کی وجہ سے یا مجرموں کے دباؤ کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتیں، جو معاملات پولیس میں درج کئے جاتے ہیں، ان ہی کی بنیاد پر یہ رپورٹیں مرتب کی جاتی ہیں؛ اس لئے حقیقی واقعات اس سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جنسی جرائم کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کا بنیادی سبب بے پردگی ،

عریانیت اور اختلاط ہے؛ اسی لئے جن ملکوں میں عریانیت اور بے پردگی کا آزادانہ ماحول نہیں ہے، وہاں ایسے جرائم کی شرح بہت ہی کم پائی جاتی ہے، مسلم ممالک میں حالاں کہ شرعی قوانین نافذ نہیں ہیں، اس کے باوجود چوں کہ مسلمان عورتیں مذہبی جذبات کے تحت اپنی خوشی سے پردہ کا اہتمام کرتی ہیں؛ اس لئے ان کی صورت حال بہتر ہے، دنیا میں کل ۱۹۵ر ممالک ہیں، ان میں سے ۱۹۳ر ممالک اقوام متحدہ کے ممبر ہیں، اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں غالباً ۵۷ر مسلم ممالک ہیں؛ لیکن سالہا سال سے جرائم کے سلسلے میں جو رپورٹیں آرہی ہیں، ان میں مسلم ممالک بحمد اللہ جرائم اور خاص کر جنسی جرائم کے اعتبار سے سب سے کم تر سطح پر ہیں، یعنی ان کے یہاں جنسی جرائم کافی کم ہیں۔

۲۰۱۸ء میں عورتوں کی عصمت دری کے اعداد وشمار کی روشنی میں ٹاپ ٹین ممالک میں ڈنمارک، فن لینڈ، اسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، امریکہ، سویڈن اور جنوبی افریقہ شامل ہیں، بحمد اللہ ان میں ایک بھی مسلم ملک نہیں ہے، افسوس کہ اس فہرست میں ہمارا ملک بھارت بھی شامل ہے، جہاں رپورٹ کے مطابق روزانہ ۹۳ر عورتوں کی عزت لوٹی جاتی ہے، (۱) یہ صرف اس لئے ہے کہ مسلمانوں میں پردہ کا تصور ہے اور عریانیت کو بہت قبیح فعل سمجھا جاتا ہے۔

ترقی کیلئے رکاوٹ نہیں!

یہ بات کہ پردہ ترقی کے لئے رکاوٹ ہے، انتہائی خلافِ واقعہ بات ہے، نہ عقل اس کی تصدیق کرتی ہے اور نہ تجربہ، غور کیجئے کہ علم کے بنیادی طور پر دو ذرائع ہیں، ایک: انسان کی عقل، جس کا مرکز دماغ ہے، دوسرے: انسان میں محسوس کرنے کی صلاحیتیں، یعنی آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتا ہے، زبان جو چکھتی ہے، ناک جس میں سونگھنے کی صلاحیت ہے، اور ہاتھ یا دوسرے اعضاء جو چھو کر کسی چیز کی سختی اور نرمی کا ادراک کرتے ہیں، ان ہی پانچ صلاحیتوں کو فلسفہ کی اصطلاح میں ''حواس خمسہ'' (Five Senses) کہا جاتا ہے، عقل

(۱) روزنامہ سالار بنگلور: ۲۷/اپریل ۲۰۱۹ء۔

اور حواس ہی علم وتحقیق کے بنیادی ذرائع ہیں، اب سوچنے کی بات ہے کہ کیا پردہ ان میں سے کسی صلاحیت کو متاثر کرتا ہے؟ کیا پردے کی وجہ سے عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے احساس کی یہ صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ پردہ کو علمی وفکری ترقی میں رکاوٹ تصور کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر شریعت کے مطابق پردہ کا نظام قائم ہو، جس میں مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط سے بچا جائے تو زندگی کی تگ ودو میں عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد کے مواقع بھی بڑھ جائیں گے، مثلاً اس نظام کے تحت اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک لڑکیوں کے تعلیمی ادارے الگ ہوں گے، جن میں خاتون اساتذہ اور عملہ کام کریں گی، ہاسپیٹلوں میں نہ صرف خواتین مریضوں کا وارڈ الگ ہوگا؛ بلکہ پورا سیکشن ہی الگ ہوگا، اس میں ڈاکٹرس اور تمام عملہ بھی عورتوں کا ہوگا، اسی طرح بینکوں میں اور عوامی ضروریات سے وابستہ اداروں میں خواتین کے مستقل حصے ہوں گے، یہی حال مارکٹوں کا ہوگا، جن میں خواتین کے لئے مستقل مارکٹ ہوگی، دوکانوں میں ان کے لئے الگ حصہ ہوگا، خواتین کے لئے مخصوص حصہ میں خاتون کارکن کام کریں گی؛ اس لئے پردہ کا نظام خواتین کے لئے کام کے مواقع کو بڑھا دے گا اور وہ مرد ساتھیوں کی ہراسانی سے بچتے ہوئے کام کرسکیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ پردہ خواتین کے لئے نعمت ہے، جو ان کو وقار عطا کرتا ہے، اور پردہ کو ختم کر دینا بہت سی معاشرتی برائیوں کا سبب بنتا ہے، جن میں سب سے اہم زنا کی کثرت اور عورتوں کو زیادہ سے زیادہ برہنہ کرنا ہے، زنا اگرچہ دوطرفہ فعل ہے؛ لیکن اس کا زیادہ نقصان عورت کو اُٹھانا پڑتا ہے، اگر وہ زنا کی وجہ سے بچے کی ماں بن گئی تو اسے اپنا ہی نہیں اپنے بچہ کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے، اور اگر بے قید تعلق کا معاملہ آگے بڑھا اور مختلف مردوں سے اس کا رابطہ ہوا تو پہلے وہی ایڈس کی مریض ہوتی ہے، پھر مرد ہوتا ہے، اور اس کی زندگی دُکھ بھری زندگی بن جاتی ہے، جب عورت کی عریاں تصویر لی جاتی ہے تو اگرچہ مرد بھی اس عمل میں شریک ہوتا ہے؛ لیکن رُسوائی اس عورت ہی کی زیادہ ہوتی ہے، اگر وہ آئندہ اپنی پاکیزہ زندگی

شروع کرنا چاہے تو اس سے قاصر رہتی ہے، مجرمانہ ذہن رکھنے والوں کا شکار اکثر وہی عورتیں بنتی ہیں، جو سرِ عام اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں، نیم برہنہ لباس پہنتی ہیں، یا ایسے چست ملبوسات کا استعمال کرتی ہیں، جن سے جسم کا نشیب وفراز نمایاں ہو جائے، جو عورتیں ڈھکا چھپا اور ڈھیلا ڈھالا لباس استعمال کرتی ہیں، ان کے ساتھ زیادتی کے واقعات کم پیش آتے ہیں اور زیادہ تر وہ عیاش مردوں کی ہوسناک نظروں سے محفوظ رہتی ہیں۔



کم عمری کی شادی

جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصاندہ ہے؛ کیوں کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اور تولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں :

طبی نقطۂ نظر

اول یہ کہ جسمانی نشو ونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں نہیں ہوتی، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ ر سال سے کم عمر کی ہر لڑکی کے لئے ماں بننا نقصاندہ ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ ر سال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو؛ اس لئے ۱۸ ر سال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں، قانونِ فطرت کے تحت لڑکی کی اِس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہوجاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

اخلاقی پہلو

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی کثرت، انٹرنیٹ اور بے ہودہ فلموں کے ویڈیوز اور ان فلموں تک کم عمر لڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورت حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز اسقاطِ حمل کی کثرت ہوگئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصاندہ ہے یا کم عمری کے جنسی

تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کردینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انھیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے ؛ تاکہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچاسکیں، اصل مسئلہ Child Marraige کا نہیں ؛ بلکہ Child Sex کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنا رہا ہے، پہلے اس کے سد باب کی کوشش کریں، مثلاً : امریکہ میں ۱۲ر سے ۱۷ر سال کے بچوں کی طرف سے دوسرے بچوں کے ساتھ جو جنسی زیادتی ۲۰۰۴ء میں ریکارڈ کی گئی ہے، وہ لڑکوں کی طرف سے ۱۲۴۵۰ اور لڑکیوں کی طرف سے ۹۷۹ ہے۔ (۱)

اگر چہ یہ امریکہ کے اعداد و شمار ہیں، ہندوستان کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوسکے ؛ لیکن اگر صحیح صورت حال سامنے آئے تو شاید ہندوستان کی صورت حال اس سے مختلف نہ ہو۔

حقیقی صورتِ حال

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جارہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصول روزگار کا بھی مسئلہ ہے ؛ اس لئے اس تلاش روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی، خود کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی، صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا

---

(1) Source: US Department of Justice, Federal Bereau of Investigation 2004.

جاسکتا؛ کیوں کہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں؛ اس لئے ایسے واقعات قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتے ہیں، اس کا اندازہ ۱۸ر سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں درج ذیل اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے :

1. 1981ء : 43,4
2. 1991ء : 35,3
3. 2001ء : 14,4
4. 2011ء : 3,7

صرف مسلم مسئلہ نہیں

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس کو مسلمانوں کے ایک سماجی مسئلہ کی نظر سے دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہیں، راجستھان میں اب بھی ''اکھا تیج'' کے موقع پر ہزاروں شیر خوار لڑکیوں کی شادی کردی جاتی ہے، راجستھان، مدھیہ پردیش، اُڑیسہ اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، مثلاً: ۲۰۱۱ء کے ایک سرکاری سروے رپورٹ کے مطابق ۱۰ر سال سے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کا تناسب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس طرح ہے :

ہندو لڑکے : 35,56 — مسلم لڑکے : 0,49

ہندو لڑکیاں : 6,65 — مسلمان لڑکیاں : 0,88

کم سنی کے نکاح زیادہ تر چوں کہ دیہاتوں میں ہوتے ہیں؛ اس لئے شہروں اور دیہاتوں کے اعتبار سے بھی اس کا تناسب ذکر کیا گیا ہے :

دیہی علاقہ : ہندو لڑکیاں : 50,34 فی لاکھ۔

	مسلمان لڑکیاں	:	2,62	فی لاکھ۔
	ہندو لڑکے	:	23,93	فی لاکھ۔
	مسلمان لڑکے	:	5,34	فی لاکھ۔
شہری علاقہ :	ہندو لڑکیاں	:	16,16	فی لاکھ۔
	مسلمان لڑکیاں	:	3,39	فی لاکھ۔
	ہندو لڑکے	:	11,67	فی لاکھ۔
	مسلمان لڑکے	:	2,29	فی لاکھ۔(۱)

اصل مسئلہ غلط رواجوں کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں اصل عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، مگر اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے اور لڑکی کو خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتے ہیں۔

ترغیب نہیں اجازت

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو :

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۔ (النساء:۶)

نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے؛ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) Source : Census of India/India Spend.

''ھو بلوغ حال النکاح من الاحتلام'' (۱) اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: ''أی صاروا محلالہ بالاحتلام'' (۲) یعنی نکاح کو پہنچے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کے اہل ہو جائیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں۔

پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے؛ کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے، خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح عمر بلوغ کو پہنچنے کے بعد ہی فرمایا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصل یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح ہو؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں۔

مصلحت کا تقاضا

یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، اس سلسلہ میں دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راستہ کھل جاتا ہے اور یہ بات اسے ناجائز رُخ پر لے جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ / سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحت جسمانی کے لئے بھی مضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں؛ کیوں کہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سماج ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا

(۱) احکام القرآن: ۲ / ۶۳۔　(۲) تفسیر جلالین: ۷۰۔

ہے، اسلام میں حفاظتِ اخلاق کی بڑی اہمیت ہے اور والدین بھی اس سلسلہ میں جواب دہ ہیں ؛ چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت کرے، پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا: ''فإنما إثمه على أبيه'' ۔(۱)

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لبِ گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے اُمید رکھی جاسکے کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کرسکیں گے اور مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں ؛ لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آ رہا ہے، تو ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اسی وقت اس کا نکاح کردیا جائے کہ اس میں اس کے لبِ گور سرپرست کے لئے سکونِ قلب بھی ہے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی اُمید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنھیں نظر انداز کردیا جائے ؛ اس لئے قانون ایسا بنانا چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں، یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں ؛ لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کردینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود و قیود جن کی اسلام میں رعایت کی گئی ہے، اگر ملحوظ ہوں تو کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جاسکتا ہے اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ اسلام میں بھی نابالغوں کے نکاح کی اجازت نہیں دی

(۱) شعب الایمان، حقوق الاولاد والأهلين، حدیث نمبر: ۸۲۹۹۔

گئی ہے، علماء اسلام نے اپنے طور پر اس طرح کی بات لکھ دی ہے؛ حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حالت نابالغی کے نکاح کا درست ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے، احادیث سے بھی اور اجماع اُمت سے بھی، نیز جب لڑکے اور لڑکیاں جسمانی طور پر بالغ ہوجائیں تو ان کا نکاح جلد کردینا چاہئے، اس کا حکم بھی قرآن وحدیث میں موجود ہے اور فقہاء اسلام نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

ایسے حضرات کی غلط فہمیاں دُور کرنے کے لئے نمبروار چند نکات تحریر کئے جاتے ہیں :

قرآن مجید

۱- نابالغی کی حالت میں نکاح کرنے کی اگرچہ قرآن مجید میں ترغیب نہیں دی گئی ہے؛ لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نکاح کرنا جائز ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ (الطلاق:۴)

جو عورتیں حیض کے آنے سے نا اُمید ہوگئی ہیں، تو اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور یہی ان عورتوں کی بھی عدت ہے، جن کو ابھی حیض آیا ہی نہ ہو۔

اس آیت میں طلاق کی عدت کا ذکر ہے اور طلاق اسی وقت واقع ہوتی ہے، جب پہلے نکاح ہو چکا ہو، تو معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکیاں جن کو ابھی حیض کا سلسلہ شروع بھی نہ ہوا ہو، ان کا بھی نکاح ہوسکتا ہے اور نکاح کے بعد وہ بھی طلاق سے دوچار ہوسکتی ہیں، اس کی مزید وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب مطلقہ عورتوں کی عدت کے تین حیض ہونے کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا تو حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت خلاد بن نعمانؓ اور بعض صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ جن عورتوں کو درازیٔ عمر یا نابالغی کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو، ان کی عدت کیا ہوگی؟ آیت میں ایسی ہی عورتوں کی عدت کا ذکر کیا گیا ہے، مشہور مفسر علامہ شہاب الدین آلوسیؒ نے

اسی بات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

وفی روایة أن قوما منهم أبی بن کعب وخلاد بن النعمان لما سمعوا قوله تعالیٰ : ''والمطلقات یتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء'' قالوا : یا رسول الله صلیٰ الله علیه وسلم فما عدة من لا قرء لها من صغر أو کبر ؟ فنزل : ''وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ'' المراد الصغار اللائی لم یبلغن سن الحیض ۔ (۱)

حدیثیں

۲- قرآن مجید کے علاوہ مختلف حدیثیں بھی نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کو بتلاتی ہیں، چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

● عن عائشة رضی الله عنها أن رسول الله صلی الله علیه وسلم تزوجها وهی بنت ست ، وبنی بها وهی بنت تسع ۔ (۲)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کیا، جب وہ چھ سال کی تھیں اور جب نو سال کی ہوئیں تو رخصتی ہوئی ۔

● عن الحسن قال ، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : اذا أنکح الرجل ابنه وهو کاره فلیس بنکاح ، و اذا زوجه وهو صغیر جاز نکاحه ۔ (۳)

(۱) روح المعانی، سورۂ طلاق: ۱۵/ ۲۰۲۔

(۲) مسلم، باب تزویج الأب البکر الصغیرة، حدیث نمبر: ۱۴۲۲، ابوداؤد، باب فی تزویج الصغار، حدیث نمبر: ۲۱۲۱، نسائی، باب انکاح الرجل ابنته الصغیرة، حدیث نمبر: ۳۲۵۵۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ، باب فی رجل یزوج ابنہ وہو صغیر، حدیث نمبر: ۱۶۰۱۰۔

حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کا نکاح کردے؛ حالاں کہ وہ اس پر راضی نہیں ہے، تو نکاح نہیں ہوا؛ البتہ اگر وہ نابالغ ہو تو نکاح جائز ہوگا۔

آثارِ صحابہ

۳- رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے اقوال وافعال کو شریعت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے؛ چنانچہ صحابہ کے عمل سے بھی نابالغی کا نکاح ثابت ہوتا ہے، شمس الائمہ ابوبکر سرخسیؒ (م: ۴۸۳ھ) نقل کرتے ہیں:

● فإن قدامة بن مظعون تزوج بنت الزبير يوم ولدت، وقال: إن مت فهي خير ورثتي، و إن عشت فهي بنت الزبير۔

حضرت قدامہ بن مظعونؓ نے حضرت زبیرؓ کی صاحبزادی سے ان کی پیدائش ہی کے دن نکاح کرلیا اور کہا کہ اگر میری موت ہوجائے تو وہ میری بہترین وارث ہے اور اگر میں زندہ رہوں تو وہ زبیر کی بیٹی ہے۔

● وزوج ابن عمر بنتا له صغيرة من عروة بن الزبير۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی نابالغہ لڑکی کا عروہ بن زبیر سے نکاح کردیا۔

● ووهب رجل ابنته الصغيرة من عبد الله بن الحسن فأجاز ذالک علی۔

ایک صاحب نے اپنی نابالغہ لڑکی عبداللہ بن حسن کے نکاح میں دی، حضرت علیؓ نے اس کو نافذ کردیا۔

● وزوجت امرأة ابن مسعود بنتا لها صغيرة ابنا للمسيب بن نخبة فأجاز ذالک عبد الله۔ (۱)

(۱) کتاب المبسوط: ۲۰۸/۴، باب نکاح الصغیر، الخ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی نے اپنی نابالغہ بیٹی کا نکاح مسیب بن نخبہ کے بیٹے سے کر دیا اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو نافذ قرار دیا۔

نیز علامہ نوویؒ نقل کرتے ہیں :

فصل : ويجوز لولى الصبى أن يزوجه اذا رأى ذالک ، لما روى : أن عمر زوج ابناله صغير ۔ (۱)

نابالغ بچے کے ولی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا نکاح کردے، اگر وہ اس کو مناسب سمجھتا ہو؛ کیوں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے نابالغ لڑکے کا نکاح کر دیا تھا۔

نیز حدیث کی معروف کتاب مصنف عبدالرزاق میں ہے :

عن الزهرى أن عروة بن الزبير أنكح ابنه صغيرا ابنة المصعب صغيرة ۔ (۲)

ابن شہاب زہریؒ سے مروی ہے کہ عروہ بن زبیرؓ نے اپنے نابالغ بیٹے کا نکاح مصعب کی نابالغ بیٹی سے کر دیا تھا۔

اجماعِ اُمت

۴- کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور آثارِ صحابہ کے بعد شریعت میں چوتھی اہم دلیل مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے؛ چنانچہ علامہ ابن منذرؒ کہتے ہیں :

أجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم ، أن نكاح الأب ابنته البكر الصغيرة جائزة ۔ (۳)

جن اہل علم کی رائیں ہم تک پہنچی ہیں ، ان سب کا اتفاق ہے کہ باپ کا اپنی نابالغہ کنواری لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے۔

(۱) شرح المہذب: ۱۷/۱۹۷، فصل فی تزویج الصبی۔
(۲) مصنف عبدالرزاق، کتاب النکاح: ۱۰۳۵۸۔
(۳) المغنی: ۹/۳۹۸، کتاب النکاح۔

نیز عصر حاضر کے ایک صاحب علم سعدی ابو جیب نے اجماعی احکام کو جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

أجمعوا على أن إنكاح الأب ابنه الصغير جائز ، وأن إجماع المسلمين على أن للأب أن يزوج ابنته الصغيرة ۔ (۱)

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ باپ اپنے نابالغ بیٹے کا نکاح کر سکتا ہے، اور اس پر بھی مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے۔

بلوغ کے بعد نکاح میں عجلت

۵- جب لڑکے یا لڑکیاں بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح جلد کر دینا چاہئے ؛ تاکہ وہ گناہ میں مبتلا نہ ہوں ؛ چنانچہ قرآن مجید میں بھی غیر شادی شدہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے: ''وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ'' (النور: ۳۲) اس کے علاوہ متعدد حدیثوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے؛ چنانچہ بعض احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں :

● لقد قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج ، فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج ۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا: اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو بیوی کے مالی حقوق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسے نکاح کر لینا چاہئے ؛ اس لئے کہ یہ نگاہوں کو پست رکھنے والا اور عصمت و عفت کا محافظ ہے۔

---

(۱) موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی: ۳/۱۱۸۵۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۳۳۹۸۔

● عن عمر بن الخطاب و أنس بن مالک عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : فی التوراة مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة ولم یزوجها فأصابت إثما ، فإثم ذالک ۔ (۱)

حضرت عمرؓ اور انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی، اس نے اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ کی مرتکب ہوئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔

● عن ابن عباس قال ، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : من ولد له ولد فلیحسن اسمه وأدبه فاذا بلغ فلیزوجه ، فإن بلغ ولم یزوجه فما أصاب إثما فإنما إثمه علی أبیه ۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بیٹا ہو، وہ اس کا اچھا نام رکھے اور بہتر تربیت کرے، پھر جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے، اگر بالغ ہو گیا اور اس کا نکاح نہیں کیا، پھر اس نے کوئی گناہ کیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر بھی ہوگا۔

غرض کہ بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد نکاح کرنے کا حکم ہے، فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ جب کسی لڑکے یا لڑکی میں صنف مخالف کی طرف شدید اشتیاق پیدا ہو جائے تو نکاح کر دینا فرض ہے؛ چنانچہ حنفی فقیہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں :

(وعند التوقان واجب) المراد به أن یخاف عنه

(۱) بیہقی فی شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد، حدیث نمبر:۸۶۶۹۔

(۲) بیہقی فی شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد والاہلین، حدیث نمبر:۸۲۹۹۔

الوقوع في الزنا لو لم يتزوج إذا لا يلزم من الاشتياق إلى الجماع الخوف المذكور ، وأراد بالواجب اللازم ، فليشمل الفرض والواجب الاصطلاحي ، فإنا قدمنا أنه فرض و واجب ۔ (۱)

(شدت اشتیاق کے وقت نکاح کرنا واجب ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ اگر نکاح نہ کرے تو زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ بھی ہو؛ کیوں کہ ہم بستری کی رغبت سے لازماً زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، اور واجب سے ''لازم'' ہونا مراد ہے؛ لہٰذا یہ فرض اور اصطلاحی واجب دونوں کو شامل ہے؛ چنانچہ ہم ذکر چکے ہیں کہ نکاح کبھی فرض بھی ہوتا ہے اور کبھی واجب بھی۔

یہی بات علامہ کاسانیؒ نے بدائع الصنائع : ۲/ ۴۹۸، کتاب النکاح میں اور علامہ حصکفیؒ وعلامہ شامیؒ نے الدر المختار مع رد المحتار: ۴/ ۶۳، کتاب النکاح میں تحریر کی ہے۔

اسی طرح علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں :

منهم من يخاف على الوقوع في محظور إن ترك النكاح ، فهذا يجب عليه النكاح في قول عامة الفقهاء ؛ لأنه يلزمه إعفاف نفسه وصونها عن الحرام ، وطريقه النكاح ۔ (۲)

جس کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں کسی ناجائز فعل میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، جمہور فقہاء کے قول کے مطابق اس کے لئے نکاح کرنا واجب ہے؛ کیوں کہ اپنے آپ کو پاکباز رکھنا اور حرام سے بچانا واجب ہے اور اس کی صورت نکاح ہے۔

---

(۱) البحر الرائق: ۳/ ۱۴۲، کتاب النکاح۔

(۲) المغنی: ۹/ ۳۴۰-۳۴۱، کتاب النکاح۔

اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آغاز شباب میں جذبات کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور ایسے موقع پر نکاح سے روک دینا گناہ کی طرف قدم بڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث

حاصل یہ ہے کہ اسلام نے کم سنی میں لڑکے یا لڑکی کے نکاح کی ترغیب نہیں دی ہے؛ البتہ اس سے منع بھی نہیں کیا ہے اور اس کی گنجائش رکھی ہے، جس کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہے، حدیث سے بھی ہے، آثارِ صحابہ سے بھی اور اس پر اُمت کا اجماع واتفاق بھی ہے، نیز یہ حکم بعض مصالح پر مبنی ہے۔

البتہ بالغ ہونے کے بعد تاکید کے ساتھ نکاح میں عجلت کا حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس سے اخلاقی اقدار کا تحفظ متعلق ہے اور نکاح میں ضرورت کے باوجود تاخیر سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو ایک پاکیزہ سماج کے لئے ہرگز مناسب نہیں، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں کم سنی کی شادی کا رواج بمقابلہ برادرانِ وطن کے بہت کم ہے اور خیار بلوغ کے ذریعہ اس کی تلافی کی گنجائش موجود ہے۔



تعدد ازدواج کا مسئلہ

تعدد ازدواج Poly Gamy کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے، جو آزادی نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیر بحث رہا ہے اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہل مغرب کی طرف سے جو بے جا اور نا منصفانہ فرد جرم عائد کی جاتی رہی ہے، اس میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے کہ وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو، اس کو درست سمجھنے لگتا ہے؛ چنانچہ تعدد ازدواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں شک وتذبذب میں مبتلا ہیں اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے، وہ بے چارے تو اس مسئلہ پر اتنے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرق ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں تک پہنچ جاتا ہو؛ اس لئے اس مسئلہ پر حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعدد ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے، مذہبی، سماجی اور اخلاقی۔

ہندو مذہب

مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر مالک رام نے رگ وید (۱۰:۱۰۸-۱۰۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست ہے اور بیویوں کی کوئی تحدید نہیں ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بکثرت ایک سے زیادہ نکاح کا ذکر ملتا ہے، جیسے :

- Apastamba میں ہے :

اگر شوہر کے پاس ایک بیوی ہے، جو اپنی مذہبی ذمہ داریوں کو پورا

کرنے کی خواہش مند ہو اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہل بھی ہو اور جولڑکے جَن سکتی ہو تو اس صورت میں شوہر دوسری بیوی نہیں رکھ سکتا؛ لیکن اگر کسی کی بیوی ان دونوں صلاحیتوں میں کسی ایک سے محروم ہے تو اس حالت میں اس شوہر کے لئے دوسری بیوی رکھنا جائز ہے؛ لیکن قبل اس کے وہ اگنی ہوتر کی آگ روشن کرے۔

● Devala میں ہے:

شودر کے لئے صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے، ویش کے لئے دو، چھتری کے لئے تین، برہمن کے لئے چار؛ لیکن بادشاہ کے لئے جتنی چاہے اتنی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔

● Gautama میں ہے:

برہمن کے لئے تین، چھتری کے لئے دو، ویش اور شودر کے لئے صرف ایک رکھنے کی اجازت ہے، اگر کسی عورت کا شوہر غائب ہو جائے تو اس کو چھ سال انتظار کرنا چاہئے، اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس کو اپنے شوہر کے پاس چلے جانا چاہئے۔(۱)

● مہابھارت میں ہے:

اس دنیا میں ظاہر ہوئے بھگوان واسودیو کی سولہ ہزار ایک سو ایک رانیاں ہوئیں، ان میں رکمنی، ستیہ بھاماں، جاموتی، چاروہاسی وغیرہ آٹھ رانیاں مشہور ہوئیں۔(۲)

رکمنی کے علاوہ شری کرشن کی جو سات رانیاں تھیں، ان کے نام کالندی، متراوندا،

---

(۱) The Institution of Pologamy in Modem India and the Contemporary Islamic World, Faculty of Law, Delhi University P.G : 119.

(۲) مہابھارت انش: ۴-۱۵۔

ستیا، کام روپڑی، جامووتی، روانی، مدراجتا بھدرا، استراجت ستا، ستیہ بھا ماں ہے اور خوبصورت ہاس والی لکشمن بہت خوبصورت تھی، ان کے علاوہ شری کرشن کی سولہ ہزار رانیاں تھیں۔(۱)

- Taittirya Sanhita میں ہے:

ایک مرد دو بیویاں رکھ سکتا ہے، جیسے کہ یگیہ میں لکڑی کے ایک ٹکڑے میں دو ڈوریاں ہوسکتی ہیں؛ لیکن کوئی عورت دو شوہر نہیں رکھ سکتی، جیسے کہ یگیہ میں لکڑی کے ٹکڑوں کے لئے ایک ڈوری نہیں ہوسکتی۔

- Baudhayana میں ہے:

ایک شوہر ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکتا ہے، اگر پہلی بیوی بدزبان ہو۔

- Devala میں ہے:

شودر کے لئے صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے، ویش کے لئے دو، چھتری کے لئے تین، برہمن کے لئے چار؛ لیکن بادشاہ کے لئے جتنی چاہے اتنی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔

- Gautama میں ہے:

برہمن کے لئے تین، چھتری کے لئے دو، ویش اور شودر کے لئے ایک۔

- Vishnu میں ہے:

اب ذاتوں کی مباشرتاً ترتیب کے مطابق ایک برہمن چار بیویاں، چھتری تین، ویش دو اور شودر ایک ہی بیوی رکھ سکتا ہے، اگر ایک

---

(۱) مہابھارت انش:۵-۲۸۔

مرد کی بہت سی بیویاں اپنی ہی قوم کی ہوں تو وہ اپنے مذہبی فرائض کو سب سے بڑی یا سب سے پہلی شادی کے بندھن میں بندھنے والی بیوی کے ساتھ ادا کرے"۔

شری رام چندر کے والد مہاراجہ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں: کوشلیا، جو رام چندر جی کی والدہ ہیں، سمترا، جو لکشمن کی والدہ ہیں، اور کیکئی جو بھرت کی والدہ ہیں۔

اسی طرح راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں، ایک: کنتی، جن کی اولاد میں سے ارجن ہیں، اور مادری، جن کی اولاد میں سہدیو ہیں۔(۱)

فرانسیسی مؤرخ گستاؤلی بان لکھتے ہیں :

مثل ہندوستان کے اور خطوں کے راجپوتانہ میں بھی کثرت ازدواج کی رسم موجود ہے؛ لیکن راجپوتوں میں ہمیشہ ایک بڑی بیوی رہتی ہے اور پرانے زمانے میں بھی بیوی اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جلائی جاتی تھی، بعض اوقات بیویوں میں آپس میں جھگڑا ہوتا تھا کہ کون ان میں سے اپنے شوہر کے ساتھ جلنے کی عزت حاصل کرے، بادشاہوں کے لئے یہ رسم تھی کہ ان کی کل بیویاں ان کی لاش کے ساتھ جلائی جاتی تھیں، اس وقت تک اودے پور میں سنگرام سنگھ اور اس کی اکیس رانیوں کا مقبرہ موجود ہے، جو ۱۷۳۳ء میں راجہ کے ساتھ جلی تھیں۔(۲)

ہندو مذہب میں تعدد ازدواج کے موضوع پر جناب حافظ محمد شارق صاحب کی تحریر بڑی چشم کشا ہے، وہ لکھتے ہیں :

---

(۱) رحمۃ للعالمین: ۲/۱۲۸، ہندو مذہب سے متعلق بیشتر معلومات ڈاکٹر شائستہ پروین کی تالیف: "ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج" سے ماخوذ ہے۔

(۲) تمدن ہند: ۲۹۹۔

''ہندو دھرم میں کثرت ازدواج کے متعلق کیا قانون ہے؟ اس بارے میں ہندوؤں کے ہاں آریہ سماج اور دیگر روایت پسند ہندوؤں کے مابین اختلاف ہے، آریہ سماج والوں کا خیال ہے کہ ہندومت میں وید کی رُو سے ایک سے زائد شادی کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ روایت پسند ہندو ایک سے زیادہ شادیوں کے قائل ہیں، آریہ سماج اپنے موقف کے لئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ وید کے منتروں میں شوہر اور بیوی کے لئے واحد کا صیغہ ہی آیا ہے، اس لئے ہندو مت میں ایک سے زائد بیوی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے؛ لیکن روایت پسند ہندوؤں کے نزدیک یہ دلیل خود ویدک گرامر کی رُو سے مضبوط نہیں ہے؛ کیوں کہ وید کے منتروں میں تذکیر وتانیث اور ضمائر کے کوئی واضح اُصول نہیں ہیں، مثلاً خود آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (d.1883) اپنی کتاب ''رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا'' میں ایک منتروں کے تحت لکھتے ہیں :

اس میں (کاٹتا ہے) واحد آیا ہے جو کہ دراصل جمع ہونا چاہئے تھا۔

چند صفحوں بعد وہ پھر لکھتے ہیں :

اس مثال میں اسم فاعل جمع کی علامت کی جگہ اسم فاعل واحد کی علامت آئی ہے۔

چنانچہ اس طرح ان کی بھومکا میں منتروں کے تحت اس قسم کی باتیں مل جاتیں ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وید کا لچک دار گرامر کوئی مذہبی حکم اخذ کرنے کے لئے ناقابل اعتبار ہے؛ لہٰذا جب وید کی گرامر کا حال یہ ہو تو پھر ایسی دلیل دینا یقیناً کوئی معقول بات نہیں ہے، گرامر کے علاوہ آریہ سماج وید کے دو منتر بھی پیش کرتے ہیں، جن میں ایک سے زائد شادی کے متعلق نفی ہے :

دو عورتوں والے مرد کا ویسا ہی حال ہوتا ہے، جیسے دوڑتے ہوئے رتھ میں بندھے دو گھوڑوں کا ہوتا ہے۔(۱)

اسی طرح اتھروید، کانڈ ۳، سکت ۱۸ کا موضوع وہ منتر ہیں جس میں ایک عورت اپنی

(۱) رگ وید، منڈل: ۱۰، سکت: ۱۰۱، منتر: ۱۰۱۔

سوکن کے خلاف جادو یا دُعاء کرتی ہے، آریہ سماج کے نزدیک سوکن کے خلاف ان دُعاؤں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وید میں ایک سے زائد شادی کرنا اچھی بات نہیں سمجھی گئی ہے، ان منتروں کے جواب میں روایت پسند ہندو کہتے ہیں کہ ان منتروں میں واضح طور پر ایک سے زائد شادی ممنوع نہیں ہے، ممکن ہے یہ منتر اس سُکت (نظم) کے لکھنے والے رشی کے ذاتی خیالات ہوں؛ کیوں کہ ہمیں کئی ایسی روایات اور منتر ملتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں ایک سے زائد شادی ممنوع نہیں ہے، مثلاً :

> یجر وید ادھیائے ۳۲، منتر: ۲۲، میں ہے کہ شری اور لکشمی تمہاری بیویاں ہیں۔

رگ وید، منڈل: ۱، سکت: ۶۲، منتر: ۱۱ میں دیوتا کی حمد وثناء کے لئے کہا گیا ہے :

> جیسے محبت کرنے والی بیویاں اپنے خاوند کو خوش کرتی ہیں، ویسے ہی آپ کے لئے کی گئی تعریفیں آپ کو خوش کرتی ہیں۔

رگ وید، منڈل: ۷، سُکت: ۱۸، منتر: ۲ میں لکھا ہے :

> جس طرح رانیوں کے درمیان راجہ رہتا ہے، اسی طرح آپ اپنی تابنا کیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

اسی منڈل کے سُکت: ۲۶، منتر: ۳ میں لکھا ہے :

> اندر دیوتا دشمنوں کے شہروں کو اپنے قبضے میں ایسے ہی کرتے ہیں، جیسے خاوند اپنی بیویوں کو۔

اس کے علاوہ یجر وید کی مستند تفسیر ستپتھ برہمن کانڈ: ۹، ادھیائے: ۴، برہمن: ۱، کنڈ: ۶ میں ہے :

> پہلے یگیہ میں ایک دیوتا کو نذر چڑھائی جاتی ہے اور پھر کئی دیویوں کو؛ کیوں کہ ایک مرد کی کئی بیویاں ہوتی ہیں۔

وید کے کے علاوہ سمرتی ادب میں شامل منودھرم شاستر میں بھی ایک سے زائد بیویوں کا ذکر ملتا ہے۔

ادھیائے: ۷، اشلوک: ۲۲۱، میں حکم ہے کہ ”راجہ کھانا کھا کر بیویوں کے ساتھ محل میں بہار کرے“۔

ادھیائے: ۹، اشلوک، ۱۴۹، کا موضوع یہ ہے کہ اگر ایک برہمن کی چار بیویاں ہوں تو ان سے پیدا ہونے والے بچوں میں وراثت کیسے تقسیم کی جائے۔

ادھیائے: ۳، اشلوک: ۱۲، اور ۱۳ میں بھی ایک سے زائد بیویوں کا ذکر ہے۔

ادھیائے: ۹، اشلوک: ۱۸۳ میں بھی منو جی کہتے ہیں کہ: ”اگر ایک آدمی کی چار پانچ عورتیں ہوں اور ان میں سے ایک صاحب اولاد ہو تو باقی سب بھی صاحب اولاد ہوں گی“۔

مزید برآں رزمیہ ادب جن سے ایک ہندو اپنی زندگی میں رہنمائی حاصل کرتا ہے، انھیں دیکھیں تو وہاں بھی ایک سے زائد بیویوں کا کئی جگہ ذکر ملتا ہے، ان روایتوں میں کئی کردار ایسے گزرے ہیں، جن کی ایک سے زائد بیویاں تھیں؛ بلکہ ایک سے زائد شوہر کا بھی ذکر ہے، گیتا کے مرکزی کردار شری کرشن کی آٹھ بیویاں تھیں، جن میں رکمنی، کلندی، متر ورندا، نگر جتی، ستیہ بھاما، لکشانا، جمبوتی اور بھندرا ہیں، اس کے علاوہ مہا بھارت انوساشن پرو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ۱۶۱۰۰ رانیاں اور بھی تھیں جنھیں کرشن نے نرکسر نامی شخص کی قید سے آزاد کیا تھا، کرشن کے والد کی ۱۶ بیویاں تھیں، ایک مشہور رشی کشیپ کی بھی ۱۳ بیویاں تھی، راماین کے مطابق ایودھیا کے بادشاہ ساگر کی دو بیویاں کیسینی اور سومتی تھی، اس کے علاوہ ایک سے زائد بیویوں کا ذکر ویدوں کے علاوہ بھاگوت مہا پران، وشنو پران اور مہا بھارت میں بھی بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے، قرونِ وسطیٰ میں لکھی گئی وشنو سمرتی کے مطابق ذاتوں کے مطابق برہمن کے لئے چار، کشتری کے لئے تین، ویش کے لئے دو اور شودر کے لئے صرف ایک بیوی کی اجازت ہے، روایت پسند ہندوؤں کے مطابق ہندو دھرم میں کثرت ازواج کی ممانعت کہیں نہیں ہے؛ بلکہ یہ بزرگوں کا عمل رہا ہے اور اس کی واضح طور پر اجازت دی گئی ہے، مثلاً: برہمن چار بیویاں رکھ سکتا ہے“۔(۱)

(۱) مہا بھارت، انوساشن پرو، باب: ۴۸، از: ہندومت، ایک تجزیاتی مطالعہ: ۲۲۱ تا ۲۲۴۔

یہودیت میں

یہودی مذہب میں بھی تعدد ازواج کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی نسل سے بنی اسرائیل بھی ہیں اور بنو اسماعیل یعنی عرب بھی، تورات میں ان کی تین بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ایک: حضرت سارہ (۱)، دوسرے: حضرت ہاجرہ، جن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے (۲)، تیسرے: حضرت قطورہ۔ (۳)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھی چار بیویوں کا ذکر تورات میں ملتا ہے: ''لیاہ اور ان کی کنیز زلفہ اور راخل اور ان کی کنیز بلہاہ''۔ (۴)

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں: ایک حضرت صفورہ جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں، (۵) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوشی خاتون سے ہوا تھا، (۶) بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی چھ بیویوں، اجینوعم (Ahinoam)، معکہ (Maachah)، ابیجیل (Abigail)، ابیطال (Abital)، میکل بنت ساؤل (Michal)، حجیت (Haggith) کا ذکر آیا ہے۔ (۷)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ ان کی سات سو بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ (۸)

عیسائیت میں

عیسائی مذہب چوں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے؛ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلاً عیسائی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت ہے؛ چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہل کلیسا نے تعدد ازدواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) پیدائش: ۱۱: ۲۹۔
(۲) پیدائش: ۳۵: ۱، ۲۔
(۳) پیدائش: ۳۵: ۱، ۲۔
(۴) پیدائش: ۲۹، ۳۰۔
(۵) خروج: ۲: ۲۱۔
(۶) گنتی: ۱۲: ۱۔
(۷) گنتی: ۲۷: ۸۔
(۸) سلاطین: ۱: ۱۱: ۳۔

مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کے مستند عالم وسٹر مارک (Vister Marc) نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدد ازدواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا۔(۱)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انجیل میں اس کا کہیں اشارہ موجود نہیں ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن تمثیل کے انداز میں ایک دولہا کے لئے دس کنواریوں کا ذکر ملتا ہے؛ چنانچہ انجیل متی میں ہے :

اس وقت آسمان کی بادشاہت ان دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنی اپنی مشعلیں لے کر دولہا کے استقبال کے لئے نکلیں۔(۲)

اگر چہ کہ کلیسا شروع میں تعدد ازدواج کا مخالف تھا؛ لیکن بہ قول مالک رام :

آخر کلیسا کو ہار ماننا پڑی، ۱۶۵۰ء میں جرمنی کے شہر نورمبرگ میں عیسائی علماء کی کانفرنس ہوئی اور یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہر شخص کو دو بیویوں سے نکاح کر لینے کی عام اجازت ہے۔(۳)

اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ نگار کا یہ تبصرہ بھی قابل توجہ ہے :

تعدد ازواج مسیحی یورپ میں بھی پایا گیا ہے، ان ملکوں میں جہاں بت پرستی کے دور میں تعدد ازواج کا رواج تھا، مسیحی فرمانرواؤں کی طرف سے تعدد ازواج کی راہ میں موانع حائل کئے گئے، چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں آئرلینڈ کے فرمانروا ڈائرمیٹ کی دو ملکہ اور دو داشتائیں تھیں، شارلمین کی دو بیویاں اور دو داشتائیں تھیں

---

(۱) الفلسفۃ القرآنیۃ: ۵۴۔

(۲) انجیل متی: ۱۵:۱۔

(۳) اسلامیات: ۱۱۶، مطبوعہ: جامعہ بک ڈپو دہلی۔

اور اس کے ایک قانون سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازواج کا رواج
پادریوں میں بھی غیر معروف نہ تھا، بعد کے زمانوں میں حسا کے
فلپ اور پروشیا کے فریڈرک ولیم دوم نے لوتھر کو ماننے والے
پادریوں کی اجازت سے ایک سے زائد شادیاں کیں۔(۱)

عرب جاہلیت میں

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو، جس نے تعدد ازواج کو جائز نہ رکھا ہو، اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی غیر محدود تعدد ازواج کی اجازت تھی، غیلان ثقفیؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ چار بیویاں رکھو اور بقیہ کو علاحدہ کردو: ''أمسک أربعا وفارق سائرھن''۔(۲)

اسی طرح نوفل بن معاویہؓ جب مسلمان ہوئے تو ان کی پانچ بیویاں تھیں، آپ ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ چار بیویاں رکھیں اور باقی کو علاحدہ کردیں، (۳) اسی طرح ابوداؤد میں حارث بن قیسؓ سے روایت ہے کہ میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے چار کو رکھو اور چار کو چھوڑ دو: ''اختر منھن أربعاً''۔(۴)

غرض کہ تعدد ازدواج کا رواج قانونی یا رواجی صورت میں تقریباً تمام ہی اقوام اور تہذیبوں میں رہا ہے، اسی لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

ایک دستور کی حیثیت سے تعددِ ازواج دنیا کے تمام علاقوں میں پایا
جاتا ہے، قدیم قبائل میں ایسے قبائل بہت کم ہیں، جن کے بارے

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا: ۱۸۶/۴، بحوالہ: قرآن مجید اور عصر حاضر: ۲۶۷۔
(۲) صحیح ابن حبان، عن ابن عمرؓ، باب نکاح الکفار، حدیث نمبر: ۴۱۵۷۔
(۳) مفاتیح الغیب: ۵/ ۴۲۲، تفسیر سورۂ نساء: ۳۔
(۴) سنن ابی داؤد، باب فی من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع الخ، حدیث نمبر: ۲۲۴۱، عن وہب الأسدی۔

میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں مرد کو استطاعت ہوتے ہوئے ایک
سے زائد رشتۂ ازواج کی اجازت نہیں دی گئی، تعددِ ازواج یا داشتہ
عورتیں رکھنے کی رسم جسے اصل تعددِ ازواج سے بہ مشکل ہی ممتاز
سمجھا جاتا ہے، قدیم تہذیب کے اکثر لوگوں میں پائی گئی ہے، چین
میں قانونی خاص بیوی کے علاوہ کچھ اور عورتیں بھی بیویاں کہلائی
جاتی تھیں، جو خوش اخلاقی کے تحت رکھ لی جاتی تھیں، یا قانونی
داشتائیں ہوتی تھیں، جاپان میں چینی ٹائپ کی داشتہ عورتیں رکھنے کا
رواج ایک قانونی نظام کی حیثیت سے ۱۸۸۰ھ تک موجود تھا۔(۱)

اسلامی تصور

اسلام نے بھی تعدداز دواج کی اجازت دی ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں تین باتیں قابل توجہ ہیں :

اول یہ کہ اسلام نے صرف اس کی اجازت دی ہے، ترغیب نہیں دی ہے، اس کو جائز تو ٹھہرایا گیا ہے؛ لیکن مستحب قرار نہیں دیا گیا ہے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں غزوات اور ان کی وجہ سے بیواؤں اور یتیموں کی کثرت کی بناء پر صحابہ کی بڑی تعداد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتی تھی، خود رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت واشاعت اور یتیموں اور بیواؤں کی کفالت جیسی مصلحتوں کی بنا پر کئی نکاح فرمائے؛ لیکن فقہاء اسلام نے اسی بات کو بہتر قرار دیا ہے کہ ایک ہی بیوی پر کتفا کیا جائے؛ چنانچہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ (۵۳۰-۵۹۳ھ) فرماتے ہیں :

رجل له امرأة فأراد أن يتزوج عليها أخرى إن خاف
أن لا يعدل بينهما لا يسعه أن يتزوج ، وإن علم
أن يعدل بينهما فهو فى سعة ، و إن لم يفعل ذلك

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا: ۱۸۶/۴۔

فهو مأجور ؛ لأنه ترک إدخال الغم علی امرأته ، وکذا المرأة إذا أرادت أن یتزوجها علی امرأة أخری ، وسعها ذلک وإن ترکت تثاب علیه۔ (۱)

کسی شخص کی بیوی ہو اور وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا چاہے تو اگر اس کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں کے درمیان عدل نہیں کر سکے گا تو اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر یقین ہو کہ وہ ان کے درمیان عدل کر سکے گا تو اس کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش ہے؛ تاہم اگر اس کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرے تو اجر کا مستحق ہوگا؛ اس لئے کہ وہ اپنی بیوی کو رنج واندوہ سے دوچار کرنے سے باز رہا ہے، اسی طرح اگر کوئی عورت پہلے سے موجود بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے جائز ہے؛ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کو اجر وثواب حاصل ہوگا۔

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے :

و إذا کانت له امرأة وأراد أن یتزوج علیها أخری ، وخاف أن لا یعدل بینهما لا یسعه ذلک ، و إن کان لا یخاف وسعه ذلک ، والامتناع أولیٰ ویؤجر بترک إدخال الغم علیها۔ (۲)

کسی کی ایک بیوی موجود ہو، وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہو اور اندیشہ ہو کہ ان دونوں کے درمیان عدل نہیں کر سکے گا، تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر اس کا اندیشہ نہ ہو تو دوسری شادی کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن نہ کرنا

---

(۱) مختارات النوازل: ۲/۸۴۔ (۲) الہندیہ: ۱/۳۴۱۔

بہتر ہے، اور اگر نہ کرے تو پہلی بیوی کو غم سے دو چار نہ کرنے کا اجر
اسے حاصل ہوگا۔

اسی طرح فقہ حنفی کی ایک اور کتاب میں لکھا ہے :

وقالوا : إذا ترک أن يتزوج خوف أن يدخل الغم
على زوجته التي كانت عنده كان ماجورا ۔ (۱)

فقہاء نے کہا ہے کہ اگر پہلی بیوی کو رنج پہنچنے کے غم سے دوسرا نکاح
نہ کرے تو یہ اس کے لئے باعث ثواب ہوگا۔

یہی نقطۂ نظر فقہاء شوافع کا ہے :

قال الشافعي : وأحب له أن يقتصر على واحدة و إن
أبيح له أكثر : لقوله تعالى : فإن خفتم ألا تعدلوا
فواحدة الخ ۔ (۲)

امام شافعیؒ نے فرمایا: میرے نزدیک مستحب یہ ہے کہ ایک ہی بیوی
پر اکتفا کرے، اگر چہ کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا بھی جائز ہے؛
کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ
کر سکو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

فقہ شافعی کی ایک اور اہم متداول کتاب میں لکھا گیا ہے :

ويحرم على الحر أن يجمع بين أكثر من أربع
والأولى الاقتصار على واحدة ۔ (۳)

آزاد مرد کے لئے بیک وقت چار سے زیادہ عورتوں کو جمع کرنا حرام
ہے اور بہتر ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔

---

(۱) حاشیۃ الشلبی علی تبیین الحقائق: ۲/ ۱۱۲۔

(۲) البیان فی مذہب الامام الشافعی، کتاب النفقات: ۱۱/ ۱۹۰۔

(۳) عمدۃ السالک وعدۃ الناسک: ۱/ ۲۰۵۔

فقہاء حنابلہ نے بھی یہی لکھا ہے :

قال المرداوی الحنبلی : ویستحب أیضاً : أن لا یزید علی واحدة ، إن حصل بها الإعفاف ، علی الصحیح من المذهب ، قال ابن خطیب السلامیة : جمهور الأصحاب استحبوا أن لا یزید علی واحدة ۔ (۱)

علامہ مرداوی حنبلیؒ کہتے ہیں کہ مذاہب کا قول صحیح یہی ہے کہ اگر ایک بیوی عفت و پاکدامنی کے لئے کافی ہو جائے تو ایک سے زیادہ نکاح نہ کرے، نیز علامہ ابن خطیب سلامیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور حنابلہ نے اسی بات کو بہتر قرار دیا ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح نہ کیا جائے۔

فقہ حنبلی کی ایک اور اہم کتاب کشاف القناع میں لکھا ہے :

ویستحب أن لا یزید علی واحدة إن حصل بها الإعفاف ؛ لما فیه من التعرض للمحرم ۔ (۲)

اگر ایک بیوی سے پاکدامنی حاصل ہو جائے تو مستحب ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح نہ کیا جائے ؛ اس لئے کہ اس میں اپنے آپ کو حرام (یعنی ناانصافی) کی طرف لے جانا ہے۔

اسی طرح کی صراحتیں مختلف کتابوں میں منقول ہیں۔ (۳)

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے بیویوں کی تعداد کی توسیع نہیں کی ہے ؛ بلکہ اس کو محدود کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دی ہے :

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۔ (النساء:۳)

---

(۱) الانصاف: ۱۲ / ۲۰۳۔ (۲) کشاف القناع: ۱۱ / ۱۳۸۔

(۳) دیکھئے: النجم الوہاج فی شرح المنہاج: ۷ / ۱۰، مغنی المحتاج: ۴ / ۲۰۷، شرح المہذب: ۱۶ / ۱۳۷، التنبیہ فی فقہ الشافعی: ۱ / ۱۸۷ وغیرہ۔

تمہیں جو عورتیں پسند ہوں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار
سے نکاح کر سکتے ہو اور اگر اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر
ایک ہی پر اکتفا کرو۔

غرض کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

تیسرے: یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گزر چکا ہے: "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً" (نساء:۳) "اور اگر اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفاء کرو"۔

جو شخص دو بیویوں کے درمیان عدل نہ کرے، اس کے لئے بڑی وعید ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إذا كانت عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما
جاء يوم القيامة وشقه ساقط۔ (۱)

اگر مرد کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ
کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ ایک پہلو جھکا
ہوا (یعنی مفلوج) ہوگا۔

چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر انصاف قائم کرنے کی اُمید نہ ہو تو دوسرا نکاح کرنا جائز نہیں، اوپر ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنے کے سلسلے میں فقہاء کی جو صراحتیں گزری ہیں، ان سب سے میں جہاں ایک نکاح کو مستحب قرار دیا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ حکم اس شخص کے حق میں ہے، جس کو اُمید ہو کہ اگر اس نے دوسرا نکاح کیا تو دونوں کے درمیان برابری کا سلوک کر سکے گا، جس کو یہ اُمید نہیں ہو، اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا دیانتاً جائز نہیں ہے، نیز اگر کسی شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں کے درمیان عدل سے کام نہ لے تو جس کے ساتھ ناانصافی کی جائے، وہ عدالت سے برابری کے سلوک کا بھی مطالبہ کر سکتی ہے اور اگر شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو تو فسخ نکاح کا بھی دعویٰ کر سکتی ہے۔

(۱) المستدرک للحاکم، کتاب النکاح، حدیث نمبر:۲۷۵۹۔

سماجی ضرورت

دوسرا پہلو سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا؛ لیکن شرح اموات میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ زیادہ تر حادثات میں مردوں کی ہی جانیں کام میں آتی ہیں، مثلاً: پہلی جنگ عظیم —— جو ۲۸/جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۱/نومبر 1918ء تک جاری رہی —— میں ایک کروڑ ۸/لاکھ، ۲۴/ہزار ۲۳۶ کے قریب تو صرف فوجی مارے گئے، اور ۲/کروڑ ۶ ۳/لاکھ ۶۵/ہزار، ۸۷۳ زخمی ہوئے، عام شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، (۱) ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ عظیم —— ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی —— میں کل ساڑھے آٹھ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے، معذور ہونے والے ان کے علاوہ ہیں، ان مہلوکین اور معذورین میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، ان جنگوں میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا؛ چنانچہ اس کے بعد عرصہ تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے مقابلہ شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ، ۲۳/ہزار، ۷۰۹ زیادہ تھی، اور آسٹریا میں ۱۸۹۰ء میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار سو، چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۷۹ء-۱۹۸۸ء) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہو گئیں اور اب تک عراق کے بدقسمت مہلوکین کی تعداد ۱۰/لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے، بڑی طاقتوں نے ایک سازش کے طور پر شام پر جو جنگ مسلط کی ہے، اس میں بھی اب تک ۵/لاکھ لوگوں کی جانیں جا چکی ہیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے ٹریفک یا صنعتی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ ہلاک ہوتے ہیں، ان میں بھی عام طور پر مرد ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

مثلاً امریکہ میں ٹریفک نظام کے استحکام اور لوگوں میں نسبتاً زیادہ شعور پائے جانے کی وجہ سے ٹریفک حادثات کم ہوتے ہیں؛ لیکن وہاں گذشتہ پانچ سال کے ٹریفک حادثات میں

---

(۱) وکی پیڈیا، ورلڈ وار: ۱۔

مرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد اس طرح ہے :

نمبر شمار	سال	تعداد مرد	تعداد عورتیں
1.	2011ء	مرد : 22,937	عورت : 9534
2.	2012ء	مرد : 23,961	عورت : 9809
3.	2013ء	مرد : 23,243	عورت : 9638
4.	2014ء	مرد : 23,266	عورت : 9463
5.	2015ء	مرد : 24,899	عورت : 10166 (۱)

پھر اگر جیلوں میں قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی بڑی تعداد مردوں کی ہوتی ہے، مثلاً : ہندوستان میں ۲۰۱۵ء میں وزارت اُمورِ داخلہ کی اطلاع کے مطابق کل چار لاکھ انیس ہزار چھ سو تین قیدی تھے، جن کا تناسب مجموعی اعتبار سے 33 فی ایک لاکھ ہوتا ہے، ان قیدیوں میں خواتین 4.3 تھیں اور بقیہ مرد تھے۔

بالخصوص طویل المدت قیدیوں کی بڑی تعداد مردوں پر مشتمل ہوتی ہے، (United Nation Figures) کیوں کہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے اور دفاعی ٹکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ میں اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بھی بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریباً اسی لاکھ زیادہ تھی۔

اسی طرح مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کی تعداد میں فرق واقع ہوتا رہا ہے اور اکثر اوقات عورتوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر درج ذیل نقشہ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے :

---

(۱) Source:US Department of Transportations Fatality Analysis Posted System.

نمبر شمار	ملک	مرد	عورت
1.	آسٹریا	47.07	52.93
2.	برما	48.81	51.19
3.	جرمنی	48.02	51.89
4.	فرانس	48.99	51.501
5.	اٹلی	48.89	51.11
6.	پولینڈ	48.61	51.39
7.	اسپین	48.94	51.06
8.	سوئزرلینڈ	48.67	51.33
9.	سوویت یونین	46.59	53.03
10.	برطانیہ	48.58	51.42 (۱)

اس میں شبہ نہیں کہ بعض ممالک میں آبادی کا تناسب اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہاں از خود لوگ یک زوجگی پر مجبور ہوں گے اور تعدد ازدواج کی نوبت کم سے کم پیش آئے گی؛ لیکن عورتوں کی شرح آبادی بڑھی ہوئی ہو اور وہاں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے؛ اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں؛ بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

اخلاقی پہلو

تعدد ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر ومادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان میں بھی ہے

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، بحوالہ: خاتون اسلام، تالیف: مولانا وحید الدین خان: ۲۷۴۔

اور دوسرے حیوانات میں بھی؛ لیکن یہ انسانی سماج کا امتیاز ہے کہ نکاح کے ذریعہ ایک مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہوجاتی ہیں، دوسری مخلوقات اس وفاداری سے ناآشنا ہیں، اسی وفاداری کا نام ''عفت وعصمت'' ہے، عفت وعصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کرسکتا، تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے، وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے، قدیم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی، ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء-۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی؛ لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں تھی۔(۱)

چنانچہ منصف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، علم تمدن کے معروف عالم ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں :

> مغرب میں بھی ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے، اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کس امر میں مغربیوں کے ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے۔(۲)

جناب مالک رام، ملک کے حقیقت پسند اصحابِ دانش میں تھے، ان کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے :

---

(۱) تاریخ اخلاق یورپ:۲۴۰، ترجمہ دریابادی۔ (۲) تمدن عرب:۳۶۶۔

> تعدد ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً یہ کہ عام حالت میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، اگر ایک مرد، ایک عورت کے اُصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں، اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انھیں قعر مذلت میں ڈھکیل رہے ہیں اور انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں؛ کیوں کہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت سماج کی اجازت سے اس جذبہ کی تسکین نہیں کر سکے گی تو سماج کو دھتا بتائے گی اور گھونگھٹ کی اوٹ میں شکار کھیلے گی، اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانوناً تسلیم کرنا پڑے گا، حق انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قابل عزت بیوی اور گھر کی مالکہ اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابل نفرت داشتہ یا کسی خانماں برباد اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلنک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے۔(۱)

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی گنجائش ایک عفیف و پاک دامن سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں؛ بلکہ مغرب کا عصمت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے!

اس کا اندازہ مغربی ملکوں میں غیر ثابت النسب بچوں کی سال بہ سال بڑھتی ہوئی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے، ۲۰۱۴ء کی رپورٹ ہے:

---

(۱) اسلامیات: ۱۶۱-۱۶۲۔

1. بلغاریہ		58,8
2. بلجیم	:	52,3
3. چیک ریپبلک	:	46,7
4. اسپین	:	42,5
5. لاطویہ	:	44,00
6. سلووینیہ	:	58,3
7. سویڈن	:	54,6
8. برطانیہ	:	47,5
9. ناروے	:	55,5 (۱)

عورتوں کیلئے رحمت نہ کہ زحمت

تعدد ازواج میں ایک پہلو عورت کے ساتھ رحم دلی کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو، صاحب اولاد نہ ہونے کے سبب یا کسی اور مناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہو تو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے، یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصاندہ ہوتی ہے؛ کیوں کہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کرسکتی ہے اور اپنے خنجر ناز سے قانونی بیوی کو گھائل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے نہ کہ زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی تعدد ازدواج بنتا ہے، اور یہ تعدد ازدواج بھی دوسری بیوی کی رضا مندی اور خوشنودی ہی سے وجود میں آتا ہے؛ کیوں کہ کسی عورت کو دوسری بیوی بننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، خود عورتوں کو بھی اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ جب عورتوں کی شرح آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لئے قانونی طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیوی بنتی رہیں اور ان حقوق و فوائد سے بھی محروم رہیں، جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟

(۱) Source : Eurostal Conline Data Code : Demo-Find.

ہندوستانی مسلمان اور تعدد ازدواج

ہندوستان میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج زیادہ ہے، فرقہ پرست جماعتیں اس کا خاص طور پر پروپیگنڈہ کرتی ہیں اور اکثریتی فرقہ کو اس سے ڈراتی ہیں، مگر حقیقت اس کے برخلاف ہے، ڈاکٹر شائستہ پروین نے ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں مختلف سروے رپوٹیں جمع کی ہیں، جن میں مختلف قوموں میں تعدد ازدواج کا تناسب واضح کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

۱-	1931-40	1941-50	1951-60
قبائلی :	9.35	17.53	17.98
ہندو :	6.79	7.15	5.06
مسلمان :	7.29	7.06	4.31

۲- 1961ء کا ایک اور سروے :

قبائلی : 15.25۔

بدھسٹ : 7.97۔

جین : 6.72۔

ہندو : 5.08۔

مسلمان : 5.07۔

۳- 1961ء سمتا بنرجی کی سروے رپورٹ :

قبائلی : 15.25۔

ہندو : 5.06۔

مسلمان : 4.31۔

۴- 1991ء ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ :

قبائلی	:	15.25۔
بودھ	:	7.97۔
ہندو	:	5.80۔
مسلمان	:	5.73۔

۵- 1984ء تمل ناڈو :

ہندو	:	5.05۔
مسلمان	:	4.2۔

ان کے علاوہ بعض اور سروے رپورٹوں کے لئے مذکورہ کتاب ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' دیکھی جاسکتی ہے، ان سبھوں سے مشترک طور پر جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعدد ازدواج کا سب سے کم تناسب مسلمانوں میں ہے۔

خلاصۂ گفتگو

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت ایک سماجی و عمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اپنے نتائج و اثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعث رحمت ہے؛ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعدد ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں، ان کا لحاظ رکھا جائے، ورنہ یہ حکم شریعت کا استعمال نہیں؛ بلکہ ''استحصال'' ہوگا۔



طلاق، اسلامی نقطۂ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے، اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد وعورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کا ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو ڈھا نہ دیں۔

طلاق، ناپسندیدہ عمل

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کو توڑنے کا نام ہے؛ اس لئے طلاق اسلام میں ایک نہایت ناپسندیدہ عمل ہے اور طلاق کے بارے میں شریعت کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ بلاضرورت محظور یعنی ممنوع ہے، اس سلسلہ میں چند اہم فقہی تصریحات نقل کی جاتی ہیں :

- مشہور حنفی فقیہ علامہ علاء الدین کاسانیؒ (م: ۵۸۷ء) فرماتے ہیں :

إن النكاح عقد مسنون فكان الطلاق قطعا للسنة وتفويتا للواجب ، فكان الأصل الحظر والكراهة إلا أنه رخص للتأديب أو للتخليص ۔ (۱)

نکاح مسنون عقد ہے، طلاق اس سنت کو ختم کرنے اور واجب کو فوت کرنے کا سبب ہے؛ لہٰذا اصلاً یہ ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔

- فقہ حنفی کے مسائل کا مشہور مجموعہ، جس کو ہندوستان کے ممتاز علماء نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حکم پر مرتب کیا تھا اور جس کو ہندوستان کی طرف منسوب کرتے ہوئے "فتاویٰ ہندیہ" کہتے ہیں، میں ہے :

---

(۱) بدائع الصنائع: ۳؍۹۰۔

و أما وصفه (الطلاق) فهو أنه محظور نظراً إلى الأصل ، ومباح نظرا إلى الحاجة۔ (۱)

طلاق اصل کے اعتبار سے ممنوع اور ضرورت کی بناء پر جائز ہے۔

- ماضی قریب کے مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں :

و أما الطلاق فان الأصل فيه الحظر إلا لعارض يبيحه۔ (۲)

طلاق میں اصل ممنوع ہونا ہے؛ سوائے اس کے کہ کوئی ایسا عارض درپیش ہو، جو اس کے جائز ہونے کا تقاضا کرتا ہو۔

- مشہور شافعی فقیہ امام الحرمینؒ فرماتے ہیں :

إيقاع الطلاق في الأصل مكروه من غير حاجة۔ (۳)

بنیادی طور پر بلاضرورت طلاق واقع کرنا مکروہ ہے۔

- فقہ شافعی کی معروف و معتبر کتاب ''مغنی المحتاج'' میں طلاق کا حکم بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

ومكروه (الطلاق) زوجة مستقيمة الحال ۔ (۴)

اور بعض حالات میں طلاق دینا مکروہ ہے، جیسے ایسی بیوی کو طلاق دینا جس کا رویہ درست ہو۔

- شیخ منصور بن ادریس حنبلیؒ (م:۱۰۵۱ء) فرماتے ہیں :

يباح الطلاق عند الحاجة إليه ، ويكره الطلاق من غير حاجة ۔ (۵)

---

(۱) الفتاوی الہندیہ: ۱/ ۳۴۸، کتاب الطلاق، الباب الاول۔

(۲) رد المحتار: ۳/ ۲۲۸، کتاب الطلاق۔ (۳) نہایۃ المطلب: ۱۴/ ۸۹۲۶م۔

(۴) مغنی المحتاج: ۴/ ۴۹۷، فصل فی الطلاق السنی وغیرہ، کتاب الطلاق۔

(۵) کشاف القناع: ۴/ ۳۱۹، طبع: مطبعہ شرقیہ، مصر۔

ضرورت کے وقت طلاق دینا جائز ہے اور بلا ضرورت مکروہ ہے۔

- مشہور حنبلی عالم علامہ ابن تیمیہؒ (م: ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں :

إن الأصل فی الطلاق الحظر و إنما أبیح منه قدر الحاجة ۔ (۱)

اصل کے اعتبار سے طلاق ممنوع ہے؛ البتہ ضرورت کے بقدر اس کی اجازت دی گئی ہے۔

غرض کہ شریعت میں ایک سماجی ضرورت کے طور پر طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے؛ لیکن اصلاً یہ ممنوع ہے، جب ازدواجی رشتہ کو قائم رکھنا دشوار ہو جائے اور نکاح کے مقاصد فوت ہو جائیں، تب ہی اس کی اجازت دی گئی ہے، اگر کسی معقول سبب کے بغیر طلاق دی گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی؛ لیکن طلاق دینے والے مرد یا بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرنے والی عورتیں گنہگار ہوں گی۔

دلائل

طلاق کے اصلاً ممنوع ہونے اور ضرورت کی بنا پر جائز ہونے کی چند دلیلیں یہ ہیں :

حضرت محارب بن دثارؓ سے مروی ہے :

ما أحل الله شيئاً أبغض اليه من الطلاق ۔ (۲)

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے، ان میں اللہ کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی عمل نہیں ہے۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے :

أبغض الحلال إلى الله الطلاق ۔ (۳)

---

(۱) مجموع الفتاویٰ: ۳۲/۲۹۳، سُئل عن الخلع، اہل ہو طلاق محسوب من الثلاث؟

(۲) سنن ابی داؤد، باب کراہیۃ الطلاق: ۱/۵۲۶، حدیث نمبر: ۲۱۷۹۔

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق: ۱/۶۵۰، حدیث نمبر: ۲۱۷۹۔

اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إن الله لا يحب كل ذواق من الرجال ، ولا كل ذواقة من النساء ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ہر مزا چکھنے والے مرد اور ہر مزا چکھنے والی عورت پر۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أيما امرأة اختلعت من زوجها بغير نشوز فعليها لعنة الله والملائكة والناس أجمعين ۔ (۲)

جو عورت نافرمانی کرتے ہوئے اپنے شوہر سے خلع طلب کرے تو اس پر اللہ کی، تمام فرشتوں کی اور لوگوں کی لعنت ہو۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

أيما امرأة سألت زوجها الطلاق من غير ما بأس فحرام عليها رائحة الجنة ۔ (۳)

جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

طلاق کے لئے جو فقہاء نے طلاق سنت، طلاق سنی، طلاق احسن اور طلاق حسن کی اصطلاحات استعمال کی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق دینا مسنون ہے، یا طلاق دینا بہتر ہے، یہ الفاظ طلاق کے حکم کے اعتبار سے استعمال نہیں کئے گئے ہیں؛ بلکہ طریقۂ استعمال کے

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، عن شہر بن حوشب: ۱۰/۱۸۹، حدیث نمبر: ۱۹۵۳۶۔

(۲) مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکوۃ المصابیح: ۵/۲۱۳۷، بہ ضمن حدیث نمبر: ۳۲۸۰۔

(۳) سنن ابن ماجہ، عن ثوبان: ۱/۶۶۲، حدیث نمبر: ۲۰۵۵، باب کراھیۃ الخلع للمرأۃ۔

لحاظ سے یہ اصطلاحات مقرر کی گئی ہیں، جس طریقہ پر طلاق دینے کی اجازت ہے، اس کو طلاق سنت کہا گیا ہے، اور اس کی قسمیں طلاق احسن اور طلاق حسن قرار دی گئی ہیں اور طلاق دینے کا جو طریقہ غلط اور نادرست ہے، اس کو طلاق بدعت کہا گیا ہے؛ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اسلام میں طلاق دینا مسنون یا بہتر فعل ہے۔

طلاق کی گنجائش کیوں؟

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی طلاق ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور حالات کچھ ایسے ہوجاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنا ہی دونوں کے لئے سکون و چین اور اطمینان کا سامان ہوتا ہے، ان حالات میں شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت کے طور پر اس کی اجازت دیتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض چیزیں ہوتی تو ہیں ناگوار اور ناپسندیدہ؛ لیکن بعض حالات میں ضروری بھی ہوجاتی ہیں، جیسے بیت الخلاء کوئی اچھی جگہ نہیں ہوتی اور کوئی سمجھ دار آدمی اس جگہ زیادہ دیر رہنا پسند نہیں کرتا؛ لیکن وہ گھر مکمل نہیں ہوسکتا جس میں بیت الخلاء موجود نہ ہو، جسم میں نشتر لگانا ایک تکلیف دہ عمل ہے؛ لیکن وہ معالج ایک مکمل معالج کہلانے کا مستحق نہیں، جس میں رشتہ نکاح کے بندھن کو کھولنے کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہو۔

طلاق کی گنجائش نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے کتنی ہی نفرت رکھتے اور بے اطمینانی کی زندگی گزارتے ہوں؛ لیکن نہ شوہر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ترک تعلق کر کے ذہنی سکون حاصل کرے اور نہ بیوی کے لئے کوئی راستہ ہے کہ وہ اپنے شوہر سے آزادی حاصل کرے، دونوں بہر صورت نفرت کی آگ میں جلتے اور بے سکونی کی کروٹ ہوئے اپنی زندگی گزاریں، یہ یقیناً ایک غیر فطری بات ہے اور انسان فطرت سے بغاوت کر کے پُرسکون زندگی نہیں گزار سکتا؛ اسی لئے دنیا کے دو ایسے مذاہب — جن کے ماننے والوں کی بڑی تعداد ہے — کو اپنا رویہ بدلنا پڑا اور طلاق کی گنجائش پیدا کرنی پڑی،

ایک ہندو مذہب، ہندو شاستر میں طلاق کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور موت کے سوا کوئی اور چیز اس رشتہ کو توڑ نہیں سکتی؛ لیکن آخر ہندوستان میں ہندوؤں کے لئے طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی اور اس وقت ہندو بھائیوں کے یہاں طلاق کا فیصد مسلمانوں سے بھی بڑھا ہوا ہے، دوسرا مذہب عیسائیت ہے، انجیل میں حضرت مسیح کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''جس کو خدا نے جوڑا اس کو کوئی نہ توڑے'' یہ ایک اخلاقی تعلیم تھی، مگر عیسائی دنیا نے اس کو ایک واجب العمل قانون کا درجہ دے دیا، بالآخر آہستہ آہستہ مختلف اسباب و وجوہ کے باعث طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی، اب طلاق کے جتنے زیادہ واقعات عیسائی اکثریت ملکوں میں پیش آتے ہیں، دنیا میں کہیں اور پیش نہیں آتے اور تقریباً ہر عیسائی ملک میں نہ صرف طلاق کی اجازت ہے؛ بلکہ اس کو بہت آسان بنا دیا گیا ہے؛ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جیسے نکاح فطرت کا تقاضا اور معاشرتی ضرورت ہے، اسی طرح بوقت ضرورت طلاق کی گنجائش بھی فطرت کی آواز ہے اور یہ بھی معاشرہ کی ایک ضرورت ہے۔

طلاق کا حق شوہر کو کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ طلاق کا حق کس کو دیا جائے؟ امکانی طور پر اس کی پانچ صورتیں ہوسکتی ہیں :

(۱) صرف عدالت کو۔

(۲) مرد کو اور عدالت کو۔

(۳) صرف مرد کو۔

(۴) صرف عورتوں کو۔

(۵) مرد و عورت دونوں کو۔

مشرق سے مغرب تک کسی بھی مہذب معاشرہ میں عورت کو طلاق دینے کا حق نہیں دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے اندر قدرت نے جذبات کا وافر عنصر رکھا ہے، جو ان کا عیب نہیں؛ بلکہ ان کا حسن ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر وہ بے پناہ محبت کرنے والی ماں

اور خوب پیار کرنے والی بیوی ثابت نہیں ہوسکتی ، وفورِ جذبات سے جہاں محبت کی سوغات ملتی ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی وجہ سے زود رنجی اور جلد بازی پیدا ہوتی، ہر وہ شخص جس کو خاندانی و معاشرتی مسائل حل کرنے کا تجربہ ہو، وہ اس بات کی شہادت دے گا کہ خواتین بہت جلد کسی بات سے خوش بھی ہوجاتی ہیں اور ناراض بھی، فیصلہ کرنے میں عجلت سے بھی کام لیتی ہیں اور پھر بہت جلدی اپنے کئے پر پچھتاتی بھی ہیں ؛ اسی لئے خواتین کو کسی بھی مہذب سماج میں ایک طرفہ طور پر طلاق کا اختیار نہیں دیا گیا، نیز یہ بات بھی مناسب نہیں کہ طلاق کا اختیار تنہا مرد کو حاصل ہو ؛ کیوں کہ ایسی صورت میں عورت کے لئے انصاف کا دروازہ بند ہوجائے گا اور ظالم شوہر سے نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔

تیسری صورت مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر تنہا مرد ہی کو طلاق کا اختیار دیا جاتا تو وہ بیوی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرسکتا تھا، بیوی اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہو یا نہیں، اور اگر علاحدگی چاہتی ہو تو چاہے اس کی جائز بنیادیں موجود ہوں، وہ طلاق دینے کو آمادہ نہیں ہوتا؛ اس لئے اسلام نے اس نامنصفانہ صورت کو قبول نہیں کیا اور صرف مرد پر علاحدگی کو منحصر نہیں رکھا۔

اس لئے اب صرف پہلی دو صورتیں رہ جاتی ہیں :

مغربی دنیا نے عام طور پر پہلا راستہ اختیار کیا ہے کہ طلاق کا اختیار صرف عدالت کو حاصل ہوگا، شوہر سے بیوی کو شکایت ہو یا بیوی کو شوہر سے، انھیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہی ہوگا اور عدالت کے فیصلہ کے ذریعہ ہی علاحدگی ہوگی، اسلامی شریعت نے عدالت کے اختیار کو ختم نہیں کیا ہے ؛ لیکن طلاق کا انحصار اس پر نہیں رکھا ہے، اگر شوہر کی طرف سے زیادتی ہو، یا کسی وجہ سے عورت کو اس کا شوہر پسند نہیں ہو تو اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ عدالت سے رُجوع کرے اور عدالت اگر محسوس کرے کہ اس کا دعویٰ درست ہے تو تفریق کا فیصلہ کردے۔

البتہ اسلام نے عدالت کے ساتھ مرد کو بھی طلاق کا اختیار دیا ہے، اس سلسلہ میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے :

اول یہ کہ مردوں کو بے حد احتیاط کے ساتھ اس حق کے استعمال کرنے کی تلقین کی گئی ہے؛ چنانچہ :

۱- جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بلاضرورت طلاق دینا شریعت میں سخت ناپسندیدہ ہے اور فقہاء نے اس کو معصیت اور گناہ قرار دیا ہے، جو لوگ دینی مزاج رکھتے ہوں، گناہ کا خوف ان کو اس عمل سے باز رکھتا ہے۔

۲- اسلام میں ماں کا درجہ باپ سے بڑھ کر ہے، آپ نے اس بات کو تمثیلی طور پر یوں سمجھایا ہے کہ باپ جنت کا دروازہ، یعنی ''مین گیٹ'' ہے،(۱) اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے،(۲) اس کی وجہ سے ایک تو ماں کی فطری محبت اولاد کے دل میں ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ مذہبی نقطۂ نظر سے ماں کو جو تقدس حاصل ہے، اس کی وجہ سے اولاد کے دل میں ماں کی خصوصی عظمت و محبت ہوتی ہے؛ اس لئے جب میاں بیوی صاحب اولاد ہو جاتے ہیں اور اولاد ایک حد تک شعور کو پہنچ جاتی ہے تو باپ پر بال بچوں کا دباؤ ہوتا ہے اور وہ اپنے والد کو ایسا قدم اُٹھانے سے روکتے ہیں۔

۳- اسلام نے کسب معاش کی ذمہ داری مرد پر رکھی ہے اور بال بچوں کا نفقہ اسی پر عائد ہوتا ہے، کسبِ معاش کے لئے اسے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ بال بچوں کی تربیت، ان کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ کے لئے بیوی کا اعتماد حاصل کرے؛ اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ طلاق واقع ہو اور اس کا خاندان بکھر جائے۔

۴- طلاق کی بنا پر عائد ہونے والی تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر ہیں، اسے مہر ادا کرنا ہوتا ہے، جو اکثر خطیر رقم ہوتی ہے، اس کو نفقۂ عدت ادا کرنا پڑتا ہے، اگر اس کے بچے چھوٹے ہوں تو لڑکے کے سات آٹھ سال عمر ہونے اور شعور کو پہنچنے تک اور لڑکیوں کے بالغ ہونے تک ماں کو حق پرورش حاصل ہے اور اس پوری مدت میں ان بچوں کا نفقہ طلاق دینے والے شوہر کو ادا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح جب تک بچے ماں کے زیر پرورش ہیں، ماں کو پرورش کی معقول رقم بھی ادا کرنی ہوتی ہے، جو اتنی مقدار ہو کہ اس کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

---

(۱) ترمذی، ابواب البر والصلۃ، حدیث نمبر: ۱۹۰۰۔

(۲) نسائی، کتاب الجہاد، حدیث نمبر: ۳۱۰۴۔

پس یہ ساری مالی ذمہ داریاں مرد پر ہوتی ہیں، جو اسے طلاق کا قدم اُٹھانے سے روکتی ہیں۔

۵- عام طور پر طلاق سے پہلے میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے اور یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ جاتا ہے، نزاع والدین اور اولاد کے درمیان بھی ہوتی ہے ، بھائیوں اور بہنوں میں بھی ہوتی ہے، نزاع کے واقعات دوستوں کے درمیان بھی پیش آتے ہیں، ان نزاعات کو ختم کرنے کے سلسلے میں قرآن مجید میں عمومی تعلیمات پر اکتفاء کیا گیا ہے؛ لیکن زوجین کے درمیان اختلاف کو مٹانے کے لئے مستقل طور پر زور دیا گیا اور اس کی تدبیر بتائی گئی کہ سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لئے اپنی خواب گاہ اور بستر علاحدہ کرلو، یعنی وقتی طور پر بیوی سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکے تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی سی سرزنش بھی کر سکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہوجائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو، ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہو سکے اور عورت بے جا نافرمانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دُور کرنے سے قاصر ہیں؛ لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے :

> اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک پنچ (حَکم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعتاً اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردیں، بے شک اللہ علیم و خبیر ہیں۔(۱)

اسی طرح مختلف ایسی صورتیں اختیار کی گئی ہیں کہ مرد حق طلاق کا بے جا استعمال نہ کرے؛ البتہ اس بنیاد پر کہ مرد کے اندر بمقابلہ عورتوں کے قوت فیصلہ زیادہ رکھی گئی ہے اور وہ عورتوں کے بہ نسبت کم جذباتی ہوتے ہیں، انھیں طلاق کا اختیار دیا گیا ہے۔

---

(۱) النساء: ۳۵۔

طلاق کا اختیار صرف عدالت کو کیوں نہیں؟

اکثر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ طلاق کا اختیار عدالت ہی کو دے دیا جاتا؛ تاکہ کوئی شخص اس کا غلط استعمال نہیں کرتا؛ لیکن غور کیا جائے تو یہ خیال درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حق طلاق پوری طرح عدالت کو سونپ دینے میں کئی نقصانات ہیں :

اول یہ کہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ میاں بیوی دونوں چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان علاحدگی ہوجائے ، اوران کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ، مگر اس باہمی اتفاق کے باوجود انھیں علاحدگی حاصل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے اور وہ اپنی پسند کا نیا گھر آباد نہیں کر پاتے ، بعض دفعہ تو اس میں سالہا سال گذر جاتے ہیں اور کافی اخراجات بھی ہوتے ہیں ، جو ایک کم آمدنی کی حامل عورت کے لئے ممکن نہیں ہوتا اور اگر اس طرح کا معاملہ مسلمان میاں بیوی کو پیش آئے تو خاص کر اس کا زیادہ نقصان بیوی کو ہوگا ؛ کیوں کہ شوہر تو دوسرا نکاح کرلے گا؛ لیکن بیوی نیا گھر بسانے سے محروم رہے گی۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ عدالت کے ذریعہ طلاق حاصل کرنے میں دوسرے فریق کی کمزوریوں کو واضح کرنا پڑتا ہے ، بعض اخلاقی کمزوریاں ایسی ہیں کہ معاشرہ میں مردوں کی نسبت سے ان کو کم ناگوار سمجھا جاتا ہے ، جیسے : اگر کسی مرد کے بارے میں کہا جائے کہ اس کا کردار اچھا نہیں ہے ، وہ بدکردار اور بدزبان ہے ، تو آئندہ رشتہ میں اسے کچھ دشواری پیش آسکتی ہے ؛ لیکن معمولی ، اس کے برخلاف اگر مرد عدالت سے رُجوع ہو اور وہ کہے کہ میری بیوی بدچلن ہے تو اس کے لئے نیا گھر آباد کرنا دشوار ہوجاتا ہے ؛ اس لئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس سے خواتین کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مرد کو حق طلاق دینے میں بالواسطہ طور پر عورتوں کی زندگی کا تحفظ ہے ؛ کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے ، جس کے دونوں فریق جسمانی قوت کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں ، مرد طاقتور ہے اور عورت کمزور ہے ، مرد عام طور پر اپنی

حفاظت کے لئے عورت کا محتاج نہیں ہوتا، عورت اپنے تحفظ کے لئے مرد کی محتاج ہوتی ہے، ایسی صورت میں اگر میاں بیوی کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو جائے اور شوہر کسی طرح اس عورت کے ساتھ رہنا چاہتا ہو؛ لیکن قانون اسے مجبور کرتا ہو اور عدالت کی طویل العمل اور خرچ طلب کارروائی کے بغیر وہ قانونی طور پر علاحدگی حاصل کرنے سے قاصر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر قانونی راستہ اختیار کرے گا اور بیوی کے قتل کا اور اسے زندہ جلانے کا مرتکب ہوگا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ خدا ناترس مرد کے لئے بیوی کے ساتھ ایسے جرم کا ارتکاب دشوار نہیں؛ کیوں کہ وہ رات کی تاریکی اور کمرے کی تنہائی میں بھی اس کے ساتھ رہتا ہے، وہ سورج کی روشنی ہی سے نہیں؛ بلکہ گواہان کی آنکھوں سے بھی اپنے جرم کو چھپا سکتا ہے اور بہت سی دفعہ ایسے مجرمین شبہ کا فائدہ اُٹھا کر عدالت کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو معاشرہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کو قتل کرنے اور ان کو نذر آتش کرنے کے جرم میں زیادہ ملوث پایا جاتا ہے، کم تعلیم یافتہ اور معاشی اعتبار سے پسماندہ ہونے کے باوجود اس جرم میں مسلمانوں کا تناسب کم ہے، گویا طلاق کی حیثیت بجلی کے فیوز کی ہے، جو خود اڑ جاتا ہے؛ لیکن پورے گھر کی برقی کو بچالیتا ہے، ٹھیک اسی طرح طلاق ایک ناخوشگوار واقعہ ہے؛ لیکن وہ اس سے زیادہ ناخوشگوار واقعات کو روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بیوی کے ساتھ زیادتی کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور ہندوستان میں جہیز کی اموات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

۲۰۰۶ء	:	۷۶۱۸	اموات۔
۲۰۰۷ء	:	۸۰۹۳	اموات۔
۲۰۰۸ء	:	۸۱۷۲	اموات۔
۲۰۰۹ء	:	۸۳۸۳	اموات۔
۲۰۱۰ء	:	۸۲۴۲	اموات۔
۵ رسال میں	:	۴۰۶۰۸	اموات۔

یقیناً اس میں دوسرے عوامل کا بھی دخل ہے؛ لیکن ایک اہم سبب طلاق کو مشکل بنا دینا بھی ہے۔

چوتھے: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالاں کہ مغربی معاشرہ میں بھی تنہا عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا گیا ہے؛ لیکن مرد و عورت کو مساوی حق دینے اور بذریعہ عدالت طلاق کا اختیار حاصل ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں طلاق کا تناسب بے حد بڑھ گیا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے، جس میں فی سو نکاح طلاق کی شرح واضح کی گئی ہے:

۱- جاپان	60.0 :	۲- جرمنی	39.4
۳- برطانیہ	42.6 :	۴- روس	43.3 :
۵- چیک جمہوریہ	43.3 :	۶- بلجیم	44.0 :
۷- ڈنمارک	44.5 :	۸- امریکہ	54.8 :
۹- سویڈن	54.9 :	۱۰- بیلاروس	52.9 :
۱۱- آسٹریا	43.4 :	۱۲- ناروے	40.4 :
۱۳- فرانس	38.3 :	۱۴- نیدرلینڈ	38.3 :
۱۵- ہنگری	37.5 :	۱۶- سلواکیا	26.9 :
۱۷- پرتگال	26.2 :	۱۸- سوئزرلینڈ	25.5 : (۱)

کے ڈی شرما نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> امریکہ میں طلاق و تفریق نے شادی کی وہ مٹی پلید کی ہے اور اس کے ایسے نتائج پیدا ہوئے ہیں، جس کی کوئی مثال جدید تاریخ میں نہیں ملتی، ہر چوتھی شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے؛ حالاں کہ یہاں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا صرف چھ فیصد ہے۔(۲)

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے:www.divorcemag.com۔

(۲) ''مغربی تہذیب انحطاط کی شاہراہ پر'':۲۷۸، از: اکرام اللہ۔

عورت کیلئے حق طلاق کا متبادل

اس کے ساتھ دو اور باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتا ہے، اول یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ مرد کو تو حق طلاق دے دیا گیا ہو اور عورت کے لئے کوئی راستہ نہیں رکھا گیا ہو؛ بلکہ عورتوں کے لئے شوہر سے علاحدگی کے تین راستے ہیں :

(۱) تفویض طلاق۔

(۲) خلع۔

(۳) عدالت کے ذریعہ فسخ نکاح۔

تفویض طلاق کا مطلب یہ ہے کہ نکاح سے پہلے یا نکاح کے وقت یا نکاح کے بعد بیوی اپنے شوہر سے اس بات کا حق حاصل کر لے کہ وہ جب بھی چاہے گی، اپنے اوپر طلاق واقع کر لے گی، ایسی صورت میں اس کو اپنے آپ پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، خاص کر اگر شوہر کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو اور بعد میں صلح کی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت تفویض طلاق عورت کے لئے مستقبل میں شوہر کے ظلم سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔

خلع یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کو طلاق دینے پر رضا مند کر لے، خواہ مہر معاف کر کے، یا کچھ دے کر، عام حالات میں خلع شوہر کی رضامندی ہی سے ہوسکتا ہے؛ لیکن اگر میاں بیوی کے درمیان شدید اختلاف ہو؛ لیکن نفرت اس قدر بڑھ گئی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پُرسکون زندگی گذارنے سے قاصر ہوں تو اس صورت میں امام مالکؒ کے نزدیک قاضی کو اختیار ہے کہ وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر بھی خلع کر دے اور ہندوستان میں عام طور پر دارالقضاء کا عمل اسی پر ہے۔

اگر شوہر ظلم و زیادتی کرتا ہو، بیوی کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچاتا ہو، اس کے مالی، صنفی یا اخلاقی حقوق ادا نہیں کرتا ہو تو ان تمام صورتوں میں عورت کو عدالت کے ذریعہ نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے؛ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے مردوں کو تو طلاق کا اختیار دے دیا ہے؛ لیکن عورت کے لئے کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

اگر چہ ہندو میرج ایکٹ میں بھی عورت کے لئے عدالت کے ذریعہ طلاق حاصل کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے؛ لیکن اس کی اجازت بہت محدود ہے، شریعت اسلامی میں اس سلسلہ میں زیادہ وسعت ہے؛ چنانچہ سولہ اسباب ہیں، جن کی بنیاد پر عورت قاضی کے ذریعہ علاحدگی حاصل کرسکتی ہے۔(۱)

دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کے واقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں؛ لیکن یہ محض غلط فہمی یا پروپیگنڈہ ہے، آزادی کے بعد سے جو سروے کئے گئے ہیں، ان کے مطابق مسلمانوں میں طلاق کا تناسب بمقابلہ دوسری قوموں کے کم ہے، شاید اس کی ایک وجہ تعدد ازدواج کی اجازت بھی ہے؛ چوں کہ دوسری اقوام میں تعدد ازدواج کی اجازت بھی ہے؛ چوں کہ دوسری اقوام میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے؛ اس لئے اگر کوئی مرد کسی وجہ سے کسی اور عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، خواہ اپنی خواہش کی وجہ سے، یا کسی مجبوری کی وجہ سے، یا بیوی کا رویہ نامناسب ہونے کی وجہ سے، تو بہر حال اسے پہلی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا ہے؛ لیکن اسلام نے چوں کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرے نکاح کی اجازت ہے؛ اس لئے طلاق دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے، اس سلسلے میں ایک سروے رپورٹ ڈاکٹر شائستہ پروین کی کتاب ''ہندوستانی معاشرہ میں تعدد ازدواج'' سے نقل کرنا مناسب ہوگا :

زویا حسن Zoya Hasan (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) میں ماہر لسانیات اور ریتو مینن Ritu Menon (پبلشر اور رائٹر) کی زیر نگرانی کل ہند پیمانہ پر یہ سروے کرایا گیا، اس سروے میں مسلم خواتین کا مختلف میدان ہائے کار میں احاطہ کیا گیا، مثلاً: خوانگی، سماجی واقتصادی صورت حال، شادی، تعلیم، فیصلہ سازی، سیاسی بیداری وغیرہ۔

اس سروے نے اس عام تاثر کی نفی کی کہ مسلم خواتین پردہ، تعدد ازدواج اور ایک مجلس میں تین طلاق کی قیدی بن چکی ہیں، اس جائزے میں ۱۲؍ ریاستوں کے ۴۰؍ اضلاع کا

(۱) دیکھئے: مجموعہ قوانین اسلامی، قانون فسخ نکاح، دفعہ: ۳۲۲۔

احاطہ کیا گیا، ۹۶۴۱ رخواتین کی آراء لی گئیں، جس میں ۸۰ رفیصد مسلم اور ۲۰ رفیصد ہندو تھیں، اوران خواتین میں ۶۰ رفیصد دیہی اور ۴۰ رفیصد شہری علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس جائزے میں بہت سے حقائق اُبھر کر سامنے آئے، مثلاً :

طلاق کا تناسب مسلمانوں میں	:	0.41۔
طلاق کا تناسب ہندوؤں میں	:	0.47۔
تعدد ازدواج کی شرح مسلمانوں میں	:	2.9۔
تعدد ازدواج کی شرح ہندوؤں میں	:	4.05۔

۲۰۱۱ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں جو طلاق شدہ خواتین ہیں، ان میں 68% ہندو ہیں، 23% مسلمان اور 6% عیسائی، بظاہر اس میں آبادی کے لحاظ سے ہندو مطلقہ خواتین کا فیصد کم ہے؛ لیکن ہندو خواتین میں قانون طلاق کے دشوار ہونے کی وجہ سے معلقہ عورتوں کی بہت بڑی تعداد ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے ٹائمس آف انڈیا میں ایک سروے رپورٹ آئی تھی، جس کے مطابق ہر ایک ہزار میں کم سے کم 7 ایسی خواتین ہیں، جنھیں نہ طلاق حاصل ہو سکی ہے اور نہ وہ شوہر کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں اور عملاً وہ خاندانی زندگی کی سہولتوں سے محروم ہیں۔

خلاصۂ کلام

حاصل یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن ایک ناخوشگوار سماجی ضرورت کی حیثیت سے اس کی اجازت دی گئی ہے، اس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے؛ تا کہ وہ نفرت پیدا ہو جانے کی صورت میں رشتہ کو ختم کرنے کے لئے غیر قانونی راستہ اختیار نہ کرے، عورتوں کے لئے اس کے متبادل کے طور پر تفویض طلاق کا حق حاصل کرنے کی، خلع کی اور قاضی کے ذریعہ فسخ وتفریق کی گنجائش رکھی گئی ہے، عدالت کو حق طلاق اس لئے نہیں سونپا گیا کہ اس کی وجہ سے اسبابِ طلاق کو واضح کرنا ہوگا اور یہ بات عورت کے لئے نئی زندگی شروع کرنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

• • •

طلاق سے پہلے تحکیم

آسام ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب بحرالاسلام نے اپنے ایک فیصلے میں اسلام کے قانون طلاق کی اس طرح تشریح کی ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ طلاق سے پہلے زوجین کے درمیان ثالث کے ذریعہ صلح کی کوشش کی جائے، اگر اس طرح کی کوشش نہیں کی گئی اور اس کے بغیر شوہر نے طلاق دے دی تو وہ طلاق معتبر نہیں ہوگی، اس فیصلہ کے بعد مختلف عدالتوں سے مسلسل اس طرح کے فیصلے آرہے ہیں اور عام طور پر لوگوں کو بھی یہ بات بہتر محسوس ہوتی ہے کہ بجائے اس کے کہ شوہر صلح کی کسی کوشش کے بغیر طلاق دے دے، پہلے زوجین کے درمیان مصالحت کی کوشش کی جائے، اگر یہ کوشش سودمند ثابت نہ ہو تب طلاق کا قدم اُٹھایا جائے؛ اس لئے اس مسئلہ پر تین پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

اول: عقل و مصلحت کے اعتبار سے یہ بات کہاں تک مناسب ہے؟

دوسرے: کیا شریعت اسلامی نے واقعتاً طلاق سے پہلے تحکیم کو لازم قرار دیا ہے؟

تیسرے: عدالت نے اس سلسلہ میں قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا ہے، کیا وہ استدلال درست ہے؟

عقل و مصلحت کا تقاضا

جہاں تک عقل و مصلحت کے پہلو سے اس پر غور کرنے کی بات ہے تو یہ بات واقعتاً بہتر معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کا استعمال آخری چارۂ کار کے طور پر کیا جائے، اس سے پہلے باہمی صلح و صفائی کی تدبیریں کی جائیں، اِن ہی تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر زوجین آپس میں مسئلہ کو حل نہ کرسکیں تو خاندان کے بزرگوں، یا سماج کے کسی اور ذمہ دار شخص کے ذریعہ

نزاع کو سلجھانے کی کوشش کریں، قرآن نے اگر چہ ثالثی سے طلاق کو مربوط نہیں کیا ہے؛ لیکن زوجین کے درمیان اختلاف کو حل کرنے کی جو مختلف تدبیریں بتائی ہیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی ہے، جس کا سورۂ نساء کی آیت نمبر: ۳۴، ۳۵ میں ذکر آیا ہے؛ البتہ اس کو لازم قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ طلاق کے معتبر ہونے کے لئے اس کو شرط کا درجہ دیا گیا ہے۔

غور کیا جائے تو اس کو لازم نہ کرنے میں عورتوں ہی کا مفاد ہے؛ کیوں کہ طلاق زندگی کا بند دروازہ نہیں ہے، جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہو؛ بلکہ یہ ایک مرحلہ کا اختتام اور دوسرے مرحلہ کا آغاز ہے، طلاق کے ذریعہ زندگی کا ایک باب بند ہوتا ہے اور دوسرا باب کھلتا ہے، عورت کا پہلا رشتۂ نکاح ختم ہوتا ہے اور دوسرے نکاح کی راہ ہموار ہوتی ہے، اگر شوہر پر یہ بات لازم قرار دی جائے کہ وہ ان اسباب و وجوہ کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے اس نے طلاق دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سی دفعہ ان کا ظاہر کرنا خود عورت کے مفاد میں نہ ہو، ایسے مواقع پر ایک شریف اور باعزت میاں بیوی اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ علاحدگی ہوجائے اور ایسے واقعات پردہ ہی میں رہیں؛ تاکہ کسی فریق کی بے عزتی اور بے آبروئی نہ ہو اور اگر طلاق کا سبب عورت کی طرف سے پائی جانے والی کوتاہیاں نہ ہوں، تب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ خدا ناترس شوہر جھوٹ بولے اور اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرے؛ تاکہ طلاق دینے کے عمل کو درست ثابت کرسکے۔

ہر دو صورت میں عورت کے لئے آئندہ زندگی کا آغاز مشکل ہوجائے گا، جب سماج تک یہ بات پہنچے گی کہ فلاں شخص کی بیوی پر بد کردار، بداخلاق، بدزبان اور نافرمان ہونے کا الزام ہے تو غور کیجئے کہ کون شخص اس کو اپنی بیوی یا بہو بنانے پر تیار ہوگا؟ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ کی صورت حال یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کا رشتہ ملنا دشوار ہوتا ہے، وہاں کیا ایسی مطلقہ عورتوں کا رشتہ ملنا آسان ہوگا، جن کی کمزوریاں طشت از بام ہوچکی ہوں، یا وہ ہوں تو بے قصور؛ لیکن انھیں بدنام کردیا گیا ہو؟ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ طلاق سے پہلے تحکیم کو ضروری قرار دینا عورتوں کے لئے نقصاندہ ہے نہ کہ فائدہ مند۔

شریعت اسلامی کی روشنی میں!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا شریعت اسلامی میں طلاق سے پہلے تحکیم کو لازم قرار دیا گیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہم قرآن مجید، حدیث نبوی ﷺ، آثارِ صحابہ، اجماعِ اُمت اور قیاس کی روشنی میں مسئلہ کا جائزہ لیں گے :

قرآن مجید

قرآن مجید میں مجموعی طور پر چودہ مقامات پر طلاق سے متعلق احکام ذکر کئے گئے ہیں، ان میں کہیں بھی طلاق سے پہلے حَکَم یا ثالث بنانے کا ذکر نہیں ہے، بعض آیتوں میں عدت کے احکام ہیں، بعض آیات میں طلاق کے بعد پیدا ہونے والی علاحدگی کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے، بعض آیات مطلقہ کے حقوق کو واضح کرتی ہیں، بعض میں طلاق دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے؛ لیکن کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ طلاق اس وقت تک نہیں دے سکتے، جب تک کسی کو ثالث بنا کر باہم معاملہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کرلی جائے۔

طلاق دینے کا طریقہ اور اس کا حکم کیا ہے؟ اس کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر: ۲۲۹، ۲۳۰ نے واضح کیا ہے؛ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۲۹-۲۳۰)

طلاقیں (جس کے بعد بیوی کولوٹانے کی گنجائش ہے) دو مرتبہ ہیں،
پھر یا تو بھلے طریقے پر روک لینا ہے، یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا،
اور تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم نے انھیں جو دیا ہے (یعنی مہر
وغیرہ) ان میں سے کچھ لے لو، سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ
وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے، تو عورت رہائی پانے کے لئے
کچھ دے دے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں،
ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے، وہی ظالم
ہے، پھر اگر بیوی کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب وہ عورت
اس کے لئے حلال نہیں، جب تک کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ
کرے۔ پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے، تو ان دونوں کے لئے
مضائقہ نہیں کہ وہ دوبارہ نکاح کرلیں، اگر انھیں گمان ہو کہ وہ اللہ کی
حدود کو قائم رکھ سکیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، جنھیں وہ ان
لوگوں کے لئے بیان فرمارہے ہیں، جو جاننا چاہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں :

پہلی بات یہ ہے کہ اگر ایک یا دو طلاق دی جائے تو نیا نکاح کئے بغیر بیوی کو لوٹایا جاسکتا ہے، دوسری آیات واحادیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ یہ گنجائش عدت کے گذرنے تک ہے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو مہر ادا کردیا ہو، یا کچھ اور حسن سلوک کیا ہو، تو مناسب نہیں ہے کہ طلاق دیتے ہوئے ان چیزوں کو واپس لے لیا جائے، ہاں اگر عورت خود طلاق کی خواہش مند ہو اور وہ اپنی رضامندی سے مہر واپس کرنا چاہے تو اس کی گنجائش ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر شوہر نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب وہ عورت اس کے لئے حرام ہوجاتی ہے، اب اسے لوٹانے یا دوبارہ نکاح کرلینے کی گنجائش نہیں؛ بلکہ اب ان دونوں

کے درمیان دوبارہ ازدواجی زندگی کی صورت اسی وقت ممکن ہے، جب کہ اس عورت کا کسی اور مرد سے نکاح ہوا ہو اور اتفاق سے دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے، اب دوبارہ پہلے شوہر سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے۔

طلاق دینے کا طریقہ اور اس کے احکام کے بارے میں یہ بنیادی آیت ہے، اس سلسلہ میں دوسری آیت سورۂ طلاق کی آیت نمبر: ۶۵ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ طلاق دینے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے کہ عدت طویل نہ ہوجائے؛ اس لئے حالت حیض میں طلاق نہیں دی جائے: ''فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'' ان آیات میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ طلاق سے پہلے مصالحانہ کوششیں کی گئی ہوں؛ تب ہی طلاق معتبر ہوگی۔

حدیثیں

قرآن مجید کے بعد شریعت کا سب سے اہم ماخذ حدیث ہے، حدیثوں میں بھی کہیں ایسی شہادت نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے مصالحتی کوشش کو طلاق کے لئے شرط قرار دیا ہو، یا طلاق کے مسائل سامنے آنے کے بعد آپ نے تحقیق کی ہو کہ تم نے طلاق دینے سے پہلے کسی کو ثالث بنا کر مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں عہد نبوی کی چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- خود رسول اللہ ﷺ نے اُم المؤمنین سیدنا حضرت حفصہؓ کو طلاق دے دی تھی اور پھر انھیں واپس لوٹا لیا تھا، (۱) حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت میں وضاحت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ آپ حفصہؓ کو لوٹا لیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے رجعت فرمائی۔(۲)

---

(۱) سنن ابی داؤد، عن عمرؓ، حدیث نمبر: ۸۲۸۳۔

(۲) جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۴۳۲۱، بحوالہ طبرانی۔

اس حدیث میں حَکَم بنانے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور سوال یہ ہے کہ جب معاملہ مسلمانوں کا ہو تو آپ کے سوا حَکَم کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات تو خود پوری اُمت کے لئے حَکَم ہے: ''فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ''۔ (نساء:۶۵)

۲- أخبرني سالم : أن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما أخبره : أنه طلق امرأته وهي حائض ، فذكر عمر لرسول الله صلى الله عليه وسلم فتغيظ فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال : ليراجعها ثم يمسكها حتى تطهر ، ثم تحيض فتطهر ، فان بدأ له أن يطلقها فليطلقها طاهرا قبل أن يمسها۔ (۱)

سالم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی، حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا، آپ ﷺ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: انھیں کہا جائے کہ بیوی کو لوٹا لیں، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر حیض آئے اور اس کے بعد پاک ہو جائے، اب اگر طلاق دینے ہی کا ارادہ ہو تو پاکی کی حالت میں صحبت کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دیں۔

لوٹانے کا حکم آپ ﷺ نے اس لئے دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہی طلاق دی تھی اور لوٹانے کی گنجائش باقی تھی، اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دریافت نہیں فرمایا کہ مصالحتی کوشش کی گئی تھی یا نہیں؟ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اچانک اس واقعہ کی اطلاع ملی: اسی لئے آپ ﷺ کو سخت ناراضگی ہوئی، اگر مصالحتی کوشش

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ طلاق، حدیث نمبر: ۴۰۹۸۔

کے بغیر دی گئی طلاق واقع نہ ہوتی تو آپ فرماتے کہ طلاق پڑی ہی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹانے کا حکم نہیں دیتے؛ کیوں کہ لوٹانا تو طلاق واقع ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

۳- حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہارے دادا کو اللہ کا خوف نہیں ہے؟ پھر ارشاد فرمایا: تین طلاقیں تو پڑ گئی، باقی نو سو ستانوے ''عدوان اور ظلم'' ہیں، اللہ چاہیں تو عذاب دیں یا معاف کر دیں۔(۱)

اس واقعہ میں بھی مصالحتی کوشش کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ دریافت کیا، اگر طلاق واقع ہونے کے لئے مصالحانہ کوشش ضرور ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور اس بارے میں دریافت فرمایا ہوتا۔

۴- عن محمود بن لبيد قال: أخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعا، فغضب، ثم قال أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم؟ حتى قام رجل فقال: يا رسول الله ألا أقتله۔ (۲)

ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دے دی ہے، تو آپ غضبناک ہو گئے، پھر فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، یہاں تک کہ ایک

---

(۱) مجمع الزوائد: ۴/۳۳۸، باب فیمن طلق أکثر من ثلاث۔

(۲) سنن نسائي، كتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ۔

صاحب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اللہ کے رسول! میں اسے قتل ہی نہ کر ڈالوں؟

ایک ہزار طلاق دینے سے ظاہر ہے کہ یہ طلاق اچانک اور سخت غصہ کی حالت میں دی گئی تھی، ایسے حالات میں مصالحتی کوششیں نہیں ہوتی ہیں۔

آثارِ صحابہؓ

صحابہؓ کے فتاویٰ اور ان کی آراء قرآن وحدیث کی شرح کا درجہ رکھتی ہیں؛ اسی لئے صحابہ کے فتاویٰ کو شریعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور فقہاء ان مسائل میں صحابہ کے فتاویٰ کو حدیث کا درجہ دیتے ہیں، جن میں اجتہاد کا دخل نہ ہو، صحابہ کے فتاویٰ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لئے پہلے ثالث کے ذریعہ مصالحانہ کوشش سے گذرنا ضروری نہیں ہے، چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں :

● عن زيد بن وهب، أن رجلا بطالا كان بالمدينة، طلق امرأته الفا، فرجع إلى عمر، قال: إنما كنت العب، فعلا عمر رأسه بالدرة وفرق بينهما۔ (۱)

مدینہ میں ایک پہلوان قسم کا آدمی تھا، جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی، پھر حضرت عمرؓ سے رُجوع ہوا، حضرت عمرؓ نے فرمایا تو تو بڑا کھلاڑی ہے، پھر حضرت عمرؓ نے اس کے سر پر دُرّے لگائے اور دونوں کے درمیان تفریق کر دی۔

● جاء رجل الى عثمان فقال: إني طلقت امرأتي مئة، قال: ثلاث يحرمنها عليك، وسبعة وتسعون عدوان۔ (۲)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الطلاق، باب فی الرجل یطلق إمرأته مائة أو ألفا، حدیث نمبر: ۱۸۰۱۸۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الطلاق، باب الرجل یطلق إمرأته أو ألفا فی قول واحد حدیث نمبر: ۱۸۰۱۴۔

ایک صاحب حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاق دے دی، حضرت عثمانؓ نے فرمایا: تین طلاقیں تو تمہاری بیوی کو تم پر حرام کردیں گی اور ستانوے (تمہاری طرف سے) ظلم وعدوان ہیں۔

● عن حبيب قال : جاء رجل إلى علي فقال : إني طلقت امرأتي ألفا، قال : بانت منك بثلاث، وأقسم سائرها بين نسائك ـ (۱)

ایک صاحب حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا: تین طلاق کی بنا پر وہ تم سے جدا ہوگئی اور (غصہ کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا: بقیہ کو اپنی اور بیویوں کے درمیان تقسیم کردو۔

● كانت عائشة الخثعمية عند الحسن بن علي رضي الله عنه، فلما قتل علي رضي الله عنه قالت : لتهنئك الخلافة، قال : بقتل علي تظهر من الشماتة، اذهبي فأنت طالق، يعني ثلاثا، قال فتلففت بثيابها وقعدت حتى قضت عدتها، فبعث إليها ببقية بقيت لها من صداقها وعشرة آلاف صدقة، فلما جاءها الرسول قالت : متاع قليل من حبيب مفارق، فلما بلغهٗ قولها بكى، ثم قال : لولا أني سمعت جدي، أو حدثني أبي أنه سمع جدي يقول : أيما رجل طلق امرأته ثلاثاً عند الأقراء أو ثلاثا مبهمة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره لراجعتها ـ (۲)

(۱) مصنف ابن ابی شیبه، کتاب الطلاق، باب الرجل يطلق إمرأته أو ألفا في قول واحد، حدیث نمبر: ۱۷۹۰۲۔
(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الخلع والطلاق، باب ما جاء في إمضاء الطلاق الثلاث وإن كن مجموعات، حدیث نمبر: ۱۴۹۷۱۔

عائشہ خشعمیہ حضرت حسن بن علیؓ کے نکاح میں تھیں، جب حضرت علیؓ شہید کردیئے گئے تو انھوں نے عرض کیا: آپ کو خلافت مبارک ہو، حضرت حسنؓ نے کہا: کیا تم حضرت علیؓ کے قتل پر شماتت ظاہر کرتی ہو، چلی جاؤ، تم کو تین بار طلاق ہے، انھوں نے (اپنے آپ پر پردہ کے لئے) کپڑے لپیٹ لئے اور بیٹھ گئیں، یہاں تک کہ عدت گذر گئی، پھر حضرت حسنؓ نے ان کو مہر کا بقیہ حصہ نیز دس ہزار درہم زائد بھیجے، جب ان کے پاس قاصد پہنچا تو انھوں نے کہا: جس محبوب سے جدائی ہوئی ہے، اس کے مقابلہ میں یہ تحفہ تھوڑا ہے، جب حضرت حسنؓ کو ان کی یہ بات پہنچی تو رونے لگے، پھر فرمایا: اگر میں نے اپنے نانا سے نہ سنا ہوتا، یا کہا: میرے والد نے مجھ سے میرے نانا کی یہ بات نقل نہ کی ہوتی کہ جس آدمی نے اپنی بیوی کو الگ الگ طہر میں تین طلاقیں دی ہوں یا ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہوں تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں آئے تو میں نے اس سے رُجوع کرلیا ہوتا۔

● عن علقمة عن عبد الله أنه سئل عن رجل طلق امرأته مائة تطليقة ، قال : حرمتها ثلاث و سبعة وسبعون عدوان ۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس نے اپنی بیوی کو ۱۰۰ طلاق دے دی تھی، آپؓ نے فرمایا: تین طلاق نے اس کی بیوی کو حرام کردیا اور بقیہ ۷۷ طلاقیں ظلم وزیادتی ہیں۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الطلاق، باب الرجل یطلق إمرأتہ أو ألفافی قول واحد، حدیث نمبر: ۱۷۷۹۹۔

● جاء رجل إلى ابن عباس ، فقال : إني طلقت أمرأتي ألفا ومائة ، قال : بانت منک بثلاث وسائرهن وزر اتخذت آيات الله هزوا ۔ (۱)

ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا : میں نے اپنی بیوی کو گیارہ سو طلاق دے دی ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا : وہ تین طلاق کی بنا پر تم سے بائنہ ہوگئی اور بقیہ سب کی سب گناہ ہیں ، تم نے اللہ کے احکام کو مذاق بنالیا۔

● جاء رجل الى عبد الله بن عمر ، فأنا عنده فقال : يا أبا عبد الرحمٰن ، انه طلق أمرأته مرة ، قال بانت منک بثلاث وسبعة و تسعون يحاسبک الله بها يوم القيامة۔ (۲)

سعید مقبریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک صاحب آئے ، جب کہ میں ان کے پاس موجود تھا ، انھوں نے کہا : اے ابوعبدالرحمٰن ! اس نے اپنی بیوی کو سو طلاق دے دی ہے ، انھوں نے جواب دیا : تین طلاق کے ذریعہ رشتۂ نکاح ختم ہوگیا اور ستانوے طلاقوں کا اللہ تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔

ان آثارِ صحابہ سے صاف واضح ہے کہ طلاق دینے والوں نے مغلوب الجذبات ہوکر ایک ساتھ یہ طلاق دی ؛ ورنہ تین کے بجائے ہزار یا گیارہ سو طلاقیں نہ دیتے اور جب ان کے طلاق دینے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو صحابہ نے سیدھے طلاق کے واقع ہوجانے کی بات فرمائیں ، یہ دریافت نہیں کیا کہ تم نے پہلے حَکَم کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی ؟ پھر یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان میں بعض آثار خلفاء راشدین یعنی حضرت عمرؓ ، حضرت عثمانؓ

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ، کتاب الطلاق ، باب الرجل يطلق إمرأته أو ألفا في قول واحد ، حدیث نمبر : ۱۷۸۰۴۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ ، کتاب الطلاق ، باب الرجل يطلق إمرأته أو ألفا في قول واحد ، حدیث نمبر : ۱۷۸۰۷۔

اور حضرت علیؓ کے ہیں اور ایک اثر خانوادہ نبوت کی اہم شخصیت حضرت حسنؓ کا ہے، جو پانچویں خلیفہ راشد ہیں اور تین آثار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کے ہیں، جو صحابہ کے درمیان علم وتفقہ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

اجماع

کتاب وسنت کے بعد شریعت کا تیسرا ماخذ ''اجماع'' ہے، یعنی اُمت کے مجتہدین جس بات پر اتفاق کرلیں، وہ بات حجت ہے، اس وقت اہل سنت والجماعت کے پانچ مکاتب فکر ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور سلفی، نیز اہل تشیع کے یہاں فقہ جعفری پر عمل ہے، ان دونوں کے علاوہ دو اور فقہی مکاتب پائے جاتے ہیں، فقہ زیدی (جس کے ماننے والے زیادہ تر یمن میں ہیں) اور فقہ اباضی (جس پر سلطنت عمان کا عمل ہے)، ان تمام مکاتب فقہ کی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں، ان میں سے کسی کے یہاں بھی طلاق واقع ہونے کے لئے مصالحتی کوشش کا ضروری ہونا شرط نہیں ہے، خود صحابہ وتابعین اور وہ مجتہدین جن کی فقہ مستقل دبستانِ قانون نہیں بن سکی، جیسے سفیان ثوریؒ، اوزاعیؒ، حسن بصریؒ، لیث بن سعدؒ، ابن جریر طبریؒ، داؤد ظاہریؒ وغیرہ کے اجتہادات کو بھی موجودہ دور میں بعض محققین نے یکجا کیا ہے؛ لیکن کسی کے یہاں طلاق واقع ہونے کے سلسلہ میں ایسی کسی شرط کا ذکر نہیں ملتا؛ حالاں کہ اگر طلاق کے واقع ہونے کے لئے پہلے تحکیم کے مرحلہ سے گذرنا ضروری ہوتا تو فقہاء دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ ضرور اس کا ذکر فرماتے؛ بلکہ اہمیت کے اعتبار سے اس کو زیادہ زور دے کر کہا گیا ہوتا؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طلاق واقع ہونے کے لئے تحکیم کے شرط نہ ہونے پر اُمت کا اجماع واتفاق ہے۔

قیاس

قانونِ شریعت کا چوتھا ماخذ ''قیاس'' یعنی جو مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ آیا ہو، مگر اس کی نظیر قرآن وحدیث میں مل جائے تو جو حکم اس میں دیا گیا ہے، وہی حکم اس مسئلہ کا بھی مقرر کیا

جائے، اس نقطۂ نظر سے بھی یہ زائد شرط معتبر نظر نہیں آتی، طلاق کی مماثل صورتیں ''خلع، ایلاء، لعان اور فسخ'' کی ہیں، خلع میں عورت کے مطالبہ پر طلاق دی جاتی ہے، ایلاء یہ ہے کہ کوئی مرد چار ماہ تک بیوی سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھائے، اس صورت میں چار ماہ گذرنے پر طلاق واقع ہو جاتی ہے، لعان یہ ہے کہ شوہر بیوی پر بُرائی کی تہمت لگائے، عورت کو اس کا اقرار نہ ہو اور عدالت ان کو علاحدہ کر دے، علاحدگی کی پہلی تینوں صورتوں (خلع، ایلاء، لعان) کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور قاضی کے ذریعہ فسخ وتفریق کا ذکر حدیث میں آیا ہے، ان میں سے کسی بھی صورت میں زوجین کے درمیان علاحدگی کے لئے تحکیم کے مرحلہ سے گذرنا ضروری نہیں ہے؛ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہی ٹھہرا کہ ان اُمور کی طرح طلاق واقع ہونے کے لئے بھی پہلے ثالث کے ذریعہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں ہو۔

قانونی واخلاقی احکام کا فرق

ہر قانون میں کچھ احکام اخلاقی ہوتے ہیں اور کچھ قانونی، خاص کر مذاہب میں ایک بڑا حصہ اخلاقی قانون پر مشتمل ہوتا ہے، بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، دوسروں کا بوجھ اُٹھانے میں مدد کرنا اور پڑوسیوں کو بھوکا نہ رہنے دینا وغیرہ، کتنے ہی احکام ہیں جو اخلاقیات میں سے ہیں، ان کو قانون کا درجہ حاصل نہیں۔

نکاح وطلاق سے متعلق بھی بہت سے اخلاقی قوانین ہیں، مثلاً یہ کہ ایسے طہر میں طلاق نہ دی جائے، جس میں شوہر بیوی سے قربت کر چکا ہے، اسی طرح حالت حیض میں طلاق نہیں دی جائے؛ لیکن اگر طلاق دے ہی دے تو گو یہ فعل گناہ کا ہوگا؛ لیکن طلاق واقع ہو جائے گی، خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے جس واقعہ کا ذکر آیا ہے — کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی — کی طلاق کو طلاق شمار کیا گیا، حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے:

وکان عبد الله طلقها تطليقة واحدة فحسبت من طلاقها۔ (۱)

(۱) رواہ مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۷۱۔

پس مصالحانہ تدبیروں کے سلسلہ میں قرآن کے جن احکام کا اوپر ذکر آچکا ہے، وہ اولاً تو خاص طلاق سے متعلق نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا تعلق ازدواجی زندگی کے تمام ہی مسائل سے ہے، دوسرے یہ احکام اخلاقی نوعیت کے ہیں، یہ شرط کے درجہ میں نہیں ہیں کہ جب تک ان مراحل کی تکمیل نہ ہوجائے طلاق واقع ہی نہ ہو۔

تحکیم کا حکم طلاق سے متعلق ہے؟

عدالتیں جن آیات سے اس سلسلہ میں استدلال کررہی ہیں، وہ یہ ہیں :

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ، وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ (النساء:۳۴-۳۵)

مرد عورتوں پر نگراں ہیں؛ اس لئے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، پس نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کی عدم موجودگی میں جیسا کہ اللہ نے محفوظ رکھا ہے، اپنی (عزت وآبرو اور مال) کی حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں اندیشہ ہو، ان کو نصیحت کرو، ان سے بستر الگ کرلو اور ان کی سرزنش کرو، اگر وہ فرمانبرداری کریں تو ان پر (زیادتی کا) راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ بلندی اور بڑائی والے ہیں، اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک

حکم عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں
گے تو اللہ ان کے درمیان جوڑ پیدا کردیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ
علم والے اور باخبر ہیں۔

ان آیات میں مرد وعورت کا مقام بتایا گیا ہے کہ مرد صدر خاندان ہے اور عورت پر جائز اُمور میں اس کی اطاعت واجب ہے؛ چوں کہ حقوق اور فرائض کے بارے میں اکثر نزاع پیدا ہوجاتی ہے اور میاں بیوی کی ہمہ وقتی رفاقت کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع کا امکان زیادہ ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر میاں بیوی کے بارے میں بتایا گیا کہ اگر بیوی شوہر کے حقوق کے بارے میں کوتاہی کرے اور اس کی وجہ سے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے شوہر ذاتی طور پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرے اور اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں :

(۱) پند ونصیحت کے ذریعہ سمجھانا۔

(۲) عارضی طور پر ترک تعلق۔

(۳) تنبیہ وفہمائش۔

اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو سماج کو چاہئے کہ باہمی جھگڑے طے کرنے کے لئے دونوں خاندان سے ایک ایک حَکَم لے کر اختلاف کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔

یہ پورا مضمون ان ہی دو آیتوں میں آیا ہے، نہ اس سے پہلے دُور تک طلاق کا ذکر ہے نہ اس کے بعد، اگر یہ آیت طلاق سے متعلق ہوتی تو اس ارشاد کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آتا، یہ تو ایک عمومی نصیحت ہے؛ چوں کہ ازدواجی رشتہ خاندان کے استحکام کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے؛ اس لئے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں دراڑ پیدا نہیں ہونی چاہئے، شوہر بھی ذاتی طور پر اس کے لئے کوشش کرے اور سماج بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے، اس کا تعلق خاص طلاق کے مسئلہ سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ میاں بیوی میں کسی بھی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو اسے اسی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس آیت کے پس منظر میں زوجین کو نصیحت کی جاسکتی ہے کہ طلاق میں عجلت نہیں کرنی چاہئے؛ بلکہ اگر تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہوجائے تو اس کو حل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے اور آخری چارہ کار کے طور پر ہی طلاق دی جائے؛ لیکن اس کی حیثیت طلاق کے لئے شرط کی نہیں ہے اور غور کریں تو ان آیتوں میں جن مراحل کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں تین (پند ونصیحت، ترک تعلق، نیز فہمائش) تو وہ ہیں، جن کا تعلق شوہر اور بیوی کی خلوت سے ہے، ان کو تو عدالت کے سامنے ثابت کرنا بھی دشوار ہے، اگر ان دونوں آیتوں میں آنے والے احکام کو طلاق کے مسئلہ سے جوڑا جائے اور طلاق واقع ہونے کے لئے طلاق سے پہلے ان اُمور کو پورا کرنا شرط قرار دیا جائے تو عدالت میں طلاق واقع ہونے کی بات ثابت کرنا شاید ناممکن ہوجائے۔

کیا تحکیم لازم قرار دینا عورتوں کے مفاد میں ہے؟

یہ بات بادی النظر میں بہتر معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کا فیصلہ آخری چارہ کار کے طور پر کیا جائے، اس سے پہلے باہمی صلح وصفائی کی تدبیریں کی جائیں، انھیں تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر زوجین آپس میں مسئلہ کو حل نہ کرسکیں تو خاندان کے بزرگوں، یا سماج کے کسی اور ذمہ دار شخص کے ذریعہ نزاع کو سلجھانے کی کوشش کریں، قرآن نے اگرچہ ثالثی سے طلاق کو مربوط نہیں کیا ہے؛ لیکن زوجین کے اختلاف حل کرنے کی مختلف تدبیریں بتائی ہیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی ہے، جس کا سورۂ نساء کی آیت نمبر: ۳۴، ۳۵ میں ذکر آیا ہے؛ البتہ اس کو لازم قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ طلاق کے معتبر ہونے کے لئے اس کو شرط کا درجہ دیا گیا ہے۔

غور کیا جائے تو اس کو لازم نہ کرنے میں عورتوں ہی کا مفاد ہے؛ کیوں کہ طلاق زندگی کا بند دروازہ نہیں ہے، جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہو؛ بلکہ یہ ایک مرحلہ کا اختتام ہے اور دوسرے مرحلہ کا آغاز ہے، طلاق کے ذریعہ زندگی کا ایک باب بند ہوتا ہے اور دوسرا کھلتا ہے، عورت کا پہلا رشتۂ نکاح ختم ہوجاتا ہے اور دوسرے نکاح کی راہ ہموار ہوتی ہے، اگر شوہر پر یہ بات لازم قرار دی جائے کہ وہ ان اسباب ووجوہ کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے اس نے طلاق دی

ہے تو ہو سکتا ہے کہ بہت سی دفعہ ان کا ظاہر کرنا خود عورت کے مفاد میں نہ ہو، ایسے مواقع پر ایک شریف اور باعزت میاں بیوی اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ علاحدگی ہو جائے اور ایسے واقعات پردہ ہی میں رہیں؛ تاکہ کسی فریق کی بے عزتی اور بے آبروئی نہ ہو، اور اگر طلاق کا سبب عورت کی طرف سے پائی جانے والی کوتاہیاں نہ ہوں، تب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ خدا ناترس شوہر جھوٹ بولے اور اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرے؛ تاکہ طلاق دینے کے عمل کو درست ثابت کر سکے۔

ہر دو صورت میں عورت کے لئے آئندہ زندگی کا آغاز مشکل ہو جائے گا، جب سماج تک یہ بات پہنچے گی کہ فلاں عورت پر بدکردار، بد اخلاق، بدزبان اور نافرمان ہونے کا الزام ہے تو غور کیجئے کہ کوئی شخص اس کو اپنی بیوی یا بہو بنانے کو تیار ہوگا؟ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ کی صورت حال یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کا رشتہ ملنا دشوار ہوتا ہے، وہاں کیا ایسی مطلقہ عورتوں کا رشتہ ملنا آسان ہوگا، جن کی کمزوریاں طشت از بام ہو چکی ہوں؟ یا وہ ہوں تو بے قصور؛ لیکن انھیں بدنام کر دیا گیا ہو؟ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ طلاق سے پہلے تحکیم کو ضروری قرار دینا نتیجہ کے اعتبار سے عورت کے لئے نقصاندہ ہے نہ کہ فائدہ مند۔



نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ
شریعت اور انصاف کے آئینہ میں

جہاں تک قانون شریعت کی بات ہے تو شریعت میں ایک شخص کا نفقہ دوسرے شخص پر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے :

(۱) قرابت۔

(۲) حبس۔

(۳) ملکیت۔

ماں باپ ، بال بچے ، بھائی بہن ، دادا ، دادی اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے ، قرابت کی بناء پر نفقہ واجب قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں دو اُصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ، ایک یہ کہ قرابت کی بنا پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا ، جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو ، دوسرے : اس شخص پر واجب ہوگا جو اتنا خوش حال ہو کہ ضروری حد تک اپنی ضروریات پوری کر کے اس شخص کی کفالت بھی کر سکتا ہو۔

ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو ، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا ، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا ، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے ، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کر کے کھالے ، یا فروخت کر دے اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کر دے ، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں ہے اور دیانت و اخلاق کے خلاف ہے۔

''حبس'' کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا، جس کی وجہ سے وہ پابندی کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ گورنمنٹ اور آجرین پر اسی لئے واجب ہے؛ کیوں کہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہیں۔

بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے؛ بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور اُمور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے؛ اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب و تنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال و خود مکتفی، اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

پھر جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہوجاتی ہے تو عدت گذارنے کے بعد وہ اپنے سابق شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کر سکتی ہے؛ اس لئے کہ اس کو نہ سابق شوہر سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ سابق شوہر کو اس کو ملازمت یا کسی اور بات سے روکنے کا حق ہے؛ اس لئے اب ''حبس'' کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، نیز یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی؛ کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی رشتوں کی طرح اٹوٹ رشتہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہوجاتا ہے؛ اس لئے طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی، جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ مالک اور مملوک، اسلام سے پہلے عورت کو بعض سماج میں مرد کی ملکیت اور جائیداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹادیا اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر ہیں: ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''۔ (البقرۃ:۲۲۸)

غرض کہ اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی، جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

ہندو مذہب میں حقیقی تصور یہی تھا کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے اور ایک عورت کو ہمیشہ اسی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قیدِ نکاح سے آزاد نہیں کر سکتی، غالباً اسی تصور نے ''ستی'' کے رواج کو جنم دیا کہ جب شوہر مر جائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذرِ آتش کر دی جائے، پس چوں کہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں ہے؛ اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں؛ اس لئے برادرانِ وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آچکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہو سکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا ایک اعلیٰ تصور ہے کہ شوہر و بیوی ایک معاہدہ کے تحت ازدواجی رشتہ کے بندھن میں بندھتے ہیں اور بڑی حد تک مساوی حیثیت کے مالک ہیں، پھر جب کسی ایک کی خواہش پر نکاح ختم ہو جائے تو وہ اپنی اپنی زندگی کے بارے میں آزاد ہیں، دونوں کی اس حیثیت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس مرد پر اس عورت کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

عقل و مصلحت کا پہلو

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا نامناسب بات ہے اور اس سلسلہ میں چند اُمور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے:

١- اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے رشتہ ختم کرنا چاہتا ہو، اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے درپے ہو جائے گا اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے، جو روز ہمارے یہاں اخبارات کی سرخیاں بنتے رہتے ہیں،

قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ نہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

۲- طلاق کے بعد بھی نفقہ واجب قرار دینے کا ایک منفی اثر یہ مرتب ہوسکتا ہے کہ مغربی ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی نکاح کی شرح کم ہوتی ہو جائے، مغربی ممالک میں طلاق کو ایک مشکل عمل بنا دیا گیا اور طلاق کی صورت میں مرد پر ڈھیر سارے واجبات عائد کر دیئے گئے، اس کی وجہ سے وہاں نکاح کی شرح گھٹتی جا رہی ہے، مثلاً: درج ذیل اعداد و شمار ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں:

ممالک	2010ء	2009ء	2000ء	1990ء	1980ء	1970ء	1960ء
آسٹریا	45	42	49	59	62	71	83
بلجیم	39	40	44	65	67	76	71
ڈنمارک	56	60	72	61	52	75	78
فرانس	39	39	50	51	62	78	70
جرمنی	47	46	51	65	63	75	95
یونان	50	52	45	58	65	70	77
ہالینڈ	45	44	55	65	64	95	77
اٹلی	36	38	50	56	57	73	77
پرتگال	47	49	48	76	79	79	78
اسپین	36	38	54	57	59	73	78
سویڈن	53	51	45	47	45	54	67
برطانیہ	45	43	52	66	74	85	75

۳- بدقماش اور بیمار ذہن عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح پریشان کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی؛ چنانچہ ایسے

واقعات سامنے آئے ہیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہے اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض بدقماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں اور بے راہ روی کو ترجیح دیں۔

۴- آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کے واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا، تو یہ کونسی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا؛ لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟ اور پھر کیا کوئی غیرت مند شریف عورت اس بات کو گوارا کر سکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو، اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی گزارے، جس نے اسے رد کر دیا ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

مسئلہ کا حل

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہرگز نہیں، اس سلسلہ میں چند نکات کو ملحوظ رکھنا چاہئے :

● اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا؛ اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور چچا وغیرہ سے میراث کی حقدار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسب مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی اعزہ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا۔

● اکثر طلاق کے وقت مہر کی صورت میں ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کر کے کچھ گذران حاصل کر سکتی ہے۔

● اگر اس کی پرورش میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو لڑکوں کی عمر آٹھ سال ہونے تک اور لڑکیوں کی بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حقدار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اُجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے، یہ اُجرت حضانت اتنی ہونی چاہئے کہ بچہ کی پرورش کرنے والی عورت کے کھانے پہننے اور رہائش کی ضرورت پوری ہو جائے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

● سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے ایسی خواتین کے نکاح ثانی کا حکم دیا ہے: ''وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ'' (النور: ۳۲) اس لئے سرپرستوں کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ کنواری لڑکیوں کی طرح ان کے نکاح کی بھی فکر کریں۔

غرض کہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو؛ لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط رویہ سے بھی ہوتا ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو معاشرہ کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، سارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا؛ کیوں کہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں؛ بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیام آنے شروع ہو جاتے ہیں؛ اسی لئے دونوں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہے۔

● ● ●

نکاح وطلاق کے چند احکام

ہندو مذہب اور اسلامی شریعت میں!

سماج کے دو افراد کے درمیان باہمی تعلقات کے جو دائرے بنتے ہیں، ان میں سب سے اہم خاندانی تعلقات ہیں، انسان اور دوسرے جانوروں کے درمیان جن بنیادوں پر امتیاز قائم ہے، وہ یہی خاندان کی تشکیل ہے؛ اسی لئے ہر مہذب گروہ میں خاندانی زندگی کے قوانین کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، اس نقطۂ نظر سے اگر شریعت اسلامی کے قوانین کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ عدل، اعتدال اور انسانی فطرت کی رعایت پر مبنی ہے، مگر افسوس کہ فرقہ پرست گودی میڈیا آج کل اسلام کے عائلی قوانین پر انگلی اٹھاتا اور شیشہ کے گھر میں بیٹھ کر پتھر پھینکنے کا کام کررہا ہے، آیئے اس پس منظر میں ہم اسلامی شریعت اور برادران وطن کی بعض مذہبی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں :

● نکاح جو خاندان کی بنیاد ہے، اس کا آغاز رشتہ طے کرنے سے ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں واضح ہدایت دی ہیں کہ نکاح چار اسباب کے تحت کئے جاتے ہیں: خاندان (نسب)، خاندانی وجاہت (حسب)، مال ودولت اور دین واخلاق، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چوتھی بنیاد درست ہے؛ اس لئے دین واخلاق کی حامل بیوی کا انتخاب کرو، یہی معیار شوہر، داماد اور بہو کے انتخاب میں بھی ہونا چاہئے، اس میں کامیابی ہے: ''فاظفر بذات الدین'' (۱) عربوں میں ذات پات اور برادروی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، غیر عرب لوگوں کو بالخصوص سیاہ فاموں اور غلاموں کو چاہے وہ آزاد کردیئے گئے ہوں، بہت نیچا سمجھا جاتا تھا، آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام سے کیا، (۲) نیز حضرت بلال حبشیؓ اور دوسرے عجمی نژاد صحابہؓ کا نکاح عرب کے معزز قبائل میں کرایا؛ تاکہ اس تصور کو ختم کیا جائے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الاکفاء فی الدین، حدیث نمبر: ۵۰۹۰۔

(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی، باب لا یرد نکاح غیر الکفؤ اذا رضیت بہ الزوجۃ، حدیث نمبر: ۱۳۷۸۲۔

اس کے برخلاف برادرانِ وطن کے یہاں رشتہ طے کرنے میں ذات برادری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے؛ چنانچہ منوجی کہتے ہیں :

ایک شودر کی بیوی صرف شودر عورت ہی ہو سکتی ہے، جب کہ ایک ویش کی بیویوں میں سے ایک اس کی ہم مرتبہ یعنی ویش اور دوسری شودر ہو سکتی ہے، کشتری کی بیویوں میں سے ایک اس کی ہم مرتبہ یعنی کشتری اور دوسری ویش یا شودر ہو سکتی ہے، جب کہ برہمن کی بیویوں میں سے ایک اس کی ہم ذات اور باقی کشتری یا ویش یا شودر ہو سکتی ہیں۔ (۱)

• ہندو مذہبی کتابوں میں رشتہ کے لئے لڑکی کی بعض خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے :

شادی کسی ایسی لڑکی سے نہ ہو، جس کے (بال) سرخ ہوں، نہ اس سے جس کا کوئی عضو زائد ہو، نہ اس سے جو طبعاً علیل ہو، نہ اس سے جس کے بال نہ ہوں، یا بہت زیادہ ہوں، اور نہ ہی اس سے جو سرخ آنکھوں والی ہو، یا باتونی ہو، نہ اس کے ساتھ جس کا نام کسی ستارے کے مجمع، درخت یا دریا کے نام پر ہو، نہ اس کے ساتھ جس کے نام کا کوئی حصہ نچلی ذاتوں یا کسی پہاڑ کے لئے مخصوص نام پر مشتمل ہو، اس کا نام یا نام کا کوئی حصہ کسی پرندے، سانپ یا غلام کے نام پر نہیں ہونا چاہئے، اور نہ ہی (ایسی چیز کے نام پر جو) دہشت انگیزی کا تاثر دیتی ہو، شادی ایسی لڑکی سے ہو، جس کے اچھے معانی ہوں، چال، ہنس یا ہاتھی جیسی، سر اور جسم کے بال زیادہ ہوں نہ کم، دانت چھوٹے اور اعضاء کامل ہوں۔ (۲)

---

(۱) منودھرم شاستر، باب ۳/ اشلوک ۱۳۔

(۲) منودھرم شاستر، باب: ۳/ اشلوک: ۱۰۸۔

اسلام کی نظر میں نکاح کے لئے اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ اس کا نام کیا ہے، رشتہ کے انتخاب میں اپنی پسند کا لحاظ کرنا جائز تو ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص صورت کی لڑکی سے نکاح کرنے کو ناپسند کیا گیا ہو، اسی طرح نکاح کا تعلق نکاح کرنے والے مرد وعورت سے ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ لڑکی کا بھائی ہے یا نہیں ہے؟ اللہ نے اس دنیا میں مختلف شکل وصورت اور الگ الگ صلاحیتوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو پیدا فرمایا ہے، کسی کو بھائی دیئے ہیں اور کسی کو بھائی نہیں دیئے ہیں، اگر نکاح کے لئے ایسی شرطیں لگائی جائیں تو یہ غیر فطری ہوں گی، اور بہت سے لڑکے اور لڑکیاں نکاح جیسی ضرورت سے محروم ہو جائیں گے۔

اسی طرح ہندو مذہب میں بیوہ عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا، جب کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو اسے زندگی بھر تجرد کی زندگی گزارنی ہے، اسلام میں چاہے کوئی کنواری لڑکی ہو یا مطلقہ اور بیوہ عورت ہو، تجرد کی زندگی گزارنا بہتر نہیں ہے، اور اس بات کو پسند کیا گیا ہے کہ وہ ازدواجی رشتہ میں بندھ جائے: ''فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ'' (البقرہ:۲۳۲) اور ان کے سرپرستوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کے نکاح کی فکر کریں: ''وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ'' (النور:۳۲) ظاہر ہے کہ کسی بیوہ عورت کو نکاح سے روک دینا اس کے فطری تقاضوں کا خون کرنا اور اس کو بے سہارگی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کرنا ہے، نیز یہ کھلی ہوئی ناانصافی ہے کہ بیوی کے گزر جانے کے بعد مرد کو دوسرے نکاح کی اجازت ہو اور عورت کو اس کی اجازت نہیں ہو۔

● اسلام میں لڑکے اور لڑکی کے لئے شادی کی کوئی عمر متعین نہیں ہے؛ اگرچہ بہتر ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح کرے، جس کا اشارہ قرآن مجید میں موجود ہے، (النساء:٦) لیکن اگر مناسب رشتہ میسر آجائے تو نابالغ کا نکاح بھی کیا جاسکتا ہے، ہندو مذہب بھی یہی کہتا ہے؛ چنانچہ سیتا جی کہتی ہے :

> جب ہماری شادی کو بارہ برس گزر گئے، اس وقت میرے شوہر کی عمر پچیس اور میری عمر اٹھارہ برس تھی۔ (۱)

(۱) راماین: ارنیہ کانڈ، سرگ: ۴۷ / اشلوک: ۱۱، ۱۰، ۴۔

سیتا جی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ چھ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی؛ بلکہ ہندو مذہب میں ترغیب دی گئی ہے کہ لڑکیوں کی شادی کم عمری میں کر دینی چاہئے :

چار سے دس برس کی عمر کے اندر ہی باپ کو اپنی لڑکی کا بیاہ کسی صاحب علم، معروف جوان اور اچھے خاندان کے لڑکے سے کر دینی چاہئے، جو باپ اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کرتا، وہ جہنم میں جائے گا۔(۱)

بلکہ بعض مذہبی ماٰخذ میں تو بلوغ سے پہلے ہی لڑکی کی شادی کا حکم دیتے ہوئے جو ایسا نہ کرے، اس کو گناہ گار قرار دیا گیا ہے :

بلوغت کو پہنچنے سے قبل ہی لڑکی بیاہ دینی چاہئے، جو شخص (یعنی لڑکی کا سرپرست) ایسا نہیں کرتا، وہ گنہگار ہوگا، حتیٰ کہ بعض (علماء) کے مطابق لڑکی کپڑے پہننے (کی عمر) سے پہلے ہی بیاہ دینی چاہئے۔(۲)

● ہندو مذہب میں اس کی بھی تلقین کی گئی ہے کہ مرد عورت کے درمیان عمر کے اعتبار سے زیادہ فرق ہونا چاہئے؛ چنانچہ منو جی فرماتے ہیں :

تیس سال کا مرد بارہ سال کی لڑکی سے شادی کرے گا، جو اسے خوش رکھ سکے، یا چوبیس سال کا مرد آٹھ سال کی لڑکی سے شادی کرے، تاہم دوسرے فرائض حائل نہ ہوں تو اسے جلد شادی کر لینی چاہئے۔(۳)

اسلام میں عمر کے فرق کے سلسلہ میں کوئی تصور نہیں ہے، آپ ﷺ نے اپنے سے زیادہ عمر کی خاتون سے بھی نکاح فرمایا ہے، برابر عمر کی خاتون سے بھی اور اپنے سے کم عمر کی خواتین سے بھی۔

● کن رشتہ داروں سے نکاح حلال ہے اور کن سے نکاح حرام ہے؟ اسلام میں اس

---

(۱)　برہی پران: ادھیائے، ۱۶۵، اشلوک: ۷۔

(۲)　گوتم دھرم سوتر، ادھیائے: ۱۸، اشلوک: ۲۱ تا ۲۳۔

(۳)　منو دھرم شاستر: باب، ۹، اشلوک: ۹۴۔

سلسلہ میں تفصیلی ہدایت دی گئی ہے، اور قرآن مجید کا پورا ایک رکوع اسی مسئلہ سے متعلق ہے، (النساء: ۲۳) ہندو مذہب میں اس کے لئے گوتر قانون ہے، گوتر سے مراد ہے: قبیلہ اور خاندان، یعنی اپنے خاندان میں نکاح نہیں ہوسکتا۔

اولاً تو ہندو دھرم میں ذات پات کا تصور بہت گہرا ہے، جس ذات کو نیچ سمجھا جاتا ہے، اونچی ذات والی لڑکی سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا؛ لیکن خود اپنی برابری میں نکاح کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ہی گوتر سے تعلق نہ رکھتے ہوں، اسی قانون کے تحت چچا زاد، خالہ زاد، ماموں زاد وغیرہ کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا، اگر سات نسلوں میں بھی ان کا رشتہ مل جاتا ہے تب بھی وہ ایک دوسرے کے لئے حرام ہیں، اس طرح رشتوں کے انتخاب کے مواقع بہت محدود ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں سگے بھائی بہن کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا، سگے بھائی بہن سے یہ مراد ہے کہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں، یا مائیں الگ ہوں دونوں کے باپ ایک ہوں، یا باپ الگ ہوں اور مائیں ایک ہوں، ان کے درمیان حرمت کی ایک تو اخلاقی مصلحت ہے، دوسری طبی، اخلاقی مصلحت یہ ہے کہ جن دو لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان دائمی طور پر حرمت کا رشتہ ہوتا ہے، ان میں طبعی طور پر جنسی تعلق کا تصور ختم ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کو اس کی بہن کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے تو وہ اس کو بدترین گالی تصور کرتا ہے، اور مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے، عام طور پر سگے بھائی بہن ایک گھر میں زندگی گزارتے ہیں، ایک ساتھ رہن سہن ہوتا ہے، اور بے تکلفی ہوتی ہے، اگر ان کو ایک دوسرے کے لئے حرام قرار نہ دیا جائے تو ان دونوں کے درمیان جنسی تعلق سے جو طبعی نفور ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے گا، بھائیوں اور بہنوں کے درمیان ناجائز تعلقات کے واقعات بڑھ جائیں گے، اب اگر ان کے درمیان جسمانی رشتے قائم نہ ہوں، تب بھی کسی اور مرد سے لڑکی کا نکاح ہوگا، تو لڑکی کے شوہر کے دل میں اپنی بیوی کے بارے میں شبہ پیدا ہوگا، اور زندگی میں کڑواہٹ کا سبب بن سکتا ہے؛ طبی مصلحت یہ ہے کہ قریب ترین رشتہ دار سے نکاح کی صورت میں خلقی نقص کے ساتھ اولاد کے پیدا ہونے کا قوی

اندیشہ ہے، جن قبائل میں اس طرح کی شادیاں ہوتی ہیں، وہاں ایسے واقعات پیش آتے ہیں، موجودہ دور میں جینیٹک سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ شادی اجنبیوں سے یا دور کے رشتہ داروں سے ہونی چاہئے۔

اسلام نے بہت قریبی خونی رشتہ داروں کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان رشتۂ نکاح کو جائز قرار دیا ہے، جیسے: چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد وغیرہ، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ رشتے تلاش کرنا آسان ہوتا ہے، دونوں پہلے سے ایک دوسرے کی شکل وصورت اور اخلاق وعادات سے واقف ہوتے ہیں؛ اس لئے بعد میں اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہیں آتی، دوسرے: خاندان میں کچھ ایسے بزرگ ہوتے ہیں، جو دونوں کے نزدیک قابل احترام سمجھے جاتے ہیں، جب کبھی میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو یہ بزرگ شخصیتیں مسئلہ کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور زندگی کی گاڑی پٹری سے ہٹ کر پھر اپنی پٹری پر واپس آجاتی ہے۔

● اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان نکاح کے سلسلہ میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں نکاح عقد ہے، عقد کے معنیٰ ہیں: باہمی معاہدہ، یعنی شوہر و بیوی معاہدہ کے دو فریق ہوتے ہیں، اس میں ایک فریق مالک اور دوسرا فریق مملوک نہیں ہوتا، قریب قریب دونوں کا درجہ برابر ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے: ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ'' (البقرۃ: ۲۲۸) ہندو مذہب میں نکاح کو ''کنیا دان'' کہا جاتا ہے، کنیا کے معنی دلہن کے ہیں، اور دان کے معنیٰ عطیہ کے ہیں، گویا لڑکی کا باپ لڑکی کو اپنے داماد کو عطیہ کر دیتا ہے، شوہر کی حیثیت مالک کی اور عورت کی حیثیت اس کی ملکیت کی ہوتی ہے، اس تصور سے ہندو معاشرہ میں دو اور تصورات پیدا ہوئے، ایک: ستی کا رواج کہ جب شوہر کا انتقال ہو اور ہندو رسم ورواج کے مطابق اس کی لاش جلائی جائے تو بیوی کو بھی اس کے ساتھ جل جانا چاہئے، یہ رسم ہندو سماج میں بہت قوت کے ساتھ رائج تھی، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اگرچہ ہندو رعایا کے لئے ان کے مذہبی قوانین باقی رکھا اور ان میں دخل نہیں دیا؛ لیکن ستی کی ظالمانہ اور غیر انسانی رسم کو منع کر دیا، اس کے باوجود بعض دفعہ ہندو معاشرہ میں ستی کے اکا دکا واقعات پیش آہی جاتے ہیں۔

دوسرا تصور یہ پیدا ہوا کہ جب کوئی لڑکی کسی مرد کے نکاح میں چلی جائے تو پھر ان کے درمیان طلاق نہیں ہوسکتی، اُن کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ہی زندگی گزارنا ہے، شاید اسی لئے شادی کی رسم انجام دیتے وقت دلہا دلہن کے کپڑے ایک دوسرے کے ساتھ باندھے جاتے ہیں، آگ جلائی جاتی ہے اور یہ دونوں اس آگ کے گرد سات چکر لگاتے ہیں، یہ اس بات کا وعدہ خیال کیا جاتا ہے کہ سات جنم کے لئے شوہر و بیوی ایک دوسرے کے ساتھی ہیں؛ اسی لئے اصل ہندو مذہب میں طلاق کا تصور نہیں ہے، یہاں تک کہ شوہر کے مرنے کے بعد بھی نکاح ختم نہیں ہوتا اور عورت دوسرا نکاح نہیں کرسکتی؛ البتہ چوں کہ یہ ایک غیر فطری قانون ہے؛ اس لئے ہندوستان میں ۱۹۵۵ء میں ہندو میرج ایکٹ کے نام سے ایک قانون بنا، جس میں طلاق کی گنجائش فراہم کی گئی اور ہندو بیوہ عورت کو نکاح کی اجازت دی گئی۔

● چوں کہ ایک عورت کے بیوہ ہونے کے بعد ہمیشہ تجرد کی زندگی گزارنا ایک غیر فطری بات ہے؛ اس لئے اس کا حل نیوگ کی شکل میں تلاش کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دیور یا کسی اور مرد سے صنفی تعلق قائم کر کے اولاد حاصل کرے، پھر اس قانون کو وسعت دی گئی کہ اگر شوہر موجود ہو؛ لیکن باپ بننے کی صلاحیت نہ ہو تو عورت کسی اور مرد سے صنفی تعلق قائم کر کے اولاد پیدا کرسکتی ہے، مشہور ہندو عالم پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی معروف کتاب ''ستیہ پرکاش'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس عمل کو ''نیوگ'' کہتے ہیں؛ چنانچہ سوامی جی لکھتے ہیں :

> جب شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تب وہ اپنی عورت کو اجازت دے کہ اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی! تو میرے علاوہ دوسرے شوہر کی خواہش کر؛ کیوں کہ اب مجھ سے اولاد نہیں ہوسکے گی، تب عورت دوسرے مرد کے ساتھ نیوگ کر کے اولاد حاصل کرے؛ لیکن اس بیاہے مہاشے (خاوند) کی خدمت میں کمربستہ رہے، ایسے ہی عورت جب بیماری وغیرہ میں پھنس کر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تو اپنے شوہر کو اجازت دے کہ اے مالک! آپ اولاد کی اُمید مجھ سے چھوڑ کر کسی دوسری بیوہ عورت سے اولاد حاصل کرلیجئے۔

آج کل بعض ہندو رہنما نیوگ کا انکار کرتے ہیں؛ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ہندو دھرم کی مشہور کتاب ’’مہا بھارت‘‘ کے مطابق وید ویاس جی نے اپنے بھائیوں چتر انگ اور وچتر ویرج کے مرنے کے بعد ان کی بیویوں سے نیوگ کیا، جس سے دھرت راشٹر، پانڈو اور داسی پیدا ہوئے، سوامی دیا نند سرسوتی نے پوری قوت کے ساتھ ویدوں اور مذہبی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ نیوگ ایک جائز مذہبی بلکہ قابل ثواب عمل ہے، منو جی کی تعلیمات کو ہندو مذہب میں شریعت اور فقہ کا درجہ حاصل ہے، ان کے یہاں بھی بار بار اس کا ذکر ملتا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> اولاد حاصل نہ کرسکنے والی عورت اپنے دیور یا جیٹھ یا کسی اور مرد کے ساتھ اولاد کے لئے مباشرت کرسکتی ہے۔(۱)

ایک اور موقع پر کہتے ہیں :

> ’’مباشرت کے لئے مقرر کیا گیا مرد جسم پر گھی لگا کر خاموشی سے رات کو رجوع کرے گا‘‘۔(۲)

اگر چہ منو جی نے یہ نصیحت بھی کی ہے کہ :

> مقصد پورا ہو جانے کے بعد دونوں فریق ایک دوسرے کے لئے باپ اور بہو کی طرح ہوں گے۔(۳)

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ نیوگ کا تعلق قائم ہونے کے بعد پھر کیا ان کے روابط میں ایسا تقدس قائم رہ سکتا ہے!!



---

(۱) منوشاستر: باب،۹، اشلوک:۵۹۔

(۲) منوشاستر: باب،۹، اشلوک:۶۰۔

(۳) منوشاستر: باب،۹/اشلوک:۶۲۔

حق میراث اور خواتین

اسلام سے پہلے دنیا کے اکثر مذاہب میں خواتین کا میراث میں کوئی حق نہیں سمجھا جاتا
تھا، عربوں کا خیال تھا کہ جو لوگ قبیلہ کی مدافعت کر سکتے ہوں اور لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں،
وہی میراث پانے کے حقدار ہیں، یہودیوں میں سارا ترکہ پہلوٹھے کا حق مانا جاتا تھا، ہندوؤں
کے یہاں بھی عورت کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک
یورپ میں عورتوں کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، اسلام نے جہاں مرد رشتہ داروں کو حصہ
دلایا، وہیں ان کی ہم درجہ خواتین کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا، والد کی طرح والدہ کو، بیٹے
کی طرح بیٹی کو، بھائی کی طرح بہن کو، شوہر کی طرح بیوی کو، آج پوری دنیا میں خواتین کو جو ترکہ
کا مستحق مانا جاتا ہے، وہ دراصل شریعت اسلامی کا عطیہ ہے۔

ذوی الفروض اور خواتین

اسلام کے قانون میراث میں جن رشتہ داروں کو مقدم رکھا گیا ہے اور جو کسی حال میں
میراث سے محروم نہیں ہو سکتے، وہ چھ ہیں، جن میں تین مرد ہیں: باپ، بیٹا اور شوہر، تین عورتیں
ہیں: ماں، بیٹی اور بیوی، اس کے علاوہ خصوصی اہمیت ان حقداروں کو حاصل ہے، جن کو ذوی
الفروض کہا جاتا ہے، یعنی وہ اعزہ جن کے حصے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان میں مردوں سے
زیادہ تعداد خاتون رشتہ داروں کی ہے؛ اس لئے کہ مرد چھ حالتوں میں ذوی الفروض میں شمار کیا
جاتا ہے، اور عورت ١٧ حالتوں میں اس حیثیت سے میراث کی مستحق ہوتی ہے؛ چنانچہ یہاں
حصوں کا تناسب اور ان کی مستحق خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) دو تہائی

۱- دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں۔ ۲- دو یا دو سے زیادہ پوتیاں۔
۳- دو یا دو سے زیادہ سگی بہنیں۔ ۴- دو یا دو سے زیادہ باپ شریک بہنیں۔

(ب) نصف

۱- ایک بیٹی۔ ۲- ایک پوتی
۳- ایک سگی بہن۔ ۴- ایک باپ شریک بہن۔

(ج) ایک تہائی

۱- ماں۔ ۲- ماں شریک بہن۔

(د) چھٹا حصہ

۱- ماں۔ ۲- دادی۔
۳- پوتی۔ ۴- باپ شریک بہن۔
۵- ماں شریک بہن۔

(ھ) چوتھائی

۱- بیوی۔

(و) آٹھواں حصہ

۱- بیوی۔

اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ متعینہ حصوں میں سب سے زیادہ دو تہائی اور اس کے بعد نصف ہے، دو تہائی حصہ کا مردوں میں سے کوئی مستحق نہیں ہوتا، اور نصف کا مستحق بھی مردوں میں صرف شوہر ہو سکتا ہے، جب کہ میت کی اولاد نہ رہی ہو۔

مقدار کے اعتبار سے خواتین کے حصہ پانے کی چار حالتیں ہوتی ہیں :

۱- جب عورت کا حصہ اپنے ہم درجہ رشتہ دار مرد کے مقابلہ آدھا ہوتا ہے۔

۲- جب مرد اور عورت کا حصہ برابر ہوتا ہے۔

۳- جب عورت کا حصہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴- جب عورت وارث ہوتی ہے اور مرد وارث نہیں ہوتا ہے۔

یہاں ان تمام صورتوں کا احاطہ مقصود نہیں ہے، لیکن اجمالی طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے :

عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ نصف

اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار کے مقابلہ عورت کے نصف حصہ پانے کی صورتیں یہ ہیں :

۱- بیٹے کے ساتھ بیٹی : مثلاً کسی نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو چھوڑا اور اس کا ترکہ تین لاکھ روپے ہو تو ایک لاکھ بیٹی کا حق ہوگا اور دو لاکھ بیٹے کا۔

۲- باپ کے ساتھ ماں : بشرطیکہ اولاد اور شوہر یا بیوی نہ ہو، اس صورت میں ماں کو ایک تہائی ملے گا اور عصبہ ہونے کی بناء پر باپ کو دو تہائی مل جائے گا۔

۳- حقیقی بہن یا باپ شریک بہن، حقیقی بھائی یا باپ شریک بھائی کے ساتھ وارث ہو، یعنی میت نے والدین، یا اولاد، شوہر، یا بیوی کو نہ چھوڑا ہو، صرف حقیقی بھائی اور حقیقی بہن، یا باپ شریک بھائی، یا باپ شریک بہن اس کے وارث ہوں، اس وقت بہن کے مقابلہ بھائی کا حصہ دوگنا ہوگا، مثلاً : ایک حقیقی بھائی اور ایک حقیقی بہن ہو، تو بھائی کو دو تہائی ملے گا اور بہن کو ایک تہائی۔

۴- شوہر کا حصہ بمقابلہ بیوی کے دوہرا ہوگا، یعنی اگر بیوی کا انتقال ہوا اور اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، تو شوہر کو اس کے ترکہ کا نصف مل جائے گا اور اولاد بھی چھوڑی ہو تو چوتھائی ملے گا، اس کے برخلاف شوہر کے ترکہ میں سے بیوی کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں چوتھائی اور اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ ملے گا۔

مردوں کے برابر حصہ

جن حالات میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر ہوتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں :

۱- میت نے ماں، باپ اور بیٹے کو چھوڑا ہو، تو ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا، اسی طرح اگر اس نے ماں، باپ اور دو بیٹیوں کو چھوڑا، تب بھی ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا اور دو تہائی بیٹیوں کو ملے گا، نیز اگر کسی عورت نے شوہر، باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اس صورت میں میں بھی ماں اور باپ چھٹے حصہ کے مستحق ہوں گے۔

۲- ماں شریک بھائی بہن کا حصہ بھی برابر ہوگا، جیسے ایک عورت نے شوہر کو، ماں کو اور ماں شریک بھائی کو چھوڑا تو وہ بھی چھٹے حصہ کا مستحق ہوگا، اگر شوہر اور ماں کے علاوہ صرف اخیافی بہن کو چھوڑا تو وہ بھی چھٹے حصے کی ہی مستحق ہوگی، اسی طرح اگر کسی عورت کا انتقال ہوا، اس کے ورثہ، شوہر، ماں، اخیافی بھائی اور اخیافی بہن ہوں تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، چھٹا حصہ ماں کا اور ایک تہائی میں بھائی اور بہن کا حصہ برابر ہوگا۔

۳- بہت سی حالتیں ایسی ہیں کہ اگر مرنے والے کا ایک ہی وارث ہو، خواہ مرد ہو یا عورت، تو وہ پورے ترکہ کا حقدار قرار پاتا ہے، جیسے: باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، ماموں اور چچا، اسی طرح خاتون رشتہ داروں میں: ماں، بیٹی، بہن، بیوی، خالہ اور پھوپھی، مثلاً: اگر کسی شخص کے انتقال پر صرف اس کا بیٹا ہی باقی بچا ہو تو وہ پورے ترکہ کا حقدار ہوگا؛ اس لئے کہ وہ عصبہ ہے، اسی طرح اگر اس نے صرف بیٹی کو چھوڑا ہو تو وہ پورے ترکہ کی حقدار ہوگی، نصف تو اس کا متعینہ حصہ ہوگا اور باقی نصف اس کو بطور ''رد'' کے ملے گا۔

۴- بعض دفعہ حقیقی بہن اور حقیقی بھائی کا حصہ بھی برابر ہو جاتا ہے، جیسے: ایک عورت نے شوہر اور ایک حقیقی بھائی کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حق ہوگا اور نصف بھائی کا، اسی طرح اگر شوہر اور حقیقی بہن کو چھوڑا تو نصف شوہر کا حصہ ہوگا، اور نصف حقیقی بہن کا، اگر اس نے شوہر اور حقیقی بھائی کے علاوہ ایک بیٹی کو بھی چھوڑا ہے، تو شوہر چوتھائی ترکہ کا اور بیٹی نصف ترکہ کی مستحق ہوگی، باقی بھائی کا ہوگا، اگر یہاں حقیقی بھائی کے بجائے حقیقی بہن ہو تو باقی اس کو ملے گا؛ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقی بھائی اور ماں شریک بہن کا حصہ برابر ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت نے شوہر کو، ماں کو، ماں شریک بہن کو اور حقیقی بھائی کو چھوڑا ہو تو نصف ترکہ کا

مستحق شوہر ہوگا، چھٹا حصہ ماں کو ملے گا، حقیقی بھائی اور اخیافی بہن دونوں چھٹے حصے کے حقدار ہوں گے؛ حالاں کہ رشتہ کے اعتبار سے یہ بھائی اس بہن سے زیادہ قریب ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ بہت سی ایسی صورتیں بنتی ہیں، جن میں عورت اپنے ہم درجہ مرد رشتہ دار کے برابر حصہ پاتی ہے۔

مردوں سے زیادہ حصہ

بہت سی صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں سے بڑھ جاتا ہے، چند صورتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں :

۱- اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس نے شوہر، باپ، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا اور بالفرض اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے پر مشتمل ہو تو دونوں بیٹیوں کو بتیس لاکھ روپئے یعنی فی کس سولہ لاکھ روپئے ملیں گے، اور اس نے شوہر، باپ، ماں کے علاوہ دو بیٹوں کو چھوڑا ہو تو وہ پچیس لاکھ یعنی فی کس ساڑھے بارہ لاکھ روپئے کے حقدار ہوں گے، اسی طرح اگر کسی عورت کے ورثہ میں شوہر، ماں اور حقیقی بہنیں ہوں اور مثال کے طور پر اس کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو دونوں بہنوں کو چوبیس یعنی فی کس بارہ لاکھ ملے گا، اور اسی صورت میں اگر دو بہنوں کے بجائے دو حقیقی بھائی ہوں، تو ان کا حصہ سولہ لاکھ یعنی فی کس آٹھ لاکھ ہوگا، ان صورتوں میں عورتوں کا مقررہ حصہ دو تہائی اس حصہ سے بڑھ جاتا ہے، جو مرد کو بطور عصبہ حاصل ہوتا ہے۔

۲- بعض صورتوں میں عورت نصف ترکہ کی مستحق ہوتی ہے، یہ اس کا مقررہ حصہ ہے، جب کہ اس کے ہم درجہ مرد کا حصہ کم بنتا ہے، جیسے ایک عورت نے شوہر، باپ، ماں اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہو تو اگر ترکہ ایک کروڑ چھپن لاکھ روپئے پر مشتمل ہو تو بیٹی بہتر لاکھ کی مستحق ہوگی، اس صورت اگر بیٹی کی جگہ بیٹا ہو تو اس کا حصہ پینسٹھ لاکھ ہوگا، بعض دفعہ تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے، جیسے کسی عورت کے ورثہ میں شوہر ہو، ماں ہو اور حقیقی بہن ہو اور فرض کیجئے کہ مرحومہ کا ترکہ اڑتالیس لاکھ ہو تو بہن کا حصہ اٹھارہ لاکھ ہوگا اور اس صورت میں اگر بہن کے بجائے بھائی ہو تو اس کا حصہ صرف آٹھ لاکھ ہوگا۔

۳- بعض دفعہ عورت کا مقررہ تہائی حصہ بھی اپنے مقابل مرد رشتہ دار سے زیادہ ہوجاتا ہے، مثلاً: ایک شخص نے بیوی، ماں، دو حقیقی بھائی اور دو ماں شریک بہنوں کو چھوڑا اورفرض کیجئے کہ مرنے والے کا ترکہ اڑتالیس لاکھ روپئے تھا تو دونوں ماں شریک بہنوں کو سولہ یعنی فی کس آٹھ لاکھ روپئے ملیں گے اور دونوں حقیقی بھائیوں کا حصہ بارہ یعنی فی کس چھ لاکھ ہوگا، اسی طرح اگر عورت نے شوہر، دو ماں شریک اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہو اور مثلاً اس کا ترکہ ساٹھ لاکھ روپئے ہوتو دونوں بہنوں کا حصہ بیس لاکھ ہوگا اور دونوں بھائیوں کا دس دس لاکھ۔

۴- بعض دفعہ خواتین کا مقررہ حصہ ترکہ کا چھٹا حصہ ہوتا ہے؛ لیکن وہ اس کے مقابل مرد رشتہ دار سے بڑھ جاتا ہے، جیسے ماں شریک بہن کا مقررہ حصہ چھٹا حصہ ہے، اب اگر کسی عورت نے شوہر، ماں، ایک ماں شریک بہن اور دو حقیقی بھائیوں کو چھوڑا ہوتو اگر ساٹھ لاکھ ترکہ ہوتو بہن کو دس لاکھ ملے گا اور دو بھائیوں کو بھی دس لاکھ یعنی فی کس پانچ لاکھ ملے گا، اس طرح کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں۔

جب صرف عورت وارث بنتی ہے

بعض حالتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورت وارث بنتی ہے، مرد وارث نہیں بنتا، جیسے :

۱- ایک عورت نے شوہر، باپ، ماں، بیٹی، اور پوتی کو چھوڑا ہوتو پوتی چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی؛ لیکن اسی صورت میں اگر پوتی کے بجائے پوتا ہوتو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

۲- اسی طرح اگر شوہر، حقیقی بہن اور باپ شریک بہن وارث ہوں تو باپ شریک بہن چھٹے حصہ کی مستحق ہے اور اگر اس کی جگہ باپ شریک بھائی ہوتو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

ان کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہیں، جن میں خواتین حصہ پاتی ہیں اور ان کے مقابل مرد رشتہ دار حصہ نہیں پاتے۔

خواتین کا کم حصہ کب اور کیوں؟

اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ لازمی طور پر میراث میں حصہ پاتے ہیں، یعنی باپ، ماں،

بیٹا، بیٹی اور شوہر و بیوی، ان میں مردوں کا حق عورتوں سے زیادہ یا دوہرا رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کو مردوں اور عورتوں کے درمیان جنس کی بنیاد پر تفریق نہیں سمجھنا چاہئے، یہ اس اُصول پر مبنی ہے کہ جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی، ان کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے، اور جس کی ذمہ داری کم ہوگی، اس کے حقوق کم ہوں گے، اس اُصول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد سے واضح فرمایا ہے: ''الخراج بالضمان''۔(۱)

اس کا ماحصل یہ ہے کہ جو نقصان برداشت کرے گا، وہی فائدہ کا بھی حقدار ہوگا۔

اس پہلو سے اگر مردوں اور عورتوں کی مالی ذمہ داریوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی، مرد پر اپنی کفالت خود واجب ہے، بیوی کی ضرورت کو پوری کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اولاد کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت کے تمام اخراجات، نیز ان کی شادی بیاہ مرد کے ذمہ ہے، یہاں تک کہ اگر بیوی شیر خوار بچہ کو دُودھ پلانے پر آمادہ نہ ہو تو باپ کا فریضہ ہے کہ اس کے دُودھ کا انتظام کرے، والدین نیز یتیم، غیر شادی شدہ بھائیوں، بیوہ اور مطلقہ بہنوں کی کفالت بھی اکثر حالات میں وہی کرتا ہے، اولاد اگر خدانخواستہ اس دنیا سے گذر جائے تو پوتوں اور پوتیوں کی پرورش اس کی ذمہ داری ہے، غرض کہ تمام مالی ذمہ داریاں مردوں پر رکھی گئی ہیں، عورتوں پر اس ذمہ داری کا بہت کم حصہ عائد ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود اپنی کفالت کی ذمہ داری سے بھی آزاد ہیں، اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بیٹا، بیٹی، باپ، ماں اور شوہر و بیوی کے حصہ میراث میں اس سے بھی زیادہ تفاوت ہونا چاہئے تھا؛ لیکن خواتین کی خِلقی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے حصوں میں کم تفاوت رکھا گیا ہے۔

اس کو ایک اور طریقہ پر سمجھا جا سکتا ہے، شریعت میں والدین کی اہمیت و عظمت اولاد سے زیادہ ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ والدین کا حصہ زیادہ ہو اور اولاد کا حصہ کم ہو؛ لیکن اس کے برخلاف ترکہ میں ماں باپ کا حصہ کم ہے اولاد کا زیادہ؛ کیوں کہ ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الاجارہ، باب فی من اشتری عبداً فاستعملہ، حدیث نمبر: ۳۵۰۸، ترمذی، عن عائشہؓ، حدیث نمبر: ۱۲۸۵۔

فارغ ہو رہے ہیں، ان کی ذمہ داریوں کی بساط لپیٹی جارہی ہے اور اولاد ذمہ داریوں کے میدان میں قدم رکھ رہی ہیں؛ اس لئے اولاد کا حصہ زیادہ رکھا گیا اور والدین کا کم، غرض کہ قانون میراث کا گہرا تعلق نفقہ اور کفالت کے قانون سے ہے، جن کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں، ان کا حصہ بھی زیادہ ہے اور جن کی ذمہ داریاں کم ہیں، ان کا حصہ بھی کم ہے، یہ ایسا منصفانہ اُصول ہے جس کی معقولیت سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کرسکتا۔



عورتوں کی گواہی ☆

عورت کی نفسیاتی ساخت، دائرہ کار، زندگی کا محور اور معاشرتی ذمہ داریوں اور جذباتی عوامل کی وجہ سے عورتوں کے مخصوص مسائل کے علاوہ دیگر معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی کافی نہیں سمجھی گئی ہے؛ بلکہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ دوسری عورت بھی شریک رہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۔ (البقرۃ:۲۸۰)

اور اپنے دو مردوں کو اس پر گواہ بنالو، اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بناؤ، گواہ ایسے ہوں کہ وہ تمہاری نگاہ میں پسندیدہ ہوں، دو عورتیں اس لئے ہیں کہ اگر ایک بھٹک جائے تو دوسری اسے یاد دلادے۔

اس آیت کی تفسیر میں سید قطبؒ نے جو لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے گواہ کے لئے مردوں کو اس لئے رکھا ہے کہ مسلم سماج میں کاموں کی ذمہ داری عموماً مردوں کی ہوتی ہے، عورت کو اس سماج میں معاش فراہم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ معاش کے میدان میں آکر اپنی ممتا، نسوانیت اور سب سے بیش بہا انسانی سرمایہ کی حفاظت وتربیت کے اہم کام پر ظلم ڈھاتی ہے، یہ ظلم چند لقموں یا چند روپیوں کی خاطر ہوتا ہے؛ لیکن جب دو مرد گواہی کے لئے نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے گا، اس کی وجہ خود قرآن میں مذکور ہے کہ ایک سے غلطی ہوجائے تو دوسری اسے یاد دلادے گی۔

☆ سیرت سیمینار میں پیش کیا گیا مقالہ، از: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی (استاذ: جامعۃ الفلاح بلیریا گنج، اعظم گڑھ)۔

غلطی ہونے کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں، کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عورت معاملے کی تمام باریکیوں اور تقاضوں کا احاطہ نہیں کرپاتی اور اس کے ذہن میں وہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی، اس موقع پر دوسری عورت اسے یاد دلادے گی، غلطی ہونے کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عورت کی فطرت میں انفعالیت اور جذباتیت ہے اور یہ عورت اور بچے پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے، عورت کی اس فطرت کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک معاملے میں اس کی فطرت کچھ ہو اور دوسرے میں کچھ اور، گواہی کے معاملے میں انفعالیت سے پاک ہونے اور جذباتیت کے بغیر واقعات سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔(۱)

غرضیکہ صرف ایک عورت کی گواہی ناکافی ہونے کی دو وجہ ہے ایک یہ کہ اس کا دائرہ کار گھر ہے، اس سے اندرون خانہ کی ذمہ داریاں متعلق ہوتی ہیں، تجارتی اور کاروباری دنیا سے اس کا تعلق بہت کم ہوتا ہے، اس لئے باہر کی دنیا کے معاملات میں ان کے اندر دقیقہ رسی کی کمی ہوتی ہے اور ان کے مغالطہ میں پڑنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے؛ البتہ گھریلو مسائل اور عورتوں کے معاملات میں ان کا ذہن بہت تیز اور یادداشت بڑی اچھی ہوتی ہے؛ اس لئے اس طرح کے معاملات میں اس کی گواہی کی بڑی اہمیت ہے اور تنہا اس کی گواہی کافی ہے۔

دوسرے یہ کہ جذبات کی فراوانی، معاملہ فہمی پر اثر انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے واقعات کو اچھی طرح سمجھنا اور یاد رکھنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے؛ چنانچہ ماہرین نفسیات کا اس پر اتفاق ہے کہ خواتین میں کسی ایسی ذمہ داری کی صلاحیت قدرے کم پائی جاتی ہے جس میں ذہنی محنت، توازن واعتدال اور غیر جانب دارانہ فیصلے کی ضرورت ہو، ان کے اندر حقائق کے برعکس جذباتی فیصلے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے، ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہوتی ہے اور واقعات کے بیان میں ان میں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کی صفت غالب ہوتی ہے؛ حالاں کہ کسی معاملہ میں گواہی کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور جذبات وتعصّبات سے بالا ہوکر مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے۔

---

(۱) فی ظلال القرآن: ۷۸۲۔

ڈاکٹر ہارڈنگ اپنی کتاب "The Way of Allwomen" میں رقمطراز ہے کہ :

عورتوں کے لئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلے کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ بیان کریں۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ عورتیں تعلیمی زندگی میں حساب وغیرہ میں بہت کم دلچسپی رکھتی ہیں، بعض لوگوں نے دونوں صنفوں کے تعلیمی رجحانات پر ریسرچ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عام طور پر لڑکے حساب، سیاسیات، معاشیات، سائنس اور تکنیکی علوم میں بہتر استعداد کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کے برعکس لڑکیاں آرٹ، معاشرتی علوم، مذہب اور لسانیات سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں، ہائی اسکول کے متعدد گروپس پر نفسیاتی ٹیسٹ کرنے کے بعد سی، سی، مامگیز نے لکھا ہے کہ :

لڑکوں میں تحقیق و جستجو، تخلیق و ایجاد، اشیاء کی ماہیت کا ادراک، مہم جوئی، ذہانت، جرأت اظہار اور حقوق کے لئے جدوجہد کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، جب کہ لڑکیاں قدرے کمزور دل، لگے بندھے کام کاج، روایت پسندی، جذبہ ہمدردی اور جمالیاتی حسن میں لڑکوں سے آگے ہیں۔(۲)

اور ٹائمز آف انڈیا (۱۸ رجنوری ۱۹۸۵ء) میں یو، پی، آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوئی، جس کے الفاظ یہ ہیں :

عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اسے ترتیب دے سکیں اور عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں، یہ بات ایک روسی سائنس دان نے کہی، ڈاکٹر ولادیمیر کونوگوف نے

---

(۱) دیکھئے: عورت، اسلام اور جدید سائنس: ۳۶۶، از: حکیم محمد طارق محمود چغتائی۔

(۲) دیکھئے: عورت، اسلام اور جدید سائنس: ۳۶۶، از: حکیم محمد طارق محمود چغتائی۔

تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں، اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصیت ہے اور صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔(۱)

اور جب طبعی طور پر عورت کی یادداشت میں کمی ہے تو ایک مرد کی جگہ پر دو عورتوں کی گواہی کا اُصول ضرورت کی بنیاد پر ہے، فضیلت کی بنیاد پر نہیں، اسی کے ساتھ یہ ذہن نشیں رہے کہ مرد میں یاداشت اور قوت فیصلہ کی صلاحیت ایک اضافی صفت ہے، اس کی وجہ سے اسے کلی فضیلت حاصل نہیں ہوگی، دوسری نوعیت کی اضافی صفت خود عورت میں موجود ہے، اللہ عزوجل نے ہر ایک کو بعض ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے جو دوسرے میں نہیں ہے، اس لئے کسی کو حقیر اور کمتر اور دوسرے کو برتر سمجھنا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (۲)

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے، اس کی تمنا نہ کرو، جو کچھ مردوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے، اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق اس کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

لہٰذا جسے جو ملا ہے، اسے صحیح طریقے پر استعمال کر کے اللہ کی بندگی میں مشغول رہے اور انسانیت اور تمدن کی تعمیر میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرے، اور اللہ عزوجل نے جس خاص کام کے لئے اسے پیدا کیا ہے، اس میں اپنے آپ کو لگادے کہ اسلام کی نگاہ میں رنگ ونسل اور جنس

(۱) حوالہ سابق: ۱۰۰۔ (۲) النساء: ۳۲۔

کی کوئی حیثیت نہیں ہے؛ بلکہ کامیابی و ناکامی، فضیلت و بزرگی اور حقارت و پستی، فکر کی سلامتی اور عمل کی درستگی سے وابستہ ہے؛ اس لئے ایک عورت بھی مادی اور روحانی اعتبار سے ان تمام بلندیوں کو حاصل کرسکتی ہے، جہاں تک مرد کی رسائی ممکن ہے، اور مرد و عورت کی ذمہ داریوں میں اور دائرہ کار میں جو فرق رکھا گیا ہے، اس کی وجہ تقسیم کار اور انتظام ہے نہ کہ اعزاز اور امتیاز، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (النحل:۹۷)

جس نے بھی ایمان کی حالت میں اچھا کام کیا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہتر کاموں کا ضرور اجر و ثواب عنایت کریں گے۔

گواہی کے سلسلے میں عورتوں اور مردوں کے درمیان جو فرق کیا گیا ہے یہ صرف اسلام میں ہی نہیں ہے، دیگر مذہبی کتابوں میں بھی یہ تصور پایا جاتا ہے۔

چنانچہ ہندو مذہب کی معروف کتاب منودھرم شاستر (باب: ۸، اشلوک: ۷) میں کہا گیا ہے: عورت باکردار بھی ہو تو اس کی گواہی قبول نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ عورت کا فہم و ادراک متزلزل ہوسکتا ہے۔



بیوی کی تادیب ☆

غلط فہمی سے جڑے چند احکام میں ایک بیوی کی تادیب کا عنوان ہے، یہ مسئلہ اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس بابت قرآن کریم کی آیت وارد ہوئی ہے، جس میں مخصوص صورت حال میں بیوی کی تادیب کا حکم ہے، (۱) موجودہ مساواتِ مرد وزن کے ماحول میں اس قرآنی حکم اور اس کے پس منظر نیز اس کی صحیح نوعیت سے ناواقف کچھ کم علموں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام نے شوہر کے ہاتھ میں ڈنڈا تھما دیا ہے، جس سے وہ اپنی بیوی کی تادیب کرتے پھریں اور اگر شوہر نا ہنجار وظالم ہو تو اسلام نے بیوی کو اس کی تادیب کا اختیار نہیں دیا ہے، پس یہ عورت پر ظلم ہے، جس کی گنجائش اس ترقی یافتہ زمانہ میں نہیں ہو سکتی، بعض محتاط لوگوں نے یوں الگ راہ نکالنی چاہی کہ قرآن کا یہ حکم عرب کے اس جاہلی اور غیر متمدن سماج کے رواج کی عکاسی ہے، عرب کے قدیم سماج کے لئے تو یہ مناسب حکم تھا، اب یہ قابل عمل نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس حکم قرآنی کی نوعیت پر اظہار خیال کریں، ایک بدیہی سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ قرآن کی مکمل عملی تشریح ہے، اور قرآن کی ایک ایک آیت جو آپ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوئی، وہ آپ ﷺ کے پیکر عمل میں ڈھل کر سامنے آئی، قرآن کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا حکم ایسا نہیں ہے جس پر رسول مقبول ﷺ نے پہلے خود عمل نہ کیا ہو، جب یہ بات پوری طرح طے شدہ ہے، تب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ بیوی کی تادیب کے اس قرآنی حکم پر رسول اللہ ﷺ نے کس طرح عمل کیا؟ اس حکم کا جو مفہوم

☆ بین الاقوامی سیرت سیمینار میں پیش کیا گیا مقالہ، از: ڈاکٹر فہیم اختر ندوی (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)۔

(۱) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۹۵۔

اوپر ذکر ہوا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سب سے پہلے اس مفہوم کا نمونہ موجود ملتا، پھر تو آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایسا ڈنڈا نظر آتا، جس سے آپ ﷺ اپنی بیویوں کی تادیب کر رہے ہوتے، آپ ﷺ کی متعدد ازواج تھیں، جو مختلف مزاج اور ماحول سے تعلق رکھتی تھیں، آپ ﷺ کی زندگی ان کے تئیں قرآن کے اس حکم کی سراپا تعمیل ہوتی، تو کیا سیرت نبوی ﷺ میں بیوی کی تادیب کا عنوان اور مثال موجود ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سراپا رحمت پاکیزہ حیات میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے، آپ ﷺ کے اندرون خانہ کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات محفوظ ہیں، گھر کے اندر ازواج کے درمیان بعض باتوں پر نوک جھونک؛ بلکہ بعض باتوں پر آپ ﷺ کی ناراضگی کے واقعات بھی موجود ہیں، لیکن ایسی ایک مثال موجود نہیں ہے کہ آپ ﷺ — نعوذ باللہ — ڈنڈا لے کر بیوی کی تادیب اور پٹائی کے لئے اٹھے ہوں، تفصیلات بتاتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنی تمام ازواج کے لئے بے انتہا محبوب شوہر اور سراپا محبت و شفقت تھے، ان کی خوبیوں کو سراہتے، ان کی تعریف کرتے، ان کے لئے محبت و خیر خواہی کا اظہار کرتے، ان کی خواہشات اور شوق کو پورا کرتے اور ان کے حق میں اپنی ذات کو نمونہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، حدیث میں تو ملتا ہے کہ: ''خیرکم خیرکم لاھله وانا خیرکم لاھلی'' (۱) (تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں) حدیث میں یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کے کھانے کی آپ خوب تعریف کرتے، خود زمین پر بیٹھ جاتے اور آپ کے گھٹنوں پر پاؤں رکھ کر آپ کی زوجہ اونٹ پر چڑھ جاتیں، صلح حدیبیہ کے نازک ترین موقع پر اپنی زوجہ حضرت اُم سلمہؓ سے مشورہ کرتے اور اس پر عمل کرتے، حضرت عائشہؓ سے محبت کا یہ عالم ہوتا کہ کھانے میں ہڈی پر اسی جگہ منھ لگاتے جہاں پر حضرت عائشہؓ منھ لگاتیں، ان کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرتے، انھیں اپنے پیچھے کھڑا کر کے گھنٹوں حبشیوں کا کھیل دکھاتے، حضرت خدیجہؓ جیسی بیوی کی ایک ایک ادا یاد کرتے، شکر

(۱) الفصول فی السیرۃ: ۱۸۷۔

گزاری کا اظہار کرتے، ان کی سہیلیوں کو بھی تحفے بھیج کر دلجوئی کرتے، آپ ﷺ کی تمام ازواج نے آپ ﷺ پر فخر کا اظہار کیا ہے اور آپ ﷺ کی محبتوں کے گن گائے ہیں، ایسے چند نہیں بے شمار واقعاتِ محبت ہیں جو سیرت نبوی ﷺ کے صفحات بکھرے ہیں۔

ناراضگی کے بعض واقعات بھی موجود ہیں؛ لیکن ان کا اظہار صرف الفاظ میں ہوا ہے، سیرت میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے جو قرآن پر سب سے پہلے عمل کرنے والے تھے، زوجہ کی تادیب کے لئے لاٹھی، ڈنڈا یا مار پیٹ کا سہارا لیا ہو، اگر سیرت نبوی قرآن کی تشریح ہے تو اس تشریح میں بیوی کی وہ پٹائی نہیں ملتی جو اس قرآنی حکم سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کے اس حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کی پٹائی کی جائے اور اسے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جائے۔

قرآن کے اس حکم کا مطلب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سیاق کو دیکھیں جہاں یہ حکم آیا ہے، اور یہ دیکھیں کہ اس آیت کی تفسیر میں نیز احادیث میں اس کی کیا تشریح کی گئی ہے، سورۂ نساء میں جہاں اللہ نے ازدواجی زندگی کے بعض احکام بیان فرمائے ہیں، اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ خاندان کا سربراہ اللہ نے مرد کو بنایا ہے، پھر مرد کے بعض اختیارات ذکر کئے گئے ہیں، اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ اگر زوجین کے درمیان نااتفاقی پیدا ہونے لگے تو پہلے مرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کرے اور گھر کے ادارہ کو صحیح ڈگر پر لائے، اگر اس کے بعد بھی اختلاف برقرار رہے تو پھر دونوں طرف سے حَکَم طے کئے جائیں اور وہ اس اختلاف کا مناسب حل نکالیں، پس یہاں ازدواجی زندگی میں فیملی کے سربراہ کے ناطے مرد پر ادارہ چلانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

دراصل کسی بھی ادارہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اس کا ایک سربراہ طے کرنا ضروری ہوتا ہے، کسی ملک، کسی حکومت، کسی تنظیم اور کسی ادارہ کو اسی وقت چلایا جاسکتا ہے جب اس کا ایک سربراہ ہو، اسی لئے ملک کا صدر، حکومت کا وزیر اعظم، فوج کا کمانڈر اور تنظیم یا ادارہ کا چیرمین بنایا جاتا ہے، پھر اس سربراہ کو ادارہ چلانے کے لئے زائد اختیارات دیئے جاتے ہیں

اور دوسروں پر اس کی تابعداری لازمی کی جاتی ہے، یہ روزمرہ زندگی میں ہر جگہ کا دستور ہے، اس کے بغیر ادارہ نہیں چل سکتا ہے، اب یہ سربراہ کوئی بھی ہوسکتا ہے؛ لیکن جو بھی سربراہ ہوگا، اس کے اختیارات زیادہ ہوں گے اور اس کی بات ماننی ضروری ہوگی۔

خاندان کے ادارہ کے لئے اللہ نے سربراہی کا حق مرد کو دیا ہے؛ کیوں کہ جس طرح اندرون خانہ کے مسائل اور بچوں کی پرورش کی نمایاں قابلیت مرد کے مقابلہ عورت میں زیادہ رکھی گئی ہے، اسی طرح پورے گھر کو چلانے اور بیرونی دنیا سے معاملات کرنے کی صلاحیت عورت کے مقابلہ مرد میں زیادہ رکھی گئی ہے، مرد کی اس سربراہی کے اختیارات میں یہ بتایا گیا ہے کہ دوسرے افراد خانہ اس کی بات مانیں، ازدواجی زندگی کی کامیابی اسی میں ہے، اگر بیوی شوہر کی بات نہیں مانتی ہے، جس کو قرآن کے الفاظ میں 'نشوز' کہا گیا ہے، تو شوہر کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ پہلے سمجھائے، پھر اظہار ناراضگی کے لئے خواب گاہ الگ کرلے پھر ضرب سے کام لے، اگر بیوی اطاعت کرنے لگے تو پھر اس کو ستانے کا راستہ نہ ڈھونڈے، (۱) یہ ضرب کیا ہے؟ تفسیر کی کتابوں اور حدیث میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ رومال سے یا مسواک سے تنبیہ کریں، (۲) یہ گویا تنبیہ کا اظہار ہے نہ کہ پٹائی کا موقع؛ کیوں کہ ان ہی تشریحات میں یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے جس سے جسم پر نشان آجائے یا چہرہ پر اثر ہو، یا جسم کے کسی بھی حصہ کو نقصان پہنچے، اس میں مرد کو تنبیہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تکلیف اور نقصان پہنچانے کا نہیں۔

اس مفہوم کی مزید تشریح ایک واقعہ سے ہوتی ہے جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، بعض مہاجر صحابہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہماری عورتیں مردوں سے دب کر رہتی تھیں، مدینہ میں عورتوں کی دخل اندازی تھی، ہماری عورتیں بھی اس ماحول میں انہی کے نقش قدم پر چلنے لگیں، بعض صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اس صورت حال کی شکایت کرکے ان کی تنبیہ کرنے کی اجازت مانگی، آپ ﷺ نے اجازت دے دی، تو اسی شب متعدد خواتین نے دربار نبوی

(۱) سورہ نساء، آیت نمبر: ۳۴۔ (۲) تفسیر طبری، متعلقہ آیت، قول ابن عباسؓ، اور حدیث نمبر: ۹۳۸۸۔

میں آکر اپنے شوہروں کے رویوں کی شکایت کی، صبح میں آپ ﷺ نے بتایا کہ متعدد عورتوں نے آج شب اپنے شوہروں کی شکایت کی ہے، خدا کی قسم، ایسے شوہر تم میں اچھے انسان نہیں ہیں: "لا تجدون اولئک خیارکم "(۱) رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ایسے شوہروں کی یہ توصیف ایک بڑا تازیانہ تھی، اور آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ اپنی بیویوں پر سختی کرنے والے نہ صرف اچھے شوہر نہیں بلکہ اچھے انسان بھی نہیں ہیں، پس رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرز عمل جو ہر مسلمان کے لئے لازمی اسوہ ہے اور مذکورہ واقعہ میں صحابہ کرام کے رویہ پر آپ ﷺ کا جواب اس مسئلہ کو پوری طرح صاف کر دیتا ہے؛ لہٰذا قرآن کا یہ حکم عورت پر مرد کے کسی ظالمانہ اختیار سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ یہ صرف گھر کے ادارہ کو چلانے کی اس ذمہ داری کا بیان ہے جو اللہ نے مرد پر ڈالی ہے، اور اگر کسی گھر میں مرد ظالم وغلط کار ہے تو اس کی تنبیہ اور سزا کے دیگر تمام راستے کھلے رکھے گئے ہیں، شوہر کی تنبیہ کا اختیار عورت کو اسی طرح نہیں دیا گیا ہے جس طرح کسی بھی ادارہ کے سربراہ کی تنبیہ کا اختیار اس ادارہ کے ملازم کو نہیں دیا جاتا ہے، اور جس طرح رشتوں کے اندر چھوٹے کو بڑے کی تنبیہ کرنے مثلاً بیٹی کو ماں کی تنبیہ کرنے اور بیٹے کو باپ کی تنبیہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا ہے۔



(۱) سنن نسائی، حدیث نمبر: ۹۱۲۲۔

عورت کی امامت☆

عورت کی امامت بھی ان مسائل میں سے ایک ہے، جن پر موجودہ دور میں سوالات اُٹھائے گئے ہیں اور کم علمی کے نتیجہ میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسلامی لٹریچر میں 'امامت' دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے، ایک: نماز کی امامت، اور دوسرے: قوم کی امامت و سربراہی، پہلا مفہوم عبادات سے متعلق ہے اور دوسرے کا تعلق سیاسیات سے ہے، پہلے ہم سیاسیات کے میدان کی امامت پر بات کرتے ہیں۔

سیاست کے بارے اسلام نے کسی متعین نظام اور طریقہ کی تعلیم نہیں دی ہے، صرف ان ہی اُصولوں اور رہنما ہدایات کا ذکر کیا ہے جو کسی بھی اجتماعیت کے لئے ضروری ہوتی ہیں، مثلاً امر بالمعروف ونہی عن المنکر، عدل وانصاف کا قیام، جرائم پر گرفت، سزاؤں کی تنفیذ، عوام کی فلاح و بہبود، قانون کی نظر میں سب کی برابری، جوابدہی اور بیت المال کے اندر امانت داری وغیرہ، پھر سیاسی نظام صدارتی ہو کہ پارلیمانی، وفاقی ہو کہ وحدانی، الیکشنی ہو کہ نیابتی انتخراتی، ہر نظام کی گنجائش ہے، دورِ خلافتِ راشدہ میں بھی انتخابِ خلیفہ کے مختلف طریقے رائج رہے، حضرت عثمانؓ کے انتخابِ خلیفہ کے وقت چھ رکنی کمیٹی کے کنوینر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مدینہ میں بڑے پیمانے پر رائے شماری کی تھی، اور اس میں گھروں کی پردہ نشین خواتین سے بھی رائیں لی گئی تھیں، حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ کو خود رسول کریم ﷺ نے مدینہ کے بازار کی نگرانی پر مقرر فرمایا تھا، اور آپ ﷺ نے مکہ کے اہم سفر کے دوران صلح حدیبیہ کے نازک ترین موقع پر اپنی زوجہ حضرت اُم سلمہؓ کے مشورہ پر اقدام فرمایا تھا، ان اُمور سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست خواتین کے لئے شجر ممنوعہ نہیں ہے، اور مردوں کی طرح خواتین بھی دیگر فرائض وآداب کی رعایت کے ساتھ ایسی ذمہ داریاں اُٹھا سکتی ہیں۔

☆ سیرت سیمینار میں پیش کیا گیا مقالہ، از: ڈاکٹر فہیم اختر ندوی (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز: مانو، حیدرآباد)۔

بحث اس وقت اہمیت اختیار کر جاتی ہے، جب امامت عظمیٰ یعنی ملک کی اعلیٰ ترین سر براہی کا مسئلہ درپیش ہو، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یمن کی ملکۂ سبا خاتون تھیں اور پیغمبر کے دربار میں اس کی حاضری اور قبول اسلام کا واقعہ قرآن نے نقل کیا ہے، بہر حال امامت عظمیٰ یعنی صدارت عالیہ کے منصب پر خواتین کی تقرری پر اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، جو رائے اس منصب سے خواتین کو روکتی ہے، اس کے پیش نظر سماج میں خواتین کا زیادہ اہم کردار ہے جو بحیثیت نسل انسانی کی ماں کے خالق انسانیت نے انھیں عطا کیا ہے، ان کی تائید اس حدیث رسول ﷺ سے بھی ہوتی ہے کہ ''وہ قوم فلاح یاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنا زمام اختیار کسی خاتون کو سونپ دیا ہو'' ۔(۱)

جہاں تک نماز کے اندر امامت کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر یورپ و امریکہ میں زیادہ واویلا مچایا گیا ہے، جس کی گونج ان کے ہمنواؤں کے یہاں برصغیر وغیرہ میں بھی سنائی دیتی رہی ہے، اس مسئلہ کو یوں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسجدوں کے اندر مرد نماز کی امامت کرتے ہیں، عورتیں امامت نہیں کرتی ہیں، تو یہ مساوات کے خلاف ہے؛ چنانچہ امریکہ میں بعض خواتین نے مسجد کے اندر جا کر مرد و عورت کی مشترک نماز کی امامت انجام دی۔

دراصل اس مسئلہ میں کئی مسئلوں کو الجھا دیا گیا ہے اور عورت کی عزت اور اس کے وقار کے تحفظ کو غلط طریقہ سے اس کی عبادت اور مساوات کے مسئلہ سے جوڑ دیا گیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں عورت کو اسی طرح عبادت کا حق ہے جس طرح مردوں کو حق ہے، عورت کو بعض دوسرے مذاہب کی طرح عبادت گاہوں میں داخلہ سے کبھی نہیں روکا گیا ہے؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں وہ مسجد نبوی کے اندر باجماعت نماز پڑھتی تھیں، اور اب تک اس پر عمل نہ صرف حرمین میں بلکہ پوری دنیا میں موجود ہے، عبادات کے سلسلہ میں مرد اور عورت کے درمیان ایک فرق اس طرح رکھا گیا ہے کہ مرد پر ایک ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور عورت کو اس ذمہ

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۴۲۵۔

داری اور لزوم سے رخصت دی گئی ہے، وہ ذمہ داری یہ ہے کہ مرد پر پانچوں وقت کی روزانہ نمازیں مسجد کے اندر آکر جماعت کے ساتھ ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے؛ لیکن عورت کو اس پابندی سے رخصت دی گئی ہے کہ وہ مسجد میں بھی پڑھ سکتی ہے اور گھر کے اندر بھی، ذرا سوچئے! اگر عورت پر بھی یہ لازمی ہوتا کہ وہ روزانہ پانچوں وقت گھر سے نکل کر مسجد میں آکر جماعت ہی سے نماز پڑھے ورنہ اس کا ثواب گھٹ جائے گا اور اللہ کی ناراضگی ملے گی جس طرح مرد کے لئے ہے، تو اس سے عورت کو دشواری ہوتی یا آسانی؟ آج تو بہت سے نمازی مرد اس سہولت پر عمل کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ گھر کے اندر نماز پڑھ لیتے ہیں؛ حالاں کہ مردوں کو یہ سہولت نہیں دی گئی ہے، عورتوں کے لئے یہ سہولت دراصل اللہ کی جانب سے صنف نازک پر ایک بڑا احسان اور کرم ہے جس کا نمونہ عبادات اور فرائض کے مختلف احکام میں موجود نظر آتا ہے۔

عبادات کے سلسلہ میں شریعت کا ایک حکم یہ ہے کہ مردوں کی عبادتیں علاحدہ ہوں گی اور عورتوں کی علاحدہ؛ چنانچہ نماز کے اندر دونوں کی صفیں علاحدہ علاحدہ ہوں گی، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی کے اندر ایسی ہی صفیں بنتی تھیں، اور آپ ﷺ نے اسی کی تاکید فرمائی تھی،(۱) یہ حکم بھی دراصل عورتوں کی سہولت اور آرام نیز ان کے تحفظ کے پیش نظر تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے یہ بھی حکم فرمایا تھا کہ جماعت کی نماز ختم ہونے کے بعد مرد ٹھہریں رہیں، اور پہلے خواتین مسجد سے نکل جائیں، تب مرد باہر نکلیں؛ لہٰذا ایسی نماز اللہ کو پسند نہیں ہوگی جس میں مرد اور عورت خلط ملط ہو کر صف بنائیں، امریکہ میں ایسی ہی نماز پڑھی گئی تھی جو سراسر غلط ہے، عورتوں کے لئے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے؛ لیکن وہ جماعت میں شامل ہو سکتی ہیں، اگر وہ اپنی علاحدہ جماعت بنانا چاہتی ہیں تو ایسا بھی کر سکتی ہیں، اس کی بھی ممانعت نہیں ہے، فقہ کی کتابوں میں عورتوں کی باجماعت نماز کے مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں؛ لیکن ان پر لازم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کسی جگہ اکٹھی ہوں اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں،

(۱)　مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۸۹۶۔

جیسا کہ مرد پر لازم کر دیا گیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ جمعہ اور عیدین کی نمازیں جو جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتیں، عورتوں پر فرض نہیں کی گئیں کہ اس کی وجہ سے ان پر وہاں آنے کی پابندی ہو جائے گی؛ البتہ ان نمازوں میں عورتوں کو شرکت کی ہمیشہ اجازت ہے۔

پس حاصل یہ ہے کہ مسجد کے اندر کی باجماعت نماز میں خواتین شریک ہو سکتی ہیں، جہاں ان کی صفیں مردوں اور بچوں کی صفوں کے بعد علاحدہ ہوں گی، خواتین اپنی مخصوص جماعت بھی بنا سکتی ہیں، جو اُن کا اختیاری عمل ہوگا، ان کی مجبوری نہیں ہوگی؛ لیکن ایسی جماعت جس میں عورت امامت کر رہی ہو اور اس کے پیچھے مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہی ہوں، اسی طرح ایسی جماعت جس میں صفوں کے اندر مرد اور عورت باہم ملے جلے اور خلط ملط ہو کر کھڑے ہوں، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ نماز اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی نماز کی تعلیم نہیں دی ہے۔

چنانچہ بینکوں اور مختلف سرکاری شعبوں میں خواتین کی لائین الگ رکھی جاتی ہے، بہت سی جگہ بسوں میں خواتین کی سیٹیں الگ ہوتی ہیں، اکثر مقامات پر مردوں اور عورتوں کے بیت الخلاء الگ ہوتے ہیں، یہ امتیاز برتنا نہیں ہے؛ بلکہ سیکوریٹی کے تقاضے ہیں۔



شیطان کی رفاقت ☆

عورت کے بارے میں بڑے غلط قسم کے تصورات رائج رہے ہیں، یونان کے تعلیم یافتہ فلاسفہ نے بھی عورت کو انسانیت کے ارفع مقام سے نیچے رکھا، کئی مذاہب نے اسے گناہ کی جڑ اور شیطان کا آلہ قرار دیا، انسانی تاریخ میں اسلام نے قرآن اور حدیث کے صفحات پر پہلی مرتبہ عورت کے مقام انسانیت اور مقام عزت وحیثیت کو ثابت کیا اور عورت کو حقوق واختیارات دیئے، سیرت نبوی کے اندر اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات ملتی ہیں؛ لیکن سیرت نبوی ہمیں خواتین کے تئیں ایک اور پہلو کی بابت آگاہی دیتی ہے اور اس آگاہی میں رہنمائی کا سامان ہے اور خواتین کے لئے خطرہ سے حفاظت کی بیداری بھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آنے والے زمانہ میں آزمائش اور فتنہ کا ایک بڑا ذریعہ عورت ہوگی، (۱) گویا عورت کا استعمال کر کے طرح طرح کے فتنے پیدا کئے جائیں گے، اس ارشاد میں جہاں اس بات کا انکار نہیں ہے کہ فتنہ وآزمائش کے دیگر وسائل بھی کارکرد ہوں گے، وہیں اس کی آگاہی ہے کہ خواتین کا منفی استعمال کرنے والے زیادہ ہوں گے، ظاہری بات ہے کہ اللہ کے احکام سے بغاوت، فحاشی کا پھیلاؤ، جنسی واخلاقی انارکی اور بے راہ روی کے کاموں کو فروغ دینا شیطان کا پسندیدہ کھیل ہے اور اس کی پوری ٹیم انسانیت کو تباہی کے غار میں ڈھکیلنے کے لئے جی جان سے لگی ہوئی ہے، شیطان کو اپنے ان کھیلوں میں خواتین کا استعمال زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؛ چنانچہ وہ اس بات کی تاک میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح

☆ سیرت سیمینار میں پیش کیا گیا مقالہ، از: ڈاکٹر فہیم اختر ندوی (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز: مانو، حیدرآباد)۔

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۷۴۶۔

بنت حواء کو اپنے دام تزویر میں لائے اور پھر اس کے ذریعہ اپنا شکار کرتا پھرے، اگر عورت اپنی ذات کو اس کی بدنگاہیوں کا ہدف نہ بننے دے تو وہ محفوظ ہو جائے گی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی خاتون باہر نکلے تو وہ جاذب نظر زینت کو پوشیدہ رکھے، اور نماز کے لئے بھی نکلے تو خوشبو کا استعمال نہ کرے؛ بلکہ اگر پھیلنے والی خوشبو لگی ہو تو اسے دھوڈالے؛(۱) کیوں کہ اس طرح شیطان لوگوں کی توجہ اس خاتون کی طرف مبذول کرتا ہے اور غلط خیالات کی پرورش کراتا ہے، اسی تناظر میں یہ حدیث ہے کہ جب عورت باہر نکلتی ہے تو شیطان اچک اچک کر اسے دیکھتا ہے، (۲) یہی دراصل شیطان کی وہ رفاقت ہے جسے وہ فتنہ گری اور فحاشی کے لئے اپنے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس فتنہ اور اس کے آلہ سے آگاہ فرما کر خواتین اور مردوں دونوں کو اس سے محفوظ رہنے کی تعلیم دی ہے، اسلام جس نے خواتین کو عزت ووقار بخشا ہے، شیطان کے اس زبردست فتنہ سے اسے محفوظ رکھنے کے لئے خطرات کی نشاندہی کرتا ہے، اور اسے عزت وسربلندی کے مقام بلند سے نیچے گرنے نہیں دینا چاہتا ہے، فحاشی اور جنسی واخلاقی انارکی ہی شیطان کا مقصود ہے، اور اس کا نتیجہ وقتی لذت کے پردہ میں خطرناک استحصال وکسمپرسی، تشدد وزیادتی بلکہ قتل وغارت گری ہے، جس کا مشاہدہ موجودہ دنیا میں کھلی آنکھوں سے روزانہ کیا جارہا ہے، اس انجام تک پہنچانے کے لئے شیطان خصوصیت کے ساتھ عورت کو نئے نئے ناموں سے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اپنے اس مشن میں عورت کو اپنا رفیق بناتا ہے، شیطان کی یہ رفاقت ہمیشہ تباہی اور بربادی ہی کے انجام سے دوچار کرے گی، حدیث شریف میں اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے شیطان کی رفاقت سے اسے روکا گیا ہے۔



---

(۱) سنن نسائی، حدیث نمبر: ۹۳۶۲۔

(۲) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۷۳۔

عورت کا کوتاہ عقل ہونا☆

عورت کے احساس میں نزاکت و ذکاوت، وجدان میں لطافت اور جذبات میں شدت ہوتی ہے، یہ چیزیں اس کے خمیر میں شامل ہیں اور اس کے لئے نقص نہیں؛ بلکہ باعث کمال ہیں، اگر اس میں جذبات کی فراوانی نہ ہو تو نسل انسانی اور جانِ ناتواں کا وجود برقرار نہیں رہ پائے گا، اس لئے فریضۂ نسوانیت کی ادائیگی کے لئے عورت کے اندر اس صفت کا ہونا ناگزیر ہے۔

جذبات کی فراوانی اور ایثار و محبت کی پیکر ہونے کی وجہ سے عورتوں میں مردوں کی طرح یکسوئی اور بیدار مغزی کی کچھ کمی ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبات میں جتنی شدت ہوگی، قوت فہم اور قوت یادداشت میں اسی درجہ کمی ہوگی؛ چنانچہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ غصہ، انتہائی خوشی، اور شدت غم کے جذبات میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم بلکہ بسا اوقات ختم ہوجاتی ہے۔

عورت کی اس صفت کو بعض حدیثوں میں ''نقص عقل'' (عقل میں کمی) کہا گیا ہے، جس کا مقصد مردوں کو ان کی اس کیفیت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کریں اور جذبات سے مغلوب ہوکر اگر وہ کوئی بات کہہ دیں تو درگذر سے کام لیں، نیز ان کے جذباتی فیصلے کو اپنے اوپر مسلط نہ کریں؛ بلکہ اپنی عقل بھی استعمال کریں۔

عورتوں کے سلسلے میں ماہرین نفسیات کا اتفاق ہے کہ وہ مردوں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس، اور جذباتی ہوتی ہیں، اُلفت و محبت، نفرت و عداوت، خوشی اور غمی ہر موقع پر وہ جذبات کا مظاہرہ کرتی ہیں، اور یہ جذبات اس کے دل و دماغ پر گہرے، دُوررس اور دیرپا

☆ سیرت سیمینار کا ایک مقالہ، از: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی (استاذ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ)۔

اثرات چھوڑتے ہیں، اور جہاں جذبات کی فراوانی ہو، وہاں کسی غیر معمولی رجحان کا پایا جانا کوئی بعید نہیں ہے؛ چنانچہ مشہور اشتراکی مصنف برو ڈن لکھتا ہے :

> عورت کا وجدان ہمارے وجدان سے کمزور، اس کی عقل ہماری عقل سے کمتر اور اس کے طبعی اخلاق ہمارے اخلاق سے مختلف ہیں، تم عورتوں پر اچھی طرح سے غور کرو تو تم دیکھو گے کہ اس میں افراط ہوگی یا تفریط۔(۱)

اور ڈاکٹر اجوس کونت کے بقول: عورتوں اور مردوں کی جسمانی قوتوں میں ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے، عورتوں کا دل، مردوں کے مقابلے میں ۶۰ گرام چھوٹا ہوتا ہے اور مردوں کا مغزِ دماغ عورتوں کی بہ نسبت سو گرام بڑا ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس اور عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے۔(۲)

واقعہ یہ ہے کہ فطرت کی تخلیقی اسکیم میں جذباتیت کا عنصر بلند پایہ مصلحتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے، عورت کو اس خیر کثیر سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ اس کے بغیر خصوصی نوعیت کے حیاتی وظیفے کی ادائیگی ناممکن ہے؛ کیوں کہ بچے کی پرورش کے لئے عقل کی نہیں بلکہ وافر جذبات کی ضرورت ہے، جو عورت کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے ہی نہیں دیتے، اور بچے کی ضرورت کی تکمیل کے لئے کسی سستی اور کوتاہی کے بغیر آگے بڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں؛ اس لئے ایک ماں نہ صرف اپنے راحت و آرام کو قربان کر کے بچے کو سکون و اطمینان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے؛ بلکہ اپنے وجود کو داؤ پر لگا کر بچے کو بچانے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔

اس طرح کی حدیثوں کا مقصد عورتوں کی حقارت نہیں؛ بلکہ ان کی فطرت کا اظہار اور مردوں کو ان کے ساتھ حسن سلوک اور نرم روی کی تلقین و تائید کرنا ہے کہ ان کے ساتھ سختی اور درشتی کا معاملہ ان کی فطرت کے خلاف ہے، اگر ایسا کیا گیا تو اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر جائے گی، جس کا نتیجہ بے سکونی، اضطراب اور سماج و معاشرہ میں فساد کی شکل میں برآمد ہوگا۔

---

(۱) عورت، اسلام کے سائے میں: ۳۶، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔ (۲) حوالہ سابق۔

ٹیڑھی پسلی سے پیدا کئے جانے کا مطلب☆

گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور نسل انسانی کو پروان چڑھانے کے لئے وافر جذبات کی ضرورت ہے ؛ کیوں کہ نسل انسانی کو پروان چڑھانا کوئی وقتی اور ہنگامی مشغلہ نہیں ہے ؛ بلکہ ایک طویل اور دشوار طلب کام ہے، جسے محض عقل کے سہارے انجام نہیں دیا جاسکتا ہے ؛ بلکہ اس کے لئے مخصوص جذباتی صلاحیت ناگریز ہے، جس کے ذریعہ عورت ان مشکل ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتی ہے، عورت کی اسی مخصوص صلاحیت کو بعض حدیثوں میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

المرأة كالضلع إن أقمتها كسرتها و إن استمتعت بها استمتعت و بها عوج ۔ (۱)

عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہوگے تو ٹوٹ جائے گی ، اور اگر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہو تو اسی کیفیت کے ساتھ اُٹھا سکتے ہو۔

دوسری روایت میں ہے :

استوصوا بالنساء خيراً فإنهن خلقن من ضلع ۔ (۲)

عورتوں کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا معاملہ کرو ؛ کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔

☆ سیرت سیمینار میں پیش کیا گیا مقالہ ، از : مولانا ولی اللہ مجید قاسمی (استاذ : جامعۃ الفلاح بلیریا گنج ، اعظم گڑھ)۔

(۱) بخاری : ۵۱۸۴، صحیح مسلم : ۱۴۶۸۔

(۲) بخاری ، حدیث نمبر : ۵۱۸۶۔

اور صحیح مسلم میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

إن المرأة خلقت من ضلع لن تستقيم لک علی طريقه ۔ (۱)

علامہ عینیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

اس حدیث میں محض تمثیل کے طریقے پر کہا گیا کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے ۔ (۲)

دراصل ایک ہے : ٹیڑھا پیدا کیا جانا اور کسی چیز کی بناوٹ میں کجی رکھنا، یہ عیب نہیں ہے؛ بلکہ حسن ہے، جیسے ہم عمارتوں کو ڈیزائن کرتے ہوئے محراب بناتے ہیں، جس میں خاص طور پر کجی رکھی جاتی ہے اور یہی اُس عمارت کا حسن ہوتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک چیز سیدھی بنائی گئی اور کسی وجہ سے اس میں ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا، یہ عیب ہے، عورت کو پسلی سے پیدا کیا جانا پہلی صورت ہے نہ کہ دوسری صورت ۔

غرض کہ یہ ''عورت پن'' کے لئے ایک ضروری وصف ہے، اسی سے نسوانیت کی تکمیل ہوتی ہے اور مہر و اُلفت کے سوتے پھوٹتے اور محبت و چاہت کے دیپ جلتے ہیں، جس طرح دل وجگر کی حفاظت کے لئے پسلی میں کجی ضروری ہے، اسی طرح سے نسوانیت کی حفاظت کے لئے ایک طرح کی کجی ناگزیر ہے، اسے ختم کرنے کی کوشش کرنا نسوانیت کے آبگینے کو ٹھیس پہنچانا ہے؛ اس لئے مرد کو اس کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے شدت وسختی کے بجائے لطف ومحبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، مذکورہ حدیث کا یہی مقصد ہے اور اس میں ایک فطری حقیقت کا بیان ہے، جس کو دوسرے لوگوں نے بھی دوسرے الفاظ میں ادا کیا ہے؛ چنانچہ میتھو آرنلڈ اس بات کو ان الفاظ میں کہتا ہے کہ ''عورت پر دل کی دلیل کام کرتی ہے نہ کہ دماغ کی'' ۔ (۳)

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۱۴۶۸ ۔

(۲) عمدۃ القاری: ۱۵ / ۲۱۳ ۔

(۳) عورت، اسلام اور جدید سائنس: ۱۱۲ ۔

بعض لوگوں نے اس طرح کی حدیثوں کو دیکھ کر خیال کیا کہ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے؛ حالاں کہ صحیح حدیثوں میں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں ہے؛ بلکہ پہلی حدیث میں تو صاف طور پر کہا گیا ہے کہ عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری حدیث میں بھی تشبیہ کا مفہوم زیادہ واضح ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور مزاج میں پسلی جیسی کجی ہے، جیسے کہ قرآن میں تمام انسانوں کے بارے میں کہا گیا ہے: "خلق الانسان من عجل" بعض لوگوں نے اس خیال کی تائید میں درج ذیل آیتیں بھی ذکر کی ہیں :

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں کے ذریعہ بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

ایک دوسری آیت میں ذکر فرمایا گیا :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۔ (الاعراف:۱۸۹)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا؛ تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

ان آیتوں کی کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کے حوالہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے؛ لیکن اس طرح کی روایتوں کے بارے میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ بائبل میں ہے :

اللہ تعالیٰ نے آدم پر گہری نیند طاری کردی اور وہ (آرام) سے

سو گیا، تب اس نے (اللہ تعالیٰ نے) اس کی ایک پسلی نکالی اور اس
کی جگہ پر گوشت بھر دیا اور اللہ تعالیٰ نے آدم سے جو پسلی لی تھی،
اس سے ایک عورت بنایا اور اس کو آدم کے پاس لایا۔(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ذریعہ یہ بات مسلمانوں تک پہنچی ہے اور پھر اسی کے ذریعہ مذکورہ آیتوں اور روایتوں کی تفسیر وتشریح کردی گئی ہے؛ حالاں کہ اس کے برعکس روایتیں بھی موجود ہیں؛ چنانچہ حضرت ربیع بن انسؓ کہتے ہیں کہ جس مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام بنائے گئے، اسی سے حضرت حوا پیدا کی گئیں، اس لئے کہ قرآن میں ہے :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ۔ (۲)
وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ امام باقرؒ بھی اسی کے قائل تھے۔(۳)

اور مذکورہ آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اسی جنس سے اس کا جوڑا بنایا گیا اور اس مفہوم کی تائید متعدد آیتوں سے ہوتی ہے؛ چنانچہ قرآن میں ہے :

● وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا ۔ (۴)
اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں؛ تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔

● جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ۔ (۵)

---

(۱) کتاب پیدائش، باب: ۲، آیت: ۲۲-۲۴۔
(۲) الانعام: ۲، عمدۃ القاری: ۱۵/ ۲۱۲۔
(۳) روح المعانی: ۴/ ۱۸۱۔
(۴) الروم: ۲۱۔
(۵) الشوریٰ: ۱۱۔

جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے۔

● وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ (۱)

اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے تمہارے لئے جوڑا پیدا کیا۔

ان تینوں میں ''نفس'' سے مراد جنس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے مذکورہ دونوں آیتوں میں بھی نفس سے یہی مراد ہے، یعنی ان آیتوں میں تمام مردوں کی بیویوں کے سلسلے میں وہی لفظ استعمال ہوا ہے، جو سورۂ نساء میں حضرت حوا کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ان آیتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا ہے کہ ہر مرد کی بیوی اس کے جسم سے نکالی گئی ہے؛ لہٰذا جس طرح سے دیگر عورتیں مردوں کی ہم جنس یعنی انسان ہیں، اسی طرح سے حضرت حوا بھی حضرت آدم علیہ السلام کی جنس سے تھیں، کہ اگر دونوں کو مثلاً: آگ اور پانی جیسی الگ الگ جنس سے بنایا جاتا تو پھر موافقت نہ ہوتی اور پرسکون زندگی گذارنا مشکل ہوتا اور یہ ناممکن ہوتا کہ وہ دونوں مشترکہ جد و جہد سے نسل انسانی کو پروان چڑھائیں، اس معاملہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، وہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دینے اور پھر اسی کی روشنی میں قرآنی آیتوں کی تفسیر کرنے کی وجہ سے ہورہی ہے؛ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔



(۱) النحل:۷۲۔

یتیم پوتے کی میراث

اس وقت پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام سکہ رائج الوقت کی طرح جاری وساری ہے، جس میں دولت کو زیادہ مرتکز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام بنیادی طور پر تقسیم دولت کا قائل ہے اور چاہتا ہے کہ مال واسباب چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا :

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۔ (الحشر:۷)

تا کہ (دولت) تم میں سے مالداروں ہی کے درمیان گھر کر نہ رہ جائے۔

اسلام کے دوسرے مالی احکام کی طرح میراث میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے، بعض مذاہب میں صرف بڑا بیٹا پورے ترکہ کا حقدار ہوتا تھا اور بعض میں بیٹوں کو حق دیا جاتا تھا، بیٹیاں محروم رہتی تھیں، شریعتِ اسلامی نے تقسیم میراث کا ایک جامع نظام مقرر فرمایا، جس میں ترکہ کی زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور بیش از بیش لوگ اس سے استفادہ کرسکیں، اس سلسلے میں میراث کے مستحق ہونے کے لئے بنیادی اُصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۔ (النساء:۷)

والدین اور نزدیک ترین رشتہ دار جو چیزیں چھوڑ جائیں، اس میں مردوں کے لئے بھی حصہ ہے، اور عورتوں کے لئے بھی والدین اور نزدیک ترین رشتہ داروں کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں حصہ ہے، خواہ وہ چیز کم ہو یا زیادہ، اور یہ حصہ لازمی طور پر ہے۔

اس آیت سے تین اُصول معلوم ہوئے :

اول یہ کہ انسان جب تک زندہ رہے، اس وقت تک مستقبل کے امکانی ورثہ کو اس کے مال میں حقِ وراثت حاصل نہیں، ایسا نہیں ہے کہ باپ کی زندگی میں اس کے بیٹے یا بیٹی کا حق باپ کی دولت سے متعلق ہو جائے ؛ لہٰذا حق میراث سے ان ہی لوگوں کا حق متعلق ہوگا، جو مورث کے مرنے کے وقت موجود ہوں، جو لوگ اس سے پہلے دنیا سے جا چکے، اس کے ترکہ میں ان کا کوئی حق نہیں رہا، مثلاً : اگر ایک شخص کے تین بیٹے تھے، ایک کا انتقال اس کی زندگی میں ہو گیا تو اس اُصول کے تحت اس شخص کے ترکہ میں اس کا کوئی حق ثابت نہیں ہوگا، ''مما ترک'' کے لفظ سے یہ اُصول واضح ہوتا ہے۔

دوسرا اُصول یہ ہے کہ ترکہ کی تقسیم ضرورت و حاجت کے اعتبار سے نہیں ؛ بلکہ رشتہ وقرابت کے اعتبار سے ہے، مثلاً : ایک شخص کی اولاد میں بعض بہت غریب ہیں اور بعض مالدار، تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ غریبوں کو تو ترکہ دیا جائے یا زیادہ دے دیا جائے، اور مالداروں کو محروم کر دیا جائے یا کم دیا جائے ؛ ترکہ کی تقسیم میں قرابت کا لحاظ رکھا جائے گا نہ کہ دولت وغربت کا۔

تیسرا اُصول قرابت داروں میں ترجیح کا معلوم ہوا، یعنی انسان کی قرابت مندی کا دائرہ تو بہت وسیع ہے، اگر آدمی چند پشت اوپر چلا جائے تو قرابت داروں میں ایک پورا محلہ شامل ہو جائے گا ؛ لہٰذا اگر ہر قرابت دار کو ترکہ میں حصہ دار بنایا جائے تو ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ کسی کی کوئی ضرورت پوری ہی نہ ہو سکے گی، بعض اوقات ایک مکان اور ایک کمرہ سینکڑوں لوگوں میں تقسیم کرنا ہوگا اور اُردو محاورہ کے مطابق ''جوتیوں میں ڈال بٹے گی'' ظاہر ہے کہ یہ بات کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوتی، اور اس کی وجہ سے غیر معمولی اختلاف وانتشار بھی پیدا ہو جاتا ؛ اس لئے قرآن مجید نے یہ ترجیح متعین کی کہ قریب ترین رشتہ دار ترکہ کے حق دار ہوں گے اور نسبتاً قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دُور کا رشتہ دار ترکہ سے محروم ہو جائے گا۔

اسی اُصول پر والد کی موجودگی میں دادا اور دادی کو حق میراث حاصل نہیں ہوگا، ماں موجود ہو تو نانا اور نانی کا ترکہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، بیٹے موجود ہوں تو پوتوں اور پوتیوں کا

حصہ نہیں ہوگا، خواہ ان کے والد زندہ ہوں، یا گزر چکے ہوں، بیٹیاں موجود ہوں تو نواسوں اور نواسیوں کا حصہ نہیں ہوگا، خواہ ان کی والدہ زندہ ہوں، یا گزر چکی ہوں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کے کئی بیٹے تھے، ان میں سے ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا اور اس کی یتیم اولاد موجود ہے تو دادا کے ترکہ میں اس کا حق ہونا چاہئے؛ مگر یہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ موقف نہ صرف اسلام کے خلاف ہے؛ بلکہ عقل و مصلحت سے بھی دُور ہے؛ کیوں کہ اول تو یہ ضروری نہیں کہ پوتا اپنے چچاؤں کے مقابلہ زیادہ غریب ہو، دوسرے: اگر دولت و غربت کو میراث کے لئے معیار بنایا جائے تو میراث کا پورا انظام درہم برہم ہو جائے گا۔

یتیم پوتے کا حق میراث اور قرآن مجید

(الف) قرآن مجید کے بیان کے مطابق دادا، دادی کے ترکہ میں سے پوتے، پوتیوں کو اپنے باپ کے واسطے سے حق میراث حاصل ہوتا ہے، یہاں صورت حال یہ ہے کہ ان کے مرحوم باپ اور ماں کا والدین کے ترکہ میں حق ثابت ہی نہیں ہوسکا تھا؛ کیوں کہ یہ حق اسی وقت ثابت ہوتا، جب وہ ان کے انتقال کے وقت زندہ رہتے۔

(ب) ہوسکتا ہے کہ یہ یتیم پوتے، پوتیاں، محتاج اور ضرورت مند ہوں؛ لیکن قرآن مجید کے مقرر کئے ہوئے اُصول کے مطابق محتاجی ترکہ کے حقدار ہونے کی بنیاد نہیں ہے؛ بلکہ اس کی بنیاد قرابت ہے۔

(ج) قرآنی اُصول کے مطابق قریبی رشتہ دار کو میراث ملے گی تو جب اِن یتیم بچوں کے چچا اور پھوپھیاں زندہ ہیں تو مرنے والے سے ان کی قرابت بڑھی ہوئی ہے؛ اس لئے اسی اُصول کے تحت نسبتاً قریب کے رشتہ دار دُور کے رشتہ دار کے لئے حاجب بن جائیں گے، دادا، دادی کے ترکہ میں ان کا حق باقی نہیں رہے گا۔

غرض کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کا مستحق میراث نہ ہونا علماء کی خود ساختہ بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ قرآن کے مقرر کئے ہوئے اُصولوں پر مبنی ہے۔

حدیث نبوی ﷺ

قرآن مجید میں جن لوگوں کے حصے مقرر کردیئے گئے ہیں، ان کو ''ذوی الفروض'' یا ''اصحاب الفرائض'' کہا جاتا ہے، ان میں اولاد شامل نہیں ہیں، اولاد کے حصہ کے لئے کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے؛ بلکہ اگر دوسرے ذوی الفروض نہ ہوں تو پورا ترکہ اور ہوں تو ان کو دینے کے بعد بقیہ ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ بیٹوں کو دو دو حصے اور بیٹیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا، اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

الحقوا الفرائض بأهلها ، فلما بقي فلأولى رجل ذكر ۔ (۱)

میراث کے حصے ان کے مقررہ حصہ داروں کو دو، پھر جو بچ رہے، وہ قریب ترین مرد رشتہ داروں کا حق ہوگا۔

اس حدیث نے بھی اسی اُصول کو واضح کیا کہ ذوی الفروض کو حصہ دینے کے بعد جو بچ جائے، وہ قریب ترین مرد رشتہ دار کو ملے گا، اور ظاہر ہے کہ جب بیٹے ہوں اور پوتے بھی ہوں تو بیٹا قریب ترین رشتہ دار ہے؛ اس لئے وہی ترکہ کا مستحق ہوگا، پوتے نہ قریبی رشتہ دار ہیں اور نہ ذوی الفروض میں شامل ہیں۔

آثارِ صحابہ

صحابہ میں علم فرائض کے اعتبار سے سب سے اونچا درجہ حضرت زید بن ثابتؓ کا تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ وہ میرے رفقاء میں سب سے زیادہ فرائض کے احکام سے واقف ہیں: ''وأعلمها بالفرائض زيد''۔(۲)

حضرت زید بن ثابتؓ کا جو فتویٰ امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے :

وقال زيد بن ثابت : ولد الأبناء بمنزلة الولد إذا لم

(۱) بخاری، عن عبداللہ بن عباسؓ، کتاب الفرائض، حدیث نمبر: ۶۷۳۵۔

(۲) سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۹۰۔

یکن دونهم ولد ذکر ، ذکرهم کذکرهم وأنثاهم
کأنثاهم یرثون کما یرثون ، ویحجبون کما یحجبون ،
ولا یرث ولد الابن مع الابن ۔ (۱)

میت کے پوتے بیٹے کے درجہ میں ہیں؛ بہ شرطیکہ ان کے مقابلہ میں
کوئی بیٹا موجود نہ ہو، پوتے بیٹوں کی طرح ہیں، اور پوتیاں بیٹیوں
کی طرح، جیسے بیٹے وارث ہوتے ہیں، اسی طرح پوتے (بیٹیوں
کے نہ ہونے کی صورت میں) وارث ہوتے ہیں، اور جیسے بیٹے
(اپنے سے دُور کے رشتہ داروں کے لئے) حاجب بنتے ہیں؛ اسی
طرح پوتے (اپنے بعد کے رشتہ داروں کے لئے) حاجب بنتے
ہیں، اور بیٹا موجود ہو تو پوتا وارث نہیں ہوسکتا۔

اجماعِ اُمت

اس بات پر عہد صحابہ سے علماء اُمت کا اجماع واتفاق ہے کہ اگر مرنے والے کے بیٹے
زندہ ہوں تو پوتے میراث کے حقدار نہیں ہوں گے؛ چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہریؒ لکھتے ہیں :

ولا یرث بنو الابن مع الابن الذکر شیئاً أباهم کان
أو عمهم ، وهذا نص کلام النبی صلی الله علیه وسلم ،
واجماع متیقن ۔ (۲)

بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث کا مستحق نہیں ہوگا؛ چاہے اس کا
باپ زندہ ہو، یا اس کا چچا، یہ رسول اللہ ﷺ کی صراحت سے بھی
ثابت ہے اور اس پر یقینی اجماع بھی ہے۔

غرض کہ قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور اجماع اُمت سے یہ بات ثابت ہے کہ بیٹوں
کی موجودگی میں یتیم پوتے میراث کے حقدار نہیں ہوں گے۔

(۱) بخاری، کتاب الفرائض، باب: ۷۔ (۲) المحلی: ۹/ ۲۷۱، مسئلہ: ۱۷۲۶، موسوعۃ الاجماع: ۳/ ۱۱۲۴۔

عقل وقیاس

یہی عقل وقیاس کا تقاضا بھی ہے؛ کیوں کہ اگر اس معاملہ میں یتیم پوتوں کے والد کو زندہ تصور کر کے ان کا حصہ لگایا جائے، اور پھر اس کو ان کی اولاد پر تقسیم کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے مواقع پر اس اُصول کو نہیں برتا جائے، مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا، دادی اور ماں کی موجودگی میں نانا نانی کو حصہ نہیں ملتا؛ حالاں کہ وہ بڑھاپے اور اکثر اوقات کسبِ معاش کی طاقت سے محروم ہونے کے اعتبار سے کچھ کم قابل رحم اور لائق ترس نہیں ہوتے؛ اسی طرح بیٹا موجود ہو تو میت کے بھائی بہن حق میراث سے محروم ہو جاتے ہیں؛ حالاں کہ بعض حالات میں وہ اس کے بہت زیادہ ضرورت مند ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان اقارب کو ترکہ میں حصہ نہیں ملتا، پس عقل و مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ جیسے دوسرے معاملات میں قریب ترین رشتہ دار دُور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے، براہ راست اولاد کی موجودگی میں بالواسطہ اولاد محروم ہو جائے۔

بعض شبہات

یتیم پوتوں، پوتیوں کے میراث کے حقدار ہونے کے سلسلے میں نہ کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل؛ بلکہ عام طور پر ایک جذباتی بات کہی جاتی ہے کہ یہ سب بے چارے یتیم اور غریب ومحتاج ہیں، اگر دادا کے ترکہ میں سے ان کو حصہ نہیں ملے تو کیسے ان کی ضرورت پوری ہوگی اور کیوں کر ان کی پرورش ہو سکے گی؟ مگر یہ بات کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے:

- یتیم پوتوں اور پوتیوں کا اپنے چچاؤں کے مقابلے غریب ومحتاج ہونا ضروری نہیں، بہت سی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کے انتقال کے بعد بیٹے کی اولاد کی طرف دادا کا جھکاؤ بڑھ جاتا ہے، وہ تعلیم وتربیت کے اعتبار سے ایک مقام حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ان کی حالت اپنے چچاؤں سے کئی درجہ بہتر ہوتی ہے؛ اس لئے لازماً ان کو محتاج سمجھنا اور ان کے مقابلہ ان کے چچاؤں کو معاشی اعتبار سے بہتر تصور کرنا درست نہیں؛ بلکہ دونوں پہلوؤں کا یکساں امکان ہے۔
- جن لڑکوں اور لڑکیوں کے والد کا انتقال ہو گیا، ان کو تو دادا کی جائیداد سے حصہ مل

جائے ، اور جن کے والد زندہ ہیں، ان کی اولاد کو حصہ نہ مل پائے ، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے ؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ دادا کے ترکہ سے ان کے والد کو جو حصہ ملے ، وہ والد کے ہاتھوں ہی خرچ ہوجائے اوران کی وفات کے بعدان کی اولاد کے لئے اس میں سے کچھ باقی نہ رہے۔

- یہ بات بھی انصاف کے خلاف ہے کہ یتیم پوتوں، پوتیوں یا نواسوں،نواسیوں کے سلسلے میں تو رعایت پر مبنی اُصول کو برتا جائے اور بوڑھے دادا، دادی اور نانا، نانی کے ساتھ اس اُصول کو اختیار نہیں کیا جائے۔
- سوال یہ ہے کہ ترکہ حاجت کی بنیاد ہے یا قرابت کی بنیاد پر؟ اگر قرابت کی بنیاد پر ہے تو پھر خاص اسی مسئلہ میں حاجت کو کس طوز پر معیار بنایا جاسکتا ہے؟
- ترکہ کا مقصد پرورش نہیں ہے، اگر اس کا مقصد پرورش ہوتو جن لوگوں کے مورث ترکہ چھوڑ کر نہیں جائیں، ان کی پرورش کس طرح ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ یتیم پوتے کی میراث کے مسئلہ کو جس انداز پر پیش کیا جاتا ہے، وہ واقعہ کے بھی خلاف ہے اور شریعت میں تقسیم میراث کے جو اُصول مقرر ہیں ، ان کے بھی مغائر ہے۔

مسئلہ کا حل

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر دادا یا نانا ایسے محروم ہوجانے والے پوتوں، پوتیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیں تو ان کے لئے راستے بند ہیں ؛ بلکہ ان کے لئے دوصورتیں ہیں :

(ا) ہبہ : یعنی ان کو زندگی ہی میں جائیداد کے کچھ حصہ کا مالک بنادیا جائے ، اس میں مقدار کی کوئی قید نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے والد کے زندہ ہونے کی صورت میں اس کا جتنا حصہ ہوسکتا تھا، اس سے زیادہ حصہ دادا اپنے پوتے کو دے دے، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے محرم رشتہ دار کو کوئی چیز ہبہ کرے تو یہ ہبہ نا قابل واپسی ہوتا ہے؛ اس لئے اگر دادا نے پوتے کو کوئی چیز ہبہ کردی تو اب وہ اس سے رُجوع بھی نہیں کرسکتا۔

(۲) وصیت : یعنی وہ وصیت کرسکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کے ترکہ میں سے اتنی مقدار اس کے محروم الارث پوتے پوتی کو دے دیا جائے، وہ ایک تہائی ترکہ کی بھی وصیت کرسکتا ہے، وارث کے حق میں تو وصیت معتبر نہیں ہے؛ لیکن چوں کہ پوتا وارث نہیں؛ اس لئے اس کے حق میں وصیت کا اعتبار ہے، مثلاً: اگر دادا پوتے کے لئے ایک تہائی کی وصیت کرجائے تو ممکن ہے کہ یہ اس کے چچا کے فی کس حصہ سے بھی بڑھ جائے۔

ہبہ اور وصیت کی صورت تو اختیاری ہے؛ لیکن نفقہ کا حکم لازمی ہے، اور اگر کسی شخص کے والد نہ ہوں تو دادا پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور دادا نہ ہوں تو پھر دوسرے رشتہ داروں پر واجب ہے، جیسے میراث کے حقدار ہونے میں رشتہ داری کا لحاظ رکھا جائے گا، اسی طرح نفقہ کے واجب ہونے میں بھی رشتہ داری ملحوظ ہوگی، فقہاء نے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے؛ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے :

> نفقہ ہر محرم رشتہ دار کا واجب ہے؛ اگر وہ نابالغ اور محتاج ہو اور عورت ہو تو بالغ کا بھی؛ بشرطیکہ محتاج ہو، یا بالغ محتاج مرد ہو، اپاہج یا نابینا ہو، تب بھی اس کا نفقہ واجب ہوگا اور یہ نفقہ میراث کے تناسب سے واجب ہوگا اور جس پر واجب ہے، اسے نفقہ ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، نیز اعتبار صرف اس بات کا ہے کہ وہ اس سے میراث پانے کا اہل ہو، حقیقتاً میراث کا مستحق ہو، یہ ضروری نہیں ہے، اور ذوی الارحام اگر مالدار ہوں، تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اسی طرح ان عمر رسیدہ لوگوں کا بھی جو صحت مند ہوں، چاہے وہ محتاج ہوں، دوسروں پر ان کا نفقہ واجب نہیں کیا جائے گا، ہاں ذوی الارحام میں سے عمر رسیدہ خواتین کا نفقہ واجب ہوگا؛ اگر وہ تندرست ہوں؛ بشرطیکہ ان کو نفقہ کی ضرورت ہو۔(۱)

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۵۶۰-۵۶۶۔

اسی طرح علامہ ابن عابدین شامیؒ اقارب کے نفقہ کی ترتیب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> جب باپ کے پاس مال نہ ہو اور دادا، یا ماں، یا ماموں، یا چچا خوش حال ہوں تو انھیں نابالغ بچہ کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، اور جب باپ خوش حال ہو جائے تو وہ اس پر اپنے کئے ہوئے اخراجات کے لئے رُجوع کریں گے، اسی طرح قریبی رشتہ موجود نہ ہوں، تو دُور کے رشتہ دار کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا، اگر ماں خوش حال ہو، تو ماں پر نفقہ ہوگا اور وہ بعد میں اس کے باپ سے پیسہ وصول کرے گی، اسی طرح اگر باپ نہ ہو تو مذکورہ رشتہ داروں کو نفقہ پر مجبور کیا جائے گا۔(۱)

اس لئے اگر کوئی لڑکا یا لڑکی یتیم ہو جائے تو شریعت کے مقرر کئے ہوئے اُصول کے مطابق اس کا نفقہ اس کے رشتہ دار ادا کریں گے، بہر حال شرعاً جن لوگوں سے نفقہ کا حکم متعلق ہے، ان پر یہ حکم وجوبی ہے، محض استحباب اور جواز کے درجہ میں نہیں ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں اقرباء پر نفقہ واجب قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ''۔(البقرۃ:۲۳۳)

علی کا لفظ عربی زبان میں کسی چیز کے واجب و لازم ہونے کو واضح کرتا ہے :

> و اما علی فهو للإلزام باعتبار اصل الوضع ۔ (۲)



---

(۱) ردالمحتار:۵/۲۳۵، باب النفقہ ۔ (۲) أصول السرخسی:۱/۲۲۱۔

اسلام پر بے جا اعتراضات

ہندوستان اور مسلمان

بابری مسجد کا مسئلہ☆

ہندوستان پر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو ہندو مسلم دونوں نے مل کر پوری قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اس سلسلے کی سب سے طاقتور اور ملک گیر کوشش ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سامنے آئی ، اس تحریک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق سے انگریزوں کی یہ سوچ بنی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کیا جائے ، ہندوستان کو اپنے قابو میں نہیں رکھا جاسکتا، اس لئے انھوں نے ایک کام علمی سطح پر کیا اور ایک کام سیاسی سطح پر کیا، علمی سطح پر یہ کیا کہ ہندوستان کی ایک نئی تاریخ لکھی اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے ایسا مواد شامل کیا جس سے ظاہر ہو کہ مسلمانوں نے اس ملک میں ہندو رعایا پر بڑے مظالم ڈھائے ، ان کو جانی نقصان پہنچایا ہے، ان کی دولت کو لوٹا ہے، ان کی عزت وآبرو کو پامال کیا ہے، ان کو جبراً مسلمان بنایا ہے اور ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا ہے۔

سیاسی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسے گروہ پیدا کئے جو مذہبی منافع کے داعی اور ہندو مذہب اتحاد کے مخالف تھے ، ہندوؤں میں یہ فرقہ پرست لوگوں سنگھ پریوار کی شکل میں پیدا ہوئے ، آزادی سے پہلے اس نے انگریزوں کا آلۂ کار بن کر فرقہ پرستی کا ذہن بنایا اور آزادی کے بعد بھی منظم طور پر اس کام کو جاری رکھا، یہاں تک کہ اپنے نفرت انگیز ایجنڈہ کے ذریعہ بام اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ، مسلم فرقہ پرستوں کو بھی انگریزوں نے خوب پروان چڑھایا اور مسلمانوں میں ایک ایسے گروہ کو اُبھارا گیا جو قومی نظریہ کا پرجوش داعی تھا، اس تحریک میں پاکستان کی شکل میں اپنی کوششوں کا پھل حاصل کرلیا، اگرچہ پاکستان کی بنیاد

☆ اس تحریر میں ڈاکٹر مختار احمد مکی کے مضمون (ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی) ، سید صباح الدین عبد الرحمنؒ اور جناب عبد الرحیم قریشیؒ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اور اس کا عطر جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ (رحمانی)

لاکھوں مسلمانوں کی لاش پر قائم ہوئی؛ لیکن بہر حال مسلم فرقہ پرستی کا مسلم فرقہ پرستی نے پاکستان کو اپنی منزل بنایا اور ہندوستان اس سے محروم ہوگیا؛ لیکن ہندو فرقہ پرستی پوری قوت کے ساتھ آج ہندوستان پر مسلط ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ آئے دن مسجد مندر اور مسلم حکمرانوں کے مظالم کی جھوٹی داستان میڈیا کے ذریعہ پھیلائی جارہی ہے اور اب جھوٹ کو تاریخ کا حصہ بنایا جارہا ہے، اس پس منظر میں مختلف زبانوں اور خود اُردو زبانوں میں بہت سارا لٹریچر شائع ہو چکا ہے، ان ہی مسائل میں ایک بابری مسجد کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر جناب سید صباح الدین عبد الرحمنؒ، جناب عبدالرحیم قریشیؒ اور جناب محمد مختار ملکی کی تحریریں بڑی اہم ہیں، ان کتابوں سے اور بعض دیگر مأخذ سے استفادہ کرتے ہوئے یہ تحریر مرتب کی گئی ہے۔

بابری مسجد کے مسئلہ میں کئی سوالات اہم ہیں :

(۱) کیا رام جی کا واقعی وجود تھا، یا رامائن میں ایک علامتی اور افسانوی کردار کی حیثیت سے ان کا ذکر آیا ہے؟

(۲) اگر رام جی کا حقیقی وجود تھا اور آپ ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے تو ایودھیا سے کونسی جگہ مراد تھی؟

(۳) اگر آپ ایودھیا ہی میں پیدا ہوئے تو کس جگہ پیدا ہوئے؟

(۴) کیا بابری مسجد کی جگہ پر کوئی مندر تھا اور بابر یا اس کے گورنر میر باقی نے مندر کو منہدم کر کے مسجد بنائی تھی؟

رام جی، ایک تاریخی شخصیت یا فرضی کردار؟

رام جی سے اس قدر دیو مالائی اور محیر العقول واقعات رامائن کے مختلف نسخوں میں نقل کئے گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے اور تاریخی شہادتوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے بہت سے ہندو دانشور بھی اس کو ایک فرضی داستان سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رامائن کے سلسلہ میں ہندو دیدوانوں کا کہنا ہے کہ یہ پان ہمار کروڑ سال پہلے کی تصنیف ہے؛ کیوں کہ والمیکی رامائن میں

راون کے دروازہ پر چار دانت والے ہاتھی کھڑے رہنے کا ذکر ہے جو کہ ڈائنا سور ہوتے تھے، مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے رامائن ہنومان نے لکھی تھی؛ لیکن جب اس نے والمیکی کی تحریر کردہ رامائن سنی تو اپنی رامائن کو سمندر میں غرق کر دیا۔

اس کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں رامائن موجود ہیں :

● بودھوں کے جاتک کتھا میں رام چندر اور سیتا کو سگا بھائی بہن بتایا گیا ہے، جب ان دونوں کے درمیان غیر اخلاقی جسمانی رشتہ قائم ہو گیا تو ان دونوں کو سماج نے بن باس کی سزا دی۔

● پوم چرونامی جینیوں کی ایک مشہور کتاب جو نویں صدی کے جین شاعر سوئم بھوکی تخلیق بتائی جاتی ہے، اس میں بھی رام اور لکشمن کا تذکرہ ہے؛ لیکن اس میں لکشمن کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، لکشمن کو ہریا ور رام کو ہلدھر کا اوتار بتایا گیا ہے، لکشمن کے لئے اس میں ہری واسدیو، گووند، گوودھر، سارک دھر، کشو، جنادن اور سری گنت جیسے القاب استعمال کئے گئے ہیں، اس میں رام اور لکشمن کو جین مذہب کا پیروکار بتایا گیا ہے۔

● تمل کا کامپر رامائن، بنگلہ کا کتیری راسا رامائن، اودھی زبان کا رام چرتر مانس، ملیالم کا الکوٹا کن اوپا تما وغیرہ میں بیان کردہ کہانیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

● برما کی رامائن کے مطابق رام دسویں صدی میں بدھ دھرم کے ماننے والے راجہ تھے اور ان کی ملاقات گیا میں بودھی درخت کے نیچے بندر کے راجا سوریہ سے ہوئی تھی۔

● تبت میں موجود رامائن کے مطابق سیتا لنکا کے راجہ راون کی بیٹی تھی، جسے اس نے نجومیوں کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا، وہی بعد میں رام چندر کی بیوی بنی۔

● ملیشیاء میں موجود رامائن میں اسلامی عناصر شامل ہیں، اس کے مطابق اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو راون کے پاس بھیجا اور آدم نے راون کو دنیا کا بادشاہ بنا دیا، دسرتھ حضرت آدم کے پرپوتے یا چھڑپوتے تھے، جن کی دو بیویاں مندوآری اور بیلا داری تھی، راون نے دسرتھ سے مندوآری کو حاصل کر کے اپنی بیوی بنالیا، رام، سیتا، راون، والسین اور ہنومان آپس میں رشتہ دار تھے اور سیتا راون کی بیٹی تھی۔

● تھائی لینڈ۔ یے رامائن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ اصل رامائن ہے، والمیکی کی رامائن تھائی لینڈ کی راماکن (Ramakein) کا چربہ معلوم ہوتا ہے، اس میں تھائی لینڈ کے اودھیا (Ayutthaya) کو رام کی راجدھانی قرار دیا گیا ہے، لنکا میں فتح حاصل کر کے جب رام اجودھیا پہنچے تو انھوں نے ہنومان کو انعام دینے کے لئے ایک تیر چھوڑا کہ جہاں پر گرے گا وہ ہنومان کا علاقہ ہوگا، یہ تیر تھائی لینڈ کے لوپ بوری (Lopburi) میں گرا، وہاں کی زمین سفید ہوگئی اور یہ آج بھی ہے۔

● اس میں ہنومان کا کردار بھی خاصا دلچسپ ہے، ہندوستان کی رامائن کے مطابق ہنومان برہمچاری تھے، جب کہ رامکین (Ramakein) میں تفصیل سے اس کی شادی کے متعلق لکھا گیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ اس کے ناجائز تعلقات بہت سی عورتوں سے تھے۔

● لاؤس کے رامائن کے مطابق راون رام کا چچازاد بھائی تھا، بن باس کے دوران جب رام جنگلوں میں بھٹک رہے تھے تو انھوں نے ایک درخت کا پھل کھالیا، جس کے اثر سے وہ بندر بن گئے، رام نے ننگسی (Nengsi) نامی ایک بندریا سے شادی کرلی اور اس سے ہنومان کی پیدائش ہوئی۔

● کمبوڈیا کی رامائن رامکار (Ramkar) کے مطابق رام بھگوان وشنو کے اوتار تھے، ان کے ایک دربان اکینگامیسو (Akaingameso) نے راون کی شکل میں جنم لیا، سیتا پہلے اندر کی بیوی تھی؛ لیکن جب راون نے اس کی تذلیل کی تو اس نے راون کی بیٹی کی شکل میں جنم لیا، راون نے اپنے نجومی بھائی بیبھیک (Bibhek) کے مشورہ پر سیتا کو ایک بکس میں کر کے زمین میں گاڑ دیا تھا، راجہ جنک نے اس بکس کا پتہ لگا کر اس کو وہاں سے نکالا۔(۱)

● راج مندری (دکن) کے ملادی ونکٹ رتنم (Malladhi Venat Ratnam) اپنی کتاب ''مصر کا فرعون، رام'' میں تحریر کرتے ہیں کہ :

---

(۱) اے ایس بوریج، بابرنامہ (لندن ۱۹۲۱ء) جلد دوم۔

رامائن ایک مصری فرعون رامسیز ثانی کی کہانی سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے بادشاہ کا یہی نام تھا، سیتا بھی ایک قدیم مصری نام ہے جو آج بھی دولت مند اور متمول گھرانہ میں عام ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے، خود رامائن کے مطابق بالمیک ہندو نہیں بلکہ بدیسی نووارد تھا، برہما نے اپنے بیٹے نردکو آسمان سے اس داستان کو سنانے کے لئے بھیجا تھا اور یہ قصہ سنا کر وہ آسمان کی طرف لوٹ گیا۔

ونکٹ رتنم کا خیال ہے کہ یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ وروپ دے دیا گیا ہے، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ رام نام کے کسی بادشاہ کا ذکر ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتا، رامائن کے مطابق راجہ دسرتھ نے دس ہزار اور رام نے گیارہ ہزار برس تک حکومت کی تھی، اگر ان دونوں کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے پچیس ہزار سال قبل مان لیا جائے تو ان دونوں کا عہد حکومت چھیانوے ہزار سال قبل مسیح ہوتا ہے، جب کہ رامائن میں ہی گوتم بدھ کا ذکر بھی موجود ہے جو کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے۔

● اس چیدانند داس گپتا نے السٹر ٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے ۱۵ر جون ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں تحریر کیا ہے کہ وید کے مطابق راجہ دسرتھ اور رام وارانسی کے راجہ تھے، دسرتھ جاتیکا میں بھی انھیں وارانسی کا ہی راجہ بتایا گیا ہے، مزید یہ کہ سیتا کا تعلق راجہ جنک سے نہیں تھا؛ بلکہ وہ رام و لکشمن کی سگی بہن تھی، اس کے علاوہ رام کے جس لنکا کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ سری لنکا نہیں؛ بلکہ مدھیہ پردیش کی ایک جگہ ہے۔

● پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی ۱۹۵۵ء کے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جرنل میں تحریر کردہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

رامائن کا قصہ ہومر سے مستعار لیا گیا ہے؛ کیوں کہ دس سروں والے راکشش کا وجو یونانی تخیل کی بازگشت ہے، ہندوؤں کی قدیم ترین خرافاتی ادب میں بھی ایسے راکشش کا ذکر موجود نہیں ہے۔

مختلف شواہد کی بنیاد پر ان کا یہ بھی کہنا ہے رام اور سیتا حقیقی بھائی بہن تھے اور ازدواجی رشتہ میں بھی منسلک تھے۔

● الٰہ آباد یونیورسٹی کے قدیم تاریخ کے پروفیسر آر پی ترپاٹھی کے مطابق "کسی کردار کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے تاریخ یہ تقاضہ کرتی ہے کہ سکوں یا کندہ تحریروں وغیرہ کی ٹھوس شہادت موجود ہو، اگر ہم اُن مقامات کو بھی نظر میں رکھیں جن کا ذکر رامائن میں آیا ہے، جیسے: چترکوٹ، ایودھیا، جو آج بھی موجود ہیں، تب بھی حقیقت یہ ہے کہ رامائن ایک تاریخی کتاب نہیں ہے؛ اس لئے اس نقطۂ نظر سے رام کے وجود کو ثابت کرنے کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے، یہ کہنے کے باوجود رام کے وجود کا ہم آسانی سے انکار نہیں کرسکتے؛ کیوں کہ ایک عرصہ دراز سے رام ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ رہے ہیں"۔

ایس ستار (Satttar) سابق صدر نشین انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کہتے ہیں کہ: "رامائن میں ایسی کوئی شہادت نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ دیو مالائی قصہ کے سوا کچھ اور ہے، کوئی تاریخی یا آثارِ قدیمہ کی شہادت موجود نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہو کہ رام کا وجود تھا اور یہ کہ انھوں نے ایودھیا پر حکومت کی۔

● زمانے کی وقت شماری کے ہندو یگ سسٹم کے مطابق شری رام ۲۴ ویں یا ۲۸ ویں تریتا یگ کے اواخر میں پیدا ہوئے اور ہم کلیگ کے ۲۸ ویں دور میں ہیں، اس لحاظ سے شری رام کا زمانہ قریباً (۱۸۰) لاکھ سال پہلے کا ہے، دنیا میں کہیں بھی (۱۰) لاکھ سال پہلے کے کوئی آثار یا کوئی نشانیاں موجود نہیں ہیں، رامائن وغیرہ میں اس وقت کے ستاروں اور برج کی جو کیفیت ملتی ہے، اس کی بنیاد پر ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ شری رام عیسیٰ علیہ السلام سے ۵۵۶۱ یا ۳۲۲۷ سال پہلے پیدا ہوئے ہوں گے؛ لیکن ایودھیا میں یا (UP) کے کسی اور مقام پر جن کے نام رامائن میں شری رام کے قصہ کے کسی واقعہ کے بارے میں ملتے ہیں، وہاں عیسیٰ علیہ السلام سے ۷۰۰ سال پہلے ماضی میں کوئی انسانی آبادی نہیں پائی گئی، رامائن کی (Archaeology) نائی پروجیکٹ کے تحت ایودھیا کے بعض مقامات پر کھدائیوں سے یہ حقیقت سامنے آئی اور اس

سوال کا مثبت انداز میں تاریخی اور آثار قدیمہ کی شہادتوں کے ساتھ جواب دینا تقریباً ناممکن ہے کہ رام ایک تاریخی شخصیت یا تاریخ میں گذرے ہوئے انسان تھے۔(۱)

یہ تو مؤرخین اور اصحابِ تحقیق کا بیان ہے؛ لیکن بہ طور فرض وتقدیر برادرانِ وطن نے رام جی کے وجود کو عقیدہ کا حصہ مان لیا ہے تو ہم بھی اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

ایودھیا کا محل وقوع

ایودھیا سے کونسی جگہ مراد ہے؟ وہی جگہ جو ابھی ایودھیا کہلاتی ہے یا کوئی اور جگہ؟ اس میں بھی خاصا اختلاف ہے :

● آثار قدیمہ کے سابق ڈپٹی سپر ٹنڈنٹ ایم، ڈی، این، کرشنا راؤ نے دعویٰ کیا تھا کہ اصل ایودھیا ہریانہ کا مقام ''بناولی'' ہے اور ان کے بہ قول اس سلسلہ میں ان کے پاس دلائل بھی ہیں۔(۲)

● رام پور کے ایک پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ رام جی کی پیدائش کی اصل جگہ رام پور ہے اور اس سلسلہ میں ان کے پاس ثبوت ہے۔

● نیپال کے موجودہ وزیر اعظم کے پی شرما کا بیان ایک سے زیادہ بار آچکا ہے کہ رام جی نیپال میں پیدا ہوئے تھے اور رامائن میں جس ایودھیا کا ذکر ہے، وہ نیپال کے شہر بیر گنج سے مغرب میں واقع ہے۔(۳)

● آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور اس سے قبل بنارس ہندو یونیورسٹی نے ایودھیا نندی گرام اور چترکوٹ میں کھدائیاں کیں؛ تاکہ شری رام کے دور کے آثار و واقعات کا پتہ لگایا جائے، نندی گرام کو بھرت نے شری رام کے بن باس کے دوران پایہ تخت بنایا تھا اور چترکوٹ میں شری رام نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا، ان کھدائیوں نے ثابت کیا کہ شری رام کے زمانہ

---

(۱) ایودھیا کا تنازعہ: ۵۳-۵۴۔

(۲) قومی آواز، دہلی: ۶/ مارچ ۱۹۹۸ء۔

(۳) بی بی سی اُردو نیوز: ۱۵/ جولائی ۲۰۲۰ء۔

میں ان مقامات کا کوئی وجود نہیں تھا، ان مقامات پر شری رام کے زمانہ میں کوئی انسانی آبادی نہیں تھی، ان مقامات پر انسانوں نے شری رام کے بہت بعد ہزاروں سال بعد بسنا شروع کیا، اس لئے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے ۱۹۸۰ء کے بعد کھدائیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔(۱)

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فی الحال جو جگہ ایودھیا سے موسوم ہے، وہ ایودھیا نہیں ہے، جس میں رام جی کی پیدائش ہوئی تھی۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے جسورام نے اپنی تحقیق ''رامائن کا قدیم جغرافیہ'' کے نام سے مرتب کی ہے، ان کی تحقیق کے مطابق دو الگ الگ ایودھیا ہیں، ایک وہ جو رام سے پہلے بسایا گیا، دوسرا: وہ جس کو رام نے بسایا؛ چنانچہ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

> رامائن کے مطابق رام نے دریائے سریو پر پہلا شہر تعمیر کیا اور اس کا نام ایودھیا رکھا، یہ دریائے سریو، دریائے گھاگھرا نہیں ہے؛ بلکہ رِگ وید کے مطابق دریائے سندھ میں گرنے والا دریا ہے، اس دریا پر واحد قدیم شہر ہڑپہ ہے جو حصار بند ہے، مہابھارت کے مطابق ایودھیا دریائے ایراوتی اور دریائے سریو کے درمیان واقع تھا، اس لئے رام سے پہلے کا تعمیر کردہ ایودھیا رحمٰن ڈیری ہے اور بعد کا رام کا تعمیر کردہ ایودھیا ہڑپہ ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ اس نے بی بی لال سے بھی گفتگو کی، جس نے اتفاق کیا کہ موجودہ ایودھیا شری رام کا ایودھیا نہیں ہے، دو ایودھیا جن میں سے ایک کو رام کے پردادا راجا رگھو نے تعمیر کیا اور دوسرا ایودھیا جس کو خود رام نے تعمیر کیا، یہ دونوں ایودھیا پاکستان کے شمال مغربی صوبہ کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ہیں۔(۲)

---

(۱) ایودھیا تنازعہ:۵۷، تالیف: جناب محمد عبدالرحیم قریشیؒ۔

(۲) ایودھیا کا تنازعہ:۶۰، تالیف: محمد عبدالرحیم قریشیؒ۔

رام جی کی جائے ولادت

اگر ایودھیا وہی جگہ ہے جو اس وقت ''ایودھیا'' کہلاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس شہر میں رام جی کی پیدائش کس جگہ پر ہوئی؟ کیوں کہ اس وقت ایودھیا میں ڈبلوا ے تیاگی کے بہ قول ۲۳/ ایسے مندر موجود ہیں جن کے بارے میں ان مندروں کے متولیوں کا دعویٰ ہے کہ یہی رام جی کی جائے پیدائش ہے، پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں رام جی کی اصل جائے پیدائش معلوم کرنے کے لئے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اس کمیٹی نے کافی تلاش وجستجو کے بعد دو مقامات کے بارے میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ رام جی کی جائے پیدائش ہو، ان میں سے ایک کا نام ''رام جنم استھل'' رکھا، اور دوسرے کا ''رام جنم بھومی'' (Disputedmosque) یہ دونوں جگہیں بابری مسجد کے علاوہ ہیں۔

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشن کے بیٹے پروفیسر ایس گوپال نے مدراس میں اپنے ایک خطبہ میں کہا کہ ایودھیا میں ۳۰/ ایسے مقامات موجود ہیں، جن کے پجاری کہتے ہیں کہ یہی اصل میں رام کا جنم استھان ہے۔(۱)

کیا بابری مسجد کی جگہ پر کوئی مندر تھا؟

اب اس نکتہ پر غور کیجئے کہ جس جگہ بابری مسجد کی عمارت تھی، کیا اس جگہ پہلے مندر تھا؟ اس سلسلہ میں کوئی تبصرہ کئے بغیر تاریخی شواہد اور ماہرین کی آراء پیش کی جاتی ہیں، جن میں زیادہ تر غیر مسلم دانشوران ہیں :

● سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۸۱ء کے امپیریل گزٹ میں لکھا ہے کہ ایودھیا کی کل ۵۱۸، ۷ کی آبادی میں ۶۰ ۴ ، ۴ ہندو ۵۱۹، ۲ مسلمان ہیں، ہندوؤں کے ۹۶ مندر ہیں، جب کہ ۳۶ مسجدیں ہیں، کوشل خاندان کے خاتمہ کے بعد یہاں بدھوں کا تسلط بھی قائم ہوا تھا اور یہ بدھ مت کا بھی ایک بڑا مرکز بدھ نگری رہا ہے، ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ نے بھی ۹ ر سال

(۱) ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی: ۱۰۸، تالیف: ڈاکٹر مختار احمد مکی۔

یا ۱۹ ارسال یہاں گزارے تھے، ایک زمانہ میں یہاں بدھ مت کے ۲۰/ویہار بھی موجود تھے، جس میں ۳۰۰۰ بھکشو رہا کرتے تھے، پانچویں صدی میں چینی سیاح فاہیان اور ساتویں صدی میں ہوین سانگ نے ایک بدھ شہری کی حیثیت سے اس کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے بودھ آبادی اور پرارتھنا استھلوں کا تذکرہ کیا ہے، یہ جین مت کے ۵ تیرتھنکر یا پیشواوؤں کا بھی مسکن مانا جاتا ہے اور ان کے منادر بھی یہاں تھے، اجودھیا میں رام بھکتی سے دوسو سال قبل صوفی ازم بھی پہنچ چکا تھا؛ کیوں کہ یہ مانا جاتا ہے کہ رام بھکتی کا ہندوعوام میں پھیلاؤ اکبر کے ہم عصر تلسی داس کے رام چرت مانس کے ذریعہ ہی ہوا، تلسی داس اور بالمیکی کی ایودھیا دیو مالائی نگری اور سریو ندی ایک دیو مالائی ندی رہی ہے، اس بنیاد پر ہندو ایودھیا کو خاص طور پر پوتر (پاک زمین) مانتے ہیں، یہ ان کے لئے دھارمک پرمپرا کا معاملہ ہے، ان کی آستھا (عقیدہ) کے مطابق رام چندر جی کی پیدائش ایودھیا میں ہوئی تھی، جہاں انھوں نے گیارہ ہزار برس تک حکومت کی اور مرنے پر یہیں انھیں نذرِ آتش کیا گیا۔

● ۱۸۵۴ء سے قبل تک کسی بھی ہندوستانی یا غیر ملکی سیاح، مشاہد یا مورخ نے ایودھیا میں کسی رام جنم بھومی مندر کا تذکرہ نہیں کیا ہے، نہ تو فاہیان یا ہیون سانگ نے اور نہ ہی چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ نے، ولیم فنچ جو پہلا یورپین سیاح مانا جاتا ہے، جب وہ ۱۶۰۸ء میں ایودھیا کا ذکر کرتا ہے تو وہ وہاں کے گھاٹوں اور عقیدوں کا ذکر کرتا ہے، مسجد یا جنم بھومی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، بابر کا ایامِ شہزادگی میں بھیس بدل کر ایودھیا آنے کا ذکر نہ تو تزکِ بابری میں ہے اور نہ ہی گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ میں، اور نہ ہی کسی مستند یا غیر مستند تاریخی کتاب میں۔(۱)

● ابوالفضل نے آئین اکبری اور اکبرنامہ میں صرف اتنا کہا ہے کہ ایودھیا رام چندر جی کی پیدائش کی جگہ کہی جاتی ہے اور یہ یاترا کے لئے مشہور ہے، جو ۴۰ کوس مشرق ۲۰ کوس

(۱) شہر اولیاء: دبیر احمد: ۲۷۶، ط: فیض آباد، ۱۹۹۱ء۔

شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی ہے، اس میں چھ سات گز لمبی دو قبریں ہیں، جو کہ حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام سے منسوب ہیں اور ان سے متعلق کہانیاں مشہور ہیں، اس میں بھی مندر گرا کر مسجد کی تعمیر کا کوئی ذکر نہیں۔

● سوشیل شری واستو لکھتے ہیں :

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عام عقیدہ کہ بابر یا اورنگ زیب نے ایودھیا میں مندر گرائے، ان نظریات کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ایجاد کئے گئے، انگریز اسکالروں نے اس بات کو ہوا دی کہ بابر ایودھیا آیا تھا، کوئی ٹھوس تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب کبھی ایودھیا گیا تھا، یا اس نے وہاں کسی مندر کو توڑنے کا حکم دیا۔(۱)

● پروفیسر ہربنس لال مکھیا کہتے ہیں :

۱۸۲۲ء کے بعد یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ مسجد کی جگہ مندر تھا ورنہ کسی مسلمان یا ہندو کی کتاب میں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں، یہ محض قیاس ہے، واقعہ نہیں کہ یہاں مندر تھا اور قیاس بھی اسی بنیاد پر ہے کہ چوں کہ بابر مسلمان تھا اس لئے ضرور اس نے مندر توڑا ہوگا۔(۲)

● اس سلسلہ میں سنسکرت کتاب اسکندر پران کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس کا ایک باب ایودھیا ماہاتمیہ ہے، اس کے علاوہ کہ یہ بات محققین کے نزدیک الحاقی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ رام چندر جی کی پیدائش ایودھیا میں ہوئی تھی؛ لیکن جائے پیدائش کی جو چوحدی دی گئی ہے، اس کے مطابق یہ مقام ۵۰۰ دھنش (۹۱۰ میٹر) لومش سے مغرب اور ۱۰۰۹ دھنش (۱۸۳۵ میٹر) وگھنیشور سے مشرق میں واقع ہے، لومش رینا موچنا (Rinamochana) کا

---

(۱) ڈسپیوٹیڈ ماسک، سوشیل شری واستو: ۶۷، ط: دہلی ۱۹۹۶ء۔

(۲) مضمون: دی ہندو مدراس: ۲۶/ جون: ۱۹۹۴ء۔

قدیم نام ہے، اس طرح یہ پریم کند کے نزدیک سریوندی کے کنارے کہیں واقع ہے، یہ جگہ موجودہ بابری مسجد سے کافی دُور ہے، بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر سید شہاب الدینؒ لکھتے ہیں :

ایسا کوئی ثبوت یا شہادت موجود نہیں ہے کہ شری رام کی جائے پیدائش پر بنائے گئے مندر کو ۱۵۲۸ء میں گرا کر مسجد بنائی گئی ہو، پہلے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس مندر کو راجہ بکرماجیت نے ۵۰ سال قبل مسیح بنوایا تھا، مگر بدقسمتی سے دو مشہور سیاح فاہیان اور ہیون سانگ نے کبھی بھی اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر نہیں کیا، تب یہ کہا گیا کہ اس مندر کو گیارہویں صدی میں قنوج کے راجہ نے بنایا تھا، اودھ کا علاقہ دسویں اور گیارہویں صدی میں مسلسل اور متواتر افغان حملہ کا نشانہ رہا، حیرت ہے کہ ان حالات میں بھی یہ مندر بنتا رہا، بارہویں صدی کے آخر میں ایودھیا مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، ساڑھے تین سو سالوں میں ان مسلمان حکمرانوں نے اس کو کچھ بھی نہیں کیا اور اسے توڑنے کا کام بابر کے لئے چھوڑ دیا۔(۱)

بابر کا مزاج

کسی واقعہ کی تصدیق میں اس بات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ واقعہ جس شخص کی طرف منسوب کیا جارہا ہے، کیا یہ بات اس کے مزاج سے میل کھاتی ہے؟ اس پہلو سے غور کیا جائے تو مندر منہدم کرنا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کرنا بابر کے مزاج سے بالکل میل نہیں کھاتا ؛ چنانچہ ۲۰؍جنوری ۱۵۲۶ء کو بمقام دھولپور فارسی زبان میں ہمایوں کے لئے جو وصیت نامہ بابر نے تحریر کیا ہے، وہ بابر کے مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے، اس کا ایک اقتباس اس طرح ہے :

اے میرے فرزند! ہندوستان مختلف مذاہب سے بھرا پڑا ہے، بحمد اللہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس پر تمہیں بادشاہی عطا فرمائی ہے، تمہیں

(۱) ریڈینس، دہلی ۱۹-۲۵؍مارچ ۱۹۹۵ء۔

> لازم ہے کہ اپنے دل کو ہر قسم کے مذہبی تعصبات سے خالی کر کے ہر قوم کے طریقہ کے مطابق عدل و انصاف کرو، اپنی بادشاہی کے اندر کسی قوم کی عبادت گاہوں کو خراب یا مسمار مت کرنا، ایسا انصاف کرنا کہ بادشاہ رعیت سے اور رعیت بادشاہ سے خوشحال ہو جائے، اسلام کی ترقی تیغِ ظلم کے بجائے تیغِ احسان سے زیادہ بہتر ہے، مختلف العقیدہ رعایا کو عناصر اربعہ کی طرح متحد کر دو؛ تاکہ سلطنت کا جسم امراضِ مختلفہ سے محفوظ رہے۔(۱)

یہ تحریر اسی زمانہ کی ہے جب بابری مسجد تعمیر ہوئی تھی، اگر یہ کسی رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کو اس طرح کا وصیت نامہ تیار کر کے کیوں دیتا، بابر کے سلسلہ میں ہندو مورخین بھی اس کی شخصیت کی دل آویزی کے قائل رہے ہیں، الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنی کتاب رائز اینڈ فال آف مغل امپائر میں تحریر کرتے ہیں کہ :

> بابر میں مذہبی جنون بالکل نہیں تھا، اس کا رویہ ہندو، افغانی امراء اور رعایا کے ساتھ انتہائی مہذبانہ، شریفانہ اور دوستانہ ہوتا تھا، مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہیں بلکہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ ان کی مذہبی رواداری میں تھی، جس کی ابتدا بابر سے ہوئی تھی۔(۲)

رام پرشاد کھوسلہ نے ۱۹۳۴ء میں شائع اپنی کتاب مغل کنگ شپ اینڈ نوبیلیٹی میں بابر کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا کوئی ذکر موجود نہیں، اور نہ یہ ثبوت ہے کہ اس نے کسی کافر کو اس کے مذہب کی وجہ

(۱) راجندر پرساد، انڈیا ڈیوائڈیڈ، تیسرا ایڈیشن، ص:۳۹۔
(۲) رائز اینڈ فال آف مغل امپائر: ۱؍۵۴-۵۵۔

سے قتل کیا ہو، وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بَری تھا۔(۱)

بابر نے اپنی کتاب تزک بابری میں بہت دلچسپی سے اور لطف لے کر یہاں کے مندروں کا تذکرہ کیا ہے؛ لیکن کہیں بھی تعصب کی بنا پر مندر توڑنے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، مثلاً: بابر جب گوالیار کے قلعہ میں پہنچا تو وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالیشان بُت خانہ اتنا بلند ہے کہ قلعہ میں اس سے اونچی کوئی دوسری عمارت نہیں، دھولپور کے قلعہ سے اس کا نظارہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ بُت خانہ کا سارا پتھر وہاں موجود تالاب کو کھود کر حاصل کیا گیا تھا، (۲) اسی طرح بابر جب پھرار وکی جانب جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس کے اطراف کے پہاڑ کا ایک ٹکڑا تراش کر چھوٹے بڑے بُتوں کی مورتیاں بنائی گئی ہیں، اس کے جنوب میں ایک بہت بڑے بُت کی مورتی ہے جو تقریباً بیس گز کی ہوگی، ان سب بتوں کو ننگا بنایا گیا ہے اور اس کا ستر ڈھکا ہوا نہیں ہے، (۳) اگر بابر ایودھیا آیا ہوتا، یہاں کوئی مندر ہوتا اور خاص کر اس کو منہدم کر کے وہاں مسجد بنائی گئی ہوتی تو بابر نے اس کا ذکر کیا ہوتا۔

بابری مسجد میں موجود کتبہ پر فارسی زبان میں جو تحریر تھی، اسے اے ایس بیورج نے اپنی کتاب بابرنامہ میں اس طرح نقل کیا ہے :

بفرمود شاہ بابر کہ عدلش — بنائست کا کاخ گردوں ملاقی

بنا کرد ایں مہبط قدسیاں — امیر سعادت نشاں میر باقی

بود خیر باقی وسال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی (۹۳۵ھ)

بابر کے حکم سے جس کا انصاف ایک ایسی عمارت ہے جو آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے، یہ فرشتوں کے اُترنے کی جگہ خوش قسمت سردار میر باقی کے ذریعہ تعمیر کی گئی ہے، یہ کبھی ختم نہ ہونے والا تحفہ

(۱) مغل کنگ شپ اینڈ نوبیلیٹی: ۲۰۷۔ (۲) تزک بابری (اُردو ترجمہ): ۳۳۲۔
(۳) تزک بابری (اُردو ترجمہ): ۳۳۳، انگریزی ترجمہ بابرنامہ: ۶۱۳-۶۱۴۔

ہے؛اس لئے اس کی تعمیر کی تاریخ ان الفاظ سے عیاں ہے، یعنی یہ
کبھی ختم نہ ہونے والا فیاضی کا شاہکار ہے۔(۹۳۵ھ،۱۵۲۸ء)

(الف) دنیا پر حکومت کرنے والے حکمراں کی خواہشات کے مطابق۔

(ب) یہ عظیم الشان عمارت۔

(ج) یہ قائم رہنے والا خدا کا گھر تعمیر کیا گیا۔

(د) خوش قسمت سردار میر باقی کے ذریعہ۔

(ہ) اس عمارت کی بنیاد رکھنے والا خدا کرے، ہمیشہ باقی رہے، وہ اس دنیا کا اور اس زمانہ کا حکمراں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے اور جس پر مجھے ایمان ویقین ہے۔

(۱) اس کے نام سے جو صاحب عقل عظیم اور ساری کائنات میں عظیم ترین ہستی ہے۔

(۲) اِس حمد کے بعد ان کے منتخب پیغمبر پر رحمت ہو جو سارے پیغمبروں کے سردار اور اس کائنات میں افضل ترین ہے۔

(۳) قلندر کی مانند بابر ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا ہے؛اس لئے اس کے عہد میں دنیا کو خوش حالی نصیب ہوئی۔

(۴) وہ ایک ایسا فرماں روا ہے جس نے ہفت اقلیم کو فتح کیا۔

(۵) اس کے دربار کے ایک عالیشان سردار میر باقی ہیں۔

(۶) جو اس کی سلطنت کے منتظم، اس مسجد اور اس کی چوحدی کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔

(۷) اے خدا وہ ہمیشہ اس دنیا میں اپنی دولت، تاج اور تخت کے ساتھ برقرار رہیں۔

یہ تحریر اللہ کی وحدت اور خدا کی تعریف اور پیغمبر کی تعریف اور بادشاہ وسردار کی تعریف کے ساتھ مکمل ہوئی، خدا اس کی یادگار کو روشن اور قائم رکھے، تحریر شدہ بندہ حقیر وعاجز فتح اللہ محمد غوری۔(۱)

---

(۱) ڈاکٹر راجندر پرشاد، انڈیا ڈیوائیڈیڈ، طبع سوم:۳۹۔

اس کتبہ کے مطابق بابری مسجد کی تعمیر ۲۹ر ۱۵۲۸ھ میں مکمل ہوئی تھی، اگر یہ مندر توڑ کر بنائی گئی ہوتی تو اس کو بنوانے والے میر باقی اسے اپنا نمایاں کارنامہ سمجھتے ہوئے اور اس کی مذہبی حیثیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اس کتبے میں اس بات کا حوالہ ضرور دیتے کہ اس مسجد کو کفار کے عظیم رام مندر کو توڑ کر بنایا جارہا ہے۔

دوسرے قرائن

● مزید یہ کہ بابری مسجد کی تعمیر (۱۵۲۸ء) کے ۴۵ سال کے اندر ہی ۱۵۷۵ء میں تلسی داس نے اپنی مشہور کتاب رام چرتر مانس ایودھیا میں بیٹھ کر لکھی تھی، اگر رام چندر جی جو اُن کے ہیرو ہیں اور ان کی عظیم الشان مندر کو توڑ کر مسجد بنادی گئی تو وہ میر باقی کے ذریعہ مندر توڑ کر مسجد بنانے کا تذکرہ ضرور کرتے؛ لیکن ایسا کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں تھا تو وہ کس بات کا تذکرہ کرتے؛ بلکہ ان کا تو کہنا ہے کہ ایودھیا سے زیادہ تیرتھ یاترا کے لئے اہم جگہ پریاگ ہے۔

● سکھوں کے بانی اور پہلے گرو، گرونانک دیو (۱۴۶۹ء، ۱۵۳۸ء) بابر کے ہم عصر اور اس کے حملہ کے نقاد تھے، انھوں نے اپنے کئی دوہوں میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ ''تو نے ہندوستان میں دہشت پھیلا دی ہے تو نے یم (موت کے دیوتا) کو بابر کی شکل میں بھیج دیا ہے، تو اے چروا ہے تجھے ہی جواب دینا ہوگا؟ اے رب! تیرے طریقۂ کار کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے ''عجب ہیں تیرے طریقے، عجب ہیں تیرے فیصلے'' لیکن تمام دوہوں میں کہیں بھی کسی مندر کو توڑے جانے کا ذکر نہیں ملتا ہے؛ جب کہ روایت یہ بھی ہے کہ وہ ایودھیا گئے اور ٹھہرے بھی تھے۔

۱۹۹۱ء میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین پر مشتمل ایک غیر جانب دار ٹیم جو پروفیسر آر ایس شرما، پروفیسر محمد اطہر علی، پروفیسر این جھا اور پروفیسر سورج بھان پر مشتمل تھی، تاریخی بنیاد پر بابری مسجد سے متعلق ایک رپورٹ حکومت کو پیش کی تھی، اسے بعد میں لندن کے ایک ادارے انڈین مسلم فیڈریشن آف یوکے نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا، اس نے بابری مسجد کے تعلق سے

تمام ثبوتوں کے جائزے پر کافی غوروخوض کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ کچھ اس طرح ہے :

(۱) رام جنم بھومی سے متعلق کوئی بھی مخطوط ثبوت سولہویں صدی سے قبل کا موجود نہیں ہے، جو یہ ثابت کرے کہ ایودھیا میں کس مقام کو رام چندر جی کی جائے پیدائش کے طور پر تقدس حاصل تھا۔

(۲) اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ بابری مسجد کے مقام پر ۲۹-۱۵۲۸ء میں اس کی تعمیر سے قبل رام مندر یا کوئی مندر تھا، یہ نتیجہ آثارِ قدیمہ کے شواہد اور مسجد پر لگے کتبہ سے بھی ظاہر ہے۔

(۳) یہ داستان کہ بابری مسجد رام مندر کی جگہ پر قبضہ کر کے بنائی گئی ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں گڑھی گئی۔

(۴) یہ پوری داستان کہ رام چندر جی کی جائے پیدائش پر تعمیر شدہ مندر اور سیتا کی رسوئی منہدم کی گئی تھی، ۱۸۵۰ء کے بعد گڑھی گئی، یہ ایک تصوراتی تاریخ کے ترقی پسندانہ انداز سے تخلیق کا ڈراما ہے، جو صرف عقیدہ اور آستھا پر مبنی ہے اور جس کا حقیقت سے کوئی تعلق یا لینا دینا نہیں ہے۔

● اِلٰہ آباد ہائی کورٹ نے بابری مسجد کیس کی سماعت کرتے ہوئے ۵ / مارچ ۲۰۰۳ء کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ذمہ یہ کام سونپا کہ وہ کھدائی کے بعد پتہ چلائے کہ بابری مسجد سے پہلے اس جگہ پر کوئی مندر تھا یا نہیں، محکمۂ آثارِ قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے دوران وقفہ وقفہ سے جو رپورٹ عدالت کو پیش ہوتی رہی، اس میں یہ واضح طور پر کہا گیا کہ اس جگہ پر کسی مندر کی موجودگی کا کوئی آثار یا ثبوت نہیں ملا ہے؛ لیکن سب سے آخر میں جو رپورٹ ۲۲ / اگست ۲۰۰۳ء کو عدالت میں یکایک داخل کی گئی، اس میں حیرت انگیز طور پر دعویٰ کیا گیا کہ وہاں مندر تھا، غیر جانبدار سیکولر مؤرخین نے انتہائی حیرت کے ساتھ اس رپورٹ کو پڑھا اور اس کے

مختلف نکات پر تبصرہ کیا، عہد وسطیٰ کے ایک مشہور مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے اپنے ایک انٹرویو میں بہت واضح الفاظ میں کہا کہ سنگھ پریوار کے لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ وہاں کوئی مندر تھا، ان کا کہنا ہے کہ اس پوری رپورٹ کے ہر باب پر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے افراد استعمال نہیں کرتے ہیں۔

● اس کے علاوہ کھدائی کے دوران زمین پر موجود فرش کو مندر کا فرش بتایا گیا ہے، جب کہ وہ فرش چونا اور سرخی کا بنا ہوا ہے، جس کا استعمال اس زمانہ میں صرف مسلمان ہی اپنی عمارتوں میں کیا کرتے تھے، مزید یہ کہ ان بتوں پر ذبح کئے گئے جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں، ظاہر ہے مندروں میں جانور ذبح نہیں کئے جاتے ہیں۔

● بابری مسجد کے ملبہ میں شیو، ویشنو، بدھ اور جین کی مورتیاں ایک ساتھ ملی ہیں، مندر کسی ایک بھگوان کا ہوسکتا ہے ''کمپوزٹ ہندو ٹیمپل'' کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں ہے۔

● مزید یہ کہ کھدائی کے دوران ایک کتبہ کا طُغرا بھی ملا ہے جس کا رسم الخط تیرہویں چودہویں صدی کا ہے۔

● کھدائی کے دوران گلی زدہ ٹائیلس بھی ملے ہیں جو کسی مسجد میں ہی ممکن ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہاں سلطانی عہد کی کوئی مسجد تھی اور اس خستہ حال عمارت کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کی گئی ہو۔

● کھدائی کے دوران دیوی دیوتاؤں کے ٹوٹے پھوٹے پتھروں سے بنی دیوار بھی ملی ہے، جس میں ایک خاص طرز کے محراب اور طاق موجود ہیں، جو صرف مسجدوں میں ہوتے ہیں؛ لیکن اسے مندر کا بتایا جارہا ہے۔

اس طرح وشال مندر میں پچاس ستون کی بات کی جاتی رہی ہے؛ لیکن کوئی ستون نہیں ملا ہے، جسے آج ستون کہا جارہا ہے، وہ چونا اور سرخی کا ٹیڑھا میڑھا کنکریٹ ہے، ظاہر ہے مسجد کی چھت کسی ستون کے سہارے ہی کھڑی رہی ہوگی۔

بقول پروفیسر سورج بھان: جسے یہ مندر کی دیوار بتاتے ہیں، درحقیقت وہی یہ ثابت

کرتا ہے کہ وہ مندر کے نہیں بلکہ مسجد کے ہیں اور چاروں فرش جو انھیں ملے ہیں وہ بھی مسجد کے ہی ہیں۔(۱)

مزید یہ کہ سنگھ پریوار سے وابستہ تمام افراد اور ان کے ذریعہ تیار کردہ تمام لٹریچر اور کتابوں میں تحریر ہوتا ہے کہ ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء میں رام جی بابری مسجد میں اچانک پرکٹ ہو گئے؛ لیکن ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو تعزیرات ہند کی دفعات ۴۴۸، ۲۵۹ اور ۱۴۷ کے تحت فیض آباد کے ایودھیا تھانے میں تعینات سب انسپکٹر پنڈت رام دیو دوبے نے ماتا پرساد کانسٹیبل نمبر ۷ اور ہنس راج کا کانسٹیبل نمبر ۷۰ کے بیان پر جو پہلی F.I.R لکھی ہے، اس کے مطابق ابھیہ رام داس، رام شکلا، سدرشن داس کے علاوہ دیگر پچاس ساٹھ آدمی بابری مسجد کا دروازہ توڑ کر اور دیوار پھلانگ کر مسجد کے احاطہ میں داخل ہوئے اور وہاں بھگوان رام کی مورتی رکھ دی اور اندر کی دیواروں پر زعفرانی اور پیلے رنگ سے رام اور سیتا کی تصویریں بنا دیں، اس طرح انھوں نے مسجد کے تقدس کو پامال کیا، جب انھیں روکا گیا تو وہ لوگ نہیں مانے، صبح تک وہاں پانچ ہزار لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی اور ان لوگوں نے بھجن و کیرتن شروع کر دیا اور مذہبی نعرے لگانے لگے۔

الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ہندو فریقین کے ایک اہم گواہ سوامی اول مکینشور آنند جی مہاراج نے عدالت کو بتایا تھا کہ بابری مسجد کی جگہ میں پنج وقتہ نماز ۲۲/دسمبر ۱۹۳۶ء کی نماز عشاء تک ہوتی رہی ہے، (ایسا اس لئے ہے کہ ایک یہ دلیل پیش کی گئی کہ ۱۹۳۶ء سے اس میں نماز بند ہے اور صرف جمعہ کی نماز ہوتی رہی ہے) جسٹس ایس یو خان نے اپنے فیصلہ میں ان مراسلات کا حوالہ دیا، جو کہ پولیس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وغیرہ میں ہوتے رہے تھے، جب کہ اس واقعہ کو دوسرے ججوں نے پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے اپنے سروے کے دوران کوئی ایسی چیز برآمد نہیں کی جسے وہ مندر سے وابستہ کرتے، صرف ایک جوڑواں مرد و عورت کا درمیانی دھڑ ہے؛ لیکن یہ

---

(۱) فاروقی تنظیم پٹنہ، رانچی، ۱۱/اپریل ۲۰۱۲ء۔

بھی نیچے کی کھدائی میں نہیں ہے؛ بلکہ بابری مسجد کے ملبہ ملا ہے، میں جو ۲۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء تک مندر کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، مسجد کے نیچے کچھ باقیات اور ایک دو دیواریں ملی ہیں، جو کافی مضبوط اور لمبی ہیں جو کہ شمال سے جنوب کی جانب قبلہ رُخ ہے، جس کے بارے میں قیاس ہے کہ بابری مسجد بننے سے قبل وہاں موجود کسی مسجد کی رہی ہوں گی؛ کیوں کہ ہندوستان کے کسی مندر میں مغرب کی سمت کی دیوار شمال سے جنوب کی طرف نہیں ہوتی ہے، کھدائی کے دوران ایسے پتھر ضرور ملے ہیں جس پر نقش کندہ ہے؛ لیکن کوئی بھی نقش کسی مورتی یا انسان کی شبیہ کا نہیں ہے۔

ڈاکٹر سورج بھان، ڈاکٹر جیا مننن، ڈاکٹر ٹھکران وغیرہ نے عدالت میں دیئے اپنے بیان میں کہا کہ کھدائی سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا ہے کہ اس جگہ پر کبھی کوئی مندر یا کوئی ہندو مذہبی عمارت تھی۔(۱)

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ ۱۹۹۵ء میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

> میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں، رام چرت مانش یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔

ایک سابق آئی پی ایس آفیسر، پٹنہ ریلوے اسٹیشن کے باہر سرکاری زمین پر ایک عظیم مہابیر مندر تعمیر کروانے والے محکمہ داخلہ اُمور کے O.S.D دھارمک نیائے پریشد کے ایڈمنسٹر، سنسکرت کے ماہر ۱۹۹۰ء میں ایودھیا جانچ کمیٹی کے ممبر اور دربھنگہ سنسکرت یونیورسٹی کے

(۱) راشٹریہ سہارا، دہلی، ۷؍مئی ۲۰۰۵ء۔

وائس چانسلر کیشو کنال کی سات سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب (Ayodhya Rebuilt) ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی ہے، اس میں اس نے برٹش میوزیم لائبریری اور اب تک تمام موجود ثبوتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ بابری مسجد بابر نے نہیں بلکہ اورنگ زیب نے بنوائی تھی، اس کا کہنا ہے کہ بابر بہت سی خوبیوں کا مالک، آزاد خیال، سمجھدار اور عظیم بادشاہ تھا، وہ تمام مذاہب کا یکساں احترام کرتا تھا، جس وقت مندر کو توڑنے کی بات کی جاتی ہے، وہ ہندوستان آیا ہی نہیں تھا اور جب وہ ہندوستان آیا تو اسے ایودھیا جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی، مزید یہ کہ میر باقی نام کا اودھ کا کوئی گورنر ہوا ہی نہیں ہے؛ بلکہ ایک انگریز افسر کانن نے جب ۱۴، ۱۸۱۳ء میں ایودھیا کا سروے کیا تو وہاں ملے ایک کتبہ کی بنیاد پر اس نے دعویٰ کیا؛ لیکن اس کو انگلینڈ واپس پہنچنے کی جلدی تھی، اس وجہ سے اس نے کوئی تحقیق نہیں کی، اس کی اسی تحریر سے یہ غلط فہمی پھیلی کہ بابر نے مندر توڑ کر مسجد کی تعمیر کروائی ہوگی؛ جب کہ اورنگ زیب نے متھرا اور وارانسی کے منادر کو تڑوا کر مسجد بنوائی تھی، اس کا مزید کہنا ہے کہ بابر سے لے کر شاہجہاں تک تمام مغل بادشاہ کافی لبرل تھے اور انھوں نے تمام مذاہب کی یکساں حفاظت کی، یہ اورنگ زیب تھا جس کے زمانہ میں ۱۶۶۰ء میں جب کہ فدائی خان ایودھیا کا گورنر تھا یہ مسجد بنائی گئی تھی، اس نے اس کے لئے تھامس ہربرٹ، جونیس ڈے لائیٹ اور سی بیٹل جیسے انگریز مؤرخوں کا حوالہ دیا ہے؛(۱) لیکن دوسرے ہندو مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ اورنگ زیب کے تمام فرمان ماثر عالمگیری کے نام سے موجود ہیں، جس میں ایودھیا کے مندر کو توڑے جانے کا کہیں کوئی ذکر تک نہیں ہے۔

سوامی اگنی ویش کے چشم کشا نکات

مشہور آریہ سماجی سوامی اگنی ویش کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے، ان کا کہنا ہے کہ سنگھ پریوار اور بھگوا دھاری گروہ کا الزام ہے کہ ۱۵۲۸ء میں مغل بادشاہ بابر کے سپہ سالار میر باقی نے رام مندر توڑ کر بابری مسجد تعمیر کروائی تھی، میرے ذہن میں ایک سوال اُٹھتا ہے کہ کیا

(۱) پربھات خبر جمشید پور، ۲۰؍جون ۲۰۱۶ء۔

ہندوستان کا اکثریتی طبقہ اتنا نامرد تھا کہ اپنے ارادھیہ دیو رام کے جنم استھان جیسی جگہ پر بنے مندر کو ٹوٹتے دیکھتا رہا، نہ تو اس کی مخالفت کی اور نہ ہی کوئی تحریک چلائی، یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی؛ بلکہ وہ نہ کہ برابر تھے، تاریخ میں مندر توڑنے کے بعد بھی کسی تحریک کے چلائے جانے کی کوئی سند کسی سنگھی مورخ نے بھی پیش نہیں کی ہے، میرے ذہن میں یہ بھی خیال آتا ہے کہ اگر اس جگہ رام پیدا ہوئے تھے اور وہاں بھویہ مندر تھا تو وہ آبادی سے اتنا دور کیوں تھا؟ کیا کوشلیہ رام کو جنم دینے جنگل گئی تھی؟ کیوں کہ ابھی تک کی تمام کھدائی کے نتیجہ میں اس کے آس پاس ڈیڑھ کیلومیٹر کے دائرہ میں کسی قدیم آبادی کا نام و نشان تک بھی نہیں ملتا ہے، اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے میں نے مغل پیریڈ کے آس پاس اور اس کے بعد کے ہندو اور سکھ مہاپرشوں اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا، سکھ اس لئے کہ جس زمانے میں مندر توڑنے کی بات ہوئی ہے، اسی زمانہ میں سکھ مغلوں سے دو دو ہاتھ کر رہے تھے، اس سلسلہ میں مجھے کچھ نام ملے گرو گووند سنگھ، شیواجی مہراج، مہارشی دیانند، سوامی وویکانند، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل، ساورکر، گروگلوالکر، ہیڈگوار، شیاما پرشاد مکھرجی، پنڈت دین دیال، انگریز، کمیونسٹ، مسلم اور سنگھی مورخ جنھوں نے مغلوں کی تاریخ لکھی ہے۔

سکھوں کے دسویں گرو گووند سنگھ پٹنہ میں پیدا ہوئے، اس دور میں انھوں نے مغلوں سے ۱۴ جنگیں لڑیں، ان کے چار بیٹے بھی شہید ہوئے، پٹنہ سے پنجاب آتے جاتے ہوئے راستہ میں ایودھیا پڑتا ہے؛ لیکن انھوں نے یہ کہیں بھی نہیں لکھا ہے کہ رام مندر کو توڑ کر بابر نے مسجد بنوائی تھی، جاپ صاحب، اکال استت، وچیتر ناٹک پتھ(؟)، چہ پتر کے چار حصہ شاستر نام مالا، اُتھر بکھیا، چہ پتر لکھا ہے، مناجات اسما جیسی کتابوں میں ہندو مندر توڑنے کا ذکر تک بھی نہیں ملتا، یہی نہیں اورنگ زیب کے نام لکھے اپنے خط ظفر نامہ میں بھی اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

شیواجی مہراج ساری عمر مغلوں سے لڑتے رہے؛ لیکن انھوں نے بھی کہیں نہیں لکھا ہے کہ بابر نے مسجد بنانے کے لئے کسی ہندو مندر کو مسمار کروایا تھا۔

مہارشی دیانند سرسوتی تمام عمر فیض آباد میں تمام مذاہب کے لوگوں سے مذاکرہ اور مناظرہ کرتے رہے؛ لیکن انھوں نے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے، ان کی لکھی کتاب سنسکرت رتن مالا، پاکھنڈ کھنڈن، تری وید بھاشیہ میں بھی نہیں ملے گا کہ اس نے مندر توڑ کر مسجد بنوائی تھی۔

سوامی وویکانند سے بڑا کوئی ہندو مبلغ ہو ہی نہیں سکتا ہے، جس نے امریکہ کے شکاگو شہر جا کر سناتن دھرم کے بارے میں زوردار تقریر کی تھی، ان سے منسوب دوسو کتابیں موجود ہیں؛ لیکن اس میں بھی یہ کہیں نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی جس نے ''ہے رام'' کے ساتھ ہی اپنی آخری سانس لی، انھوں نے بھی اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔

مغلوں کو حملہ آور کہنے والے ڈسکوری آوف انڈیا کے مصنف پنڈت نہرو رام مندر توڑنے کا کوئی ذکر نہیں کرتے ہیں۔

سردار پٹیل نے بھی کبھی ایسا کوئی بیان نہیں دیا ہے؛ بلکہ بطور وزیر داخلہ وہ مسجد میں مورتی رکھنے کے سخت مخالف تھے۔

رام چرتر مانس کے مصنف گوسوامی تلسی داس نے ایودھیا میں سریو ندی کے کنارے بیٹھ کر ۲۳ کتابیں لکھیں، رام چرتر مانس، رام للا نہوج، ویراگیہ سندی پنی، ویرودھ رامائن، پاروتی منگل، جانکی منگل، راما گیاپن، دوہاولی، کویتاولی، گیتاولی، سری کرشن جیتاولی، وینیہ پتریکا، ست سئی، داولی رامائن، کنڈلیا رامائن، رام شلوکا، سنکٹ منچن، کرکھا رامائن، رولا رامائن، جھلنا، چھپلیا رامائن، کویتا رامائن، اور کرل دھرما، دھرم انروپن وغیرہ؛ لیکن ان ساری کتابوں میں ایک لفظ بھی مندر توڑ کر مسجد بنانے کے سلسلے میں نہیں ہے، گرچہ سنگھیوں نے ایک نئی کتاب تلسی دوہا شتک لکھ کر رام مندر کو توڑنے کا دوہا شامل کیا ہے، جس کے متعلق ہندی کے مشہور مصنف نامور سنگھ کا کہنا ہے کہ یہ اصلی نہیں ہے، خود ہمنت شرما کا بھی یہ ماننا ہے کہ ناگرنی پرچارنی سبھا کے ذریعہ چار حصوں میں شائع تلسی گرنتھ مالا نامی کتاب میں اس دوہے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ماتا پرساد گپتا جس نے تلسی داس اور ان

کے ساہتیہ پر کافی تحقیق کی اور کروائی ہے، ان کے یہاں اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

حتیٰ کہ آر ایس ایس نے اپنے قیام ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک کبھی بابری مسجد کے سلسلہ میں کوئی بیان نہیں دیا، سنگھ سے وابستہ گوالکر، ساورکر، بلی رام ہیڈگوار پنڈت دین دیال، شیاما پرساد مکھرجی کی سینکڑوں زہر اُگلتی تقریروں اور کتابوں میں بھی بابر کے ذریعہ مندر توڑ کر مسجد بنانے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے، مزید یہ کہ ساٹھ سال تک بابری مسجد کبھی بھی سنگھ کے ایجنے میں شامل نہیں رہی۔

بابری مسجد کی تعمیر کے ۴۰ سال بعد اکبر کے دور میں گوسوامی تلسی داس نے رام چرتر مانس لکھی، اس کے بعد ہی مسجد سے دو کلیومیٹر دور راجہ دسرتھ کا راج بھون بنا، رام چندر جی کی جائے پیدائش کے طور پر رام کوٹ مندر اور سیتارام کے رہائش گاہ کے طور پر کنک مندر بنا، اس کے ساتھ ہی ہنومان گڑھی مندر، رادھو جی مندر، سیتا رسوئی وغیرہ کی عمارتیں تعمیر ہوئیں؛ لیکن ان سب سے دوکیلومیٹر کی دوری پر ۱۵۲۸ء سے لے کر ۱۸۸۵ء یعنی ۳۵۰ سال تک بابری مسجد بغیر کسی تنازعہ کے اپنی جگہ ایک اللہ کی عبادت کے لئے قائم رہی، ۱۸۵۷ء میں مسجد کے بغل والی خالی زمین پر ایک دیوار اُٹھا کر ہندوؤں کو دے دی گئی، جس پر ۱۸۸۳ء میں ہندوؤں نے مندر بنانا چاہا؛ لیکن حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی، تو ۱۸۸۵ء میں مہنت رگھو پرداس نے فیض آباد کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا کہ جنم استھان نام کا ایک چبوترہ مسجد کے سامنے ہے، جس کی لمبائی مغرب سے مشرق اکیس فٹ اور چوڑائی شمال تا جنوب سترہ فٹ ہے، سردی اور برسات میں پوجا کرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، اس وجہ سے اس پر چھت ڈالنے کی اجازت دی جائے؛ چوں کہ حکومت عمارت بننے سے منع کر رہی ہے؛ اس لئے عدالت کے ذریعہ حکومت کو حکم نامہ جاری کیا جائے؛ لیکن ۲۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن نے اس مقدمہ کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ مسجد کے سامنے مندر بننے سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان خون خرابہ ہوگا، اس وجہ سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، اس فیصلہ کے خلاف رگھوبرداس نے فیض آباد کے ضلع جج کرنل جئے آریہ کی عدالت میں اپیل کی؛

لیکن ۱۶ر مارچ ۱۸۸۶ء کو کورٹ کے ذریعہ اس جگہ کے معائنہ کے بعد اس اپیل کو بھی خارج کردیا گیا، رگھوبرداس نے ایک بار پھر جوڈیشنل کمشنر کی عدالت میں اپیل کی؛ لیکن وہاں سے بھی یکم نومبر ۱۸۸۶ء کو یہ اپیل خارج ہوگئی، مگر اس پورے عرصہ میں مسجد کی جگہ مندر ہونے کا کوئی دعویٰ پیش نہ ہوا، ۱۹۳۴ء کو فیض آباد کے فرقہ وارانہ فساد میں مسجد کو نقصان پہنچایا گیا، ۲۲ اور ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی تاریک سردرات میں رام للا کی مورتی زبردستی مسجد کے ممبر پر رکھ دی گئی، کانسٹبل ماتا پرساد نے اس کے لئے تھانہ میں ایف آئی آر درج کروائی اور پولیس افسر انچارج رام دوبے نے تین نامزد لوگ سمیت ۵۰ تا ۶۰ نامعلوم افراد کے خلاف تحریر کیا کہ یہ لوگ تالا توڑ کر مسجد میں داخل ہوئے، مسجد کو ناپاک کیا اور زبردستی مورتی اس کے اندر رکھ دی؛ لیکن اس پر اعلیٰ افسران کی جانب سے بغیر کسی کارروائی کے مسجد کو متنازعہ قرار دیتے ہوئے اس کے دروازہ پر تالا لگا کر مسجد کے اندر کسی بھی فریق کے داخلہ پر پابندی عائد کردی اور مسجد کے ۵۰۰ میٹر کی دوری تک مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، ۱۹ر جنوری ۱۹۵۱ء کو کورٹ سے بھی یہ بیان آیا کہ یہ مسجد ہے جس میں مسلمان ۱۵۲۸ء سے لگاتار نماز ادا کرتے آرہے ہیں۔

ڈبلو، اے، تیاگی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایودھیا صرف ایک شہر نہیں؛ بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے، کہا جاتا ہے کہ ایودھیا میں رام جی پیدا ہوئے تھے اور ان کی زندگی کے ہر ہر پل کو یاد رکھنے کے لئے الگ الگ مندر بنائے گئے ہیں، جہاں وہ کھیلتے تھے، وہاں گوکیلا مندر ہے، جہاں پڑھائی کی، وہاں ویسشٹ مندر ہے، جہاں کھانا کھایا، وہاں سیتا رسوئی ہے، ہنومان کے رہنے کی جگہ پر ہنومان مندر ہے، کوپ بھون، سومیترا مندر اور دسرتھ بھون ہے، اس طرح وہاں ۲۳ر ایسے منادر بھی ہیں جس کے مہنت دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ رام جنم بھومی ہے اور رام یہیں پیدا ہوئے تھے، اس طرح یہ مندروں کا شہر ہے؛ لیکن ان سب کی عمر چار سے پانچ سو سال کے درمیان ہے، یعنی یہ سارے مندر تب بنے جب مسلمان یا مغل وہاں کے حکمراں تھے، آخر ان مسلمانوں نے ان مندروں کو بننے کیسے دیا؟ وہ تو مسجد توڑنے والے تھے؛ لیکن ان کے رہتے مندر بنتے رہے؛ بلکہ ان مسلمانوں نے ہی زیادہ تر مندروں کے لئے زمین دی تھی

اور اس کے دستاویزی ثبوت بھی موجود ہیں، گلیلا مندر کے لئے زمین مسلمان حکمراں نے دی تھی، دیگمبر اکھارہ میں موجود دستاویز بتاتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے مندر بننے کے لئے ۵۰۰ بیگھہ زمین دی تھی، نرموہی اکھارہ کے لئے نواب شجاع الدولہ نے زمین دی تھی، تلسی داس جب رام چرتر مانس لکھتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں کہ مانگ کے کھائبو اور مسیت میں سوئبو، ایودھیا میں مسلمان پانچ چھ پیڑھی سے پھولوں کی کاشت کرتے اور یہ سب پھول وہاں کے مندروں کو ہی جاتے ہیں، ایودھیا کے سندر مندر کے منیجر منومیاں تھے، ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۹۲ء یعنی اپنی موت تک اس کے ذمہ دار رہے، اگروال مندر کی سارے اینٹوں پر ۷۸۶ کندہ ہے، جسے حسین علی خان نے دی تھی، حتیٰ کہ اکتوبر ۲۰۰۸ء کے اخبار میں بھی چھپی ایک خبر کے مطابق بابری مسجد کے مدعی اقبال انصاری اور مدعا علیہ مہنت، دونوں نے آپس میں مل کر ایودھیا میں ایک گئوشالہ قائم کیا ہے۔

رام مندر کے انہدام کا الزام اور اس کا پس منظر

صورت حال یہ ہے کہ اول تو تاریخی طور پر رام جی کا وجود اور رامائن کی کہانی ثابت نہیں ہے، جن لوگوں نے اس کو تسلیم کیا ہے، انھوں نے ایک عقیدہ اور آستھا کے طور پر مانا ہے، نہ کہ تاریخی حقیقت کے طور پر، دوسرے: حقیقی ایودھیا کا محل وقوع بھی مشکوک ہے، تیسرے: ایودھیا میں رام جی کی جائے ولادت کونسی جگہ تھی؟ اس میں بھی کافی اختلاف ہے، چوتھے: بابر کا ایودھیا آنا، یا میر باقی کا مندر کو منہدم کرنا بھی ثابت نہیں ہے، تو پھر رام جنم بھومی کی خونیں تحریک شروع ہونے اور مسجد کی شہادت تک پہنچنے کا پس منظر کیا ہے؟

تو اس کا جواب ہمیں الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ہندو فریق کے ایک اہم گواہ سوامی ادل مکیلشور آنند جی مہاراج کے بیان سے ملتا ہے، انھوں نے عدالت کو بتایا تھا کہ بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی ہونے کا عقیدہ ہندوؤں میں انگریزوں کے دور حکومت میں شروع ہوا۔(۱)

(۱) ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی: ۱۲۳۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک عیسائی پادری جوزف ٹفن تھالر نے پہلی بار اپنی کتاب جو فرانسیسی زبان میں ۱۷۸۸ء میں پیرس سے شائع ہوئی، اس فتنہ کو جنم دیا، اس نے لکھا :

> اورنگ زیب عالمگیر نے رام کوٹ کے قلعہ کو منہدم کر دیا تھا اور اس کی جگہ ایک مسلمان ٹیمپل (مسجد) تین گنبدوں کے ساتھ تعمیر کروائی تھی، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کروایا تھا، اس میں ۱۴ سیاہ پتھروں کے ستون جو اس قلعہ کے اندر کے کچھ مقامات سے حاصل کر کے استعمال کئے گئے ہیں، ان میں سے ۱۲ ستون اس وقت مسجد کی اندرونی چھت کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں، جب کہ دو ستون کسی مسلمان کے مقبرے میں فٹ ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سیاہ ستون لنکا سے لائے گئے تھے اور ان کے لانے والے ہندوؤں کے راجہ ہنوبان تھے۔

اس کے بعد ہی یہ فرضی کہانی یا داستان پھیلتی گئی کہ بابری مسجد کی جگہ کوئی مندر موجود تھا؛ لیکن ۲۰ سال بعد ۱۸۱۰ء جب Francis Buchanan نے ایودھیا کا دورہ کیا تو اس نے سختی سے تردید کی اور کہا کہ یہ بے بنیاد کہانی ہے، جو لیڈن (Leydon) نے ۱۸۱۶ء میں بابر نامہ کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے لکھا کہ غالباً ۱۵۲۸ء میں بابر ایودھیا آیا تھا، اس کو بنیاد بنا کر مارٹن منٹگمری نے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے مشرقی ہندوستان پر معلومات فراہم کرنے کا کام سونپا گیا تھا، ضلع گورکھپور کا سروے کرتے ہوئے ایودھیا کا دورہ کیا، اس نے ۱۸۳۸ء میں لکھا کہ یہاں کے ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ان کے مندروں کو اورنگ زیب نے گرایا ہے؛ کیوں کہ مسجد میں جو ستون ہیں، وہ غیر اسلامی ہیں اور غالباً کسی مندر سے لئے گئے ہیں۔(۱)

۱۸۵۴ء میں ولیم ارسکائین (Erskine) نے بھی بابر نامہ کا ترجمہ کیا اور یہی بتایا کہ

---

(۱) حوالہ سابق: ۱۰۳، بحوالہ: جان لیڈن۔

بابر ۲۸ر مارچ ۱۵۲۸ء کو ایودھیا گیا تھا، ۱۸۷۰ء میں کارنیگی (Comege) نے بابر پر براہِ راست الزام لگایا کہ اس نے رام جنم بھومی مندر توڑا تھا، (۱) ۱۸۷۷ء میں ڈبلوسی بینٹ (Benet) نے کارنیگی کے الزام کی تائید کی، دوسری جانب کچھ مسلمان مصنفین نے بھی ناواقف عوام پر رُعب ڈالنے اور اپنے بزرگوں کی کرامات کے اظہار کے لئے ایک روایت گڑھی کہ بابر اپنے بچپن کے ایام میں خفیہ طور پر فقیرانہ لباس میں کابل سے ہندوستان آیا، سکندر لودی کا زمانہ تھا اور شہر اودھ اس وقت صدر مقام تھا، بابر نے شہر اودھ میں آکر شاہ جلال اور حضرت موسیٰ علیہ السلام عاشقان کی خدمت میں حاضر ہوکر ہندوستان پر فتح یابی کے لئے باطنی امداد طلب کی؛ تاکہ ان بزرگوں کی دُعا سے ہندوستان کی حکومت حاصل ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا، ہندوستان فتح کر لینے کے بعد بابر نے بطور یادگار شہر ایودھیا میں ایک عالیشان مسجد میر باقی کی نگرانی میں تعمیر کرائی، (۲) ۱۸۵۵ء میں اودھ کے ایک مرزا جان نے بھی اپنی کتاب حدیقۃ الشہداء میں ایک شعلہ انگیز تحریر لکھی، جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ اقتباس اس نے بہادر شاہ عالمگیر کی بیٹی کی کتاب "صحیفہ چہل نصائح بہادر شاہی" سے نقل کیا ہے، جس کے مطابق :

> بت پرست ہندوؤں کے مندر جو متھرا، بنارس اور اودھ (ایودھیا) وغیرہ میں موجود ہیں، جنھیں خراب حال کفار کنہیا (کرشن) کی جائے پیدائش یا سیتا کی رسوئی یا ہنومان کا گھر مانتے ہیں، جس میں رام چندر جی کی لنکا کی فتح کے بعد انھیں ٹھہرایا گیا تھا، منہدم کردیئے گئے ہیں اور اسلام کو مستحکم کرنے کے لئے ان جگہوں پر مساجد تعمیر کی گئی ہیں، مسلمانوں کو ان مساجد کو جمع کی نماز اور جماعت کے ذریعہ آباد رکھنا چاہئے۔ (۳)

(۱) ہسٹریکل اسکیچ آف انڈیا فیض آباد، ط: ۱۸۷۰ء لندن۔ (۲) گم گشتہ حالات ایودھیا: سید عبدالغفار۔
(۳) مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ: ۱۱۵/ ۳۲، ص: ۳۱۱۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نام کی کوئی شہزادی نہیں ہوئی ہے، شہزادی کے والد کا نام بہادر شاہ عالمگیر بتایا گیا ہے، جب کہ اس نام کا کوئی بادشاہ بھی نہیں گذرا ہے، عالمگیر اورنگ زیب کا خطاب تھا، مزید یہ کہ بہادر شاہ عالمگیر کی کسی بیٹی کی کوئی بھی تصنیف بہ عنوان صحیفہ چہل نصائح بہادر شاہ کے وجود کا ذکر کسی ذخیرہ کتب میں دنیا کے کسی بھی حصہ میں نہیں ہے، یہ ڈی این مارشل کی کتاب مغل ہندوستان، اے بلیوگرافیکل سروے جلد اول، یا سی اے اسٹوری کی کتاب پرشین لٹریچر، اے ببلیوگرافیکل سروے میں بھی اس نام کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

ایک پاکستانی مؤرخ عزیز احمد کا بھی ایک بیان نقل کیا جاتا ہے :

> بُت شکنی کا مذہبی جوش بابر میں بہت نمایاں تھا، اس کے حکم سے میر باقی نے رام کی جائے ولادت ایودھیا کے متبرک اور اہم مندر کو گرا کر اس کی جگہ ۱۵۲۸ء میں ایک مسجد تعمیر کروادی۔

لیکن اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ آخر وہ اس نتیجہ پر کیوں کر پہنچا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی واقعہ اسی وقت معتبر تسلیم کیا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو کسی معاصر چشم دید شخص نے نقل کیا ہو، یا ان لوگوں کے حوالہ سے نقل کیا ہو، جو خود اس واقعہ کے وقت موجود تھے، سینکڑوں سال بعد یہ کہنا کہ ''ایسا کہا جاتا ہے، یا ایسا گمان کیا جاتا ہے'' کی ایک اٹکل سے زیادہ اہمیت نہیں ہے، پھر یہ بات بھی اہم ہوئی کہ جس کی طرف کسی عمل کی نسبت کی جائے، وہ اس کے مزاج ورویہ سے ہم آہنگ بھی ہو، جب کہ بابر کے بارے میں تمام ہی مسلم وغیر مسلم مؤرخین متفق ہیں کہ وہ مذہبی تعصب سے دور اور انصاف پرور حکمراں تھا اور اس نے اپنے جانشینوں کو بھی اسی کی ہدایت کی تھی۔

اصل میں انگریزوں نے محسوس کیا کہ اگر اس ملک میں ہندو مسلمان متحد رہے، تو وہ یہاں اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکیں گے، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں واضح طور پر اسی حقیقت کا اظہار ہوا؛ چنانچہ برطانوی مؤرخ تھامس لیو نے اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> دختر کش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند تو ندوالا

مرہٹہ بھی اس جہاد میں شامل تھے، گائے کو کھانے والا اور گائے کا
بچاری، خنزیر سے کراہت رکھنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا
''لا إلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا کلمہ گو اور برہما کے منتروں کو جپنے والا
سبھوں نے مل کر بغاوت کی تھی۔(۱)

لارڈ الفنسٹن (Lord Elphinston) ۱۴؍مئی ۱۸۵۸ء کو ایک سرکاری یادداشت میں لکھتا ہے :

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو قدیم رومی طرز عمل تھا، ہماری حکمت عملی بھی
یہی ہونی چاہئے، اگر میں یہ ثابت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ میرے
خیالات ڈیوک آف ویلنگٹن (Duke of Wellengton) کے
خیالات کے عین مطابق ہیں تو اس قدر واضح انداز میں اپنے
خیالات کے اظہار کی جسارت نہیں کرتا۔(۲)

اسی طرح جارج فرانسس ہملٹن (Hamilton) سکریٹری آوف اسٹیٹ برائے ہندوستان نے لارڈ کرزن کو ۲۶؍مارچ ۱۸۸۸ء کو اپنے ایک خط میں لکھا :

میرے خیال میں فی الحال ہماری حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے؛
لیکن آج سے پچاس سال بعد برطانوی حکومت کو جو خطرہ درپیش
ہوگا اس سے بچاؤ کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی
مختلف قوموں کے درمیان نفاق کو بڑھاوا دیں اور ایسی نصابی
کتابیں مرتب کروائی جائیں کہ ان کے درمیان اختلاف میں مزید
بتدریج اضافہ ہوا۔(۳)

---

(۱) سنٹرل انڈیا ڈیورنگ ریبلین آف ۱۸۵۷ء، ص: ۲۳۲، ط: لندن ۱۸۶۰ء۔
(۲) روٹس آف کمیونل پولیٹکس بھگوان داس کمیٹی رپورٹ، ص: ۴۰، ط: دہلی ۱۹۷۶ء۔
(۳) وروڈس پیپر ۳۰؍مارچ ۱۸۹۲ء، لندن، بحوالہ: اسلام اینڈ کلچر، بی، این، پانڈے، ص: ۱۳، ط: پٹنہ ۱۹۸۵ء۔

غرض کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت انگریزوں نے تاریخ کو بگاڑنے، نصابِ تعلیم میں زہر آلود مواد شامل کرنے اور ہندوستان کی دو بڑی اقوام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کی منصوبہ بند شروعات کی اور اسی پالیسی کو سنگھ پریوار والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عوام کو کچھ اس طرح یہ زہر پلایا کہ آج ان سے ترقی، معاشی گراوٹ، ملازمتوں کے فقدان، ناانصافی، غریبوں کی فاقہ کشی اور کمزوروں پر ظلم کے بارے میں سوالات نہیں کئے جاتے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان صحیح تاریخ مرتب کریں اور سیکولر برادرانِ وطن کی مدد سے کرائیں اور سچائی کو اس قدر پھیلائیں کہ جھوٹ اپنا منھ چھپانے پر مجبور ہو جائے۔



محمد بن قاسمؒ قاتل یا مسیحا؟

محمد بن قاسم کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے درج ذیل اُمور کو سمجھنا چاہئے :

- محمد بن قاسم کے حملہ کا واقعہ کیوں پیش آیا؟
- اس نے کس طرح کامیابی حاصل کی، صرف عرب فوج سے یا مقامی لوگوں کی مدد سے؟
- محمد بن قاسم کا اپنی مسلم وغیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟
- راجہ داہر کس کردار کا انسان تھا اور اپنی رعایا کے ساتھ اس کا کیا رویہ تھا؟

اس سلسلہ میں ڈاکٹر مختار احمد مکی کی کتاب ''ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی'' کے ایک مضمون کا خلاصہ کسی قدر حذف واضافہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے :

حملہ کا محرک

حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ سراندیپ اور مالابار میں پہلے سے مسلمان آباد تھے، لنکادیپ اور مالدیپ میں بھی مسلمان آبادیاں تھیں، اور سراندیپ کا راجہ مسلمان ہو چکا تھا، اس نے سلطنت اسلامیہ کی خدمت میں آٹھ جہازوں پر مشتمل ایک بحری بیڑہ روانہ کیا، جس میں بیش قیمت تحائف بھی تھے، اور حاجیوں اور مسلمان تجار کے یتیموں اور بیواؤں پر مشتمل ایک قافلہ بھی سوار تھا، لیکن سمندری طوفان میں وہ بیڑا بھٹک کر دیبل کے ساحل پر جا پہنچا، ان جہازوں کو لوٹ لیا گیا، اور تمام لوگوں کو گرفتار کر کے راجہ داہر کی راجدھانی الور بھیج دیا گیا؛ لیکن اس میں سے دو افراد کسی طرح جان بچا کر عراق پہنچے، اور اس قزاقی کی المناک داستان عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو سنائی کہ جب ایک بیوہ عورت پر تشدد کیا جا رہا تھا تو وہ یا حجاج! أغثنی (اے حجاج! مجھے بچاؤ) یا حجاج! أغثنی (اے حجاج! مجھے بچاؤ) چیخ رہی تھی۔

حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کو فوراً ایک خط لکھ کر ان قیدیوں کو واپس کرنے کو کہا، چچ نامہ اور تاریخ فرشتہ کے مطابق راجہ داہر نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ کام ایسی قوم نے کیا ہے، جو بڑی قوت وشوکت کی مالک ہے، اور اس پر قابو پانا ممکن نہیں ہے؛ حالاں کہ یہ مال واسباب اور عورتیں بعد میں راجہ داہر کے کمانڈروں ہی کے یہاں سے برآمد ہوئیں، اس جواب کے بعد حجاج نے عبداللہ اسلمی کو ایک مختصر فوجی دستہ دے کر ان سمندری لٹیروں کی سرکوبی کے لئے دیبل روانہ کیا، اس کا مقابلہ دیبل پہنچنے سے قبل ہی بلوچستان میں راجہ داہر کے بیٹے کشیب (جسے عرب جیہ سیہ کہتے تھے) سے ہوا، اس لڑائی میں عبداللہ اسلمی شہید ہو گئے، اور فوج کو شکست سے دو چار ہونا پڑا، جب اس کی خبر حجاج کو ملی تو اس نے ایک بڑا دستہ جس میں چار ہزار لوگ تھے، بدیل مجالی کی قیادت میں بھیجا؛ لیکن اس کو بھی دیبل پہنچنے سے قبل ہی کشیب نے اپنی زبردست فوج اور جنگی ہاتھیوں کی مدد سے شکست دے دی۔

اب حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سندھ پر باضابطہ حملہ کی اجازت چاہی؛ لیکن خلیفہ کو حجاج کی اس درخواست پر تأمل تھا؛ کیوں کہ دو بار مسلمانوں کی فوج کو شکست ہو چکی تھی، حجاج بن یوسف نے ساری کارروائی کی ذمہ داری اپنے سر لی، اس نے اپنے سترہ سالہ چچازاد بھائی اور داماد محمد بن قاسم کو شیراز سے بلا کر چھ ہزار شامی گھوڑ سوار، چھ ہزار عراقی شتر سوار اور تین ہزار بار برداری کے اونٹ کے ساتھ سندھ کے لئے ۷۱ھ میں روانہ کیا، اس کے ساتھ ہی بحری جہازوں کا ایک بیڑا بھی تھا، جس میں سامان رسد کے علاوہ آلات جنگ اور منجنیق وغیرہ تھے۔

مقامی لوگوں کی مدد

محمد بن قاسم کی فوج نے سندھ پہنچ کر اس کے ایک شہر دیبل کا محاصرہ کر لیا، آٹھ دنوں تک میدان کارزار گرم رہا، راجہ داہر کا بیٹا کشیب اپنے ساتھ چار ہزار فوج لے کر راتوں رات دیبل سے نکل بھاگا اور شہر پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہو گیا، مختلف شہروں کے حاکم اور عوام محمد بن قاسم کے حسن سلوک کی وجہ سے اس کے مطیع ہوتے گئے، کچھ شہروں کے حاکموں اور عوام نے

اپنی رغبت سے شہر خالی کر دیئے تو کچھ جگہوں پر مقابلے ہوئے اور بزور قوت اس پر قبضہ حاصل کیا گیا، اس طرح وہ راجہ داہر سے لڑنے کے لئے الور کی جانب روانہ ہوا، جہاں راجہ داہر اپنے بیٹے کشیب اور خلیفہ بغداد کا ایک باغی محمد علاقی کو لے کر ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کا منتظر تھا، الور سے پہلے ایک تیز وتند دریا کو عبور کرنا تھا، محمد بن قاسم کی فوج نے کشتی کا ایک پل تیار کیا اور اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے دریا کی دوسری جانب پہنچ گیا، اس جنگ میں اس کی مدد کے لئے موکا بن بسیا اور اس کا بھائی راسل ٹھاکر اور جاٹ کی ایک بڑی تعداد بھی تھی، ابتداء میں اس کا مقابلہ داہر کے بیٹے کشیب سے ہوا، اس وقت محمد بن قاسم کے پاس پندرہ ہزار کے قریب فوج تھی، جب کہ راجا داہر کے پاس پچیس سے تیس ہزار زرہ پوش سپاہی، دس ہزار نیزہ بردار اور تقریباً پچاس ہزار کے قریب فوج، نیز جنگی ہاتھی بھی تھے، راجہ داہر کے ہاتھیوں نے محمد بن قاسم کی فوج کو کافی نقصان پہنچایا، ۲۰ر جون ۷۱۲ء کو بڑے زور وشور کے ساتھ جنگ ہوئی، تیسرے روز راجہ داہر کی فوج تتر بتر ہوگئی؛ لیکن وہ اپنے ایک ہزار وفادار سپاہیوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا، ۲۱ر جون مطابق ۱۰ر رمضان المبارک ۹۳ھ کو بعد مغرب داہر کے قتل ہونے کے ساتھ ہی جنگ کا فیصلہ محمد بن قاسم کے حق میں ہوگیا۔

محمد بن قاسم کی دوسری بڑی فتح برہمن آباد کی مانی جاتی ہے، جہاں راجہ داہر کا بیٹا کشیب ،محمد علاقی اور وزیر سی ساگر دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ اس سے مقابلہ کے لئے تیار تھا، چھ ماہ تک اس قلعہ کا محاصرہ جاری رہا، بالآخران لوگوں نے جان ومال کی امان حاصل کر کے قلعہ محمد بن قاسم کے حوالہ کر دیا، محمد بن قاسم نے بغیر کسی کشت وخون کے تمام اہل کاروں کو اپنی جگہ مامور رکھا، صرف جزیہ (ٹیکس) کے لئے اعلان کیا گیا کہ درجہ اول یعنی امراء طبقہ کے لوگوں سے ۱۴ر تولہ، درجہ دوم کے لوگوں سے ۷ر تولہ اور عام لوگوں سے پونے چار تولہ چاندی وصول کی جائے گی، اور جو لوگ اسلام قبول کر لیں گے، ان سے اسلامی احکام کے مطابق زکوٰۃ وصدقات کی رقم وصول کی جائے گی، نیز جو لوگ اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہیں گے، ان کے لئے کوئی رکاوٹ اور زور زبردستی نہیں کی جائے گی، وہ اپنی زمین، مکان اور جائداد کے حسب سابق مالک رہیں گے۔

راجہ داہر کی ایک بیوی لادی نے اسلام قبول کرلیا اور محمد بن قاسم نے اسے عزت دیتے ہوئے باندی کے درجہ میں رکھنے کے بجائے اپنے نکاح میں لے لیا، بقیہ بیویاں یا تو ستی ہوگئیں یا پُرامن طور پر اپنی زندگی کے بقیہ اوقات پوری کرنے میں لگ گئیں، راجہ داہر کی دو بیٹی سوریہ دیوی اور پرمالی دیوی کو گرفتار کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دیا گیا، بقیہ تمام قیدی رہا کر دیئے گئے، اور عام لوگوں کو امان دے دی گئی، اسی طرح اس نے ملتان کو بھی دو ماہ کے محاصرہ کے بعد اپنے قبضہ میں لے لیا، جہاں ایک برہمن کی نشاندہی پر جیسو نامی ایک قدیم راجہ کا خزانہ ہاتھ لگا، اس میں دوسو تین من خالص سونے کی ایک مورتی اور زیرِ زمین تیرہ ہزار دوسو من سونے کا ٹکڑا تھا، ملتان کی اس فتح کے بعد محمد بن قاسم کے فوجیوں کی تعداد بڑھ کر پچاس ہزار کے قریب ہوگئی، جو سندھ نژاد نومسلم، جاٹ اور میڈ اس ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھی، جب کہ اس نے جب سندھ میں قدم رکھا تھا تو اس کے ساتھ صرف بارہ ہزار شامی وعراقی فوجی تھے، کاکا، موکا، سی ساگر، کاکیسا وغیرہ ہندو سردار بھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے، جن پر وہ اسی طرح بھروسہ کرتا تھا، جیسا کہ مسلمان سرداروں پر کیا کرتا تھا، اس نے ان میں سے کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے کبھی مجبور نہیں کیا، راجہ داہر کا بیٹا کشیب نے بھی محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد دوبارہ برہمن آباد پر قبضہ کرلیا اور اپنی حکومت مستحکم کرلی، دوسال بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں اس نے اسلام قبول کرلیا اور برہمن آباد پر قابض رہا، محمد بن قاسم ہندستان کے لوگوں کو اہل کتاب تسلیم کرتا تھا، اس کا ایک واضح حکم تھا کہ ہندوؤں کے مندروں کی حیثیت وہی رہے گی، جو عیسائی چرچوں، یہودیوں کے عبادت خانوں اور پارسیوں کی آتش کدوں کی ہے۔

''چچ نامہ'' میں ہے کہ برہمن آباد کی مہم کے خاتمہ کے بعد مقامی باشندوں نے اپنے ایک مندر کی تعمیر نو کے لئے اس سے استدعاء کی، محمد بن قاسم نے اس سلسلہ میں حجاج بن یوسف کو ایک خط لکھا، جس کا جواب حجاج نے ان الفاظ میں دیا:

> مکتوب عزیز پہنچا، احوال مندرجہ سے آگہی ہوئی، برہمن آباد کے سربرآوردہ لوگوں نے اپنے مندر کی تعمیر اور اپنی قوم کے متعلق

التماس کیا ہے، جب ان لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے، اور دارالخلافہ کے طے کردہ رقوم کی ادائیگی کا ذمہ لے لیا ہے، تو پھر ہمارا ان پر کوئی حق نہیں رہتا؛ اس لئے اب وہ ذمی ہو گئے ہیں، اوران کی جان و مال میں تصرف کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے؛ اس لئے اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، اور کسی شخص کو اس کے مذہب کے متعلق ممانعت نہ ہو؛ تاکہ وہ اپنے گھروں میں اپنی رائے کے مطابق رہیں سہیں۔(۱)

محمد بن قاسم کا سلوک و اخلاق

اب ایک نظر محمد بن قاسم کے اخلاق وسلوک پر ڈالئے! مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ محمد بن قاسم اپنی سیرت اور کردار کا ایک غیر فانی نقش سندھ میں چھوڑ گیا، جو عرب مسلمان یہاں رہ گئے تھے، انھوں نے اپنے مرثیوں میں خون کے آنسو بہائے، اوران سے زیادہ ماتم مقامی باشندوں نے کیا، اس کی فیاضی، سرچشمی، رواداری اور حسن اخلاق کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اس کی مورتی بنائی، وہ عقیدت سے اس کے آگے سرِ نیاز خم کرتے، جیسا کہ مشہور مؤرخ بلاذری نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں نے محمد بن قاسم کی موت پر آنسو بہائے، ارکیرج (کوراج یا جے پور) میں اس کی مورتی بنا کر رکھی گئی۔

ڈاکٹر تارا چند رمحمد بن قاسم کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

مسلمان فاتح نے مفتوحون کے ساتھ نہایت عقل مندی اور فیاضی کا سلوک کیا، مال گزاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا، اور قدیم ملازموں کو اپنی جگہ برقرار رکھا، ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندر میں پوجا پاٹ کی اجازت تھی، ان پر فقط ایک خفیف سا محصول عائد کیا

(۱) ویشم ڈجیکسن، ہسٹری آف انڈیا: ۵/ ۱۲، طبع: لندن، ۱۹۰۷ء۔

جاتا، جو اسے آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا، زمین داروں کو اجازت تھی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں۔(۱)

راجہ داہر کا کردار واخلاق

جب کہ راجہ داہر کے باپ کے متعلق تارا چندر ہی لکھتے ہیں:

وہ ایک انتہائی متعصب بادشاہ تھا اور رعایا کے ایک طبقہ کے لئے اس کے قوانین انتہائی سخت اور جابرانہ ہوتے تھے، انھیں ہتھیار رکھنے، اچھا کھانے، کپڑا پہننے اور گھوڑسواری کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

ایک جرمن دانشور جان کریمر لکھتا ہے کہ:

سندھ میں محمد بن قاسم کی حکومت میں اور اس کے بعد بھی برہمنوں کی عزت اور ان کا رتبہ جوتوں کا قائم رہا، زمین کی مال گزاری بھی حسب معمول جوں کا توں تین فیصدی جاری رکھی گئی، ہندوؤں کو کھلی اجازت تھی کہ اپنے مندر بنانے کے لئے وہ آزاد ہیں، ہندو تاجر مسلمان تاجروں کے ساتھ اپنی تجارت بڑھانے کے لئے جو بھی طریقہ مناسب سمجھتے، عمل میں لاتے، عربوں اور سندھیوں میں اس قدر باہمی تعلقات اور محبت کے رشتے استوار ہو گئے کہ خلیفہ نے کبھی سندھ میں مندروں کو گرانے کی یا اسلام کے پرچار کی اجازت نہیں دی۔

ایشوری پرشاد نے محمد بن قاسم کے کارناموں کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اس کے باوجود ان کا بیان ہے:

محمد بن قاسم نے ہندوستان پہنچ کر اپنے جھنڈے کے نیچے ان جاٹوں اور میدیوں کو جمع کیا، جو ہندوؤں کی غیر روادارانہ حکومت

(۱) اے، شارٹ ہسٹری آف انڈیا: ۱۲۲۔

سے عاجز تھے، اور بہت ذلت برداشت کر رہے تھے، وہ گھوڑے
پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، ان کو اچھے کپڑے پہننے کی ممانعت تھی، ان کو
ننگے سر رہنے کا حکم تھا، ان ذلتوں کے باعث وہ محض لکڑ ہارے
اور پن بھرے بن کر رہ گئے تھے، ان کے دلوں میں ایسا عناد بھرا ہوا
تھا کہ انھوں نے اپنی قسمت کو فوراً ہی ایک اجنبی کے سپرد کر دیا۔(۱)

ڈاکٹر بینی پرساد لکھتے ہیں :

ہندوستان میں حکومت کے مقبول ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ
بھی ہے کہ اس کے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اور عبادت
کرنے کی آزادی حاصل ہو، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے
مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا، اور اپنی حکمت
عملی اس کے مطابق بنائی، آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم نے سندھ
میں اپنی حکومت کا جو نظم و نسق قائم کیا، وہ اعتدال اور رواداری کی
روشن مثال ہے۔(۲)

The Muslim invaders had realised the importance of religion and accordingly adopted their administrative measures, In the 8th century the rule which Mohammad Bin Qasim established was a excellent example of tolerance. (3)

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ بھی محمد بن قاسم کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

---

(۱) ایشوری پرشاد، ہسٹری آف میڈ ائیول انڈیا:۵۶۔
(۲) ہسٹری آف جہانگیر:۸۹۔
(3) Beni Prasad History of Jahangir. pp. 88.89

اگر چہ محمد بن قاسم کی نوعمری اور شباب کا عالم تھا؛ مگر وہ بڑا مدبر اور شجاع تھا، شمشیر اور تدبیر دونوں سے کام لیتا تھا، اگر اتفاقیہ شمشیر سے کوئی ستم ہو گیا تو تدبیر سے اس کی مکافات بھی ضرور کی، اگر کہیں بتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ بت خانوں کی مرمت کا بھی حکم دے دیا، اگر کہیں لوٹ مار سے دشمنوں کو خستہ کیا تو ان کو بیت المال سے معاوضہ بھی دلا دیا، قدیم قاعدہ جو ہندوؤں کا تھا کہ زر مال گزاری میں سے تین فی صد خزانہ شاہی میں اس لئے داخل کیا کرتے تھے کہ اس روپیہ میں سے برہمنوں کی خدمات کا معاوضہ دیا جائے، اسے اسی طرح بدستور برقرار رکھا، جو بھی مقامی ذی لیاقت آدمی ملا، اس کی قدر شناسی کی؛ بلکہ لائق آدمی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا اور سرفراز کیا، اس نے یہاں کے وزیروں کو وزیر اور مشیروں کو اپنا مشیر مقرر کیا اور اپنے پاس رکھا، غرض مردم شناسی اور دلجوئی اس پر ختم تھی۔(۱)

اوپر راجہ داہر کے اپنی رعایا کے ساتھ سلوک کا ذکر آچکا ہے، اپنی ذاتی زندگی میں اس کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ چچ کی موت کے بعد اس کا بھائی چندر راجہ بنا، چند سالوں میں وہ فوت ہو گیا تو شمالی سندھ میں چچ کا بڑا بیٹا دھرسیہ راجہ بنا اور جنوبی سندھ میں چھوٹا بیٹا داہر، چچ کی ایک بیٹی تھی، دھرسیہ نے اس کے جہیز کا سامان تیار کیا اور اسے داہر کے پاس بھیج دیا کہ اس کی شادی کر دی جائے، داہر نے ہندو جوتشیوں سے زائچہ نکلوایا، جوتشیوں نے کہا کہ آپ کی بہن بہت نصیب والی ہے، یہ جس کے پاس رہے گی، اس کے پاس سندھ کی حکومت ہوگی، داہر نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کے ہاتھوں سے حکومت نہ چلی جائے، وزیروں سے مشورہ کیا، انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی بہن سے شادی کر لیں، بات اچھی ہو یا بری، لوگ دو چار دن یاد رکھتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں، لوگوں نے تو راج پاٹ کے چکر

(۱)　تاریخ ہند: ۲۴۵۔

میں بھائیوں اور باپ تک کو قتل کرا دیا، بہن سے شادی تو معمولی بات ہے؛ چنانچہ داہر نے اپنی بہن سے شادی رچالی، دھرسیہ کو یہ بات ناگوار گزری اور وہ ایک لشکر جرار لے کر برہمن آباد سے روانہ ہوا اور وادی مہران کے جنوبی علاقے نیرون کوٹ (موجودہ حیدرآباد سندھ) پہنچا، اور قلعے کا محاصرہ کرلیا، اسی دوران چیچک کی وبا پھیلی اور دھرسیہ فوت ہوگیا، اب راجہ داہر پورے سندھ کا راجہ بن گیا اور اس کی خودسری حد سے بڑھ گئی، قزاقی، لوٹ مار اور غنڈہ گردی کرنے والوں کے لئے داہر ایک سایہ عافیت بن گیا۔(۱)

خلاصۂ تحریر☆

حاصل یہ ہے کہ :

(۱) غزوۂ ہند کا واقعہ پیش آچکا ہے، مستقبل میں پیش آنے والا نہیں ہے۔

(۲) غزوہ ہند کی مہم انجام دینے والے سے مراد محمد بن قاسم کا حملہ ہے۔

(۳) محمد بن قاسم نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی تھی؛ بلکہ راجہ داہر کی طرف سے لوٹ مار اور عورتوں کو گرفتار کرنے کا جو واقعہ پیش آیا، اس کی وجہ سے حملہ کرنا پڑا۔

(۴) محمد بن قاسم کے ساتھ کئی ہندو سردار بھی شامل تھے، وہ صرف ۱۲ر ہزار فوجیوں کے ساتھ آیا، مگر بہت کم عرصہ میں اس کی فوج پچاس ہزار ہوگئی، یہ سب بقیہ فوجی مقامی تھے، اور ان میں بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی، اس نے تمام رعایا کو مذہب کی مکمل آزادی دی تھی۔

(۵) راجہ داہر نے اپنی سگی بہن سے شادی کر رکھی تھی اور وہ غیر برہمن کے ساتھ نہایت حقارت آمیز سلوک کرتا تھا؛ اسی لئے مقامی لوگ اس سے بددل تھے اور وہ بہ آسانی محمد بن قاسم کے ساتھ آگئے، یہ بات غیر مسلم محققین نے بھی لکھی ہے۔

(۶) محمد بن قاسم کے حسن سلوک کی وجہ سے رعایا اس کی گرویدہ تھی، یہاں تک کہ انھوں نے اس کا مجسمہ بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔



---

(۱) تاریخ سندھ: ۴۵-۴۶۔　　☆ از: مرتب۔

محمود غزنوی اور مندروں کا انہدام☆

جہاں تک بتوں کی بے حرمتی اور مندروں کے انہدام کا سوال ہے تو یہ الزام عموماً تمام مسلم حکمرانوں پر لگائے جاتے ہیں؛ لیکن ان میں محمود غزنوی اورنگ زیب سرِ فہرست ہیں، یہ صحیح ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان کے مختلف حصوں پر — جن میں مندر بھی شامل تھے — لگا تار حملے کئے؛ لیکن یہ حملے مذہبی ارادے سے نہیں؛ بلکہ حصولِ زر اور دوسری وجہوں سے ہوتے تھے، اس میں ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ یہ مندر دولت کے خزانے تھے، اسلام کے نزدیک تمام مذاہب کی عبادت گاہیں قابلِ احترام ہیں اور یہ نظریہ مذہبی رواداری اور روایات سے زیادہ اہم ہے، محمود غزنوی کے ایک ہم عصر مورخ نے تاریخِ یمینی میں بڑی تفصیل سے محمود غزنوی کے ان حملوں کا ذکر کیا ہے، اس نے متعدد بار ہندوستان پر لگا تار حملے کئے اور دولت کی خاطر اس نے دولت کے خزانے مندر کو بھی جی بھر کر لوٹا، جس طرح چور چوری سے قبل مکان مالک کے مذہب کو نہیں پوچھتا ہے، اسی طرح لٹیروں کو مندر یا سرکاری خزانہ میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا، (مسجدیں اس لوٹ کھسوٹ سے صرف اس وجہ محفوظ رہیں کہ ان کے پاس اینٹ اور پتھروں کی دیوار کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا)؛ لیکن اس کے لئے ہندستان کے تمام مسلم حکمراں ذمہ دار قرار نہیں دیئے جاسکتے، ان سب کے باوجود یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے، بقول تارا چند :

> محمود غزنوی کی فوج میں بکثرت ہندو سپاہی تھے، جو اس کی حمایت میں وسطی ایشیا تک جاکر لڑے، اس کے ایک ہندو فوجی کمانڈر تلک نے لاہور میں احمد نیا پتگین کی بغاوت سرکرنے میں اہم رول ادا کیا۔(۱)

☆ یہ مقالہ بھی جناب ڈاکٹر مختار احمد مکی کی کتاب ''ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی'' صفحہ: ۸۰ تا ۸۵ سے لیا گیا ہے، واقعہ ہے کہ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۲۰۰۵ء، ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی، مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز تاریخ کے رد کے لئے نہایت مفید کتاب ہے اور دستاویزی معلومات کی حامل ہے۔(رحمانی)

(۱) خورشید مصطفیٰ رضوی، تاریخ کی سچائیاں، (دہلی ۱۹۹۶ء)، ص: ۱۴۔

پھر اسی تلک نے سلطان مسعود کی جانب سے راجہ ہانسی کے خلاف لڑ کر قلعہ ہانسی فتح کیا، ایک طرف ہندو مسعود کی طرف سے ہندوستان میں لڑ رہے تھے تو دوسری جانب پانچ سو ہندو سرخس میں سلجوقیوں کے خلاف مسعود کی طرف سے برسرِ پیکار تھے، محمود غزنوی کے سلسلہ میں ایشوری پرشاد کا بھی کہنا ہے کہ :

محمود نے تاریخ میں جو جگہ بنائی ہے، اس کا تعین کرنا مشکل امر ہے، اپنے عہد کے مسلمانوں کی نظر میں تو وہ ایک غازی اور مذہب اسلام کا علم بردار تھا، جس نے کفر کا خاتمہ کرنا چاہا، ہندوؤں کی نظر میں آج بھی وہ ایک سنگ دل اور ظالم لٹیرا ہے، جس نے ان کی مقدس عبادت خانوں کو ملیامٹ کر کے ان کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا؛ لیکن ایک غیر متعصب محقق اور مورخ اس زمانے کی صورت حال کے پیش نظر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما، ایک انصاف پسند، دیانتدار حکمراں، ایک باکمال اور پر جوش سپاہی، عدل وانصاف کا شیدائی اور علوم وفنون کا مربی تھا، وہ بلا شک وشبہ دینا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کئے جانے کے لائق تھا۔(۱)

جہاں تک محمود غزنوی کے ذریعہ ہندوستان پر لگاتار حملے کا سوال ہے تو یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ، جب امیر سبکتگین ۹۷۶ء میں غزنی میں تخت نشیں ہوا تو اس وقت کابل اور پشاور کا علاقہ پنجاب کے راجہ جے پال کے زیر نگیں تھا اور افغانستان میں دونوں کی سرحدیں ملتی تھیں، جے پال ایک لشکر لے کر غزنی کی طرف بڑھا، ۹۷۹ء میں غزنی اور لمغان کے درمیان ان دونوں میں جنگ ہوئی جس میں جے پال کو شکست ہوئی اور وہ صلح کا طلب گار ہوا، ہرجانہ کی شرط پر صلح ہوئی؛ لیکن لاہور پہنچ کر وہ اپنے وعدہ سے مکر گیا، ہرجانہ کی شرائط کے مطابق اسے

(۱) ایشوری پرساد، ہسٹری آوف میڈانیول انڈیا، ص:۵۶۔

دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی دینا تھا، جو سفیر رقم لینے آیا اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا، گویا وعدہ خلافی اور سفیر کے ساتھ غلط سلوک کی وجہ سے یہ حملہ ہوا تھا، نتیجتاً امیر سبکتگین نے جے پال کے علاقہ پر حملہ کر دیا، اس درمیان راجہ جے پال نے ہندوستان کے تمام راجہ مہاراجہ سے مدد مانگی، دہلی اجمیر، کالنجر اور قنوج کی منتخب و مشترکہ افواجِ کثیر سے امیر سبکتگین کا مقابلہ پشاور کے قریب ہوا، جس میں ہندوستان کی مشترکہ افواج کو شکست سے دو چار ہونا پڑا، اس طرح سبکتگین نے کابل اور پشاور کا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا، ۹۹۷ء میں جب امیر سبکتگین نے وفات پائی اور سلطان محمود تخت نشیں ہوا تو اس نے جے پال کے خلاف اپنی لڑائی جاری رکھی، دوسری جانب جے پال کی موت کے بعد اس کا بیٹا آنند پال تخت نشیں ہوا تو اس نے بھی ناسمجھی میں ۱۰۰۵ء میں سلطان محمود پر حملہ کر دیا؛ لیکن شکست کھائی اور کشمیر بھاگ گیا، پھر سلطان محمود نے پے در پے حملے شروع کر دیئے، (۱) حملہ کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی کہ جے پال اور بعد میں آنند پال نے بھڑوں کے چھتہ کو چھیڑ دیا تھا، اور اب یہ بھڑ اس کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، یا وہ کمبل چھوڑنے کو تو تیار تھے؛ لیکن کمبل ہی انھیں نہیں چھوڑ رہا تھا، اس طرح محمود غزنوی کا حملہ ہندو مذہب اور ہندو قوم سے نفرت کی بنا پر نہیں تھا؛ بلکہ اسے تو اپنی سلطنت کی توسیع اور دولت کی تحصیل سے غرض تھی، اس نے ایران کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا، ساتھ ہی اس نے سندھ اور ملتان کی عرب حکومتوں کو بھی فتح کر کے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔

سر ہنری ایلیٹ لکھتا ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر ۱۷/بار حملہ کئے تھے؛ جبکہ دوسرے تمام ہندوستانی مورخوں کا اتفاق ہے کہ اس نے ۱۷/بار تو نہیں؛ لیکن اگر اس کے تمام چھوٹے بڑے حملوں کو ملا دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ۱۲/بار حملہ کیا تھا، جس میں سب سے اہم حملہ ۱۰۲۴ء میں سومناتھ مندر پر کیا گیا حملہ مانا جاتا ہے، کیتیاواڑہ (گجرات) میں سمندر ساحل پر شیو کا یہ مندر شالی ہندوستان کا سب سے بڑا مندر تھا، مختلف ہندو مصنفین کے مطابق اس مندر کے نام دس ہزار گاؤں وقف تھے اور لاکھوں بھکت روزانہ اس پر چڑھاتے، ایک

(۱) تاراچند: ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات (نئی دہلی ۱۹۹۶ء)، ص: ۴۰۔

ہزار برہمن یہاں پوجا پاٹھ میں مشغول ہوتے،منور کے ہال میں شیو کا لنگ ہوا میں معلق تھا، جس کی وجہ سے اس کی دھوم تھی اور لوگوں کا اعتقاد تھا کہ محمود غزونی یہاں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کی حفاظت کے لئے شیو بذات خود موجود ہیں، ۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی نے اس مندر پر حملہ کیا اور ہال میں ہر چہار جانب لگے چمبک (مقناطیس) کے پتھروں کو توڑ ڈالا جس سے شیولنگ زمین پر گر پڑا، اس مندر میں دولت کی بہتات تھی، مندر کے ایک کونہ میں ڈھائی سومن سونے کی ایک بڑی اور موٹی زنجیر تھی جس سے مندر میں بجنے والا گھنٹہ لگا ہوا تھا، پانچ سو طوائفیں اور دو سو سازندے مندر اور پجاریوں کی خدمت کے لئے مامور تھے، جن کو مندر کی جانب سے معقول تنخواہ دی جاتی تھی، بہت سے راجاؤں اور ان کے وزیروں نے اپنی اپنی بیٹیاں مندر کی خدمت کے لئے وقف کردی تھیں؛ تاکہ ان کا اثر مندر پر بنا رہے، یہ اپنے حسن و جمال میں یکتا ہوتیں اور ناچنے گانے والیوں میں شامل ہوتیں، انھیں دیوداسی کہا جاتا اور ان کا اصل پیشہ عصمت فروشی اور پجاریوں کا دل بہلانا تھا، سنار اور جولاہے اپنی پہلی بیٹی کو مندر کے نام وقف کرنا لازمی تصور کرتے تھے، ان دیوادسیوں کے بچے کو دیوتاؤں کی اولاد ہری جن تصور کیا جاتا تھا، ان کا کام ہر وقت بناؤ سنگھار اور رقص کرنا ہوتا تھا، تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی مندر کے دیوتا سے کردی جاتی، مندر کا خاص پجاری یا اس کا نمائندہ اس کے ساتھ سہاگ رات مناتا اور پھر یہ عصمت دری کے لئے آزاد ہوتیں،(۱) محمود غزنوی یہاں موجود تمام سونا، چاندی اور جواہرات کو لوٹ کر سندھ کے ریگستان کے راستے غزنی واپس پہنچا؛ گرچہ راستے میں ہندوستانی رہبروں نے اسے راستہ سے بھٹکانے اور اُلجھانے کی تمام کوششیں کیں اور جاٹوں نے اسے کافی پریشان بھی کیا، جس کا بدلہ لینے اور جاٹوں کو سبق سکھانے کے لئے ایک بار مزید اس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔(۲)

---

(۱) سوامی دھرم تیرتھ (پرمیشور مینن)، ڈی اور ہسٹری آوف ہندو امپیریلزم، مترجم: سید شاہد ہندو سامراج کی تاریخ، (نئی دہلی یونیورسل پیس فاونڈیشن ۲۰۰۴ء)، ص: ۸۲-۸۳۔

(۲) ایل پی شرما، مدھیہ کالین بھارت، (آگرہ لکشمی نرائن ۲۰۱۳ء)، ص: ۵۲۔

محمود غزنوی نے غزنی میں ہندوؤں کے بود و باش کے لئے ایک محلہ بھی آباد کرایا تھا، کسی بھی ہندو کو کبھی بھی اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، بقول الفنسٹن غیر مسلموں کو مسلمان بنانا محمود غزنوی کا مقصد نہیں رہا، سوائے لڑائی کے کسی ہندو کو کبھی بھی اس نے قتل نہیں کیا، محمود غزنوی کوئی مبلغ اسلام نہیں تھا اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانا کبھی بھی اس کا مقصد نہیں رہا، الفنسٹن کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ گجرات میں عرصہ تک رہا، لاہور میں بھی اس کا قیام رہا؛ لیکن اس نے کبھی بھی کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق کہیں بھی یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ اس نے کبھی بھی کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے مجبور کیا ہو اور نہ ہی کسی شخص کو اس کے مذہب کی بنا پر موت کی سزا دی ہو، لڑائی اور محاصرہ کے وقت دشمن ہلاک کئے جاتے تھے؛ لیکن اس بنیاد پر نہیں کہ وہ ہندو ہیں، اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری آزادی حاصل تھی، انتظامی اُمور اور فوج میں عرب، افغانی، ویلمی، خراسانی اور غوری وغیرہ تھے، اسی طرح ہندو بھی تھے، ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سونڈی رائے، جئے سین، وجے رائے اور ہج رائے وغیرہ کے نام نمایاں ہیں جس پر اسے مکمل اعتماد تھا۔(۱)

ایل پی شرما کا کہنا ہے کہ :

> محمود ایک باہمت بہادر فوجی، عظیم سپہ سالار اور سامراجیہ قائم کرنے والا ایک جری حکمراں تھا، وہ تعلیم یافتہ، تہذیب وتمدن کا دلداہ، عالموں اور فن کاروں کا قدر کرنے والا حکمراں تھا، اس نے غزنی میں حساب فلسفہ، جیوتش، اور سنسکرت کے عظیم عالموں کو جمع کر رکھا تھا، عظیم اسکولر البیرونی، مورخ عطمی، اور دہاقی فلسفی فارابی، فارسی شاعر اجاری، ماہر تعلیم طوسی، عنصری، اسجدی، فروخی اور شاہنامہ کا خالق فردوسی وغیرہ اس کے دربار سے وابستہ تھے، اس نے غزنی میں ایک یونیورسٹی، لائبریری اور عجائب گھر قائم کر رکھا تھا، اس نے بیرون

---

(۱) ڈاکٹر ایشور ٹوپا، پولیٹیکس ان پری مغل ٹائمس، ص:۴۶۔

ملک سے عظیم فن کاروں کو بلا کر غزنی میں محل، مسجدیں اور مقبرے بھی تعمیر کروائے، وہ ایک انصاف پرور حکمراں تھا، اس نے اپنے ایک بھتیجے کو غیر عورت سے تعلق رکھنے کے جرم قتل کروا دیا اور اپنے بیٹے اور ولی عہد مسعود کو ایک تاجر سے قرض لینے کے معاملہ میں قاضی کی عدالت میں بذات خود حاضری کا بھی حکم دیا تھا، وہ دولت کا لالچی تو ضرور تھا؛ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اسے خرچ بھی کرتا تھا۔(۱)

سلطان محمود کی موت کے پندرہ روز کے بعد ہی اس کے بیٹے سلطان مسعود نے ایک ہندو فوجی سردار سونڈی رائے کو ہندو سواروں کی معیت میں ان امراء کے خلاف لڑائی کے لئے بھیجا جو اس کے بھائی کے حامی تھے، پانچ سال بعد مسعود ہی کے حکم سے تلک نے ہندو سپاہیوں کے ساتھ نیا لپتگین کے خلاف لشکر کشی کی اور اس کو شکست دیکر ہلاک کر دیا، اس کے پانچ سال بعد سلطان مسعود جب سلجوقی ترکمانوں سے مغلوب ہو کر غزنی سے ہندوستان چلا آیا تو یہاں اس نے ایک بڑی فوج اکٹھا کی، جس میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی۔(۲)

سنیتی کمار چٹرجی کی تحقیق ہے کہ:

اس کے سکوں پر سنسکرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اس کے سیاسی سوجھ بوجھ کے ثبوت ہیں۔(۳)

بقول سی وی ویدیہ:

محمود ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اس نے محض اپنی قوت بازو سے ایک چھوٹے سی پہاڑی علاقہ کو ایک وسیع اور خوشحال سلطنت میں

---

(۱) ایل پی شرما، مدھیہ کالین بھارت، (آگرہ لکشمی نرائن ۲۰۱۳ء)، ص: ۵۴۔

(۲) ایلیٹ، تاریخ سبکتگین: ۲ر۲۰۔

(۳) شیخ محمد اکرام، آب کوثر (دہلی ۱۹۷۶ء)، ص: ۱۰۔

تبدیل کر دیا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا...... میرا خیال ہے کہ محمود ان افراد میں ہے جو قدرت کی جانب سے ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں، جن میں غیر معمولی قسم کی خوبیاں اور عدیم المثال صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو دنیا کی تاریخ اور قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں، ایک انسان کی حیثیت سے وہ ایک سخت نظم وضبط اور اعلیٰ کردار کا حامل تھا، اس کے بہت سے حملوں کی مثال تو ملتی ہے جس میں مندر منہدم ہوئے، خون ریزیاں ہوئیں، قیدی غلام بنائے گئے؛ لیکن عورتوں کی عصمت ریزیاں یا ان کے قتل وخون کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ جلیل القدر عادل حکمراں تھا، اس لئے وہ ظلم سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا کہ اگر اس کا لڑکا بھی زنا کا مرتکب ہوتا تو وہ اس کو قتل کر دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔(۱)

مزید یہ کہ سومناتھ کے مندر کو برباد کرنے کی تفصیل تو موجود ہے؛ لیکن جب محمود غزنوی نے متھرا کے مندر کو دیکھا تو وہ اس کی شان وشوکت اور حشمت دیکھ کر ششدر رہ گیا، اپنے ایک خط میں وہ اقرار کرتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عمارت بنانا چاہے تو اسے لاکھوں سرخ دینار خرچ کرنا پڑے گا اور شاید دو سو سال میں بھی ایسی عمارت نہ بن پائے،(۲) اس طرح یہاں وہ نہ تو بت شکن دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی بت فروش؛ بلکہ مندر کے حسن نے اسے مبہوت کر رکھا تھا، وہ بڑا مزہ لے لے کر ان بتوں کا تذکرہ کرتا ہے، اس کے ہی الفاظ میں پانچ بت تھے جو سرخ سونے سے بنائے گئے تھے، ان میں سے ہر ایک ہوا میں پانچ گز اوپر کسی سہارے کے بغیر معلق تھے، ان بتوں میں سے ایک کی آنکھ میں دو لعل تھے، جو فروخت کئے جاتے تو صرف

(۱) سی وی ویدیا، میڈ ائیول ہندو انڈیا، (نئی دہلی ۱۹۷۰ء)، ص: ۹۲۔

(۲) تاریخ یمنی، حوالہ ایلیٹ: ۲ر۴۴۔

ایک کی قیمت پچاس ہزار دینار ہوتی، دوسرے بتوں کی آنکھ میں نیلم تھا، وہ پانی سے زیادہ صاف اور بلور سے زیادہ چمکدار تھے، ان بتوں میں اٹھانوے ہزار تین سو مثقال کے سونے تھے۔(۱)

مشہور مورخ گبن کا کہنا ہے کہ :

> محمود غزنوی دنیا کے جلیل القدر بادشاہوں میں سے ایک تھا، وہ ایک بہادر سپاہی، تجربہ کار کمانڈر، عدل وانصاف کا علمبردار اور علماء فضلاء کا مربی تھا، وہ ایک ایسا حکمراں تھا جس نے ملک میں امن وامان اور خوشحالی لانے کی کوشش کی اور تعلیم وتجارت کو فروغ دیا، وہ ایک انسان کی حیثیت سے قواعد وضوابط کا پابند رہا، فطری طور پر نہ تو وہ ظالم تھا اور نہ ہی لالچی ؛ بلکہ اعتدال پسند اور فیاض تھا، وہ مذہبی بھی تھا اور اپنے عقائد کا سختی سے پابند بھی نہیں تھا"۔(۲)



(۱) صباح الدین عبدالرحمن، سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت وشیفتگی کے جذبات، (اترپردیش اُردو اکیڈمی لکھنو ۱۹۸۳ء)، ص: ۱۴۔

(۲) صباح الدین عبدالرحمن، مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، (اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء)، ص: ۳۶۔

اورنگ زیب اور ہندو منادر☆

جہاں تک اورنگ زیب پر متھرا اور بنارس کے مندروں کو توڑنے کا الزام ہے تو اس نے گولکنڈہ کی جامع مسجد کو بھی مسمار کرایا تھا؛ کیوں کہ وہاں کے حکمراں تانا شاہ نے مرکز کو خراج دینا بند کر دیا تھا اور اس سارے خزانے کو مسجد میں دفن کروا دیا تھا، بادشاہ کو خبر ملی تو اس نے عمارت تڑوا کر شاہی خزانہ حاصل کیا، یہی نہیں؛ بلکہ اس نے اپنے باپ کے مزار سے چاندی کے تختے نکلوا کر اس کے سکے ڈھلوائے اور اس سے نہریں کھدوائیں اور دریا میں پل بنوائے،(۱) وہی اورنگ زیب تقریباً ۲۵ رسال تک دکن میں اجنتا اور ایلورا کے مندروں کے قریب رہا؛ لیکن اس کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، جنوبی ہندوستان کی ہزاروں مندریں آج بھی اس کے گواہ ہیں کہ کسی بھی مسلم بادشاہ نے خواہ مخواہ اس کو نہیں چھیڑا، اورنگ زیب کے ذریعہ کسی مندر کو تڑوانے کی کوئی مستند روایت موجود نہیں ہے، اپنے وسیع رقبہ (شمال میں قراقرم کے پہاڑ اور آلسپس دریا سے جنوب میں دریائے کاویری تک اور مغرب میں ایران کی سرحد سے لے کر برما تک) اور طویل المدت (پچاس سالہ) دورِ حکومت میں مذہبی تعصب کی بنیاد پر اگر وہ مندروں کو مسمار کرتا تو ہندوستان میں آج ہندو مندر نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ جاتی اور نہ ہی شاید کوئی ہندو ہی بچتا۔

مزید یہ کہ اگر اورنگ زیب مذہب کے معاملہ میں ایسا ہی سخت اور کٹر تھا تو کیا شریعت اسلامی مندروں کو توڑ کر مسجد بنانے کی اجازت دیتی ہے؟ ظاہر ہے اسلام نے دوسروں کی زمین یا کسی بھی مذہبی جگہ کو چھین کر یا غصب کر کے یا زور زبردستی قبضہ کر کے مسجد بنانے کی کبھی

☆ تحریر: ڈاکٹر مختار احمد مکی (از: ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی، باب: ۱۴)۔

(۱) بشمبھر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، آزاد ہند: ۲۳ راکتوبر ۱۹۸۳ء۔

بھی اجازت نہیں دی ہے، خود فتاویٰ عالمگیری میں بہت ہی واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد بنانا کسی بھی طرح درست نہیں ہے، ناجائز حصول کی جو بھی شکل ہو، مثلاً: کسی کا گھر، زمین، جائداد وغیرہ، اگر کچھ لوگ زبردستی حاصل کر کے وہاں مسجد یا جامع مسجد بنالیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، جائز طریقے سے حاصل کئے بغیر کسی زمین پر زور زبردستی سے قبضہ کر کے مسجد بنالینا جائز نہیں، اگر کوئی مسجد بنالی گئی ہے تو وہ شرعاً مسجد نہ ہوگی، اس میں نماز کی ادائیگی درست نہیں ہے؛ بلکہ ایسی مسجدیں ممنوع ہیں اور وہاں نماز نہ پڑھی جائے۔(۱)

اسلام تو دوسرے مذاہب اور ان کے دیوی دیوتاؤں کو بھی غلط ناموں سے یاد کرنے کی اجازت نہیں دیتا، قرآن مجید میں ایک بھی آیت ایسی نہیں ہے جس میں مال و دولت حاصل کرنے یا ملک گیری اور لوگوں کو پامال کرنے کی ہدایت یا اعتدال سے تجاوز کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہو، بقول پروفیسر محمد فرمان مغل حکمراں خاص طور پر جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب وغیرہ پہلے حکمراں یا شہنشاہ تھے، اس کے بعد ہی ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج کا خیال تھا، (۲) اورنگ زیب کو یوں بھی مسجدیں تعمیر کروانے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا، اس کے دورِ حکومت میں زیادہ تر مسجدوں کی مرمت ہی ہوئی ہے، (۳) ویسے بھی مغل بادشاہوں کو زمین کی قلت نہیں تھی کہ وہ مندروں کو تڑوا کر مسجدیں تعمیر کرواتے، مزید یہ کہ ایک قابل حکمراں کی حیثیت سے وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ ہندوستان کی بڑی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے، جو اپنے مذہب اور عقیدہ کے لحاظ سے پکے ہیں، ہندو رعایا اور طاقتور ہندو راجہ اور زمیندار اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے، پھر اگر انھیں زبردستی مسلمان بنا بھی لیا جاتا تو کیا ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا؟ اس بات کی کوئی ضمانت تھی کہ وہ مسلمان بنے رہیں گے، اورنگ زیب کے سامنے یقیناً حضرت نظام الدین اولیاء کا یہ قول رہا ہوگا کہ :

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری: ۶/ ۲۱۲۔ (۲) محمد فرمان، حیات مجدد: ۵۸۔
(۳) رشید احمد ندوی: مسلم حکمراں (لاہور ۱۹۶۱ء): ۱۲۷۔

غیر مسلموں کو طاقت اور ترغیب سے جھکایا نہیں جاسکتا ہے؛ بلکہ ان کو
صرف ہمدردانہ میل جول سے اسلام کی جانب مائل کیا جاسکتا ہے۔(۱)

بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ نے کچھ اہم دستاویزات کے ساتھ اپنی کتاب دی فیدر اینڈ اسٹون (The Feather and Stone) میں روشنی ڈالی ہے جسے پٹنہ میوزیم کے کیوریٹر ڈاکٹر بی این گپتا اور مشہور مورخ بی این پانڈے نے بھی تسلیم کیا ہے :

بنگال جاتے ہوئے اورنگ زیب بنارس کے قریب سے گزرا، اس کی فوج میں شامل ہندو راجاؤں نے گنگا اشنان اور وشنو پوجا کی خواہش ظاہر کی، جس کی اجازت اورنگ زیب نے دے دی، متعدد رانیوں نے گنگا اشنان کے بعد وشوناتھ کا درشن کیا؛ لیکن واپسی پر کچھ (سندھ) کی مہارانی غائب تھی، مندر کے احاطہ کی تلاشی لی گئی؛ لیکن مہارانی نہیں ملی، اورنگ زیب کو جب اس کی خبر ملی تو اسے بے انتہا غصہ آیا، سختی سے مندر کی دوبارہ تلاشی لی گئی تو پتہ چلا کہ گنیش کی مورتی کے پیچھے سے دیوار میں ایک خفیہ سرنگ ہے، اندر جانے پر روتی بلکتی بے آبرو مہارانی ملی، جس کے ساتھ اجتماعی آبرو ریزی کی گئی تھی، اور یہ تہہ خانہ وشوناتھ کی پرتیا کے عین نیچے تھا، فوج میں موجود ہندو راجاؤں کے اصرار پر اس حرام کاری کے اڈے کو مسمار کر دیا گیا، دیوتا کی مورتی وہاں سے ہٹادی گئی اور اس کے مہنت کو سخت ترین سزا دی گئی۔(۲)

جہاں تک بنارس کے گیان واپی مسجد کا سوال ہے تو محلہ کا نام گیان واپی ہے اور اسی

---

(۱) ڈاکٹر تارا چند: ہسٹری آف فریڈم موومنٹ: ۱/۶۱۔
(۲) ایم حبیب احمد: ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس، (ترقی اردو دہلی ۱۹۶۴ء)، ص: ۳۶۲۔

مناسبت سے اس مسجد کو اسی نام سے جانا جاتا ہے، گیان کے معنی علم وحکمت اور واپی کے معنی باؤلی کے ہیں، ایک زبانی روایت کے مطابق ہندوؤں کے مہادیو اس باؤلی میں چھپے ہیں، تاریخی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد کب اور کس نے رکھا تھا؛ لیکن تاریخ کی کتابوں سے یہ واضح ہے کہ اکبر کے دور حکومت میں بھی یہ مسجد موجود تھی اور اس میں باضابطہ نماز ادا کی جاتی تھی، غالباً اس کا سنگ بنیاد سلطان ابراہیم شاہ شرقی (متوفی : ۱۴۴۰ء) کے زمانہ میں رکھا گیا تھا اور اورنگزیب کے زمانہ میں اس کی مرمت اور تعمیر نو ہوئی ہے، مسجد کی پشت والی زمین پر اکبر نے 'دین الٰہی' کا ایک ادارہ قائم کیا تھا، جسے شاہجہاں نے ۱۶۷۳ء میں توڑوا کر دینی تعلیم کے لئے ایک عمارت تعمیر کروائی اور اس کا تاریخی نام 'ایوان شریعت' رکھا گیا، (۱) جس کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں اور مسجد کے احاطہ میں دینی تعلیم کا یہ سلسلہ بیسویں صدی کے چھٹی ساتویں دہائی تک باقی تھا، مسجد اپنی اصل بنیاد اور دیوار پر آج بھی قائم ہے۔

سری کرشن ورما اپنی کتاب مرقع بنارس میں کاشی کھنڈ کے مختلف حوالہ کی بنیاد پر دعویٰ کرتے ہیں کہ موجودہ مسجد وشوناتھ مندر کی جگہ پر نہیں ہے، ان کے الفاظ میں اگر یہ مسجد قدیم وشوناتھ مندر کی جگہ پر ہے تو کاشی کھنڈ سچی نہیں ہے اور اگر کاشی کھنڈ معتبر کتاب ہے تو جامع مسجد وشوناتھ جی کے مندر کی جگہ پر نہیں بنی ہے، (مرقع بنارس صفحہ ۱۷۰) ان کے مطابق ہم ہندوؤں کے یہاں پران گرنتھ سب سے قدیم کتاب مانی جاتی ہے اور پرانوں میں سب سے قدیم اور سچی تاریخی اسکندر پران ہے، اس کے باوجود ہمیں مندر کا پتہ نہیں ہے اور ہم مسجد گیان واپی کو ہی پرانا مندر سمجھ بیٹھے ہیں، (مرقع بنارس صفحہ ۲۸۶) مولانا امام الدین رام نگری اپنی کتاب عالمگیر اور جامع مسجد گیان واپی میں تحریر کرتے ہیں کہ مسجد کا صدر دروازہ پہلے مشرق کی جانب تھا جسے بند کردیا گیا ہے اور مندر و مسجد دونوں میں داخل ہونے کے لئے شمال کی جانب تنگ دروازہ ہے، آزادی ہند سے قبل تک وہاں ایک قناتی مسجد ہوا کرتی تھی جو آج موجود نہیں اور اس کے فرش کا استعمال شرنگا گوری کی ادائیگی کے لئے کیا جاتا ہے، جب کہ اصل شرنگا گوری گیان واپی مسجد کے مغربی موڑ سے تقریباً ۵۰ قدم پر واقعہ پھول منڈی میں موجود ہے۔ (۲)

(۱) اوم پرکاش پرشاد (مترجم فیضان رشید) اورنگ زیب ایک، نیا زاویہ نگاہ (پٹنہ ۱۹۹۴ء)۔

(۲) مفتی عبدالباطن نعمانی، جامع مسجد گیان واپی، تاریخی کے آئینہ میں، (بنارس ۱۴۲۹ھ)۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ خود اورنگ زیب نے بڑی تعداد میں ہندو مندروں اور مٹھوں کی نہ صرف حفاظت کی؛ بلکہ پوجا اور بھوگ کے لئے وظیفے اور جاگیریں مقرر کر رکھے تھے، ۲؍جولائی ۲۰۱۷ء کے ٹیلیگراف دہلی میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق آزادیِ ہند کے بعد جب چین نے کیلاش پربت، کیلاش مانسرور اور اُورانچل پردیش پر قبضہ کرلیا تو اس کے خلاف پنڈت نہرو نے انجمن اقوام متحدہ کو جو دستاویزات فراہم کئے تھے، اس میں یہ تحریر ہے کہ یہ ہندوستان کا حصہ رہا ہے، جب چین نے اس پر قبضہ کیا تھا تو اورنگزیب نے چین کے راجہ کو ایک خط لکھا کہ کیلاش پربت اور مانسرور ہندوستان کا حصہ ہے اور ہمارے ہندو بھائیوں کی آستھا سے جڑا ہے؛ لہٰذا اس پر قبضہ نہ کیا جائے، جب ڈیڑھ ماہ تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا تو اورنگزیب نے ۱۶۸۰ء میں حملہ کر کے صرف دو دن میں اس پر قبضہ کرلیا، یہ ایک سرجیکل اسٹرائیک تھا، اس کے حلفیہ دستاویزات ہندوستانی پارلیامنٹ لائبریری اور انجمن اقوام متحدہ کے آفس میں موجود ہیں، ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ :

> جب میں الٰہ آباد میونسپلٹی کا چیرمین تھا تو ترپتی سنگم کے قریب واقع سومیشور ناتھ مہادیو مندر کے مہنت کی موت کے بعد اس کے دو دعویدار اُٹھ کھڑے ہوئے، ان دونوں نے میونسپلٹی میں داخل خارج کے لئے اپنے کاغذات جمع کئے تھے، جب میں نے ایک دستاویز پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ وہ اورنگ زیب کا فرمان تھا جس میں انھوں نے مندر کے پجاری کو بھوگ اور پوجا کے لئے جاگیر میں دو گاؤں عطا کئے تھے، مجھے دستاویز دیکھ کر نقل کا گمان ہوا کہ اورنگ زیب جیسا بت شکن اور کٹر مسلمان بت پرست کیسے ہوسکتا ہے؟ میں اس دستاویز کو لے کر سیدھے سر تیج بہادر سپرو کے پاس گیا جو کہ فارسی وعربی کے ایک بڑے اسکالر تھے اور نہیں اسے دکھایا؛ انھوں نے مطالعہ کے بعد بتایا کہ یہ دستاویز اصلی ہیں، میں نے اپنے شک کا

اظہار کیا کہ عالمگیر تو مندروں کو توڑتا تھا، بت شکن تھا، وہ ٹھاکر جی کے
بھوگ اور پوجا کے لئے جائداد کیسے دے سکتا ہے؟ اس پر سپرو جی نے
بنارس کے جنگم باڑی شیومندر کے سلسلہ میں اورنگ زیب کے چار
فرمان دکھائے، جس میں جنگموں کو معافی کی زمین عطا کی گئی تھی۔(۱)

اِلٰہ آباد میں واقع مشہور ناتھ مہادیو مندر، (۲) اجین کا مہا کالیشور شیو مندر، گوہاٹی کا اوماہنداور کاما کھیا مندر، (۳) (اورنگ زیب کی تخت نشینی کے نویں سال میں ۲ صفر کا فرمان)، (۴) تروپتی مندر، چتر کوٹ کے بالا جی مندر (مہنت بالاواس کے نام تین سو بیگھ زمین کی مال گزاری معاف زمین کا فرمان)، (۵) اور ستر ونجی میں جین آبو مندر وغیرہ وہ چند منادر ہیں جس کے فرمانوں کی کاپیاں آج بھی اصلی حالت میں موجود ہیں جنھیں اورنگ زیب کے ذریعہ ۱۶۵۹ء تا ۱۶۸۵ء جاگیریں اور عطیات عنایت کئے گئے تھے، (۶) اسی طرح ۱۱ شعبان اور ۵ رمضان ۱۶۷۲ء کے فرمان کے ذریعہ اس نے بنارس کے جنگم باڑی مٹھ میں ۱۷۸ ربیگھ زمین اور بینی مادھو گھاٹ پر ۱۶۸۳ء میں مرکزی مسجد کے پاس دو پلاٹ رام جیون گوسائیں اور اس کے لڑکے کو بطورِ انعام عطا کیا؛ تاکہ مذکورہ پلاٹوں پر برہمنوں اور فقیروں کے لئے رہائشی مکانات بنوانے کے بعد وہ خدا کی عبادت اور ہماری سلطنتِ خداداد کی بقائے دوام کے لئے التجاء ودُعاء میں لگ جائیں، (۷) متھرا سے ۲۰ رکیلو میٹر دور شمال میں دس ہزار آبادی پر مشتمل آج ایک قصبہ بلدیو (کرشن کے بڑے بھائی بلرام یا بلدیو کی مناسبت سے) اپنی ہرنگا ہولی

(۱) بشمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، (آزاد ہند کلکتہ ۲۳ راکتوبر ۱۹۸۳ء)۔
(۲) شوکت علی فہمی، (دیباچہ)، ہند عہد اورنگ زیب میں، (دہلی ۱۹۶۲ء)، ص: ۱۳۔
(۳) راجندر پرشاد، انڈیا ڈیوائیڈیڈ، (نئی دہلی ۱۹۵۵ء)۔
(۴) اوم پرکاش پرشاد، (مترجم فیضان رشید)، اورنگ زیب، ایک نیا زاویہ نگاہ (پٹنہ ۱۹۹۴ء)۔
(۵) انڈیا ٹوڈے، (نئی دہلی ۱۵ ردسمبر ۱۹۸۵ء)۔
(۶) بی این پانڈے، (مترجم نوشاد عالم)، تاریخ کے ساتھ یہ بے انصافی کیوں؟ (برہان دہلی نومبر ۱۹۹۶ء)۔
(۷) ابوالمسیم وحید علی خاں، رواداری ہندوستانی سماج میں، (نئی دہلی ۱۹۹۷ء)، ص: ۸۷۔

کے لئے مشہور؛ وہاں ۵۰۰ سالہ قدیم داؤ جی مندر کے بھوگ راگ اور نقار خانہ کے انتظام کے لئے ۱۶۷۲ء میں اورنگ زیب نے پانچ گاؤں کی جاگیر عنایت کی تھی، بعد میں شاہ عالم نے نہ صرف اسے برقرار رکھا؛ بلکہ اس میں ڈھائی گاؤں کا مزید اضافہ کر کے اسے ساڑھے سات گاؤں کر دیا، اس کی تختی آج بھی اس کے نقار خانہ میں موجود ہے، مندر کے پجاری انیل کمار پاٹھک اور دوسرے پجاری بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ۱۱۵۸۰ ایکڑ کی زمینداری اورنگ زیب نے داؤ جی مہراج کو دی تھی، (۱) اسی طرح گنگا جمنا سنگم پر واقع سومیشور مہادیو مندر کے ستون پر تحریر کردہ الفاظ آج بھی موجود ہیں جس کے مطابق اورنگ زیب نے اسے بھاری بھر کم رقم اور اراضی دی تھی، اسی طرح بنارس کے ایک ویشنو مندر میں مورتی کے لئے ایک کیلو وزن کا اورنگ زیب کا عطا کردہ زیور موجود ہے جس کا فرمان اس مندر کے مہنت کے پاس آج بھی موجود ہے۔ (۲)

لال قلعہ (دہلی) کے چاندنی چوک کے مشرقی کنارے پر واقع جین مندر کے پجاری کو اورنگ زیب کی جانب سے باضابطہ وظیفہ دیا جاتا تھا، یہ سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر تک جاری رہا، اس مندر کی پیشانی پر لگا فارسی کتبہ ۱۹۴۷ء کے بہت بعد تک وہاں موجود تھا، (۳) اورنگ زیب نے ترہت (بہار) کا سفر ۱۰۷۱ھ کے آس پاس کیا تھا؛ کیوں کہ چمپارن ضلع کے لورہیا نامی مقام پر اشوک کی لاٹ پر دکھن جانب تقریباً ڈیڑھ فیٹ اوپر کلمہ طیبہ تحریر ہے اور اس کے نیچے نہایت عمدہ خط میں محی الدین اورنگ زیب عالمگیر غازی ۱۰۷۱ھ تحریر ہے، اس سفر میں اورنگ زیب نے چنپٹیا مٹھ، ارے راج مٹھ اور اندرواماٹھ کو جاگیریں عطا کیں تھیں، آج بھی ان مٹھوں کے نام کئی کئی ہزار بیگھے زمینیں ہیں، اس سلسلہ میں اورنگ زیب کے اصلی فرامین اور بعض فرامین کی نقلیں ان مہنتوں کے پاس موجود ہیں، کچھ

---

(۱) ندیم رضوی (صدر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، عوامی نیوز رانچی ۳۱؍جولائی ۲۰۱۸ء)۔

(۲) ڈاکٹر رام پنیانی، جے ان یو، ٹیوب، انٹرنیٹ۔

(۳) ضیاء الرحمٰن قاسمی، ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین: ۴۔

فرامین کی نقلیں چمپارن کے مشہور وکیل عزیز ہاشمی کے پاس بھی موجود ہیں جو کہ مٹھ کے مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے، (۱) اسی طرح مونگیر (بہار) میں خانقاہ رحمانی سے کچھ فاصلہ پر موجو سیتا کنڈ کے پنڈت کے پاس اورنگ زیب کے ذریعہ عطا کیا گیا شاہی فرمان موجود ہے جس کے مطابق ۷۰ بیگھ زمین اورنگ زیب نے اس سیتا کنڈ کو وقف کیا تھا۔ (۲)

پروفیسر شریف حسین قاسمی صدر شعبہ فارسی دہلی یونیوسٹی تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۹۹ء میں ایک انگریز خاتون اسکولران کے پاس آئی اور بتایا کہ وہ مسلم حکمرانوں کے ذریعہ ہندو منادر اور مٹھوں کو دی گئی جاگیر سے متعلق فرامین پر تحقیقی کام کر رہی ہے، اس سلسلہ میں اس نے ہریانہ کے قدیم مندروں اور مٹھوں کا سروے کیا اور ان کے پجاری، پروہت اور مہنوں سے شاہی فرمان دکھانے کی درخواست کی، ان پجاریوں نے ایک سفید فام، بیرون ملک کی نوجوان خاتون کو کچھ پیسہ کے لالچ میں اپنے پرانے کاغذات دکھائے تو اس نے اپنے کیمرہ میں اسے قید کر لیا، اب وہ ان فارسی فرامین کا ترجمہ چاہتی تھیں، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ان فارسی فرامین کا ترجمہ کر کے اس انگریز خاتون اسکولر کے حوالہ کر دیا، ان فرامین کی تعداد ۳۰۰ تھی (۳) یعنی صرف ہریانہ میں اس خاتون کی رسائی جن مندروں اور مٹھوں تک ہو سکی تھی اور جن سے اس نے ایسے ۳۰۰ فرامین حاصل کئے جو کہ مسلم حکمرانوں کے ذریعہ مختلف ہندو مندروں اور مٹھوں کو دے گئے تھے، اگر پورے ہندوستان کے قدیم مندروں اور مٹھوں سے یہ فرمان حاصل کئے جا سکیں تو نہ معلوم ان کی تعداد کتنی ہوگی۔

۱۵ر جمادی الثانیہ ۱۰۶۴ھ (مطابق مارچ ۱۶۶۰ء) کو اورنگ زیب کے ذریعہ جاری کیا گیا ایک فرماں ناظم بنارس ابوالحسن کے نام موجود ہے جس میں یہ تحریر ہے :

اسلامی شریعت کی رو سے قدیم مندروں کو ہرگز منہدم اور برباد نہ کیا

(۱) عطاء الرحمٰن قاسمی، ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین: ۵۔

(۲) عطاء الرحمٰن قاسمی، ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین: ۵۔

(۳) گیان چندر، اورنگ زیب اینڈ ہندو ٹیمپل، جرنل آف پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، جلد: ۵ شمارہ: ۴۔

جائے، ہماری اطلاع میں یہ بات آئی ہے کہ بعض لوگ ازراہ جبر وتعدی قصبہ بنارس اور اس کے نواحی مقامات کے رہنے والے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم مندروں کے پروہت ہیں، تشدد اور زیادتی کرتے ہیں؛ تاکہ انھیں ان کے قدیم حقوق سے محروم کردیں، اس لئے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے؛ تاکہ کوئی ان کے ساتھ زیادتی نہ کرے اور نہ ہی انھیں کسی تشویش میں مبتلا ہونے دیا جائے۔(۱)

اور (ضمیمہ) ۱۷ر ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ کے ایک فرمان میں کہا گیا ہے :

رام نگر (بنارس) کے مہاراج رام سنگھ نے ہمارے دربار عالیہ میں یہ عرضی پیش کی ہے کہ ان کے باپ نے گنگا ندی کے کنارے اپنے مذہبی گرو بھگوت گوسائیں کی رہائش کے لئے ایک مکان بنوایا تھا، اب کچھ لوگ گوسائیں کو پریشان کر رہے ہیں، اس لئے یہ شاہی فرمان جاری کیا جاتا ہے کہ اس حکم کے پہنچتے ہی تمام موجود اور آئندہ آنے والے سرکاری افسران اس کا بخوبی اور یقینی بندوبست کرلیں کہ کوئی شخص گوسائیوں کو پریشان اور ڈرا دھمکا نہ سکے، اور نہ ہی ان کے عمل دخل میں کسی بھی طرح کی کوئی دخل اندازی کرے؛ تاکہ وہ پوری دل جمعی کے ساتھ ہماری سلطنت خداداد کی دوام وبقا کے لئے دُعاء کرتے رہیں، اس فرمان پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔(۲)

اس طرح جنگم باڑی مٹھ کے مہنت کے پاس موجود کچھ فرمانوں سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب یہ قطعی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے کسی بھی رعایا کا کوئی حق ضبط

(۱) بشیر الدین احمد، فرامین سلاطین، (برہان، دہلی نومبر ۱۹۹۶ء)۔

(۲) بی این پانڈے، (مترجم نوشاد عالم)، تاریخ کے ساتھ یہ بے انصافی کیوں؟ (برہان، دہلی نومبر ۱۹۹۶ء)۔

کرے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ان موجود فرامین میں سے ایک کا تعلق جنگم (شیو) فرقہ کی طرف سے ایک مسلمان باشندہ نظیر بیگ کے خلاف اورنگ زیب کے پاس شکایت کی گئی، تو اس کی جانب سے ۱۱ رمضان ۱۰۷۷ھ بمطابق ۱۶۷۷ء کے فرمان میں کہا گیا ہے کہ بنارس صوبہ الٰہ آباد کے افسروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پرگنہ بنارس کے باشندگان ارجن مل اور جنگمیوں نے یہ شکایت کی ہے کہ بنارس کا ایک باشندہ نظیر بیگ نے قصبہ بنارس میں ان کی پانچ حویلیوں پر قبضہ کرلیا ہے؛ انھیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اگر یہ شکایت درست پائی جائے اور مذکورہ جائداد پر حق ملکیت ان کا ثابت ہوجائے تو نظیر بیگ کو ان حویلیوں میں داخل نہیں ہونے دیا جائے؛ تاکہ جنگمیوں کو مستقبل میں اپنی شکایت دور کروانے کے لئے ہمارے پاس دوبارہ نہ آنا پڑے۔

اسی مٹھ کے پاس موجود ایک دوسرا فرمان جس پر یکم ربیع الاول ۱۰۷۸ھ کی تاریخ مرقوم ہے، کہا گیا ہے کہ پرگنہ حویلی بنارس کے تمام موجود اور آئندہ کے جاگیرداروں اور کڑوریوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ کے حکم سے ۱۷۸ بیگھ زمین جنگمیوں کو دی گئی ہے، یہ شہنشاہ کی جان کے صدقے کے طور پر زمین انھیں دی جاتی ہے، خریف کی فصل کی شروعات سے زمین پر ان کو قبضہ دیا جائے، ایک دوسرے فرمان مؤرخہ: ۵ رمضان ۱۰۷۸ء میں کہا گیا ہے کہ یہ زمین مال گذاری سے آزاد ہوگی۔

ناگر سیٹھ نے کسی جنگ میں اورنگ زیب کی مدد کی تھی، اس سے خوش ہوکر گرتار اور آبو کی کچھ زمینیں اسے عطا کی گئیں، فرمان کے الفاظ اس طرح ہیں:

> شروک فرقہ کے شانتی داس ولد ساہس بھائی نے مابدولت سے انعام خاصہ کی التجا کی ہے، شخص مذکورہ نے ہماری فوج کو کوچ کے دوران اجناس کی فراہمی سے مدد کی تھی اور اس خدمت کے عوض وہ مخصوص انعامات سے نوازے جانے کا طلب گار ہے؛ لہٰذا پالتیانہ کا دیہی علاقہ جو احمد آباد کے دائرہ اختیار میں آتا ہے اور پلتیانہ کی پہاڑی جو شترنجیہ کے نام سے معروف ہے، معہ اس مندر کے

مابدولت شراوک فرقے کے مذکورہ ستی داس جوہری کو عطا کرتے ہیں، شترونجہ پہاڑی سے جو لکڑی اور ایندھن حاصل ہوں گے، وہ بھی شراوک فرقے کی ملکیت شمار ہوں گے؛ تاکہ وہ اسے اپنی کسی بھی ضرورت کے لئے استعمال کرسکیں، جو بھی شترونجہ پہاڑی اور اس کے مندر کی حفاظت کرے گا، وہ پالتیانہ کی آمدنی کا حقدار ہوگا، (جس کی مالیت سالانہ دو لاکھ دم ہے) وہ اپنے طور سے عبادت کریں؛ تاکہ ہماری حکومت قائم و دائم رہے، تمام عمال حکومت عہدہ دار جاگیردار اور کروڑیوں کا فرض ہے کہ وہ اس حکم نامے میں نہ کوئی تبدیلی کریں، اور نہ ہی اس سے سرمو انحراف کریں۔ اس کے علاوہ جونا گرھ میں جو پہاڑ گرنار یا گرنال کے نام سے مشہور ہے، اور آبو جی پہاڑی جو سرواہی کے دائرہ اختیار میں آتی ہے، ان دونوں پہاڑوں کو بھی ہم شراوک فرقے کے ستی داس جوہری کو بطور خاص مرحمت کرتے ہیں؛ وہ مکمل طور پر مطمئن ہوجائے؛ لہٰذا جملہ عہدیداروں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی کو ان املاک میں مداخلت نہ کرنے دیں اور حکومت کا کوئی بھی عہدیدار ستی داس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے؛ بلکہ اس کی ہر طرح سے امداد کی جائے، ان سے کوئی ٹیکس نہ وصول کیا جائے اور نہ ہی کسی بھی دشمن راجہ کو اس پر قبضہ کرنے دیا جائے، اس حکم کی تعمیل کرنے والے سے ہر سال نئی سند کا مطالبہ نہ کیا جائے۔(۱)

موجودہ بنارس ضلع کے بستی گاؤں کے ساکن جگ جیون کے لڑکے گردھر مہیش پور پرگنہ حویلی کے بدو ناتھ مصر اور پنڈت بیل بھدر مصر کو اورنگ زیب نے جاگیریں دیں، یہ سب

(۱) ۱۰ رجب المرجب ۱۰۷۰ھ، ۱۲/مارچ ۱۶۶۰ء۔

مندر کے پجاری تھے، (۱) اسی طرح ملتان کے مندر تیلامئی کے لئے چا کیا داس مصر کو سو روپیہ مندر کا خرچ چلانے کے لئے مقرر کئے، یہ مندر آج بھی موجود ہے۔ (۲)

آسام کے گوہاٹی شہر میں واقع امانند مندر کے پجاری سدامن برہمن کے نام اورنگ زیب کے تخت نشینی کے نویں سال ۲ رصفر ھ کے ایک فرمان کے مطابق آسام کے ہندو راجاؤں کی طرف سے اس مندر اور اس کے پجاری کو زمین کا ایک حصہ اور جنگلوں کی آمدنی جاگیر کی شکل میں دی گئی تھی؛ تاکہ بھوگ کا خرچہ پورا کیا جاسکے اور پجاری بھی اپنا گذر بسر کر سکیں، جب یہ صوبہ اورنگ زیب کی عملداری میں آیا تو اس نے بھی بلا تاخیر اس جاگیر کو حسب سابق رکھنے کا حکم نامہ جاری کیا، ۵ رشوال ۱۰۶۱ھ بمطابق ۱۶۵۲ء کا ایک فرمان اجین کے مہاکالیشور مندر کے پجاری دیونرائن برہمن کے نام ہے، جس کے مطابق شیو مندر کے نندہ دیپ کے لئے چبوترا کوتول کے تحصیلدار چار سیر (اکبری) گھی روزانہ کے حساب سے مہیا کرائیں گے، یہ فرمان مالوہ کے قلعہ بانڈو کے رہنمائی کرنے والے ویشوناتھ شرما نے ہندی ہفتہ روزہ پرچہ دھرم یگ کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کو دسمبر ۱۹۸۱ء میں دکھایا تھا، اس فرمان کا عکس ۲۰ ردسمبر ۱۹۸۱ء کے دھرم یگ کے شمارہ میں بھی شائع ہوا تھا۔

اس طرح گیان چندر نے اورنگ زیب کے ذریعہ مختلف مندروں اور برہمنوں کو دئے گئے ۲۴ رفرمانوں کی کاپی کے اچھے حالات میں موجودگی کا اعتراف کیا ہے، جنھیں اس نے از خود دیکھا اور پرکھا، (۳) اس نے اپنے ایک مضمون عالمگیر گرانٹس ٹو ہندو پجاری میں تیرہ پروانہ اور سند کے فارسی مضمون کو نقل کیا ہے جو کہ مالوہ کے صوبہ دار کے ذریعہ عالمگیر کی تخت کے نشینی کے ساتویں سے ۴۸ ویں سال کے دوران جاری کئے گئے تھے، یہ تمام دستاویزات مختلف مشہور مندروں کے ہندو پجاریوں کے نام ہیں جنھیں حکومت کے ذریعہ انعامات وعطیات عطا کئے گئے تھے، یہ تمام پروانے اور سند آج بھی ان پجاریوں کے خاندان میں موجود اور محفوظ ہیں۔ (۴)

---

(۱) راجندر پرساد، انڈیا ڈیوائیڈیڈ، (دہلی ۱۹۸۶ء)، ص: ۳۷۔ (۲) حوالہ سابق، ص: ۳۸۔

(۳) ایم کے اے صدیقی، ہندو اور مسلمس ان انڈیا اے کومن ڈسٹنی، (آبادی پبلی کیشن، کلکتہ ۲۰۱۲ء)، ص: ۱۳۱
حوالہ: پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی ۱۹۵۸ء جلد: ۶ حصہ: ۱۔

(۴) راجندر پرشاد، انڈیا ڈیوائیڈیڈ، نئی دہلی ۱۹۵۰ء، ص: ۴۳ تا ۴۰۔

ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا خیال ہے کہ اب بھی مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ جاری کئے گئے بہت سے فرمان 'سند' قول نامے وغیرہ ہندوستانی مندروں میں بکھرے پڑے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو مسلمان حکمرانوں کا ہندو مندروں اور رعایا کے مثبت رویہ کو ظاہر کریگا؛ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے؛ تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ یہ مسلم حکمراں مندروں کو تباہ و برباد کرنے والے تھے۔(۱)

اورنگ زیب کے ذریعہ ۱۰ر رجب المرجب ۱۰۶۹ھ بمطابق ۱۲ر مارچ ۱۶۵۸ء کو جاری کیا گیا شانتی داس ولد ساہس بھائی کے سلسلہ میں جو سند عطا کی گئی، اس کے الفاظ اس طرح ہیں :

> جوہری ستی داس نے اس مقدس اعلیٰ وارفع دربار کے ذمہ دار اشخاص کی معرفت ہمارے حضور ایک عرضداشت پیش کی ہے؛ لہٰذا عالی جاہ کا ایک فرمان ۱۹ رر مضان المبارک ۱۰۳۱ھ کو جاری کیا جاتا ہے، جو حضرت سلیمان کے فرمان جیسا اعلیٰ وارفع ہے حضرت (ظل الٰہی) حضرت سلیمان کے عہدے کے جانشین تھے، عرض گزار کو دائمی انعام کی صورت میں عطا کیا جاتا ہے، عرض گزار متوقع ہے کہ ہمارے دربار سے اس ضمن میں ایک فرمان شاہی جاری کیا جائے؛ لہٰذا حسب سابق مابعد عرض گذار کو مذکورہ بالا ضلع دائمی انعام کی صورت میں عطا کرتے ہیں، اس لئے مذکورہ بالا سرکار کے صوبے کے تمام موجودہ اور مستقبل کے منتظمین پر لازم ہے کہ وہ اس قابل تعظیم حکم نامے کی تعمیل کرتے ہوئے اس امر کی پوری پوری کوشش کریں کہ مذکورہ بالا ضلع شخص مذکورہ اور اس کی اولاد اور ورثہ کے قبضہ میں نسل در نسل رہے، اس کے علاوہ شخص مذکورہ کو تمام

(۱) پنکج پچوری، مندر کا مغلیہ رشتہ، انڈیا ٹوڈے، (ہندی)، شمارہ:۲۱ یکم سے ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء، ص:۷۰۱۔

محاصل اور دیگر بقایا جات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، نیز اس سے
ہر سال نئی سند کا مطالبہ نہ کیا جائے، عمال کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس
فرمان شاہی سے سرمو انحراف نہ کریں۔ (۹-۱۰۶۸ھ، ۱۶۵۸ء)

اورنگ زیب بذاتِ خود انتہائی سادہ زندگی بسر کرتا اور بیت المال کے پیسہ کو اپنی ذاتی ضرورتوں کے لئے استعمال نہیں کرتا تھا، وہ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف کی کتابت سے حاصل کرتا، اس نے نوے سال کی عمر میں ۲۱ر فروری ۱۷۰۷ء کو بروز جمعہ احمد نگر میں وفات پائی تو اورنگ آباد (دکن) سے بارہ کوس دور روضہ خلد آباد میں دفن ہوا، مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو اس نے ٹوپی بنانے کی مزدوری کے طور پر حاصل کئے ہیں، وہ اس کے کفن پر خرچ کئے جائیں، جب کہ تین سو پچاس روپے جو قرآن شریف کی کتابت کی اجرت کے طور پر جمع ہیں، وہ مساکین میں تقسیم کردئے جائیں، وصیت کے مطابق اس کی تدفین نہایت سادہ انداز میں ہوئی اور اس کی تربت پر کوئی مقبرہ بھی نہیں بنایا گیا۔(۱)

اسٹیفورڈ یونیورسٹی کے آڑ ڈی ٹرسکی اپنی تصنیف Culture of Encounter Sanskirit at the Mughal Court میں تحریر کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے عروج کا زمانہ سولہویں تا اٹھارویں صدی عیسوی کا تھا، جو مذہبی و ثقافتی تنازع کا نہیں؛ بلکہ زبردست بین ثقافتی احترام اور میل ملاپ کا تھا، مغل حکمرانوں نے کبھی بھی ہندوستانی ثقافت اور ہندوازم پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی تھی، اس موضوع پر اکھلیش جائسوال کا رسالہ ''اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات'' (ناشر: خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ) اور ڈاکٹر بی، این پانڈے کی: ''ہندو مندر اور اورنگ زیب عالمگیر کے فرامین'' کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔



(۱) گیان چند، عالمگیر گرانٹس ٹو ہندو پجاری، جرنل آف پاکستان، ہسٹوریکل سوسائٹی۔

ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین ☆

۱۹۴۸ء-۱۹۵۳ء کے دوران جب میں اِلہ آباد میونسپلٹی کا چیئرمین تھا تو ترمیم (یعنی داخل خارج) کا ایک کیس میرے زیر غور آیا، یہ تنازعہ ایک جائیداد کے بارے میں تھا جو سومیشور ناتھ مہادیو مندر کو وقف کی گئی تھی، مندر کے مہنت کے مرنے کے بعد اس جائیداد کے دو فریق دعویدار ہوئے، مدعیان میں سے ایک نے کچھ ایسے دستاویزات پیش کئے جو اس کے خاندان کے قبضے میں تھے، اور جو اُن فرامین پر مشتمل تھے جنھیں اورنگ زیب نے جاری کیا تھا، میں شش و پنج میں پڑ گیا، قیاس یہ تھا کہ یہ فرامین گڑھے ہوئے ہیں، مجھے تعجب اس بات پر بھی تھا کہ اورنگ زیب جو مندروں کے انہدام کے بارے میں خاص شہرت رکھتا تھا، وہ مندروں کو جاگیر عطا کرنے کے سلسلے میں اس طرح کے احکام کیسے جاری کر سکتا تھا؟

''جاگیر، پوجا اور دیوتاؤں کے بھوگ کے لئے عطا کی جارہی ہے'' مجھے یہ سوال پریشان کئے ہوئے تھا کہ اورنگ زیب اپنی شناخت بت پرستی کے ساتھ کس طرح کروا سکتا تھا، مجھے یقین تھا کہ یہ دستاویزات اصلی نہیں ہیں؛ لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے میں نے بہتر سمجھا کہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب سے مشورہ لوں، جو فارسی اور عربی کے بڑے عالم تھے، میں نے کاغذات ان کے سامنے رکھ کر مشورے کی درخواست کی، دستاویزات کے مطالعے کے بعد

☆ یہ مقالہ جناب ڈاکٹر بی این پانڈے کا ہے اور اپنے موضوع پر ایک دستاویز کا درجہ رکھتا ہے، ممتاز عالم دین مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی — جن کو اللہ تعالیٰ نے گہرا علمی ذوق عطا فرمایا ہے — نے اس کو اردو میں شائع کیا ہے، مولانا نے رسالہ کے آخر میں درویش صفت سلطان کا وصیت نامہ بھی شامل کر دیا تھا، جو اُن کے زہد اور درویشی کو ظاہر کرتا ہے، مگر چوں کہ یہ وصیت اصل مضمون سے متعلق نہیں ہے؛ اس لئے راقم نے اس کو حذف کر دیا ہے، اس سلسلہ میں ''مولانا آزاد اکیڈمی دہلی'' اور اس کے بانی و ذمہ دار مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی زید مجدہ، ہم سبھوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ (رحمانی)

ڈاکٹر سپرو صاحب نے کہا کہ اورنگ زیب کے یہ فرامین بالکل اصلی ہیں، پھر انھوں نے اپنے منشی سے وارانسی کے جنگمیری شیوا مندر کے کیس کی فائل منگوائی ، جس کی کئی اپیلیں الہ آباد ہائیکورٹ میں گذشتہ ۱۵ رسال سے زیر ساعت تھیں، جنگمیری شیوا مندر کے پاس مندر کو جاگیر عطا کرنے کے سلسلے میں اورنگ زیب کے کئی دوسرے فرامین بھی تھے۔

اورنگ زیب کی یہ نئی شبیہ جب میرے سامنے آئی تو میں بہت متعجب ہوا، ڈاکٹر سپرو صاحب کی ایما پر میں نے کئی اہم منادر کے مہنتوں کو خطوط لکھے کہ اگر ان کے پاس ان کے مندروں کو جاگیر عطا کرنے کے سلسلے میں اورنگ زیب کے کوئی فرامین ہوں تو مجھے ان کی فوٹو کاپی ارسال کی جائے ، مجھ پر اس وقت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب مجھے بڑے مندروں جیسے مہا کالیشور مندر (اُجین)، بالاجی مندر (چتر کوٹ)، امانند مندر (گوہاٹی)، جین مندر (شتر نجیا) اور دوسرے کئی منادر اور گرردوارے سے جو شمالی ہند میں بکھرے ہوئے ہیں، کی طرف سے اورنگ زیب کے فرامین کی نقول موصول ہوئیں ، یہ فرامین ۱۰۵۶-۱۰۹۱ھ (۱۶۵۹ء-۱۶۹۵ء) کے درمیان جاری کئے گئے تھے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہندو اور ان کے مندروں کے تئیں جہاں اورنگ زیب کی سخاوت ظاہر ہوتی ہے، وہیں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ مؤرخین نے اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا، وہ محض تعصب کی بناء پر تھا اور وہ تصویر کا صرف ایک رخ تھا، ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے جہاں ہزار ہا مندر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں ، مجھے یقین ہے کہ اگر مناسب تحقیقات کی جائیں تو اور بھی ایسی مثالیں سامنے آئیں گی، جو اس بات کا ثبوت ہوں گی کہ غیر مسلموں کے تئیں اورنگ زیب کا طرز عمل مخیرانہ تھا۔

اورنگ زیب کے فرامین کی تحقیقات کے دوران میرا سابقہ جناب گیان چندر اور ڈاکٹر پی ایل گپتا سے بھی پڑا، جو پٹنہ میوزیم کے سابق منتظم تھے، اور جو اورنگ زیب پر قابل قدر تاریخی اہمیت کی حامل تحقیق کر رہے تھے، مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حق کے متلاشی کچھ ایسے محقق بھی ہیں جو اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اورنگ زیب کی اس ''بدنام'' اور متہم شبیہ کی

صفائی کی جائے، جسے متعصب مورخین نے ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کی علامت قرار دیا ہے اور جس کی عکاسی ایک شاعر نے نہایت ہی دُکھ بھرا انداز میں کی ہے :

تمھیں لے دے کے ساری داستان میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

اورنگ زیب پر ہندو مخالف حکمراں ہونے کی الزام تراشی کرتے ہوئے اس کے اس فرمان کو بہت اُچھالا گیا ہے جو ''بنارس فرمان'' کے نام سے مشہور ہے، یہ فرمان بنارس کے ایک برہمن کنبہ سے متعلق تھا جو محلّہ گوری میں رہائش پذیر تھا، ۱۹۰۵ء میں گوپی اپا دھیائے کے نواسے منگل پانڈے نے اس فرمان کو سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا تھا، یہ فرمان پہلی بار ۱۹۱۱ء میں ''جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' میں شائع ہوا، جس سے اسکالرس (علماء وفضلا) کی توجہ اس جانب منعطف ہوئی اور تبھی سے مورخین بکثرت اپنی تحریروں میں اس کا حوالہ دیتے چلے آرہے ہیں...... اس بات کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہ فرمان کی اصل غرض وغایت اور اہمیت کیا تھی، انھوں نے اورنگ زیب پر یہ الزام تراشی بھی کی ہے کہ انھوں نے ہندو مندروں کی تعمیرات پر پابندی عاید کردی تھی۔

یہ فرمان اورنگ زیب نے ۱۵ر جمادی الاولیٰ ۱۰۲۵ھ (۱۰ر مارچ ۱۶۵۹ء) کو بنارس کے مقامی عہدیدار کے نام جاری کیا تھا، جو ایک شکایت نامے کے سلسلے میں تھا جسے ایک برہمن نے داخل کیا تھا، جو کسی مقامی مندر کا نگراں تھا اور جسے کچھ لوگ ستا رہے تھے، فرمان اس طرح ہے :

ابوالحسن (جو شاہی فیض کے لائق اور قابل اعتماد ہے) کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری فطری رحم دلی اور طبعی کرم کا تقاضا ہے کہ ہماری مکمل انتھک قوت اور نیک ارادے عوام وخواص امیر وغریب کی فلاح وبہبود پر صرف ہوں، ہمارے موقر قانون کے تحت ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ قدیم مندروں کو منہدم نہ کیا جائے؛ لیکن نئے مندروں کی تعمیر

کی اجازت بھی نہ دی جائے، (۱) ہمارے عدل کے دوران ہمارے قابل اکرام و احترام دربار میں یہ اطلاع پہنچی ہے کہ لوگ بنارس اور اطراف کے ہندو باشندگان اور قدیم مندروں کے برہمن نگرانوں کے معاملات میں دخیل ہوکر انھیں ستا رہے ہیں، نیز وہ لوگ ان برہمنوں کو ان کے عہدوں سے بے دخل بھی کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح کی دھمکیاں اس قوم (ہندو قوم) کے لئے باعث اذیت ہیں؛ لہٰذا ہمارا حکم شاہی یہ ہے کہ اس واضح حکم کے موصول ہوتے ہی فوری طور سے احکام صادر کیا جائے کہ مستقبل میں ان علاقوں کے رہنے والے برہمنوں اور ہندو باشندگان کے معاملات میں غیر قانونی طور سے مداخلت نہ کی جائے اور نہ ان میں اضطراب پیدا کیا جائے؛ تاکہ وہ حسب سابق اپنے عہدوں پر بحال رہ کر بشاشت قلب سے اپنی عبادات کرسکیں اور ہماری مملکت خداداد ہمیشہ ہمیش کے لئے برقرار رہے، اس حکمنامے کو "طلب" تصور کیا جائے۔

یہ فرمان واضح طور سے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے نئے مندروں کی تعمیر کے خلاف کوئی نیا حکمنامہ نہیں جاری کیا تھا؛ بلکہ اس نے صرف مروجہ دستور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موجودہ مندروں کی موجودگی کی توثیق کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مندروں کے انہدام کے خلاف غیر مبہم اور واضح احکامات صادر کئے تھے، فرمان اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس کی ہندو رعایا سکھ چین سے زندگی بسر کرے۔

(۱) یہ قانون شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں جاری ہوا تھا، صورت حال یہ پیش آئی تھی کہ ایک مقام پر دو قدیم مندر تھے، اسی مقام پر بعض لوگوں نے تیسرا مندر بھی تعمیر کرنا شروع کردیا، جس سے وہاں کے ہندوؤں میں باہمی اختلاف ہوا، جب اس کا علم بادشاہ کو ہوا تو بادشاہ نے دفع نزاع کی خاطر حکومت کی اجازت کے بغیر نئے مندر کی تعمیر پر پابندی عائد کردی، وہی حکم اورنگ زیب کے عہد تک جاری رہا، فرمان بنارس میں اسی سابق حکم کا اعادہ ہے نہ کہ کوئی نیا حکم۔ (قاسمی)

اس طرح کا یہ واحد فرمان نہیں تھا، بنارس میں ایک اور فرمان بھی پایا جاتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اورنگ زیب کی دلی خواہش تھی کہ ہندو سکون قلب سے زندگی بسر کریں، فرمان کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں :

مہاراجہ دھیرج راجا رام سنگھ نے ہمارے قابل اکرام اور رفیع الشان دربار میں ایک عرضداشت داخل کی ہے، بنارس میں گنگا کے کنارے محلّہ مادھورام میں اس کے والد نے ایک مکان بھگوت گوسائیں (جو اس کا مذہبی معلم تھا) کی رہائش کے لئے تعمیر کیا تھا؛ چوں کہ کچھ لوگ گوسائیں کو تنگ کرتے ہیں؛ لہٰذا ہمارا حکم شاہی یہ ہے کہ اس واضح حکم کے موصول ہوتے ہی موجودہ اور مستقبل کے تمام عہدیداران یہ حکم صادر کریں کہ مستقبل میں کوئی بھی شخص گوسائیں کے کسی معاملے میں نہ دخیل ہو اور نہ اسے کسی طرح پریشان کیا جائے؛ تاکہ وہ بطیبِ خاطر اپنی عبادات کی ادائیگی کر سکے اور ہماری مملکت خداداد ہمیشہ ہمیش کے لئے قائم رہے، اس حکم کو ''فوری تعمیل طلب معاملہ تصور کیا جائے''۔

کچھ دوسرے فرامین جو جنگمبری مٹھ کے مہنت کے قبضے میں ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس کی رعایا کے حقوق میں مداخلت کی جائے (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم)، وہ مجرموں سے سختی سے پیش آتا تھا، ان فرامین میں سے ایک اس شکایت نامے سے متعلق تھا جو اورنگ زیب کے دربار میں جنگم جماعت نے (جنگم فرقے کو ماننے والا سائی طبقہ) بنارس کے ایک مسلم باشندے بنام نذیر بیگ کے خلاف دائر کیا تھا، اس معاملے میں حسب ذیل فرمان جاری کیا گیا :

محمد آباد جو بنارس (صوبہ الہ آباد) کے نام سے جانا جاتا ہے، کے علمبرداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ حال میں ارجن مل اور جنگم جو پرگنہ

بنارس کے مکین ہیں، دربار شاہی میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ نذیر بیگ نے جو بنارس کا باشندہ ہے، ان کی ان پانچ حویلیوں پر بزور قبضہ کرنا چاہتا ہے، جو بنارس میں واقع ہیں؛ اس لئے حکم دیا جاتا ہے کہ اگر ان کا دعویٰ سچا ہوا اور (مذکورہ حویلیوں پر) ان کے مالکانہ حقوق ثابت ہو جائیں تو نذیر بیگ کو ان حویلیوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے؛ تاکہ جنگم جماعت مستقبل میں ہمارے دربار میں شکایت کنندگان کی حیثیت سے نہ پیش ہو۔

ایک دوسرا فرمان جو اسی مٹھ کے قبضہ میں ہے یکم ربیع الاول ۱۰۷۸ھ کو جاری کیا گیا تھا، یہ اس قطعہ زمین سے متعلق ہے جو جنگم جماعت کو عطا کیا گیا تھا اور اس فرمان کی رو سے انھیں دوبارہ لوٹایا گیا ہے، فرمان حسبِ ذیل ہے:

پرگنہ حویلی (صوبہ الہ آباد) کے تمام موجود اور مستقبل کے جاگیرداروں اور کروڑیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بحکم شاہی جنگم جماعت کو ۱۷۸ بیگھ قطعہ زمین ان کی کفالت کے لئے عطا کیا جاتا ہے، اس کے قبل پرانے حاکم اس امر کی تحقیق کر چکے ہیں، اس موقعہ پر بھی انھوں نے وہ ثبوت پیش کئے ہیں، جن پر مذکورہ پرگنہ کے ملک کی مہر ثبت ہے، اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حسبِ سابق یہ قطعہ زمین نہ صرف یہ کہ ان کے قبضے میں ہے؛ بلکہ اس پر ان کا حق بھی واضح طور سے ثابت ہوتا ہے؛ لہٰذا بحکم شاہی یہ قطعہ زمین انھیں راس شاہی کے صدقے (نثار) کے بطور عنایت کیا جاتا ہے، مذکورہ قطعہ زمین فصل خریف کے آغاز سے حسب سابق کی طرح انھیں لوٹا دیا جائے اور ان سے کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے؛ تاکہ یہ جنگم جماعت ہر فصل کی آمدنی کو اپنی کفالت کے لئے استعمال میں لائے اور برباد نہ ہو۔

اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کا عدل نہ صرف یہ کہ خلقی تھا؛ بلکہ ''نثار'' تقسیم کرنے میں وہ ہندو مساکین میں بھی امتیاز نہیں کرتا تھا، عین ممکنات میں سے ہے کہ مذکورہ ۱۷۸ ار بیگھ قطعہ زمین اورنگ زیب نے بہ نفس نفیس جنگم فرقے کو بطور عطیہ دی ہو؛ کیوں کہ اسی قطعہ زمین سے متعلق حسب ذیل فرمان بھی ہے جو ۵ رمضان المبارک ۱۰۷۱ھ میں جاری کیا تھا :

> پرگنہ حویلی بنارس (جو صوبہ الٰہ آباد کے تحت) کے موجودہ اور مستقبل کے تمام عہدیداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بحکم شاہی پرگنہ بنارس کا ۱۷۸ ار بیگھ قطعہ زمین جنگم جماعت کو ان کی گذر بسر کے لئے عطا کیا گیا ہے، حال ہی میں وہ لوگ دوبارہ دربار شاہی میں حاضر ہوئے تھے، ان کے حقوق ثابت ہو چکے ہیں اور یہ کہ وہی لوگ ہیں جن کے تصرف میں مذکورہ قطعہ زمین ہے؛ لہٰذا درج ذیل تفصیل کے تحت مذکورہ زمین کو ''مفتی زمین'' تصور کیا جائے؛ تاکہ یہ لوگ اسے استعمال کرسکیں اور شہنشاہ کی حکومت کی بقاء کے لئے دُعاء کریں۔

ایک دوسرے فرمان جاری شدہ ۱۰۸۵ء کی رو سے جو درج ذیل ہے، اورنگ زیب نے بنارس شہر کے ایک ہندو معلم کو بھی زمین عطا کی تھی :

> اس مبارک موقع پر ایک موقر فرمان جاری کیا گیا تھا، جو دو قطعات زمین سے متعلق تھا، جن کی پیائش ۵۸۸ رویرا ہے، یہ قطعات زمین بنارس میں گنگا کے کنارے بینی مادھو گھاٹ پر واقع ہیں، ان میں سے ایک قطعہ رام جیون گوسائیں کے مکان کے روبرو اور مرکزی مسجد کے پچھواڑے اور دوسرا کچھ اوپر واقع ہے، یہ قطعے جو خالی ہیں اور جن پر کوئی تعمیر نہیں کی گئی ہے، بیت المال کے تصرف میں ہیں؛ لہٰذا ہم نے اس قطعات کو رام جیون گوسائیں اور اس کے فرزند

کو بطور انعام عطا کئے ہیں ؛ تا کہ وہ ان قطعات زمین پر مقدس برہمنوں اور فقیروں کے لئے رہائشی مکان بنوائیں اور یادالٰہی میں مصروف رہتے ہوئے ہماری مملکت خداداد کے لئے دُعا کریں ، جو ہمیشہ ہمیش کے لئے قائم رہیں ؛ لہٰذا ہمارے عالی مرتبت شہزادگان ، وقیع وزراء ، شریف امراء ، عالی عہدیداران ، ڈوگرے اور موجودہ اور مستقبل کے کوتوالوں کو واجب ہے کہ وہ اس موقر حکم نامے کے مستقل اور مستمر نفاذ کے لئے ہر ممکن کوشش کریں ؛ تا کہ مذکورہ قطعات مذکورہ بالا لوگوں کے تصرف میں رہیں اور ان کی اولاد کو تمام بقایا جات اور محاصل سے مستثنیٰ رکھا جائے ، نیز ان سے ہر سال نئی سند کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

گوہاٹی کا مندر

اورنگ زیب اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کے احترام کے سلسلے میں بہت ہی محتاط تھا ، ہمارے پاس شہنشاہ کا ایک فرمان ہے ، جسے اس کے عہد حکومت کے نویں سال میں ۲ رصفر کو سدامن برہمن کے حق میں جاری کیا گیا تھا ، یہ شخص آسام میں گوہاٹی کے امانند مندر کا پجاری تھا ، آسام کے ہندو راجاؤں نے دیوتا کے بھوگ (چڑھاوے) اور پجاری کے گزر بسر کے لئے زمین کا ایک قطعہ اور جنگل کی کچھ آمدنی مختص کی تھی ، جب اورنگ زیب نے اس صوبہ پر قبضہ کیا تو فوری طور پر ایک فرمان جاری کیا ، جس کی رو سے مذکورہ مندر اور اس کے پجاری کے حق میں زمین کے عطیہ اور جنگل کی آمدنی کی توثیق کی گئی ، ’’گوہاٹی فرمان‘‘ کا متن حسب ذیل ہے :

اہم معاملات کے موجودہ اور مستقبل کے تمام عمال ، چودھری ، قانون گو ، مقادم اور کل سرکار میں واقع پانڈو پرگنہ میں پٹہ بنگیسار کے کسانوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سابق راجاؤں کے فرمان کے مطابق سکار اگاؤں کا ایک قطعہ زمین (جس کی پیمائش ۱۲ر۲ بسوا ہے)

اورجس کی مال گزاری کی جملہ رقم مبلغ ۳۰۰ ر روپے ہے، سدا من اوراس کے لڑکے (امانند مندر کے پجاری) کوعطا کی گئی تھی، حال ہی میں مندرجہ بالا دعویٰ کی صحت ثابت ہوگئی ہے کہ مذکورہ بالا نان ونفقہ کی رقم میں مبلغ ۲۰۰ ر روپے مذکورہ گاؤں کے محصول سے حاصل ہوتے ہیں اور بقایا رقم جو جنگل کی آمدنی سے حاصل ہوتی ہیں، باستثناء مال گذاری کی رقم کے جو انتخابی گاؤں سے حاصل ہوتی ہے مذکورہ بالا عطیہ داروں کو عطا کی گئی تھی؛ لہٰذا مذکورہ بالا تمام عمال پر لازم ہے کہ مذکورہ نقد رقم اور قطعہ زمین (دونوں محلوں سے علاحدہ کر کے) مذکورہ عطیہ داروں کے قبضے میں ہمیشہ ہمیش تا حیات بخش دی جائے؛ تاکہ وہ اس رقم اور قطعہ زمین کو اپنی گزر بسر اور اپنے دیوتاؤں کے بھوگ کے لئے استعمال کر سکیں اور اپنی عبادت میں منہمک ہوں؛ تاکہ ہماری حکومت ابدالآباد تک قائم رہے، وہ (یعنی عمال) اس جگہ کو کرایہ پر اُٹھانے کی اجازت نہ دیں اور نہ ہی مال گزاری یا کسی دوسرے محاصل یا نئی سند کے بارے میں (ان عطیہ داروں سے) کسی قسم کا تعرض کریں، اگر کوئی نئی سند پیش کرے تو اسے قابل اعتبار نہ گردانیں، تمام عمال اس حکم نامے کے پابند رہیں اور اس سے سرِ مو بھی انحراف نہ کریں (یہ فرمان شہنشاہ کی تخت نشینی کے نویں سال میں ۲ ر صفر کو لکھا گیا)۔

اُجین کا مہا کالیشور مندر

ہندو رعایا اور ان کے دھرم کے تعلق سے اورنگ زیب میں مثالی رواداری پائی جاتی ہے، اس کا ثبوت اُجین کے مہا کالیشور مندر کے پجاری پیش کرتے ہیں، یہ مندر شیوا کے اہم منادر میں سے ایک ہے؛ جہاں دن اور رات کے ہر لمحے ایک ''دیا'' جسے ''نندا دیپ'' کہتے ہیں،

روشن رہتا ہے اور اسے بجھنے نہیں دیا جاتا، عہد قدیم سے ہی اس دیئے کو روشن رکھنے کے لئے مقامی حکومت کی طرف سے روزانہ چار سیر گھی مہیا کیا جاتا رہا، مندر کے پجاریوں کا کہنا ہے کہ مغل دور حکومت میں بھی یہ روایت قائم رہی، یہاں تک کہ اورنگ زیب نے بھی اس قدیم روایت کی پاسداری کی، بدقسمتی سے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی شاہی فرمان نہیں ہے؛ لیکن ان کے پاس مراد بخش کے جاری کردہ فرمان کی ایک نقل ہے جسے اس نے ۵ر شوال ۱۰۶۱ھ کو اپنے والد کے عہد حکومت میں جاری کیا تھا، مہا کالیشور کے سابق پجاری دیو نارائن کی عرضداشت پر یہ فرمان شہنشاہ کی طرف جاری کیا گیا تھا۔

حکیم محمد مہدی وقیع نویس نے پرانے ریکارڈ کی چھان بین کے بعد عرضی گذار کے دعوے کی تصدیق کی، اس بناء پر چبوترہ کوتوالی کے تحصیل دار کو حکم دیا گیا کہ مندر کے مذکورہ دیئے کے لئے چار سیر (اکبری) گھی روزانہ مہیا کیا جائے۔

اس فرمان کی ایک نقل ۱۱۵۳ھ میں (یعنی اصل فرمان کے اجراء کے ۹۳ برس بعد) محمد سعد اللہ نے جاری کی۔

مندر کے موجودہ پجاری اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اصل فرمان کی نقل کا ایک طویل وقفے کے بعد اجراء کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اصل فرمان پر اس تمام مدت میں عمل ہوتا رہا اور اس مدت میں اورنگ زیب کا دور گذرنے کے باوجود اس فرمان کی کوئی وقعت نہ ہوتی تو ایک "مردہ" فرمان کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کوئی نہ کرتا۔

مندر کے سابق مہنت لکشمی نارائن نے اور بھی چند شاہی دستاویزات (جو مذکورہ مندر کے محافظ خانے یا سرکاری دفتر میں محفوظ رکھے گئے تھے) پر میری توجہ دلائی، لکشمی نارائن کے پاس اورنگ زیب کے عہد حکومت کے کچھ اور کاغذات بھی ہیں۔

شترنجیہ اور آبو کے مندر

عام طور سے مورخین اس بات کا ذکر تو کرتے ہیں کہ احمد آباد میں ناگر سیٹھ کا تعمیر کردہ چنتامن مندر مسمار کر دیا گیا تھا؛ لیکن اس حقیقت سے کنی کاٹ جاتے ہیں کہ یہ وہی اورنگ

زیب ہے جس نے اسی ناگر سیٹھ کو شترنجے اور آبو کے مندروں کی تعمیر کے لئے زمین عطا کی تھی، اس سلسلے میں جو سند عطا کی گئی، وہ اس طرح ہے :

...... جوہری ستی داس نے اس مقدس اعلیٰ دارفع دربار کے ذمہ دار اشخاص کی معرفت ہمارے حضور ایک عرضداشت پیش کی ہے؛ لہٰذا عالی جاہ ہند کا ایک فرمان ۱۹ رمضان المبارک ۱۰۱۳ھ کو جاری کیا جاتا ہے جو حضرت سلیمان کے فرمان جیسا اعلیٰ دارفع ہے، اور حضرت محمد ﷺ (ظل الٰہی) حضرت سلیمان کے عہدے کے جانشین تھے۔

اس فرمان کے تحت ضلع پلیتانہ جسے شترنجہ اختیار میں آتا ہے (یہ صوبہ احمد آباد کے زیر نگیں ہے اور اس کے محاصل کی آمدنی ۲ لاکھ درم ہے) عرض گزار کو دائمی انعام کی صورت میں عطا کیا جاتا ہے، عرض گزار متوقع ہے کہ ہمارے دربار سے اس ضمن میں ایک فرمان شاہی جاری کیا جائے؛ لہٰذا حسب سابق مابعد عرض گذار کو مذکورہ بالا ضلع دائمی انعام کی صورت میں عطا کرتے ہیں۔

اس لئے مذکورہ بالا سرکار کے صوبے کے تمام موجودہ اور مستقبل کے منتظمین پر لازم ہے کہ وہ اس قابلِ تعظیم حکم نامے کی تعمیل کرتے ہوئے اس امر کی پوری پوری کوشش کریں کہ مذکورہ بالا ضلع، شخص مذکور اور اس کی اولاد اور ورثہ کے قبضے میں نسل در نسل رہے، اس کے علاوہ شخص مذکور کو تمام محاصل اور دیگر بقایا جات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے نیز اس سے ہر سال نئی سند کا مطالبہ نہ کیا جائے، عمال کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس فرمان شاہی سے سرمو انحراف نہ کریں۔

یہ فرمان ۱۰۶۸ھ، ۱۶۵۸ء کو لکھا گیا، ناگر سیٹھ نے کسی جنگ میں اورنگ زیب کی

مدد کی تھی اور اس کی خدمات سے خوش ہو کر اورنگ زیب نے اسے گرنال اور آبو کی کچھ زمین وہاں کے مندروں کے لئے تحفتاً عنایت کردی تھی، فرمان حسب ذیل ہے :

> اللہ کے نام کے ساتھ جو بے حد رحیم اور مہربان ہے (طغرہ) ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔

مہر ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی طرف سے یہ فرمان جاری کیا جاتا ہے :

> شراوک فرقے کے شانتی داس ولد ساہس بھائی نے مابدولت سے انعام خاصہ کی التجا کی ہے، شخص مذکور نے ہماری فوج کی کوچ کے دوران اجناس کی فراہمی سے مدد کی تھی اور اس خدمت کے عوض وہ مخصوص انعامات سے نوازے جانے کا طلبگار ہے؛ لہٰذا پلیتانہ کا دہی علاقہ جو احمد آباد کے دائرہ اختیار میں آتا ہے، اور پلیتانہ کی پہاڑی جو شترنجہ کے نام سے معروف ہے، مع اس کے مندر کے مابدولت شراوک فرقے کے مذکورہ ستی داس جوہری کو عطا کرتے ہیں، شترنجہ پہاڑی سے جو لکڑی اور ایندھن حاصل ہوں گے، وہ بھی شراوک فرقے کی ملکیت شمار ہوں گے؛ تاکہ وہ اسے اپنی کسی بھی ضرورت کے لئے استعمال کرسکیں ، جو بھی شترنجہ پہاڑی اور اس کے مندر کی محافظت کرے گا، وہ پلیتانہ کی آمدنی کا حقدار ہوگا، وہ اپنے طور سے عبادت کریں کہ ہماری حکومت قائم ودائم رہے، تمام عمال حکومت عہدیدار جاگیردار اور کروڑیوں کا فرض ہے کہ وہ اس حکم نامے میں نہ کوئی تبدیلی کریں اور نہ ہی اس سے سرمو انحراف کریں۔

گرنار اور آبوجی

علاوہ ازیں جونا گڑھ میں ایک پہاڑ ہے جو گرنار (یا گرنال) کے نام سے مشہور ہے، اور آبوجی میں بھی ایک پہاڑی ہے جو سروہی کے دائرۂ اختیار میں آتی ہے، ان دونوں پہاڑوں کو بھی ہم شراوک فرقے کے ستی داس جوہری کو بطور خاص مرحمت فرماتے ہیں؛ وہ کلی طور پر مطمئن ہوجائے؛ لہٰذا جملہ عہدیداروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کو ان (املاک) میں مداخلت نہ کرنے دیں، اور کوئی بھی راجا اس (ستی داس) سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے؛ بلکہ اس کی ہر طرح سے امداد کی جائے، اس حکم کی تعمیل کرنے والے سے ہر سال نئی سند کا مطالبہ نہ کیا جائے، اور اگر کوئی شخص اس گاؤں اور تین پہاڑوں پر کوئی دعویٰ دائر کرتا ہے، جسے ہم نے (ستی داس کو) مرحمت فرمایا ہے تو اس کا یہ فعل نہ صرف یہ کہ قابل مذمت ہوگا: بلکہ وہ عوام اور اللہ کی لعنت کا بھی مستحق ہوگا، اس کے علاوہ بھی ایک، علاحدہ سند اسے عطا کی گئی ہے۔

(یہ فرمان: ۱۰؍رجب المرجب ۱۰۷۰ھ، مطابق: ۱۲؍مارچ ۱۶۶۰ء کو رقم کیا گیا)

وشوناتھ مندر بنارس کے انہدام کا اصل سبب

لیکن کچھ واقعات اس بات کے شاہد بھی ہیں اور شک وشبہ سے بالاتر بھی کہ اورنگ زیب نے بنارس کے وشوناتھ مندر اور گولکنڈہ کی جامع مسجد کے انہدام کا حکم بھی دیا تھا؛ لیکن جن حالات کے تحت مندر اور مسجد کا انہدام کیا گیا اور اس کی جو وجوہ بیان کی گئیں، ان کا فائدہ اورنگ زیب کو پہنچ سکتا ہے۔

وشوناتھ مندر کا قصہ یوں ہے کہ بنگال جاتے ہوئے اورنگ زیب جب بنارس کے قریب سے گزرا تو ہندو راجاؤں نے جو اس کے حشم وخدم میں سے تھے، اورنگ زیب سے وہاں ایک روز قیام کی درخواست کی؛ تاکہ ان کی رانیاں بنارس میں گنگا اشنان، اور وشوناتھ دیوتا کی پوجا کر سکیں، اورنگ زیب فوراً راضی ہوگیا اور ان کی حفاظت کے لئے بنارس تک کے ۵؍میل کے راستے پر فوج کی ٹکڑیوں کو تعینات کر دیا، رانیاں پالکیوں میں سوار تھیں، گنگا اشنان سے فارغ ہوکر وہ پوجا کے لئے وشوناتھ مندر روانہ ہوئیں۔

پوجا کے بعد سوائے، کچھ کی مہارانی کے تمام رانیاں واپس آ گئیں، مہارانی کی تلاش میں مندر کی پوری حدود چھان ڈالی گئی؛ لیکن اس کا پتہ نہ چل سکا، اورنگ زیب کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ سخت ناراض ہوا اور اس نے اپنے اعلیٰ عہدیداروں کو رانی کی تلاش میں بھیجا، بالآخر وہ گنیش کی مورتی کے پاس پہنچے جو دیوار میں نصب تھی اور جو اپنی جگہ سے ہلائی جاسکتی تھی، اس کو حرکت دینے پر انھیں سیڑھیاں نظر آئیں جو کسی تہہ خانے میں جاتی تھیں، وہاں انھوں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا رانی کی عزت لوٹی جاچکی تھی، اور وہ زار و قطار رو رہی تھی، یہ تہہ خانہ وشوناتھ دیوتا کی نشست کے عین نیچے واقع تھا، اس پر تمام راجاؤں نے غضبناک ہو کر سخت احتجاج کیا؛ چوں کہ جرم نہایت قبیح تھا؛ اس لئے راجاؤں نے مجرم کو عبرت انگیز سزا دینے کا مطالبہ کیا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ؛ چوں کہ وہ مقدس جگہ ناپاک ہو چکی ہے؛ اس لئے وشوناتھ کے بت کو وہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے، مزید یہ کہ مندر کو زمین بوس کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے، ڈاکٹر پی ایل گپتا کے دستاویزی ثبوت کی بنا پر ڈاکٹر پٹا بھی سیتارمیہ جو پٹنہ میوزیم کے سابق مہتمم ہیں، انھوں نے اس کا ذکر اپنی مشہور تصنیف (پر اور پتھر) میں کرتے ہوئے اس واقعے کی توثیق کی ہے۔

جامع مسجد گولکنڈہ کا انہدام

گولکنڈہ کے مشہور حاکم تانا شاہ نے یہ حرکت کی کہ شاہی محصول وصول تو کیا؛ لیکن شہنشاہ دہلی کو اس کی ادائیگی نہیں کی، چند ہی برسوں میں یہ رقم کروڑوں تک پہنچ گئی، تانا شاہ نے یہ خزانہ زمین کے اندر دفن کر کے اس پر جامع مسجد تعمیر کروادی، جب اورنگ زیب کو اس کی اطلاع ملی تو اس مسجد کے انہدام کا حکم جاری کر دیا اور مدفون خزانہ ضبط کر کے رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کیا، مندرجہ بالا دو باتیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ؛ جہاں تک عدالتی تحقیقات کا تعلق تھا اورنگ زیب نے کبھی بھی مندر اور مسجد میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔

بد قسمتی سے ہندوستان کی موجودہ اور قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے واقعات میں ایسی ایسی غلط بیانیاں کی گئی ہیں اور تاریخی کرداروں کو اس طرح مسخ کیا گیا ہے کہ ان غلط بیانیوں

اور کردار کشی کو ''خدائی''، تسلیم کیا جارہا ہے، اور اگر کوئی حقیقت وافسانہ، حق و باطل اور حق کی مسخ شدہ شکل کو علاحدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر انگشت نمائی کی جاتی ہے، متعصب افراد اور جماعتیں اپنا مفاد حاصل کرنے کے لئے تاریخ کو توڑ مروڑ کر غلط بیانی کے ساتھ پیش کر رہی ہیں۔

سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ فریقین کا بنیاد پرست طبقہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کررہا ہے؛ بلکہ ویداور قرآن شریف کے اُصول، عقائداور احکامات کی بھی غلط تشریح کررہا ہے۔

فرامین کے متون

بنام ناظم بنارس ابوالحسن

مہراورنگ زیب :

(۱) لائق العنایت والرحمت ابوالحسن بالتفات شاہانہ اُمیدوار بودہ بداندکہ چوں بمقتضائے مراہم ذاتی ومکارم جبلی ہمگی ہمت والا نہمت وتمامی نیت حق تویت مابرفاہیت جمہورانام وانتظام احوال طبقات خواص وعوام مصروف است واز روے شرح شریف وملت حنیف مقرر چنیں است کہ دیر بائے دیریں برانداختہ نشود و بت کدہ ہا تازہ بنا نیابد و دریں ایام معدلت انتظام بعرض شرف اقدس ارفع علی رسید کہ بعض مردم از راہ عنف وتعدی بہ ہنود سکنہ قصبہ بنارس و برخے امکنہ دیگر کہ بنواحی آں واقع است و جماعت برہمناں سدنہ آں محال کہ سدانت بت خانہ ہائے قدیم آنجا بآنہاں تعلق دارد مزاحم ومعترض میشوندی خواہند کہ اینان راز سدانت آں کہ از مدت مدید باہیں ہا متعلق است باز دارند وایں معنی باعث پریشانی وتفرقہ حال ایں

گروہ می گردد؛ لہٰذا حکم والا صادر می شود کہ بعد از ورود ایں منشور
لامع النور مقرر کنند کہ من بعد آمدے بوجوہ بے حساب تعرض وتشویش
باحوال برہماں ودیگر ہنود متوطنۂ آں محال نرساند تا آنہاں بدستور
ایام پیش بجا و مقام خود بودہ بجمعیت خاطر بدعائے بقائے دولت
خداداد ابد مدت ازل بنیاد قیام نمایند دریں باب تاکید دانند۔
(بتاریخ ۱۵ رشہر جمادی الثانیہ ۱۰۶۹ھ نوشتہ شدہ)

مہر اورنگ زیب :

ترجمہ: عنایت ورحمت کا سزاوار ابوالحسن شاہانہ مہربانیوں کا اُمیدوار رہے اور یہ سمجھ لے کہ ہمارے ذاتی کرم اور جبلی مکارم حسنہ کا یہ تقاضہ ہے کہ ہماری توجہ اور ہمت تمام رعایا کی بہبودی اور خواص وعوام کے تمام طبقات کی بھلائی میں مصروف ہے اور شریعت غرا اور ملت اسلام کا قانون بھی یہی ہے کہ قدیم مندروں کو ہرگز منہدم اور برباد نہ کیا جائے اور جدید مندر بلا اجازت تعمیر نہ ہوں، آج کل ہمارے گوش گذار یہ بات ہوئی ہے کہ بعض لوگ از راہ جبر وتعدی قصبہ بنارس اور اس کے نواحی مقامات کے رہنے والے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم مندروں کے پروہت ہیں، تشدد اور زیادتی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ برہمنوں کو ان کی پروہتی سے جو ان کا قدیم حق ہے، الگ کردیں، جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ یہ بے چارے پریشان ہوکر مصیبت میں مبتلا ہوجائیں، اس لئے تم (ابوالحسن) کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص اس علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں

کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے، اوران کو کسی تشویش میں مبتلا نہ ہونے دے؛ تا کہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہ اور مقام پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خدا داد کے حق میں مصروف دعا رہیں، اس معاملے میں تاکید کی جاتی ہے۔

(۱۵؍جمادی الثانی ۱۰۶۹ھ)

(۲) متصدیان مہمات حال و استقبال چبوترہ کوتوالی پرگنہ شاہ جہاں پور بدانند چوں دریں ولا حقیقت کوکا زناردار بہ ظہور پیوست کہ عیال کثیر بہ او وابستہ است وہیچ وجہ معیشت نہ دارد بران مبلغ سہ ٹکا مرادی در وجہ روزینہ مومی الیہ مقرر نمودہ شدہ باید کہ وجہ مذکورہ از ابتدا بستم شہر ذیقعدہ سن ۷ مقرر دانستہ روز بروز از محصول چبوترہ مذکور مشارالیہ می رسانیدہ باشد کہ صرف معیشت خود نمودہ بدعا دوام دولت ابد اتصال اشتغال داشتہ باشد۔

(تحریر فی تاریخ ۲۱؍ذی قعدہ ۷ جلوس)

چبوترہ کوتوالی پرگنہ شاہ جہاں پور کے حال و مستقبل کے متصدیوں کو معلوم ہو کہ کوکا زناردار (پنڈت) نے یہ درخواست دی ہے کہ اس کے کثیر بال بچے ہیں اور کوئی ذریعہ روزی نہیں ہے، اس لئے مبلغ تین ٹنکہ مرادی اس کے روزینہ کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور یہ حکم بیس ذی قعد ساتویں جلوس سے جاری سمجھا جائے، یہ روز آنہ اس کو چبوترے کی آمدنی سے ادا کر دیا جائے؛ تا کہ وہ اپنی روزی میں صرف کرے اور دوام دولت کے لئے دُعاء میں مشغول رہے، تحریر فی تاریخ ۲۱؍ذی قعدے ۷؍جلوس۔

(اس پر نجابت خاں مرید بادشاہ کی مہر ہے)

(۳) متصدیاں مہمات حال واستقبال چبوترہ کوتوالی دار الفتح اجین بدانند دریں ولا حقیقت کانجی پسر کوکا بہ ظہور پیوست کہ بموجب اسناد سابق موازی سہ بہلولی عالمگیری از ابتدائے بستم شہر رجب ۱۷ ارسن جلوس بنام کانجی پسر موی الیہ مقرر گشتہ باید کہ از محصول محال مذکور تنخواہ می داد باشد کہ آں صرف ما تحتاج خود نمودہ۔

(تحریر فی تاریخ بست یکم شہر رجب المرجب سن ۱۷ ارفقط)

چبوترہ کوتوالی دار الفتح اجین کے حال و مستقبل کے متصدیوں کو معلوم ہو کہ کوکا کے بیٹے کانجی نے درخواست دی ہے کہ پہلی سند کے بموجب کوکا کے لئے تین تنکہ کا روزینہ مقرر تھا، اب وہ حکم الٰہی سے وفات پا گیا ہے اس لئے اب تین بہلولی عالمگیری ۲۰ ر رجب ۱۷ ارویں سال جلوس سے اس کے لڑکے کانجی کے نام سے مقرر ہونا چاہئے اور محال مذکور کی آمدنی سے یہ تنخواہ اس کو دی جائے؛ تا کہ وہ اپنی ضرورت پر خرچ کرے اور دوام دولت ابد کے لئے دُعاء کرے۔

(۲۱ رجب المرجب سن جلوس ۱۷ ارفقط)

(۴) عاملان حال واستقبال پرگنہ سارنگ پور بدانند کہ چوں دریں ولا بموجب پرداشتہ امارت پناہ اسلام خاں مرحوم بہ ظہور پیوست کہ کانجی زنار دار ہیچ وجہ معیشت ندارد؛ لہٰذا مبلغ چہار آنہ یومیہ از محصول چبوترہ کوتوالی محل مستور باد مقرر است باید کہ یومیہ مذکور را روز بہ روز می رسانیدہ باشد کہ صرف اوقات خود نمودہ و در دُعا گوئی دوام اشتغال داشتہ باشد دریں باب تاکید داند۔

(تحریر فی تاریخ ۲۸ ر جمادی الثانی ۱۹ ر جلوس والا)

پرگنہ سارنگ کے حال و مستقبل کے عاملوں کو معلوم ہو کہ امارت پناہ

اسلام خاں مرحوم کے پروانے سے یہ ظاہر ہوا کہ کانجی زناردار کا کوئی ذریعہ روزی نہیں؛ اس لئے چبوترہ کوتوالی کے محصول سے چار آنہ یومیہ اس کے لئے مقرر کیا جاتا ہے، یومیہ مذکور اس کے پاس روز آنہ پہنچنا چاہئے؛ تاکہ وہ صرف اوقات کرے اور دولت ابد کے دوام کے لئے دعا میں مشغول رہے، تاکیدی حکم جانو، تاریخ ۲۸ر جمادی الثانی ۱۹ جلوس والا۔

(اس پر حبیب اللہ حسنی مرید شاہ عالمگیر کی مہر ہے)

(۵) متصدیان مہمات حال واستقبال چبوترہ کوتوالی من مضاف صوبہ اجین بدانند کہ چوں دریں ولا بوجہ پیوست کہ کوکا زناردار بموجب پراوانہ نجابت خاں مرحوم سہ ٹنکا مرادی کلاں از چبوترہ کوتوالی یومیہ مذکور مقرر داشت ودیعت حیات سپردہ؛ لہٰذا یومیہ مذکور بدستور سابق بہ کانجی پسر کوکا مذکور من ابتدا شہر ذی قعد ۱۰۷۸ر بحال ومسلم داشتہ شد باید کہ وجہ یومیہ از ابتدا صدری رسانیدہ باشد کہ آں را صرف کفاف نمودہ بدعا گوئی دوام دولت ابدمدت بندگان حضرت اشتغال می داشتہ باشد۔

(تحریر فی تاریخ پنجم ذی قعد ۱۰۷۸)

صوبہ اجین کے چبوترہ کوتوالی کے حال و مستقبل کے متصدیوں کو معلوم ہو کہ یہ معلوم ہوا ہے کہ نجابت خاں مرحوم کے پروانے کے بموجب کوکا زناردار کے لئے بدستور سابق کوکا کے بیٹے کانجی کو ذی قعد ۱۰۷۸ھ کی ابتدا سے بحال کیا جاتا ہے اور یہ اس کو ملنا چاہئے، تین ٹنکا وادی کلاں مقرر تھا، اب وہ نہیں ہے؛ اس لئے یومیہ مذکورہ جاری ہو؛ تاکہ وہ خرچ کرے اور دولت ابدمدت کے دوام کے لئے دُعا کرے۔

(اس پر مختار خاں بندۂ اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ کی مہر ہے)

(۶) چوں حقیقت استحقاق مرارزنار دار کو کابر دارکلاں موی الیہ معلوم شد کہ از مدت پنجاہ سال مبلغ پنجاہ دام کہ یک ٹنکا ہر سال از حاصل چبوترہ کوتوالی بخدمت بندگان اعلاحضرت یافتہ بنابریں ایں چند کلمہ بنام متصدیان چبوترہ کوتوالی قصبہ مذکور نوشتہ شد کہ موافق دستور قانون قدیم بہ تفصیل ذیل رساندہ کہ صرف مایحتاج خود نمودہ بدعاگوئی دوام دولت ابد پیوند ہندگان اعلیٰ حضرت می نمایند۔

(تحریر فی تاریخ غرہ شہر جمادی الثانی ۸ سن جلوس مبارک)

مرارزنار دارا اور اس کے بڑے بھائی کوکا کی درخواست سے حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ پچاس سال کی مدت سے پچاس دام یعنی ایک ٹنکا سالانہ چبوترہ کوتوالی کی آمدنی سے بندگان اعلیٰ حضرت کی خدمت کے صلے میں پا رہے ہیں؛ اس لئے یہ سطریں چبوترہ کوتوالی کے قصبہ مذکورہ کے متصدیوں کے لئے لکھی جا رہی ہیں کہ قانونِ قدیم کے دستور کے مطابق ذیل کے اشخاص کے پاس وہ رقم پہنچتی رہے کہ وہ بندگان اعلیٰ حضرت کے دولت ابد کے دوام کے لئے دُعا کریں۔(۱)

(تحریر فی تاریخ غرہ شہر جمادی الثانی سن ۸ جلوس مبارک)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاگیر داران و فوجداران و زمینداران پرگنہ ہائے ممالک محروسہ بغایت بادشاہانہ امیدار بدانند کہ چوکشور وجے چند بہ باگاہ خلائق پناہ رسیدہ بود بوسیلہ بار یافتگان حواشی بساط خلافت و جہاں داری بغرض مقدس و معلی رسانیدند کہ اکثر طائفہ ہنود در بلد و قصبات قلمرو خالصہ

(۱) تاریخ کی سچائیاں: ۳۶۔

منازل و ساکن احداث نمودہ بطریق خیرات بانہا نہادہ اند و آں جماعت درمکانہا فر بور سکونت گرفتہ بدعا گوئی دوام دولت ابد مشغول می شاند واز یں جہت کہ بعض مردم بہ علت نزول مزاحمت بحال آنہامی رسانند اُمیدوارند کہ از پیش گاہ معدلت فرمان نزول درمنازل مردم درکل مما لک محروسہ معاف و ممنوع است، حکم جہاں مطاع عالم مطیع صادر شدکہ برتقدیر وقوع مقرر سازند کہ بعد الیوم احدی بدیں سبب معترض و مزاحم جال جماعہ مرقوم نبود تا آنہا بہ جمعیت خاطر دراں اماکن مقیم بودہ بدعا بقائے سلطنت لایزال مواظبت می نمودہ باشد دوبارہ از یں رہ گزر بدرگاہ آسماں جاہ دار خواہ نیایند دریں باب قدغن و درعہدہ مشاسد۔

(تحریر فی تاریخ نوردہم ربیع الثانی ۷ ۲ جلوس والا)

ترجمہ: مما لک محروسہ کے ان جاگیرداروں، فوجداروں اور زمینداروں کو معلوم ہو کہ جو شاہانہ عنایت کے اُمیدوار ہیں کہ کشور اور روپے چند نے خلائق پناہ کے دربار میں خلافت اور جہاں داری کی بساط تک پہنچنے والوں کے وسیلے سے آ کر اس مقدس اور معلّٰی دربار میں یہ عرض کیا کہ اکثر ہندوؤں نے قلمرو کے شہروں اور قصبوں میں بہت سے گھر اور قیام گاہیں بنا کر ان کو خیرات کے طور پر دی ہیں، اور وہ سب ان مکانات میں سلطنت کے دوام کے لئے دُعائیں کرتے ہیں؛ لیکن کچھ لوگ نزول کی علت میں ان کی مزاحمت کرتے ہیں، وہ اُمید رکھتے ہیں کہ اس عدل پسند دربار سے ایسا فرمان جاری ہو جائے گا کہ کوئی ان کی مزاحمت نہ کرے؛ کیوں کہ مما لک محروسہ کے لوگوں کے تمام مکانات نزول سے بری ہیں اور ان کی وصولی

ممنوع ہے؛ اسی لئے یہ حکم جس کی اطاعت تمام دنیا میں ہوتی ہے، جاری کیا جاتا ہے کہ اگر ایسی صورت حال ہو تو اب سے اس جماعت مذکور کے سلسلے میں کوئی تعرض اور مزاحمت نہ ہو؛ تاکہ وہ اطمینان سے ان مکانوں میں رہیں اور سلطنت لایزال کی بقا کے لئے دُعا کریں اور دوسری بار اس آسماں جاہ دربار میں دادخواہی کے لئے نہ آئیں، اس امتناعی حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھیں۔

(تحریر ۱۹؍ربیع الثانی ۲۷؍جلوس والا)



ہندو راجہ اور مندر☆

تاریخ کے صفحات اس بات کے بھی گواہ ہیں کہ مسلمانوں سے زیادہ ہندو حکمرانوں نے مندروں کو لوٹنے کا کام انجام دیا ہے، کچھ ہندو حکمرانوں کے یہاں تو مندروں کو لوٹنے کا الگ سے ایک باضابطہ محکمہ بھی ہوتا تھا، بقول بابو رام نرائن :

> سوامی شنکر اچاریہ کے زمانہ میں جین اور بدھ متوں کے خلاف زبردست معرکہ آرائی ہوئی جس میں ہندو غالب رہے، اس وقت کی ہزار ہا جین اور بدھ مت کی شکستہ مورتیاں آج کل لاعلمی سے ہندو مندروں میں زمین کے نیچے دبی ہوئی ہیں جس کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔(۱)

خود دیانند سرسوتی کا یہ اعتراف ہے کہ :

> اب جتنے بھی بت جینوں کے نکلتے ہیں وہ شنکر اچاریہ کے زمانہ میں توڑے گئے تھے، جو بغیر ٹوٹے ہوئے نکلتے ہیں وہ جینوں نے ٹوٹنے کے ڈر سے زمین میں گاڑ دیئے تھے۔(۲)

☆ عام طور پر فرقہ پرست مؤرخین مسلمان حکمرانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے مندروں کو لوٹا اور اسے منہدم کیا؛ لیکن یہ دو پہلوؤں سے غلط ہے: (۱) اس میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے، (۲) یہ بات اہم ہے کہ اس طرح کے واقعات عام مسلمانوں کی طرف سے پیش نہیں آئے اور نہ اسلام کے مذہبی نمائندوں کی طرف سے پیش آئے؛ بلکہ سیاسی حکمرانوں کی طرف سے اپنے سیاسی مفاد کے لئے پیش آئے ہیں؛ چنانچہ مسلمانوں سے بڑھ کر ہندو راجہ مہاراجہ مندر شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر مختار احمد مکی کا یہ مضمون نہایت اہم ہے، جس میں ہندو، بدھ اور جین مندروں کے ساتھ ہندو راجاؤں کی ظلم و زیادتی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) بابو رام نرائن، رسالہ صوفی رامپور، اکتوبر ۱۹۲۴ء، حوالہ: عالمگیر ہندوؤں کی نظر میں، ص: ۱۱۲۔

(۲) سوامی دیانند سرسوتی، سیتارتھ پرکاش، (لاہور ۱۹۴۵ء)، ص: ۳۸۳۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد سے قبل وشنو، شیو اور ساکت مت کے ماننے والوں نے بزورِ قوت بدھ و جین مت کے اثرات کو ختم کردیا تھا، بقول کے ایس بھگوان :

> شنکر اچاریہ نے بدھ مت کی بیخ کنی کے لئے انتہائی بربریت بھرے وحشیانہ اور کمینہ طریقوں کا استعمال کیا، یہ کہنا کہ بدھ مت کا قلع قمع اس نے اپنے علم و منطق کے زور سے کیا، ایک مہمل سی بات ہے؛ بلکہ اس کے حکمراں طبقہ کی مدد سے بدھوں کا صفایا کرڈالا، جنوب میں پلو اور مغرب میں چالوکیا حکومتیں برہمنیت کے پس پشت تھیں۔(۱)

چنامنی وینائیک کا کہنا ہے کہ اس دوران برہمنوں نے اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے ایک نیا اشلوک ایجاد کرلیا تھا کہ کلجگ میں نہ تو کوئی چھتری ہے اور نہ ہی ویشیہ؛ بلکہ اس یگ میں صرف برہمن اور شودر ہی دو ذاتیں ہیں۔(۲)

کے ایم شریمالی (Shimali) اپنے مضمون کھجراہو کے برج منڈل اور فتح پور سیکری کے اطراف میں جین مندروں کی تباہی کی حالیہ دریافت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

> یہ ہندوؤں کے ہاتھوں ہوئیں؛ لیکن اسے ڈی وی شرما، بی بی لال اور ایس پی گپتا جیسے آثارِ قدیمہ کے ماہرین اب مسلمان حکمرانوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔(۳)

کشمیر کے سابق گورنر جگموہن کا کہنا ہے کہ راجہ اشوک کی موت کے بعد اس کا بیٹا گدی پر بیٹھا تو شمالی ہند میں بدھ ازم کا زور تھا؛ لیکن نئے راجہ کے زیر اثر بدھوں کے ویہاروں کو جلاکر راکھ میں تبدیل کرڈالا اور بدھوں کی زمین برہمنوں کو دے دی۔(۴)

---

(۱) کے ایس بھگوان، ہندومت میں تشدد، سہ ماہی السلام، جلد: ۳ شمارہ نمبر: ۲، جنوری ۱۹۹۹ء، حوالہ نمبر: ۵۴، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، بدھشٹ اشکس آف ناگ ارجن کونڈا اے ایچ لانگ برسٹ (دہلی ۱۹۳۸ء)، ص: ۶۔

(۲) چنامنی وینائیک ویدیہ، ہسٹری آف میڈ ایول انڈیا: ۲ / ۳۱۳۔

(۳) کے ایم شریمالی، ری ڈسکوری آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز (نئی دہلی ۴ / جولائی ۲۰۰۰ء)۔

(۴) جگ موہن، مائی فروزن ٹربولنس، (دہلی ۱۹۹۲ء)، ص: ۴۰۔

بقول ڈی دی کوسمبی :

> گیارہویں صدی میں کشمیر کے مہارشی ہرش (دیو ۱۰۸۹ء-۱۱۰۱ء) نامی حکمراں نے مندر لوٹ کا ایک علاحدہ سے محکمہ ایک افسر دیوت پٹنا ئیک یا دیوتھ پاوانائکا (دیوتاؤں کو کھدیڑنے والا افسر) کے ماتحت قائم کر رکھا تھا، اسے مندروں کو تباہ کرنے والا کہا جاتا، جس قدر مال و دولت مندروں سے لوٹا جاتا، اس میں سے نصف بطورِ انعام لٹیرے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور بقیہ کو راجہ خود لے لیتا، املاک کے علاوہ دھات کی بنی مورتیوں کو بھی اس نے نہیں بخشا، دیوتاؤں کی مورتیوں کو لوٹنے سے قبل اودے راج ننگے بھکشوؤں جن کی ناک اور دست و بازو گل چکے ہوں گے، ہاتھ سے ان پر پائخانہ و پیشاب چھڑکواتا، مورتیوں کے پیروں میں رسی باندھ کر انھیں سڑکوں پر گھسیٹا جاتا۔(۱)

بقول کلہن ریاست کے تمام گاؤں، شہر اور قبضہ میں کوئی مندر یا مورتی ایسی نہ تھی جو لوٹی، جلائی یا توڑی نہیں گئی ہو، صرف چار مورتیوں کے بچ جانے کا تذکرہ کلہن کی کتاب میں موجود ہے۔(۲)

پوری کا جگن ناتھ مندر ایک آدی باسی عبادت گاہ پر تعمیر کرایا گیا ہے، خود سوامی وی ویکا نند اعتراف کرتے ہیں کہ پوری کا جگن ناتھ مندر ایک قدیم بدھسٹ مندر پر زبردستی قبضہ کر کے اسے ہندو مندر میں تبدیل کر دیا گیا، (۳) بودھ گیا میں بنگال کے راجہ ششانک نے چھٹی صدی عیسوی میں ایک بودھ ویہار کو تڑوا کر ہندو مندر تعمیر کروایا تھا جو آج بھی وہاں موجود

---

(۱) اوم پرکاش پرشاد (مترجم: فیضان رشید)، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نگاہ (پٹنہ ۱۹۹۴ء)، ص: ۴۱۔

(۲) نیلم اگروال، راج ترنگنی کلہن، حوالہ: اوم پرکاش۔ (۳) نیلما شرما، ہندوستان ٹائمز، ۱۱ر جولائی ۲۰۰۳ء۔

ہے،(۱) کنگھم کا کہنا ہے کہ شہنشاہ اشوک نے بودھ دشمنی میں اس درخت کو کٹوا دیا جس کے نیچے گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا، جب وہ درخت دوبارہ نکل آیا اور اشوک کے بدھ مت قبول کرنے کے بعد اس کی بیوی تیشیہ تکشیتا نے اس کی عقیدت کو دیکھتے ہوئے چڑھ میں اس درخت کو ایک بار مزید کٹوا دیا، (۲) ساتویں صدیق عیسوی میں جب گونڈ (بنگال) کے شیومت کے ماننے والے راجہ ساسنگکا نے مگدھ پر حملہ کیا تو پیپل کے اس درخت کو کٹوا دیا؛ بلکہ اس کی ایک ایک جڑ کھودوا کر نکلوا دی اور اس پر گنے کا رس چھڑکوا کر پوری طرح جلا ڈالا؛ تاکہ اس درخت کا نام ونشان باقی نہ رہ جائے۔(۳)

جے سنہا (۱۱۲۸ء تا ۱۱۵۵ء) نے بھی مورتیوں کو توڑا اور مندروں کو لوٹ کر دولت حاصل کی، موریوں کے عہد میں جو مورتیاں بنائی گئی تھیں، وہ بعد کے موریہ راجاؤں نے حصول زر کے لئے پگھلا دیں، دوسری صدی قبل مسیح میں پوشیامترا سنگھا نے موریہ کے بعد برہمن حکومت قائم کی، وہ بدھوں کا سخت مخالف تھا، شاکالا کا (موجودہ سیالکوٹ) تک اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ چڑھائی کی، راستہ میں ملنے والے تمام اسٹوپا کو تباہ وبرباد کرڈالا، خانقاہوں کو جلا ڈالا اور بدھ راہبوں کا قتل عام کیا، سیالکوٹ میں اس نے اعلان کیا کہ جو بھی بدھ راہب کا سر کاٹ کر لا کر دے گا، اسے ایک سو سونے کی اشرفی انعام میں دیا جائے گا۔(۴)

شیواجی شودر تھے جب انھوں نے اپنے زور بازو سے حکومت حاصل کر لی تو ان کا راج تلک کی مذہبی رسم ادا کرنے کو کوئی برہمن تیار نہیں تھا، کافی رقم دے کر ایک پنڈت کو تیار کیا گیا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کی پیشانی پر تلک لگانے کے بجائے اپنے پیر کے انگوٹھے سے ان کا راج تلک کیا تھا، (۵) کودوم گیلور (Kodumgallur) (کیرالا) کے شری کورمبا

(۱) نمیتا بھنڈاری، لوئس فرناڈس اور مینو جین، اپینرڈ مائینوریٹی، سنڈے (کلکتہ ۱۲ر فروری ۱۹۹۲ء)۔
(۲) جنرل کنگھم، مہابودھی ڈی گریٹ بودھسٹ ٹیمپل انڈر ڈی بودھی ٹری ایٹ بودھ گیا، (لندن ۱۸۹۲ء)۔
(۳) آر ایس شرما، کومنل ہسٹری اینڈ رام ایودھیا، پیپل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۔
(۴) آر ایس شرما، کومنل ہسٹری اینڈ رام ایودھیا، پیپل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۔
(۵) ثناء اللہ، انگریزوں کی سازشی پالیسیاں اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، سہ روزہ دعوت (خصوصی اشاعت)، نئی دہلی ۱۴ر نومبر ۲۰۱۵ء، ص: ۱۱۴۔

بھگوتی (Kurumba Bhagwati) مندر میں آج بھی یہ روایت موجود ہے کہ اس کی سالانہ تقریب میں بڑے پیمانہ پر مرغوں کی بلی دی جاتی ہے، اس کے خون کو مندر کے چاروں جانب چھڑکتے ہوئے بدھوں کو گالیاں دی جاتی ہیں؛ کیوں کہ یہ مندر بودھ استوپ کو منہدم کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔(۱)

پرکاش پاترا ہندوستان ٹائمز میں چھپے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> مورخین اور اسکالر اس بات پر متفق ہیں کہ اُڑیسہ کے مشہور پوری کے جگناتھ بنیادی طور پر ایک آدی باسی دیوتا ہیں، جس کی پرستش صدیوں تک کھمبے (لکڑی کا ستون) کی شکل میں ہوتی رہی ہے، ناگ اور دوسری علامتوں کی پرستش کرنے والے آدی باسیوں نے یہ خصوصیت جگناتھ سے بھی جوڑ دی، بعد کے دنوں میں بدھ مت کے ماننے والوں نے انھیں بدھ سے جوڑ کر ان کی پرستش شروع کر دیا، جب بدھ اور جینیوں کے خلاف ہندو احیاء پسندوں کی پرتشدد تحریک شروع ہوئی تو مغربی اُڑیسہ کے بدھ وِیہار میں جن مورتیوں کی پوجا ہوتی تھیں، اسے ان لوگوں نے زمین میں گاڑ دیا، دسویں صدی عیسوی میں ایک دوسرے بدھ راجہ کو جب یہ مورتیاں ملیں تو اس نے پوری میں ایک نئے مندر کی بنیاد رکھی، بعد کے دنوں میں بلبھدر اور سبھدرا کی مورتیاں بھی اس میں شامل کر دی گئیں۔(۲)

تامل پرانوں کی رو سے شیوا دھرم کو جینیوں پر مظالم ڈھا کر مضبوطی سے قائم کیا گیا، آٹھ ہزار جینیوں کو ستونوں کے سہارے کھڑا کر کے ان کے جسم پر میخیں ٹھونک دی گئیں، گجرات میں جب کمار پال کے بعد اس کا بھانجہ اجے پال سولنکی راجہ ہوا تو وہ شیو مذہب کا پیرو

(۱) جیا جیٹلے، سمنٹ بفورا ستون، ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی ۲۳ر جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۲) پرکاش پاترا، جب آن دی جگرنوٹ، ہندوستان ٹائمز، رانچی و جمشید پور ایڈیشن، ۴ر اپریل ۲۰۰۶ء۔

تھا، اس نے جین مذہب کے پیروؤں پر کافی ظلم ڈھائے، ایک جینی عالم کیرومی کو کھولتے پانی میں ڈبو کر مار ڈالا گیا، رام چندر نامی کی مشہور مصنف جو تقریباً ایک سو کتابوں کا مؤلف مانا جاتا ہے، اسے تپتے تانبے کے پتر پر بھون کر مار ڈالا، کمار پال کے بنوائے اکثر مندروں کو گروا دیا گیا، جینیوں کے بہت سے سرداروں کو قتل کروا دیا گیا اور دربار کے ایک بہترین مدبر اور سردار مربھٹ کو اذیت دے کر ہلاک کروا دیا گیا، (۱) حتیٰ کہ رامانج کو بھی چولاؤں کے ہاتھوں اذیت اٹھانی پڑی، رگ وید کے مطابق: آریوں نے داسوں کے بنائے شہروں کو نیا شہر بسائے بغیر تباہ و برباد کر دیا، دریا کے بندھوں کو توڑ دیا؛ لیکن انھیں نہ تو انھیں دوبارہ تعمیر کروایا اور نہ ہی زراعت کے لئے نہریں کھدوائیں، مزید یہ کہ ہڑپا اور موہن جڈار و تہذیب کے منادر اور بدھوں کے دیہار آخر کہاں گئے؟ پرمار حکمراں سوبھٹ ورمن (۱۱۹۳ء تا ۱۲۳۰ء) نے گجرات پر حملہ کر کے ڈبھوئی اور کھمبات کے تمام جین مندروں کو لوٹ لیا اور انھیں تباہ و برباد کر دیا، (۲) آر ایس شرما کا کہنا ہے کہ لکھنؤ میوزیم میں بہت سے ایسی جین کی مورتیاں موجود ہیں، جو ٹوٹی ہوئی حالت میں ہیں، ایسا ویشنومت کے ماننے والوں نے کیا ہے؛ تاکہ اسے ویشنو کی شکل دی جا سکے۔

۶۴۲ء میں پلاوا راجہ نرسم باوارمنی نے چلوکا راجہ کی راجدھانی اور موجودہ بلگام ضلع کے واتوپی (بادام) کو تباہ و برباد کیا اور گنیش کی مورتی لوٹ لی، ۶۹۲ء میں چلوکیا نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور وہاں سے گنگا اور جمنا کی مورتی لوٹ کر دکن لے گئے، آٹھویں صدی عیسوی میں کشمیر راجہ لالیتیا دیتیہ پر حملہ کیا گیا اور ویکونٹھا کی مورتی لوٹ لی گئی، راشٹر کوٹا راجہ اندرا سوم نے جمنا کے کنارے کلپیا کے کالا پریا کے مندر کو نہ صرف تباہ و برباد کر ڈالا: بلکہ ان واقعات کو تحریری شکل دینے میں بھی کافی دلچسپی دکھائی، گیارہویں صدی کے ابتداء میں چولہ بادشاہ راجندر اول نے اپنی راجدھانی چلوکیہ سے لوٹی گئی درگا، گنیش، اور نندی، کلنگا اور اڑیسہ

---

(۱) سید ابو ظفر ندوی، تاریخ گجرات، ص: ۱۷۲۔

(۲) ایم حبیب احمد، ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس، ترقی اردو، (دہلی ۱۹۶۴ء)، ص: ۳۶۲۔

سے لوٹی گئی بھیرو، بھیروی اور کالی وغیرہ کو براجمان کرایا، اس طرح چولا، پلوا، چالکیا، پالا اور بہت سے دوسرے ہندو حکمرانوں نے اس غیر مذہبی کام کو انجام دینے میں کافی اہم رول ادا کیا، خود شیوا جی نے سورت اور احمد آباد کو بلا امتیاز مذہب وملت بڑی طرح لوٹا۔

اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لئے مندروں کی دولت سے اکثر ہندو حکمرانوں نے فائدہ اُٹھایا، اچاریہ چانکیہ نے اپنی کتاب ارتھ شاشتر میں حکمرانوں کو ضرورت کے وقت یا ریاست کے خزانہ میں دولت جمع کرنے اور عوام سے دولت حاصل کرنے کے لئے جہاں بیسوں طریقے بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ راجہ ضرورت کے وقت دھوکے سے چوری کرواکر یا زبردستی مندر میں جمع خزانہ کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے اور اس پر کسی قسم کی جواب دہی نہیں ہوگی۔(۱)

اس طرح کسی ایک مندر کی لوٹ ہزاروں گھروں کی لوٹ کے مقابلہ میں زیادہ آسان تھی، (آج بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے، مہاراشٹر کے سدھی وینائیک مندر میں ۱۵۰ کروڑ کی دولت ہے، تروپتی بالا جی مندر میں اتنی دولت ہے کہ صرف سود سے دو ہزار کروڑ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے) اس کے علاوہ مندر اور ان کی مورتیوں کا مسئلہ بھی الگ ہے، سدھی کے سائیں بابا، رادھاماں اور ست سائیں بابا وغیرہ کے منادر اور ان کی پوجا آخر کس کیٹگری میں آئیں گے، لالو پرشاد جب بہار میں اقتدار میں آئے تو ان کے نام سے مندر بن گئے، اس میں اس کی مورتی رکھی گئی اور اس کی پوجا پاٹ شروع ہوگئی، اس طرح گجرات، راجستھان اور مہاراشٹر میں بھی نریندر مودی کے مندر بنے ہوئے ہیں، جہاں اس کی مورتی نصب ہے اور اس کی پوجا ہوتی ہے، گجرات و مہاراشٹر میں گاندھی جی کے قاتل ناتھورام گوڈسے سے منصوب کئی منادر ہیں جن میں اس کی باضابطہ پوجا ہوتی ہے، تاریخ میں ایسے واقعات بھی بھرے پڑے ہیں؛ جب کہ مختلف مذہبی گروہ، مفاد پرست گروہ یا حکمرانوں کے ذریعہ مختلف

---

(۱) اچاریہ چانکیہ، ارتھ شاشتر (اُردو ترجمہ)، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص:۲۹۷۔

اسباب، مذہبی جھگڑے، سماجی ومعاشی وجہیں (مثلاً قحط، خشک سالی سے متعلق امداد) سیاسی پالیسی یا روحانی ہم آہنگی تعمیراتی خوبصورتی وغیرہ کی وجہ سے مذہبی یا دوسری نوعیت کی عمارتوں کو بار بار توڑا اور دوبارہ تعمیر کیا گیا، اس کے علاوہ ہندو، بدھ، شیومت، وشنومت اور لنگائیت وغیرہ نے اکثر ایک دوسرے کی مذہبی عمارتوں کو لوٹا، توڑ پھوڑ کی، یا انھیں تہس نہس کیا۔

رومیلا تھاپر کے لفظوں میں :

> کرناٹک کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے، جب کہ شیوا اور وشنو کے ماننے والوں نے بڑی تعداد میں جین کی مورتیوں کو توڑا اور ان کی جگہوں پر اپنی مورتیاں رکھ دیں، بدھوں کے دیہاروں کو بھی بڑی تعداد میں توڑا گیا، ہندوؤں کے مندروں کو بھی بڑی تعداد میں ہندوؤں نے توڑا؛ تا کہ چھوٹے اور غیر ضروری دیوتاؤں کے مقابلہ میں بڑے دیوتاؤں کو ان کی جگہ بٹھایا جا سکے، کھجراہو کی حالیہ کھدائی کے بعد ملے سرسوتی، وشنو، جین تیرتھنکروں کی مورتیاں اس کی مثالیں ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر آخر تک جتنی بھی جنگیں ہوئیں، ان میں دونوں ہی جانب سے ہندو اور مسلمان سپاہی ہوتے، اکثر تو یہ جنگیں باپ بیٹے، حقیقی بھائی اور بھائی، چچا یا خاندان کے مختلف رشتہ داروں کے درمیان ہوتیں، کبھی بھی یہ خالص ہندو اور مسلمان کے درمیان کی جنگ یا جہاد نہیں ہوتیں، جس میں ہندو اپنے دھرم کے لئے اور مسلمان اسلام کے لئے لڑے ہوں، دونوں ملک گیری منصب واقتدار کے لئے لڑتے تبلیغ دین ان کا نصب العین کبھی بھی نہیں رہا؛ بلکہ وہ سب بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے، ان کے راستہ میں جو کوئی بھی آتا، اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، ان جنگوں میں ہندو، ہندو سرداروں سے اور مسلمان مسلمان سلاطین سے لڑتے، یہ دونوں آپس میں بھی لڑتے، مسلمان سپہ سالار کے ساتھ ہندو سپاہی ہوتے تو ہندو سپہ سالار کے ساتھ مسلم

سپاہی بھی ہوتے تھے، محمد بن قاسم اور راجہ داہر دونوں کی فوجوں میں ہندو اور مسلمان سپاہی موجود تھے، محمود غزنوی کی تمام فوج کشی میں ہندوستانی راجہ یا ہندو سپاہی موجود رہے ہیں، شیخ حمید راجہ جے پال کی فوج کا کمانڈر تھا تو کوٹ کی لڑائی میں قلعہ بھیم کا ہندو راجہ محمود کے ساتھ تھا ، اس جنگ کے بعد دس ہزار ہندو باضابطہ طور پر محمود غزنوی کی فوج میں شامل ہو گئے، جن کا سپہ سالار سونیندر رائے تھا، تھانیشر کی لڑائی میں محمود غزنوی کے ساتھ بارہ ہزار ہندو فوجی بھی تھے، جب قنوج، مہابن اور برن (بلند شہر) پر فوج کشی ہوئی تو راجہ کشمیر سلطان محمود کے ساتھ تھا؛ حتیٰ کہ سومناتھ کی جنگ میں بھی سمندر کی جانب سے جو حملہ ہوا تھا اس میں ہندو سپاہی کشتیوں پر سوار تھے، سنگرام سنگھ کی فوج میں تقریباً نصف فوجی مسلمان تھے، جس کی کمان محمود لودی اور حسن خان میواتی کے ہاتھ میں تھی، چتوڑ کے محاصرہ میں توڈرمل اور بھگوان داس اکبر کے ساتھ تھے، تو اسماعیل خان فوج کا سپہ سالار اودے سنگھ کی طرف تھا، ہلدی گھاٹی کی مشہور لڑائی میں سلیم سوری رانا پرتاپ سنگھ کی طرف سے لڑا تو مان سنگھ وغیرہ اکبر کے ساتھ تھے، راجپوت، بندیلے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور مرے، مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملہ کئے اور اس کے لشکر میں بڑی تعداد میں مسلمان سپاہی بھی موجود ہوتے تھے، مزید یہ کہ اگر آج مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ لڑی گئی جنگوں کا بدلہ ہم مسلمان عوام سے لینا چاہ رہے ہیں تو راون اور کوروؤں کے کالے کارناموں اور بدھوں کے خلاف ہوئے زبردست تشدد کے لئے کون ذمہ دار ہے؟ اور اس کے لئے کس کس سے بدلہ لیں؟ دیوداسی پرتھا کے لئے کس سے بدلہ لیا جائے؟ اسی طرح ہندو سماج میں پھیلی ستی پرستی، جس میں عورتوں کو اس کے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا، ان سب کے لئے کس کس سے اور کب تک بدلہ لیا جاتا رہے گا؟

● ● ●

اورنگ زیب اور شیواجی☆

شیواجی (۱۶۲۷ء، ۱۶۸۰ء) کی پیدائش پونا کے شمال میں جوناں نگر کے قریب شیونیر کے پہاڑی میں شاہ جی بھونسلے اور جیجابائی کے گھر ۱۶۲۷ء میں ہوئی تھی، شاہ جی کی دوسری بیوی توکابائی کے باعث جیجابائی شاہ جی بھونسلے سے الگ رہتی تھیں، ۱۲ سال کی عمر میں شیواجی کی شادی سائی بائی سے ہوئی، شیواجی کا مقصد جنوب مغرب میں ایک آزاد خودمختار ریاست کا قیام تھا، اس سلسلہ میں اس کی پہلی لڑائی ۲۶ جنوری ۱۶۵۶ء کو ایک مراٹھا سردار چندر راؤ سے ہوئی جسے قتل کرکے اس نے جاؤلی کے قلعہ پر قبضہ کرلیا، مغلوں سے شیواجی کی بغاوت نہ تو ملکی تھی اور نہ ہی مذہبی؛ بلکہ یہ ایک علاقہ کے مراٹھا قبیلہ کی بغاوت کے مانند تھی، جو ہندوستان کے دوسرے قبیلہ کی بغاوت سے مختلف نہیں تھی۔

شیواجی کا مقصد کبھی بھی ہندو دھرم کا احیاء نہیں تھا، گرچہ آج کے اکثر مورخین اسے ہندو مسلم محاذ آرائی کے طور پر پیش کرتے ہیں، اورنگ زیب یا مغل عہدہ داروں سے اس کی جنگ مرکز سے منحرف ایک علاقائی ریاست کی بغاوت تھی، یہ پہاڑی چوہے اور ہاتھی کی جنگ کے مانند تھی، جس میں وہاں کے جغرافیائی حالات نے مغلوں کو کافی پریشان کررکھا تھا اور انھیں چین سے رہنے نہیں دیتے تھے، شیواجی کبھی کھل کر میدان جنگ میں نہیں لڑے؛ بلکہ ہمیشہ بڑی تیزی سے گوریلا جنگ میں مغل سپہ سالار کو زک پہنچا کر پہاڑوں میں غائب ہوجایا کرتے، یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ شیواجی کے دادا مالوجی مسلمان پیروں کے بڑے معتقد تھے اور احمد نگر اور بیجاپور کے دربار میں ایک نامور فوجی کمانڈر تھے، وہ حضرت شاہ شرف کے مرید تھے،

☆ تحریر: ڈاکٹر مختار احمد مکی، از: ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی (باب:۱۵) ط: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

جواحمد نگر میں مدفون ہیں، اپنے پیرومرشد کے نام پرہی اس نے اپنے دونوں بیٹوں کا نام شاہ جی اور شرف جی رکھا تھا، جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہوتے ہیں، ان کی ماں کا ذاتی محافظ بھی کہاری مسلمان تھے اوراس کی فوج میں بھی ایک تہائی مسلمان سپاہی تھے۔

خود شیواجی کے باپ شاہ جی مغلوں کی فوج میں شامل ہونے کے لئے بالکل آمادہ تھے: بشرطیکہ پونا کے قریب اس کو مناسب جاگیر مل جائے؛ لیکن یہ معاہدہ طے نہیں پاسکا، شیواجی بابا یاقوت (یعقوب) کلسی کا بے حد احترام کرتے تھے، اس نے ۶۵۳/۱ ایکڑ زمین بطورِ جاگیر عطا کی تھی اور وہاں ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی تھی، بابا یاقوت کا عقیدہ تھا کہ ایشور اللہ ایک ہی ہے اور کل انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، شیواجی نے اپنے فرمان میں لکھا ہے کہ حضرت بابا یاقوت بہت بڑے سنت اور صوفی ہیں، کسی بھی جنگ میں جانے سے قبل شیواجی ان سے ملنے اور ان کا آشیرواد حاصل کرنے ضرور پہنچ جاتا۔

ایک دوسرے مسلم صوفی جس سے شیواجی انتہائی متاثر تھا، وہ موتی بط تھے، وہ پاڑہ گاؤں میں رہتے تھے، کرناٹک کی مہم پر جانے سے قبل شیواجی ان کا آشیرواد حاصل کرنے پہنچے تھے، اس کے بحری افواج کا سربراہ دولت خان اور شیدی مصری تھے، مداری مہتر نامی مسلم فراش نے ہی اس کو آگرہ کے قلعہ سے بھاگنے میں مدد دی تھی؛ اس لئے وہ اس کو بہت عزیز رکھتا تھا، بیرونی ریاستوں سے رابطہ اور تعلقات قائم رکھنے ذمہ داری ملا حیدر علی منشی کی تھی، اسے ہی دکن کے مغل گورنر بہادر خان کے پاس معاہدہ کے لئے بھیجا گیا تھا، اس کا شمار شیواجی کے سب سے وفادار جنرل میں ہوتا تھا، اس کی فوج میں تقریباً ۳۵ فیصد مسلم سپاہی اور عہدہ دار تھے، پیادہ فوج کا پہلا سردار نور خان بیگ تھے، محمد سائس کی ذمہ داری فوج کے لئے گھوڑے کی خریداری اور اس کے تربیت کی تھی، بحری بیرہ کی ذمہ داری دولت خان کے حوالہ تھی جس میں داؤد خان، ابراہیم خان اور سلطان خان نامی مسلم سردار تھے، توپ خانہ کی ذمہ داری بھی مسلمان فوجیوں کے حوالہ تھی، اس کے ذاتی محافظ دستہ میں ۲۰ مسلمان موجود تھے، فوج کے علاوہ عدالتی اور حکومتی نظام میں بھی مسلمان موجود ہوتے تھے، ملا قاضی حیدر کو رائے گڑھ کا جج

مقرر کیا گیا تھا، ایک اطالوی سیاح نکولس منوجی کے سفرنامہ استوریہ دی منگور میں ایک مسلم فنکار میر محمد کی بنائی ہوئی شیواجی کے حفاظتی دستہ کی تصویر میں مسلم محافظ منفرد انداز میں دکھائی دیتے ہیں، ۱۶۷۷ء میں اس نے گولکنڈہ کے سلطان ابوالحسن تاناشاہ سے ملاقات کی تھی اور ایک ماہ تک اس کا وہاں قیام رہا تھا، ان دونوں کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا، اس کی رو سے شیواجی اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے آزاد تھے؛ لیکن دکن کی حکمرانی قطب شاہی خاندان کے پاس ہی رہے گی۔(۱)

شیواجی نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ لوٹ مار کے دوران جو مسلم خواتین ملتی ہیں ان کے ساتھ انتہائی عزت واحترام سے پیش آئیں اور انتہائی احترام کے ساتھ قرآن مجید کے نسخوں کو رکھیں، جسے بعد میں وہ کسی مسلم خادم یا سپاہی کے حوالہ کر دیا کرتا، دوسری جانب مغل افواج کا سپہ سالار ایک ہندو راجہ جے سنگھ تھا،(۲) شیواجی نے اپنی راجدھانی رائے گڑھ میں اپنے محل کے سامنے جہاں جگدیشور کا مندر بنوایا تھی، وہیں مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی،(۳) پونا محضر میں شیواجی کے دربار کی جو کاروائیاں درج ہیں، اس کے مطابق ۱۶۵۷ء میں شیواجی کے ذریعہ تقرر گئے مختلف مسلم قاضیوں کے نام درج ہیں جو مسلمانوں کے معاملات میں شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، دی بی کلکرنی اپنی کتاب پورٹریٹ آوف اے پیٹرائیٹ میں لکھا ہے کہ شیواجی کے دل میں دوسرے مذاہب کے لئے اتنی ہی عزت تھی جتنی کہ اسے اپنے مذہب کے لئے تھی، سورت میں وہ فادر ایمبروس (Amdrosc) سے کافی عزت سے ملا، جس طرح وہ گیتا اور مندر کا احترام کرتا تھا، اسی طرح وہ قرآن اور مسجد کا بھی احترام کرتا تھا۔

ڈاکٹر جیت جوشی کی ایک کتاب آگرہ سے آزادی کے نام سے مراٹھی زبان ۱۹۹۷ء

(۱) شاہ جہاں مخدوم: شیواجی اور مسلم حکمرانوں کی جنگ سیاسی تھی، (روزنامہ قومی تنظیم رانچی، ۲۰ رفروری ۱۹۱۳ء)۔

(۲) رفیق زکریا، دی نیگریشن آف شیواجی، (دی اشٹیمن اتج کلکتہ ۲۴ رجنوری ۲۰۰۴ء)۔

(۳) امیت سین گپتا، میکنگ اپ ہسٹری، (ہندوستان ٹائمز ۱۶ رجولائی ۲۰۰۰ء)۔

میں شائع ہوئی ہے، اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے اورنگ زیب اور شیوا جی کے درمیان طویل جنگ کے پس منظر کو پیش کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ ۱۲ مئی ۱۶۶۶ء کو آگرہ میں اورنگ زیب کا پچاسواں سالگرہ کا جشن منایا جارہا تھا، جس میں ہندوستان کے تمام راجہ مہاراجہ دیوان عام میں مدعو تھے، اس میں شرکت کے لئے شیوا جی بھی اپنے چھ سالہ بیٹے سمبھا جی کے ساتھ ۱۱؍مئی کو آگرہ پہونچے، ان کی دیکھ ریکھ اور مہمان نوازی کی ذمہ داری اورنگ زیب کے ایک درباری راجہ جئے سنگھ کے حوالہ تھی، راجہ جئے سنگھ نے یہ کام اپنے بڑے بیٹے رام سنگھ کو سونپ دیا، دوسرے روز رام سنگھ شیوا جی اور ان کے بیٹے سمبھا جی کو لے کر کافی تاخیر سے اورنگ زیب کے دربار میں پہنچے، اس وقت تک درباری کارروائی شروع ہو چکی تھی؛ انھیں اورنگزیب کے ایک منصب دار جسونت سنگھ کے پیچھے کھڑا کیا گیا، جسونت سنگھ کو شیوا جی نے پونے کے ایک معرکہ میں شکست دی تھی، اس وجہ سے اس کے پیچھے کھڑے کئے جانے کو اپنی توہین سمجھا اور بھرے دربار میں برہم ہو گئے، معاملہ نے کچھ طول پکڑا اور شیوا جی کو ان کے بیٹے سمیت گرفتار کر کے راجہ جئے سنگھ کی حویلی میں قید کر دیا گیا؛ جہاں شیوا جی کے ایک مسلم ملازم مداری مہتر نے آزادی دلانے میں اہم رول ادا کیا، اس کے بعد ہی سے شیوا جی اور مغل سلطنت کے درمیان مقابلہ آرائی میں شدت آتی چلی گئی، اس طرح ان دونوں کے درمیان جنگ کے اسباب مذہبی نہیں تھے؛ بلکہ انا (Ego)، توہین اور اپنی اپنی سلطنت (Empire) کو وسعت دینے کا تھا، اس کو مذہب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا؛ لیکن اپنی کوشش کو استحکام دینے کے لئے شیوا جی نے مذہبی لبادہ ضرور اوڑھ لیا تھا، جادو ناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ شیوا جی اور شمبھو جی دیہاتوں اور تاجروں کو ہندو مسلمان کی تمیز کئے بغیر لوٹتے اور مغل افواج کو آتے دیکھ کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جایا کرتے۔(۱)

بقول سر بی، سی، رائے :

> جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیاء تھا اور مغلوں کے خلاف وہ قومی جدو جہد کا رہنما تھا، وہ غلطی پر ہیں۔(۲)

---

(۱) اوم پرکاش پرساد: اورنگ زیب، ایک نیا زاویہ، فوٹ نوٹ، ص:۶۵ (حوالہ: جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب، ص:۲۴۰)۔

(۲) شیخ محمد اکرم، رود کوثر، ص:۴۶۷۔

ڈاکٹر بالاجی جادھو کی بھی ایک کتاب مراٹھی میں ''مراٹھا شنڈ جھالات کائے'' شائع ہوئی ہے، اس میں اس نے شیواجی کی رواداری سے متعلق بہت سے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ افضل خاں اور شیواجی کے درمیان حریفانہ نوعیت کی بنیاد سیاسی تھی، مذہبی نہیں تھی، افضل خان کے ساتھ اس کا سکریٹری کلکرنی بھی اس موقعہ پر مارا گیا تھا، اس نے جہاں شائستہ خان کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں وہیں اس نے مدھول کے ہندو سپہ سالار رگھوبڑ کا سر بھی قلم کر دیا تھا، پونے کے قریب پرتاب گڑھ نامی علاقہ میں افضل خان کا مزار ہے، جہاں ہر سال عرس ہوتا ہے اور بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان عقیدت مند حاضر ہوتے ہیں، اس مزار نے باضابطہ ایک درگاہ کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس سے منسلک ایک مسجد بھی ہے، شیواجی کو اس بات کا احساس تھا کہ افضل خان ایک بہادر اور وفادار جنگجو تھا، اس نے اپنی ماں جیجا جی کی ہدایت پر اسلامی طریقے سے افضل خان کی تجہیز و تدفین کا انتظام اپنے ذاتی خرچ سے کیا تھا، اس نے اس کے مزار پر افضل خان کے شایان شان مزار کی تعمیر بھی اپنی نگرانی میں کروائی، پرتاب گڑھ کے شاہی بھون مندر کے اسٹور روم سے سالانہ تیس من تیل اس مزار پر چراغاں کے لئے فراہم کرنے کا حکم جاری کیا، آج بھی افضل خان کے سالانہ عرس کے موقعہ پر درگاہ پر چادر چڑھانے کا سب سے پہلا اعزاز شیواجی کے خاندان کے لوگوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔(۱)

شیواجی کے پوتے ساہو کو اورنگ زیب نے آگرہ کے قلعہ میں بطور یرغمال اپنے محل میں قید کر رکھا تھا؛ لیکن وہاں اس نے اس کی مذہبی تعلیم کا پورا خیال رکھا، اس نے ہندو پنڈتوں کے ذریعہ دھرم شاستروں کی تعلیم دلائی، سنبھا جی کے مرنے کے بعد جب ساہو شیواجی کی سلطنت کا وارث مقرر ہوا، اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے احسانوں اور محبت کے احساس سے غمزدہ اورنگ زیب کے جنازہ کے ساتھ وہ خلد آباد تک گیا تو قبر میں مٹی ڈالتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسو سے تر تھیں۔(۲)

(۱) سعید حمید: تاریخ کے صفحات میں فرقہ وارانہ زہر، (راشٹریہ سہارا اُردو، دہلی ۲۰/دسمبر ۲۰۱۱ء)۔
(۲) جی ایس سر ڈیسائی: نیو ہسٹری آف مراٹھا: ۱/ ۶۳، (میرٹھ ۱۹۸۰ء)۔

اورنگ زیب اور سکھ☆

جہاں تک اورنگ زیب کے سکھوں سے تعلقات کا سوال ہے تو سکھوں کی بغاوت اورنگزیب کے خلاف آخری بغاوت تھی، سکھ پنت کی ابتدا گرونانک جی مہاراج سے ہوتی ہے، ان کی پیدائش ۱۵/اپریل ۱۴۶۹ء کو تلبندی (ننکانہ صاحب) میں ایک کھتری خاندان میں ہوئی، وہ صوفی منش سنت، توحید کے قائل، مساوات کے حامی، انسانیت کے علمبردار اور بت پرستی کے شدید مخالف بزرگ تھے؛ انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدا ایک مسلمان تاجر کے یہاں نوکری سے کی، آخری دنوں میں وہ ایک چولا (رومال) اوڑھتے، جس پر کلمہ توحید لا الہ اللہ محمد رسول اللہ، سورہ فاتحہ اور مختلف قرآنی آیات تحریر ہوتیں، آج بھی وہ رومال سرحد پارڈیرانانک گرودوارہ میں چولا صاحب کے نام سے موجود ہے، ان کی مذہبی کتاب گروگرنتھ کی ابتداء گرونانک کے اس اشلوک سے ہوتی ہے :

اول اللہ نور اُپایا ، قدرت کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجیا ،کون بھلے کو مندے

۲۵ سال تک انھوں نے مختلف ممالک اور مقامات کا دورہ کیا اور آخر میں کرتار پور میں آکر مقیم ہوگئے، ان کے تمام سفروں میں ان کے دو ہم سفر ہوتے ایک: مسلمان اور دوسرا ہندو، ان کی خانقاہ میں ہندو اور مسلم کی کوئی تمیز نہیں تھی، ان کے پیرو اپنے لباس وضع قطع اور شکل وصورت میں مسلمان درویشوں کی طرح دکھائی دیتے، جو مسلمان نماز پڑھتا اسے نمازی سکھ کہا جاتا، کرتار پور میں ہی ایک مسلم صوفی بزرگ کی حیثیت سے ان کا مزار اور گرودوارہ موجود ہے، جس پر تمام سکھ عقیدت مند حاضری دیتے ہیں، ان کے گلے میں ایک پوتھی (کتاب) ہوتی تھی جو حمائل شریف تھا، ان کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ حج کے ارادہ سے گئے تھے۔

☆ تحریر: ڈاکٹر مختار احمد مکی، از: ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی (باب:۱۶) ط: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

انھوں نے ایک مذہبی وسماجی مصلح کی طرح ہندو اور مسلم سماج میں پھیلے خرافات، اندھی تقلید اور رسم ورواج کی مخالفت کی، جس میں وید اور پران کی مخالفت بھی شامل ہے؛ لیکن ان کی کوئی بھی بانی (قول) قرآن کی مخالفت میں نہیں ملتی ہے،(۱) وہ مذہب وعقیدہ، شکل وصورت، رنگ ونسل، ذات و پات، کھانا پینا اور زبان وغیرہ کی تفریق کے مخالف تھے اور اسے تمام جھگڑے اور سماج میں موجود فساد کی جڑ بتاتے، اس کے خاتمہ کے لئے انھوں نے لنگر کی شروعات کی، جہاں سب آپس میں مل بیٹھ کر بغیر کسی تفریق کے ساتھ کھاتے اور آج بھی اسی اُصول پر یہ لنگر چلتے ہیں۔

ان کے بعد سکھوں کے گرولہنا (انند)، گروامرداس، گرورام داس، گروارجن داس، گروہرگووند، گروہررائے، گروہرکشن، گروتیغ بہادر اور گروگووند سنگھ وغیرہ بتدریج ہوئے، شہنشاہ اکبر نے پنجاب میں گروامرداس سے ملاقات کی اور ان کی بیٹی کو بطور تحفہ کئی گاؤں دئے تھے، اکبر نے ہی ۱۵۷۷ء میں پانچ سو بیگھا زمین —— جس میں ایک قدرتی تالاب بھی تھا —— گرو رام داس کو دیا تھا، جس پر امرتسر شہر بسایا گیا، اور یہیں صوفی بزرگ میاں میر نے ۱۶۰۴ء میں گروارجن کے زمانہ میں ہری مندر (Eolden Temple) کی بنیاد رکھی، گروارجن نے شہنشاہ جہانگیر کے بیٹے خسرو کی بغاوت پر اسے آشیرواد اور مالی وفوجی تعاون دیا تو اس سے ناراض ہوکر جہانگیر نے دولاکھ روپیہ بطور جرمانہ ادا کرنے کو کہا، جرمانہ کی رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں انھیں گرفتار کرلیا گیا اور قید کی حالت میں ہی ۱۶۰۲ء میں ان کی موت ہوگئی، اس کے بعد چھٹے گرو ہرگوبند سے جرمانہ کی رقم ادا کرنے کو کہا گیا، انکار کی صورت میں انھیں بھی گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہاں سے دوسال بعد ہی ان کی رہائی ہو پائی، رہائی کے بعد ان کے تعلقات مغلوں سے بہتر ہوگئے، شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں ایک شاہی باز کی ملکیت کو لے کر مغلوں سے ان کے تعلقات ایک بار پھر کشیدہ ہوگئے اور لڑائی کی نوبت آگئی؛ لیکن وہ بھاگ کر کشمیر کے کرتار پور چلے گئے اور قلعہ بند ہوگئے۔

(۱) انٹرنیٹ اور یوٹیوب پر موجود مختلف دستاویزات۔

عام سرداروں اور حکمرانوں کے مانند بتدریج سکھ گروؤں نے بھی اپنا مخصوص رہن سہن، وضع قطع بنالیا تھا اور اپنی باضابطہ فوج بھی ترتیب دینی شروع کردی تھی، وہ خود کو 'سچا بادشاہ' کہتے اور مغل دربار کی طرح شان وشوکت دکھانا شروع کردیا، گویا یہ ایک مساوی نظام حکومت تھا جو مغلیہ سلطنت کے اقتدار کے لئے ایک چیلنج تھا، جو کسی بھی حکومت کے لئے ناقابل قبول ہوتا ہے، ۱۶۷۵ء تک اورنگزیب نے اپنے خلاف کوئی خاص خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا، سکھوں کے ساتویں گرو ہررائے کا پہلا لڑکا رام رائے ایک باندی کے بطن سے پیدا ہوا تھا؛ جب کہ بیاہتا بیوی کے بطن سے ہرکشن کی پیدائش ہوئی تھی، گرو ہررائے اپنے پہلے لڑکے رام رائے کو اپنا جانشیں بنانا چاہتے تھے، اس کو لے کر پنجاب خصوصاً سکھوں میں تنازع کافی بڑھ گیا، فیصلہ کی ذمہ داری اورنگ زیب کو دی گئی؛ لیکن اس نے ان کے اندرونی معاملات میں کسی بھی مداخلت سے انکار کردیا، ہرکشن سنگھ سکھوں کے آٹھویں گرو بنے؛ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد چیچک سے ان کی موت ہوگئی اور تیغ بہادر کو سکھوں کا نواں گرو بنایا گیا۔

گرو تیغ بہادر نے مغلوں کی جانب سے آسام کی لڑائی میں حصہ بھی لیا، بعد میں اپنے چیلوں اور فوجیوں کا خرچ چلانے اور اپنی ذاتی عیش وآرام کی خاطر آدم حافظ کے ساتھ مل کر مالدار ہندو اور مسلمانوں سے زور زبردستی اور لوٹ مار کر دولت جمع کرنا شروع کردیا، ان دونوں کی دہشت گردی سے تنگ آکر اورنگ زیب کے فوجیوں نے دونوں کو گرفتار کرلیا، آدم حافظ کو ملک بدر کا حکم دیا گیا اور گرو تیغ بہادر کو بھی سزا دی گئی، یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ان دنوں مغل دربار میں گرو تیغ بہادر کا ایک بھتیجہ دھیرو مل بھی موجود تھا، جو ان کے خلاف مغلوں کا کان بھرتا رہتا تھا۔

سب سے پہلے میٹکاف نے اپنی کتاب سکھوں کی تاریخ جو پہلی بار ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی — میں تحریر کیا کہ اورنگ زیب نے گرو تیغ بہادر کو سزائے موت دی تھی؛ لیکن میٹکاف سے قبل اس طرح کا کوئی ثبوت یا تذکرہ موجود نہیں ہے؛ بلکہ ایک دوسری کہانی ملتی ہے، بھائی منی سنگھ کی کتاب بھکت رتناولی — جو پہلی بار ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی — میں واضح طور پر لکھا

ہوا ہے کہ ایک تھ سے ان لی اپنی اجازت سے ان کا سر قلم کر دیا تھا، کنگھم نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے :

> اورنگ زیب کو اپنی کرامات دکھانے کی خاطر انھوں نے اعلان کیا کہ ان کے پاس ایک ایسا تعویذ موجود ہے کہ جو کوئی بھی اسے اپنے پاس رکھے گا تلوار اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اس تعویذ کو خود ہی اپنی گردن میں باندھ کر انھوں نے آزمایا، ان کے اشارہ پر ان کے ایک چیلے نے ان کی گردن پر تلوار ماری، سرتن سے جدا ہو کر ایک طرف جا گرا۔

اس واقعہ کے راوی وہ لوگ ہیں جو ان کی خدمت میں اکثر رہا کرتے تھے؛ لیکن جب دوبارہ ۱۹۱۲ء میں بھگت رتناولی شائع ہوئی تو یہ واقعہ حذف کر دیا گیا تھا؛ کیوں کہ اس سے قبل میٹکاف کی کہانی آ چکی تھی، گیان سنگھ کی تصنیف پتھ پرکاش کی پہلی اشاعت (۱۸۷۹ء) اور دوسری اشاعت (۱۸۸۳ء) میں اورنگ زیب کے ذریعہ گرو تیغ بہادر کی شہادت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے؛ لیکن تیسری اشاعت جو کہ میٹکاف کی کتاب کے بعد شائع ہوئی یہ عبارت موجود ہے کہ گرو جی سے اسلام قبول کرنے کے لئے کہا گیا اور انکار کرنے پر برسرِ عام انھیں قتل کر دیا گیا، سکھانی دیے راج جو ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی، اس میں بھی اورنگ زیب کے ذریعہ گرو تیغ بہادر کی سزائے موت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔(۱)

گرو تیغ بہادر کی موت کے بعد سکھ تحریک نے بتدریج فوجی نوعیت اختیار کر لی، اس تحریک کو منظم کرنے میں دسویں اور آخری گرو گوبند سنگھ کا نمایاں ہاتھ رہا، ابتداً ہندو راجاؤں نے چاہا کہ آپسی تنازعاؤں میں سکھوں کی مدد حاصل کی جائے؛ لیکن بتدریج گرو گوبند سنگھ نے اپنی حیثیت مضبوط کر لی اور وہ ہندو راجاؤں کے مخالف ہو گئے، کئی ہندو راجاؤں نے ایک ساتھ مل کر ۱۷۰۷ء میں گرو گوبند سنگھ پر حملہ کر دیا؛ لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں مل سکی، تب ان

(۱) ارم پرکاش پرشاد، (مترجم: فیضان رشید) اورنگ زیب، ایک نیا زاویہ نگاہ، ص: ۳۰، (پٹنہ ۱۹۹۴ء)۔

ہندو راجاؤں نے اورنگ زیب سے مدد کی درخواست کی، مرکزی مغلیہ حکومت بھی اپنے مقصد کے تحت اس اُبھرتی قوت سے چوکنا تھی اور اس پر نکیل کسنا چاہتی تھی، اورنگ زیب نے لاہور کے صوبہ دار اور سرہند کے فوجدار وزیر خان کو گرو گوبند سنگھ کے خلاف پہاڑی راجاؤں کی مدد کرنے کا حکم نامہ جاری کیا جس میں انھیں کامیابی بھی ملی۔

بھائی بیر سنگھ بٹیالوی نے اپنی کتاب سنگھ ساگر میں اورنگ زیب پر گرو گوبند سنگھ کے دو بچوں کو دیوار میں چنوا کر مار ڈالنے کا الزام لگایا ہے، بعد میں براؤن اور کننگھم نے بھی اس قصہ کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا؛ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ اس نے گرو کے دو بچوں کو مروایا ہو، یہ ضرور ہے کہ اس نے مرکز سے بغاوت کرنے والی سکھ قوت کو سختی سے دبانے کی کوشش کی، ایسے واقعات بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں کہ گنگارام برہمن جن کے گھر گرو جی کی ماں سندری اور ان کے بچے پناہ گزیں تھے، اسی گنگارام نے ہی ان بچوں کو سرہند کے حاکم کے حوالہ کیا تھا، تاریخ میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ گرو ارجن سنگھ کے بھائی پرتھوی چند نے سازش کر کے گرو ارجن کو گرفتار کروایا تھا اور اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھا جب تک کہ اس کی جان نہ لے لی، ان کی جان لینے والا چندو شاہ بھی ایک ہندو ہی تھا جس نے انتہائی اذیت دے کر گرو ارجن سنگھ کی جان لی تھی۔

یہ ضرور ہے کہ سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کو اورنگ زیب کے صوبیداروں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا؛ لیکن ان کے سینکڑوں مددگار مسلمان بھی تھے، نبی خاں، غنی خاں اور جنرل سید بیگ وغیرہ نے بڑے نازک موقعہ پر گرو گوبند سنگھ کی مدد کی اور ان کی جان بچائی تھی، مزید یہ کہ اپنی وفات سے قبل گرو گوبند سنگھ مغل فوج میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہو گئے تھے، جانشینی کی لڑائی میں سکھوں نے گرو گوبند سنگھ کی قیادت میں شہزادہ معظم (بہادر شاہ اول) کا ساتھ دیا تھا، اسی دوران نادر نامی ایک پٹھان نے جس کے دو بیٹوں کو گرو جی نے مار ڈالا تھا، ان پر حملہ کر کے انھیں شدید طور پر زخمی کر دیا تو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اول نے اپنا

خاص طبیب ان کے علاج کے لئے بھیجا،(۱) بہادر شاہ اول کے ذریعہ سکھ گرو کو پیش کی گئی تلوار آج بھی آنند پور صاحب کے گرودوارہ میں محفوظ ہے۔(۲)

اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم نے سکھوں کی بغاوت (۱۷۰۸ء، ۱۷۱۱ء) کو دفع کیا؛ لیکن اس کی موت کے بعد سکھوں کی یہ بغاوت دوبارہ اُبھر کر سامنے آئی تو اس کے جانشینوں نے اسے دفع کیا اور ۱۷۱۴ء میں قابو پایا جاسکا، لدھیانہ میں پنجاب کے قریب واقع گروارہ عالمگیر اورنگزیب سے سکھوں کے بہتر تعلق کی ایک نمایاں مثال ہے، جسے اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی ایک منہ بولی بیٹی جس کی شادی اس نے ایک سکھ سے کروائی تھی کو بطور تحفہ کے عطا کیا تھا۔(۳)

لندن کے انڈیا آفس میں موجود ایک قلمی کتاب نمبر: ۱۳۴۴ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب نے اپنے بیٹے کام بخش کو ایک خط لکھ کر سخت تاکید کی تھی کہ کسانوں اور دیگر رعایا پر بے وجہ کوئی ظلم وزیادتی نہ کی جائے، ساتھ ہی اسے اس بات کے لئے بھی متنبہ کیا کہ خاندان در خاندان چلے آرہے خدمت گاروں کو نہ تو ملازمت سے برطرف کیا جائے اور نہ ہی انھیں بلاوجہ تنگ کیا جائے،(۴) اورنگ زیب کے ذاتی کردار اور صلاحیت کی مدح سرائی کرتے ہوئے تاراچند کا کہنا ہے کہ :

> اورنگ زیب کے ہاتھوں ایک ایسی سلطنت کی باگ ڈور رہی جس کا رقبہ، آبادی اور دولت کے حساب سے کوئی ثانی اور مثل اس وقت کی عالمی سیاست میں نہیں تھا، اپنے کٹھن فرائض کو ادا کرنے میں اس نے

(۱) شیخ محمد اکرام، رُودِ کوثر، (ادبی دنیا دہلی ۱۹۷۵ء)، ص: ۳۰۔

(۲) اوم پرکاش پرساد، (مترجم: فیضان رشید)، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نگاہ، (پٹنہ ۱۹۹۴ء)، ص: ۶۳۔

(۳) محمد خلیل عباس صدیقی، ہندو مسلمس اے کومن ڈسٹینی (کلکتہ ۲۰۱۰ء)، ص: ۲۰۷۔

(۴) رسالہ دارالسلام مالیر کوٹلہ، دسمبر ۱۹۹۱ء، ایم کے اے صدیقی: ہندو مسلمس اے کومن ڈسٹینی (آبادی پبلی کیشن کلکتہ ۲۰۱۲ء)، ص: ۲۰۶۔

جس خلوص، انہماک، عزم اور استقلال کا ثبوت پیش کیا، اس کی مثال نہیں، ذاتی زندگی میں وہ ایک بھلے آدمی کا نمونہ تھا، وہ ایشیائی حکمرانوں اور شاہزادوں کی عام برائیوں سے پاک تھا، وہ سادہ؛ بلکہ خشک زاہدانہ زندگی بسر کرتا، وہ کھانے پینے، پوشاک ولباس اور زندگی کی تمام ضروریات کے معاملہ میں بہت محتاط تھا، انتظامِ سلطنت کے بھاری کاموں میں مشغولیت کے باوجود اپنے ذاتی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے قرآن شریف کی نقل اور ٹوپی تیار کر کے روپیہ حاصل کرنے کا وقت نکال لیا کرتا...... وہ اپنے روزانہ کے معمولات پر سختی سے عمل پیرا رہتا، چوبیس گھنٹہ میں صرف تین گھنٹہ سوتا، کام لینے میں بڑا سخت گیر تھا، خود اپنے اوپر بھی اور دوسروں کے اوپر بھی، وہ اپنی وسیع سلطنت کے تمام کاموں کی خود نگرانی کرتا تھا اور اپنی تمام فوجی مہموں کی قیادت بھی خود کرتا، وہ ختم نہ ہونے والی انرجی اور غیر متزلزل ارادے کا مالک تھا۔(۱)



(۱) ڈاکٹر تاراچند، ہسٹری آف فریڈم موومنٹ: ۱/ ۳۸۰، (دہلی ۱۹۸۵ء)۔

سلطان ٹیپو کے بارے میں !☆

اورنگ زیب کے علاوہ ٹیپو سلطان پر بھی انگریزوں نے اس قدر کیچڑ اُچھالا ہے کہ تاریخ کی زبان میں شاید ہی کوئی گالی بچی ہو جو اسے نہ دی گئی ہو، اس کی تاریخ کو مسخ کر کے پردے ڈال دیئے اور اصل مواد لندن لے جا کر نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل کر دیا گیا، مگر لندن میں ہی ایک واقعہ پیش آیا اور یہ چھپائے ہوئے ذخیرے طشت از بام کر دیئے گئے، ان کی کھوج نکالنے والا تھا ایک ہندو ''بھگوان ایس گڈوانی'' جس نے لندن کے ان ذخیروں کو کھنگالا اور مشہور کتاب "Sword Tipu Sultan" ۱۹۷۶ء میں کئی سال کی محنت کے بعد لکھی، اسی کی بنیاد پر سنجے خاں نے مشہور سیریل بنایا تھا جو دو مرتبہ ٹیلی ویژن کے پردے کی زینت بنا اور بے حد مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا، مسٹر گڈوانی نے ایک انٹرویو میں کہا :

> ٹیپو ایک دیش بھگت قومی شہید تھا اور اسی طرح یاد کیا جانا چاہیے، اس کی اصلاحات، مذہبی رواداری اور انسانی حقوق پر اس کی گہری فکر و نظر قابل قدر اور تقلید ہیں، ٹیپو کے انیس (۱۹) جنرل تھے جن میں دس ہندو تھے، اس کے تیرہ (۱۳) میں سات وزیر ہندو تھے، اس کا مذہب اور فلاسفی کا استاد ایک برہمن گوور دھن پنڈت تھا اور ایک بھی ہندو نے اس سے غداری نہیں، وہ متعصب ہرگز نہیں تھا۔(۱)

☆ پروفیسر خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب ''تاریخ کی سچائیاں، اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان'' سے ماخوذ، ناشر: منور عباس، کوچہ پنڈت، دہلی ۱۹۹۶ء۔

(۱) ہندوستان ٹائمز ۴رفروری ۱۹۹۰ء۔

اس کی مذہبی رواداری کے گواہ وہ تیس (۳۰) خطوط ہیں جو مسٹر آر نرسا چار (ڈاکٹر آرکیا لوجی میسور) نے ۱۹۱۶ء میں ڈھونڈ نکالے تھے، سلطان شہید کا محل تین مندروں کے درمیان تھا؛ جہاں وہ روزانہ صبح کو انتظامات کی نگرانی کے لئے جایا کرتا تھا، یہ مندر آج بھی سرنگا پٹنم ریلوے اسٹیشن کے قریب موجود ہیں، میسور کے مختلف علاقوں سری نگیری، بیلور، تجن مندروں گڈھ، السور (بنگلور) وغیرہ میں ایسے بے شمار مندر ہیں جن کو سلطان نے جاگیریں دی ہیں اور مندروں کے پجاریوں اور برہمنوں کی بے حد عزت اور وقعت کی ہے، میسور آرکیالوجیکل رپورٹ ۱۷-۱۹۱۶ء (محکمہ آثار قدیمہ رپورٹ) میں اس کے خطوط پر روشنی ڈالی گئی ہے جو سرینگری کے مندر میں موجود ہیں، بہت سے مندروں میں ابھی تک سلطان کے دیئے ہوئے نقارے، برتن اور کپڑے وغیرہ محفوظ ہیں، مثال کے طور پر میل کوٹے کے مندر میں جو نقارہ استعمال ہوتا ہے وہ سلطان کا عطیہ ہے، اس کے محل کے احاطے میں رنگا ناتھ مندر تھا جس کو حیدر علی (ٹیپو کے والد) نے ایک خوبصورت رتھ اور دیگر تحفے دیئے تھے، ان عطیات کا ذکر مسٹر راجیت سین نے ایک مضمون میں کیا ہے، (۱) مسٹر رما شیام سندر نے بھی ایک مضمون میں ٹیپو کو بے حد روادار، غیر متعصب اور قابل فخر محب وطن بتایا ہے، (۲) مسٹر سبارایا چیٹی نے اپنی کتاب: ''نیولائٹ اون ٹیپو سلطان'' (ٹیپو سلطان پر نئی روشنی) "New Light on Tipu Sultan" میں بھی سلطان کی رواداری اور مندروں کے عطیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، مسٹر رما شیام سندر اپنے مذکورہ مضمون میں لکھتے ہیں:

> وہ بہادری اور استقلال سے جنگ کرتا ہوا شمشیر بدست اپنے وطن کی آن اور آزادی کے لئے شہید ہوا، وہ وہ واحد حکمران تھا جس نے محسوس کیا کہ انگریز ہندوستانی عوام اور ان کی آزادی کے اصل دشمن
> مرہٹوں کی فوج نے ہندو مٹھ کو لوٹا اور سارا دیوی کی مورتی کی توہین

(۱) Tipu Sutan Legacy by Rajib Sen in Hindustan Times, 10th Aug 1991.

(۲) Tipu Sultan -A Patriot Parexcellence by Rumma Shyam Suner, Hindustan Times 16th nov, 1985.

کی تو اسے سخت تکلیف پہنچی اور ایک معقول رقم مورتی کو دوبارہ نصب کرنے کے لئے بھیجی اور مصیبت زدہ برہمنوں کو کھانا کھلوایا، اس نے مرہٹہ فوج کے خلاف سخت کاروائی کی اور مٹھ کی حفاظت کے لئے فوج روانہ کی، یہ سچ ہے کہ ہے اس نے مالابار کے بعض علاقوں میں سخت کاروائی کی مگر یہ مذہبی تعصب کی بنا پر نہیں تھا؛ بلکہ شورش کرنے والوں کی سرکوبی اور اصلاح کے لئے تھا...... ٹیپو نے برہمنوں سے پراتھنا کی درخواست کی اور مندروں کو قیمتی تحفے پیش کئے ٹیپو نے وطن کی تحریکِ آزادی کو راہ دکھائی، اس کی صلاحیتوں اور نقل و حرکت نے میدان جنگ میں اس کے دشمنوں کو بدحواس کر دیا تھا۔

سنجے خاں نے جب ٹیپو پر سیریل بنایا تو اس وقت سیکولرازم کا نقارہ بجانے والے ''مسیحا'' فرقہ پرستوں کی بیساکھی کے سہارے اقتدار کی کرسی پر براجمان تھے اور اقتدار کی باگ ڈور دراصل بیساکھی والے فرقہ پرستوں کے ہاتھوں میں تھی، سلطان ٹیپو کا نام وہ بھلا کیسے سن لیتے؛ لہٰذا اپنے ایک خاص آدمی یعنی آر ایس ایس کے نیتا مسٹر کے آر ملکھانی کو اس سیریل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے چنا گیا، ذرا لطف ملاحظہ کیجئے کہ یہ ملکھانی صاحب ٹیپو کے بارے میں معلوم حاصل کر کے فارغ ہوئے تو کیا فرماتے ہیں :

حقیقت تو یہ ہے کہ میں ٹیپو کے بارے میں جتنا پڑھتا ہوں، اتنا ہی اس کی عظیم اور بلند شخصیت سے متاثر ہوتا جاتا ہوں...... ٹیپو کے دو استاد تھے، ایک: پنڈت گوردھن، دوسرے: مولوی عبید اللہ، اس کا وزیر اعظم پورنیا تھا، سپہ سالار کرشنا راؤ تھا، اس نے ۱۵۶ مندروں کو عطیات اور جاگیریں دی ہیں، اگر وہ چاہتا تو بہ آسانی انگریزوں کے سامنے جھک جاتا اور ایک حکمران کی طرح رہ سکتا تھا، اور آج

> اس کے وارث کلکتے کی سڑکوں پر رکشا نہ چلا رہے ہتے، مگر ٹیپو نے بے عزتی اور غلامی پر موت کو ترجیح دی، اٹھارویں صدی کے حکمرانوں میں وہ واحد شخص ہے جو غیر ملکی غلامی کے خلاف جنگ کرتا ہوا شہید ہوا، آزاد ہندوستان کے فرزند آج اس شیر کو سلام کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔(۱)

پروفیسر ایم ایس جیا پرکاش (ڈی بی کالج مستھام کوٹا کیرالہ) نے ملیالم میں ایک کتاب Ezhavasivan (انقلاب کی بنیادیں) لکھی ہے جس میں ٹیپو کے بارے میں لکھا:

> ہندوستان کا ایک ہی سپوت ہے کہ جو انگریزوں سے آزادی وطن کے لئے آخری سانس تک جنگ کرتا رہا اور وہ ہے ٹیپو سلطان، دیش کا عظیم ترین سپوت۔(۲)



(۱) Illustraed weekly 15.4.90 Radiance, 13-19May 1990.

(۲) Quoted by Prof Bharati Devi in a letter to "Radiance" New Delhi 19-25 June 1994.

سلطان ٹیپو شہید کی مذہبی اور مسلکی رواداری ☆

مغربی مؤرخین اور خود ہندستان کے بعض متعصب ہندو مصنفین کی طرف سے بھی سلطان ٹیپو پر عام طور پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ انتہائی متعصب تھا، اس نے اپنی حکمرانی کے دوران ہندوؤں اور عیسائیوں پر ظلم کیا، مندروں کو ڈھا کر اس کی جائیدادیں ضبط کیں، غیر مسلموں کا اجتماعی ختنہ کروایا اور جبراً بے شمار لوگوں کو مسلمان بنایا؛ چنانچہ مشہور انگریز مؤرخ لیون بی بورنگ سلطان کے مذہبی جوش سے متعلق اپنے نوٹس میں لکھتا ہے کہ وہ تعصب کے اعتبار سے نادر شاہ، محمود غزنوی اور علاء الدین خلجی کا ہم پایہ تھا، ان سب کی شہرت اس لئے ہے کہ ان کے حکم سے بے شمار مشرکین قتل کئے گئے، (۱) کرکے پیٹرک نے اس کو ناروادار قرار دیا ہے، ولکس تاریخ میسور میں اس کو کٹر متعصب کہتا ہے۔ (۲)

ان الزامات کا حقیقت سے کتنا تعلق ہے اس کے لئے صرف ایک مثال کافی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ٹیپو کو بدنام کرنے کے لئے ان لوگوں نے کس حد تک تکذیب و مبالغہ آرائی اور علمی خیانت سے کام لیا ہے، ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ سلطان نے صرف کورگ شہر میں ۷۰ ہزار لوگوں کو مسلمان بنایا تھا؛ حالانکہ تاریخ میسور کا ایک معمولی طالب علم بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ عہد ٹیپو میں کورگ کی جملہ آبادی ۳۰/۲۵ ہزار سے زیادہ نہیں تھی، اس میں بھی کئی ہزار مسلمان اور عیسائی شامل نہ تھے، خود ایک ہندو مؤرخ رام چندر راؤ پنکنوری کا کہنا ہے کہ کورگ پر سلطان کے قبضے کے بعد وہاں کے صرف پانچ سو لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا،

☆ مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی۔

(۱) سوانح ٹیپو سلطان، از: امجد علی اشہری۔

(۲) تاریخ ٹیپو سلطان، از: محب الحسن۔

وہ بھی اس وقت جب ان ہندؤں کو جو ہندو مت کی نسلی تفریق سے تنگ آکر عیسائیت قبول کرنے والے تھے، اس نے یہ حکم دیا کہ وہ اپنا آبائی مذہب بالکل نہ چھوڑیں، اگر ان کو کسی وجہ سے اس پر اصرار ہی ہے تو اپنے بادشاہ کا مذہب یعنی اسلام اختیار کریں؛ چنانچہ اس موقع پر سریندر ناتھ سین نے سلطان کو یہ کہہ کر بچانے کی کوشش کی کہ وہ متعصب تو نہیں تھا؛ البتہ جبراً اس نے لوگوں کو جو مسلمان بنایا اس کا مقصد مذہبی نہیں سیاسی تھا اور اس کی پشت پر سیاسی محرکات کارفرما تھے، مہاتما گاندھی نے بھی سلطان پر لگائے جانے والے اس الزام کو صاف جھوٹ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ٹیپو کے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ تعلقات نہایت ہی دوستانہ تھے، اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا محرک تھا۔

یہ بات اگرچہ صحیح ہے کہ سلطان نے بعض ہندوؤں کے ساتھ سختی کی، مثلاً کرشنا روٗ اور ان کے بھائیوں کو پھانسی کی سزا دی اور بعض دوسرے لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا؛ لیکن یہ سزائیں ان کو ہندو ہونے کی وجہ سے نہیں دی گئیں؛ بلکہ اس کا سبب ان کی نمک حرامی وغداری تھی، اس طرح کا انتقام اس نے خود بعض مسلمانوں سے بھی لیا، مثلاً انگریز سپاہیوں کے ساتھ زنا کرنے کی وجہ سے بعض مسلم خواتین کو قتل کر دیا، محمد قاسم کو غداری کی وجہ سے موت کے گھاٹ اُتار دیا، عثمان خان کشمیری کو پھانسی کی سزا دی تو کیا کوئی مسلمانوں سے سلطان کی سختی کی وجہ سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ وہ خدانخواستہ اسلام دشمن بھی تھا؛ جہاں ایک طرف ہندو، مرہٹوں اور راجہ ٹراونکور سے اس کی جنگیں ہوئیں تو دوسری طرف مسلم حکمرانوں سے بھی اس کی کئی معرکہ آرئیاں ہوئیں، مذہبی تعصب وتشدد کا الزام اس پر اس وقت صحیح ہوتا جب وہ غداری وبغاوت کی سزا میں مسلمانوں کو تو معاف کر دیتا اور ہندوؤں وعیسائیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا، ذیل میں سلطان کی مذہبی رواداری کی بعض ایسی مثالیں بھی ہم پیش کر رہے ہیں جس کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر سے بحیثیت ایک مسلم حکمران کے سلطان ٹیپو کے لئے اس کے جواز پر بحث بھی کی جاسکتی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مذہبی رواداری میں بعض مواقع پر اسلامی حدود سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔

اعلیٰ مناصب پر ہندو افسران

ہندو برہمن پورنیا سلطان کی شہادت تک پوری سلطنتِ خداداد کا وزیر خزانہ اور اختیارات کے اعتبار سے وزیر اعظم میر صادق کے بعد سلطان کا نائب دوم تھا، لالہ مہتاب رائے سبقت جو ہندو برہمن تھا، سلطان کا ذاتی منشی اور خاص معتمد تھا، یہ اُردو و فارسی کا قادر الکلام شاعر بھی تھا، ہمیشہ سلطان کے ساتھ ہی رہتا؛ حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی شاہی کیمپ ہی میں اس کا قیام ہوتا، فارسی میں بادشاہوں کے نام ٹیپو کی طرف سے لکھے جانے والے اکثر خطوط یہی تیار کرتا تھا، شاہ ایران کے نام سلطان کے طویل فارسی مراسلے کا مسودہ بھی اسی نے تیار کیا تھا، اس نے سلطان کی مدح میں بعض قصیدے بھی کہے تھے، سلطان کے ہندو معتمدین میں سے جو چند لوگ آخر تک اس کے وفادار رہے، اس میں یہ بھی تھا، اس کے علاوہ ہری سنگھ میسور کی سوار فوج کا افسر اعلیٰ تھا، اس کا بھائی نرسنگا راؤ بھی حکومت کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا، کورگ کا روجدار ایک برہمن تھا، سری نواس راؤ اور اپا جی رام کو عام طور پر ٹیپو اپنا نمائندہ بنا کر سفارتی مشن پر بھیجتا تھا، راما راؤ ایک سوار دستے کا کمانڈر تھا، ملیبار میں نائروں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے سلطان نے سری پت راؤ ہی کو بھیجا تھا۔

ایک دوسرے مرہٹہ سردار سیوا جی کی کمان میں تین ہزار سپاہیوں کی ایک مستقل فوج بھی رہتی تھی، سلطان کے دربار میں سرکاری خطوط لکھنے والے کئی منشیوں میں ایک منشی ہندو نرسیا بھی تھا، دیہاتوں کی پنچایتوں میں اکثر سرکاری نمائندگی ہندو ہی کرتے تھے، کیرالا میں ساگوان کی لکڑی کی کٹائی کا ٹھیکہ پہلے ایک ماپلہ مسلمان کو دیا گیا تھا، بعد میں یہ ٹھیکہ اس کی جگہ ایک برہمن کو دیا گیا، ہندوؤں کے مذہبی تہوار دسہرا میں سلطان اپنے تمام اعلیٰ افسران کے ساتھ نہ صرف شریک ہوتا؛ بلکہ حکومت کے خزانے سے اس کے اخراجات کے لئے ایک بڑی رقم بھی فراہم کرتا تھا، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاتفریق مذہب اس کو مسلمانوں کی طرح اپنی غیر مسلم رعایا پر بھی اعتماد تھا؛ اسی لئے حکومت کے اعلیٰ مناصب وعہدوں پر ہندو بھی فائز

تھے، تمام غیر مسلموں کو بغیر کسی دباؤ کے اپنے مذہب پر عمل کی مکمل آزادی حاصل تھی، ایک دفعہ ایک شخص نے پورنیا کی بدنیتی کا ذکر کر کے پورے ہندو برہمن طبقے کو غدار کہا تو سلطان نے یہ آیت پڑھی: ''لا عدوان إلا علی الظالمین'' کہ کسی ایک کی غلطی سے اس کی پوری قوم کو ملامت نہ کیا جائے۔

مندروں اور اس کے سوامیوں کا احترام

سلطان کے دل میں ہندوؤں کے مندروں اور اس کے سوامیوں کا بڑا احترام تھا، ۱۷۹۱ء میں مرہٹہ دراندازوں نے رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں سلطنتِ خداداد پر حملے کے دوران سرنگیری کے مندر کی بے حرمتی کی، اس کی قیمتی املاک کو لوٹ لیا، سونے سے بنی قیمتی پالکی اور جانوروں وغیرہ کو بھی لے گئے، ساردا دیوی نام کی مورتی کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا، کئی برہمنوں کو بھی اس حملے میں پکڑ کر قتل کیا گیا، یہاں تک کہ مندر کے سوامی اور متولی شنکر گرواچاریہ وہاں سے بھاگ کر قریب کے شہر کارکل میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، وہاں سے انھوں نے ٹیپو کو ایک شکایتی خط لکھا اور مندر کی بے حرمتی کی تفصیلات سے اس کو آگاہ کر کے مالی امداد کی درخواست کی، اس پر ٹیپو کی طرف سے جو جواب شنکر گرواچاریہ کو موصول ہوا، وہ خط میسور کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر راؤ بہادر نرسمہا اچاریہ کو ۱۹۱۶ء میں سرنگیری کے مندر میں ملا تھا، اس خط میں ٹیپو نے خلافِ معمول گرو جی کا نام پہلے اور اپنا نام بعد میں لکھا ہے اور اس کو اس میں بڑے احترام اور ادب کے ساتھ مخاطب کیا ہے، اس کے اس مہذب و پُرتعظیم لہجے سے اس کے دل میں ہندوؤں کے سوامیوں کے لئے موجود احترام و ادب کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس خط کا مضمون کچھ یوں ہے:

> جو لوگ مقدس و متبرک مقامات کی توہین و بے حرمتی کرتے ہیں، وہ اس دنیا ہی میں بداعمالیوں کا بدلہ پائیں گے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے کہ گناہ تو ہنس کر کرتے ہیں؛ لیکن اس کا بدلہ رو رو کر بھگتتے ہیں،

> مندر کے سوامیوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا خود اپنی نسل کی تباہی کو دعوت دینا ہے، جو لوگ ہماری سلطنت میں داخل ہو کر ہماری رعایا کو ستا رہے ہیں، ان سے ہم خود نپٹ رہے ہیں، آپ کی شخصیت قابل احترام اور دنیا سے بے نیاز ہے، آپ ہماری سلطنت کی بقا وحفاظت اور دشمنوں کی ہلاکت کے لئے دُعا کیجئے، آپ کو حسب ضرورت ہمارے زیر قبضہ دیہاتوں سے کسی بھی چیز کے لینے کا اختیار ہے۔

اسی خط کے ساتھ علاقے کے گورنر کو سلطان نے یہ حکم بھی بھیجا کہ وہ شنکر اچاریہ کی خدمت میں فوراً اس کی طرف سے دوسو اشرفیاں مع غلہ پیش کرے اور سرکاری مصارف پر سار دا دیوی نام کی مورتی کو احترام کے ساتھ دوبارہ اس کی جگہ نصب کرے اور اس تقریب کے موقع پر ایک ہزار فقراء کو کھانا بھی کھلایا جائے، (۱) سلطان کی اس وسعت قلبی سے متاثر ہو کر گرو جی نے سلطان کو ایک شال بطور شکریہ روانہ کی، جس کے جواب میں سلطان نے سارداد یوی مورتی کو پہنانے کے لئے ایک قیمتی کپڑا اور خود گرو جی کے لئے بھی ایک جوڑی شال بھیجی، ایک دفعہ اس علاقے کے گورنر سید محمد کو خط لکھا کہ وہ فوراً اس کی طرف سے دیوی کے لئے ایک پالکی گرو جی کی خدمت میں پیش کرے اور مزید کسی ممکنہ حملے سے مندر کو بچانے کے لئے سپاہیوں کو بھی مقرر کر دے کچھ دنوں کے بعد جب گرو جی پونا کے مرہٹہ سردار پرسورام بھاؤ کے پاس اپنی لوٹی ہوئی اشیاء کا مطالبہ کرنے کے لئے گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہو گئی تو سلطان نے خط لکھا کہ آپ فوراً واپس آجائیں؛ اس لئے کہ آپ کی ہماری سلطنت میں موجودگی سے خدا کی رحمتیں برستی ہیں اور فصلیں اچھی ہوتی ہیں، ایک دفعہ ان کو دارالسلطنت آنے کی خصوصی دعوت بھی دی تھی؛ لیکن وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے، یہ تو صرف ایک شہر کے ایک مندر پر سلطان کی عنایتوں کا حال ہے جس کو دھارواڑ کے محمد غوث مجاور صاحب نے سرنگیری مٹھ اور ٹیپو سلطان

(۱) ٹیپو سلطان اور سرنگیری مٹھ، از: غوث مجاور دھارواڑ بشکریہ ماسٹر ملا صاحب دھارواڑ۔

کے نام سے اپنی پچاس صفحات کی ایک کنٹری کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اس کے علاوہ محبّ الحسن، محمود خان اور امجد علی اشہری وغیرہ نے بھی اپنی کتابوں میں اس کی تفصیلات درج کی ہیں۔

مندروں کو نذرانے

تعلقہ نجن گڑھ کے ایک گاؤں کلالے کے لکشمی کانتھ مندر میں چاندی کے چار پیالے، ایک پلیٹ اور ایک اگلدان اب بھی موجود ہے، جو ٹیپو نے اس مندر کو نذر کئے تھے، اسی شہر کے سری کنیشور مندر کو سلطان نے ایک ایسا مرصع پیالہ بھی دیا تھا، جس کے نچلے حصے میں پانچ قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے، میلکوٹ کے نرائن سوامی مندر کو بھی قیمتی جواہرات سے جڑے کچھ برتن، ایک نقارہ اور بارہ ہاتھی اس نے روانہ کئے تھے، خود سری رنگا پٹنم کے رنگناتھ مندر میں ایک کافور دان اور چاندی کے سات پیالے اس کے دیئے ہوئے اب بھی موجود ہیں، ڈنڈیگل کے قلعہ پر جب سلطانی افواج نے حملہ کیا تو اس نے ان کو حکم دیا کہ چوں کہ سامنے راجہ کا مندر موجود ہے؛ اس لئے پیچھے سے گولہ باری کی جائے، ملیبار میں گروایور پر قبضے کے دوران جب مسلمان سپاہیوں نے وہاں کے مندر کو آگ لگانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو نہ صرف سزائیں دیں؛ بلکہ اسی وقت مندر کی مرمت بھی کروادی، ۱۷۸۰ء میں نواب حیدر علی نے کانجی ورم میں ایک مندر کی بنیاد رکھی تھی؛ لیکن وہ اس کو مکمل نہیں کر سکا تھا، ۱۷۹۱ء میں جب ٹیپو وہاں گیا تو اس نے مندر کی تکمیل کے لئے اپنی طرف سے دس ہزار روپے کا عطیہ دیا، خود وہاں ان کے مذہبی تہوار میں شرکت کی اور اس موقع پر ہونے والی آتش بازی کے مصارف بھی خود برداشت کئے، ۱۷۸۹ء میں جب وہ ٹراونکور میں تھا تو تریچور میں اپنے قیام کے دوران فوجیوں کا کھانا پکانے کے لئے کچھ برتن وڑکوناتھن مندر سے عاریتاً منگوائے تھے، ان برتنوں کو واپس کرتے وقت اس نے اس مندر کو ایک بڑا شمعدان بھی نذر کیا، میل کوٹ نامی شہر کے ایک مندر میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں خود ہندوؤں کے دو فرقوں واڈ گلائی اور ڈنکالائی میں جب اختلاف ہو گیا تو خود اس نے وہاں کے ہندوؤں کی خواہش پر ثالثی کے

فرائض انجام دیئے، بعد میں مندر کے منیجر کے نام حکم جاری کیا کہ وہ ذاتی طور پر اس کی نگرانی کرے کہ بھجن آئندہ سے دونوں طریقے سے گایا جائے اور دونوں فرقوں کے ساتھ برابر انصاف ہو۔

شاہی محل کے قریب مندر

بچپن میں ایک درویش کی طرف سے اس کے حق میں کی گئی پیشین گوئی کے پورا ہونے کے بعد جب سلطان تخت میسور کا وارث بنا تو اس نے اس درویش سے کئے گئے اپنے وعدے کے مطابق اپنے محل کے قریب مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا؛ چوں کہ محل کے قریب سری رنگناتھ کا مندر پہلے سے موجود تھا؛ اس لئے اسی سے متصل مسجد کی تعمیر کے لئے اس نے سب سے پہلے ہندو سوامیوں اور عوام سے اس کی اجازت حاصل کی، ان کی مرضی کے بغیر اس جگہ مسجد کی تعمیر کو وہ صحیح نہیں سمجھتا تھا، ان سے اجازت ملنے کے بعد اس نے اس جگہ مسجد اعلیٰ کی بناء رکھی، اگر وہ چاہتا تو اپنی طاقت کے بل بوتہ پر بادشاہ ہونے کی وجہ سے ان کی اجازت کے بغیر ہی اس جگہ بنا سکتا تھا، مسجد اعلیٰ سے متصل رنگناتھ مندر کے علاوہ جو اس کے محل سے صرف ایک سو گز کے فاصلے پر تھا قلعہ میں نرسمہا اور گنگا دھریسوا نام کے دو اور مندر موجود تھے، جہاں سے روزانہ صبح وشام گھنٹیوں کی آواز سلطان کے محل میں پہنچتی تھی؛ لیکن اس نے کبھی ان کے ان مذہبی اعمال کی ممانعت نہیں کی، خود بنگلور میں سلطان کے محل سے متصل بھی ایک مندر موجود تھا۔

مندروں کو جائیدادیں

ڈاکٹر سی کے کریم کی کتاب Kerala Under Tipu کے حوالے سے محمد عبداللہ بنگلوری نے اپنی کتاب ''ٹیپو کے تذکرے مختلف ادوار میں'' میں لکھا ہے کہ صرف کیرالا کے جنوبی ضلع کے ایک تعلقہ کے ساٹھ مندروں کو سلطان نے سرکاری خزانے سے سالانہ وظیفے جاری کئے تھے، گروگرو دیار یا کے مندر کو ہی چھ سو ایکڑ قابلِ کاشت زمین بطور انعام دی گئی تھی۔ (۱)

---

(۱) ٹیپو کے تذکرے مختلف ادوار میں، از: محمد عبداللہ بنگلوری۔

ملیبار کی مندروں و برہمنوں کو جو زمینیں بغیر سرکاری لگان کے ٹیپو نے دی تھیں، اس کی جو تفصیلات محبّ الحسن صاحب نے اپنی کتاب تاریخ ٹیپو سلطان میں نقل کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے۔

(۱) کالی کٹ کے قصبہ اسوم کے تریکلنٹیشورو ٹاکوام کنعاؤ مندر کے لئے ۱۹۵/۱ ایکڑ زمین۔

(۲) پونانی کے گورویاور مندر کے لئے ۵۰۴/۱ ایکڑ زمین۔

(۳) چیلم برا تعلقہ ارا ند کے مانور مندر کے لئے ۴۳/۱ ایکڑ زمین۔

(۴) پونانی کے تروانچکسولم مندر کے لئے ۲۱۲/۱ ایکڑ زمین۔

(۵) پونانی کے نمودری پد مندر کے لئے ۱۳۵/۱ ایکڑ زمین۔

سلطنت کے وزیر خزانہ پورنیا کا خود کہنا تھا کہ سرکاری خزانے سے مندروں کو سالانہ ۱۹۳۹۵۹ پگوڈا کی مالی امداد دی جاتی تھی، جب کہ مساجد و مزاروں کے لئے یہ امداد اس سے بہت کم تھی۔(۱)

پشپا گیری کے سوامی کو گولا پلی کے مواضعات کی مال گزاری وصول کرنے کا حق دیا گیا تھا، گانجی کوٹہ کے انجانیا سوامی مندر کے رام چار نامی شخص کو کڑپہ میں ایک بڑی جاگیر دی تھی، اس کے علاوہ ۱۷۹۴ء میں قلعہ بل کے ایک برہمن مہاراجہ ہری پا کو اس نے بطور انعام ایک بڑی اراضی بھی دی تھی۔(۲)

ہندوؤں کی سماجی اصلاح

سلطان نے اگرچہ پوری سلطنت میں اپنی تمام رعایا کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دے رکھی تھی؛ لیکن اس کے ساتھ وہ غیر انسانی وغیرہ فطری اعمال ورسومات پر عمل کرنے کے لئے کسی کو بھی آزادی دینے کا قائل نہیں تھا؛ اس کے لئے اس نے جہاں مسلمانوں میں پائی جانے والی بدعات وخرافات پر روک لگائی، وہیں ہندوؤں میں بھی پائی

---

(۱) تاریخ ٹیپو سلطان، از: محبّ الحسن۔ (۲) صحیفہ ٹیپو سلطان، از: محمود خان۔

جانے والی بعض غلط چیزوں پر بھی جو فطرت سے میل نہیں کھاتی تھیں، سختی سے روک لگادی مثلاً اس وقت سلطنتِ خداداد میں بعض ہندو عورتوں کے پاس بیک وقت چار چار شوہر ہوتے تھے اوران کے بچے ماں کی طرف منسوب ہوتے تھے، اس پر پابندی لگادی گئی، مالابار کی عورتیں سینہ کھلا رکھ کر بازاروں میں بلاتکلف آتی جاتی تھیں، اس نے اس کی سختی سے ممانعت کردی، بعض مندروں میں خاص کر میسور کے کالی مندر میں دیویوں کو خوش کرنے کے لئے انسانی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی، اس پر پابندی لگادی گئی، ہندوؤں میں غلامی کا رواج تھا، بڑے بڑے شہروں میں ہندو عورتوں کی فروخت کے لئے منڈیاں لگتی تھیں، قحبہ گری کے لئے لونڈیوں کو گھروں میں رکھنے کا رواج تھا، ایک شاہی فرمان جاری کر کے غلامی ہی کو غیر قانونی قرار دیا، باعزت گھرانوں میں ناجائز اولاد کی شادی کی ممانعت کردی گئی، کورگ میں ہندو عورتوں میں رواج تھا کہ ایک گھر کے تمام بھائیوں میں سے صرف بڑا بھائی کسی ایک عورت سے شادی کرتا، جو سب بھائیوں کی بیوی ہوتی، اس غیر فطری عمل پر بھی اس نے روک لگادی۔

ہندوؤں کی ایک قوم لنگایت میں مندروں کے اندر عضوِ تناسل کی پرستش ہوتی تھی، اس بداخلاقی کی بھی اس نے سختی سے ممانعت کردی، ہندو کسان شادی بیاہ کے موقع پر غیر ضروری رسومات میں بے جا اسراف کے عادی تھے، اس نے ان کو پابند کیا کہ کوئی شخص اپنی جملہ آمدنی کا ایک فیصد سے زائد حصہ شادی بیاہ پر خرچ نہیں کرسکتا، ان سب اصلاحات کی خلاف ورزی پر اس نے سزائیں بھی مقرر کردی تھیں؛ چنانچہ انگریزوں کو مذہبی معاملات میں ٹیپو کی مداخلت کا بہانہ بنا کر مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اس کے خلاف بھڑکانے میں کامیابی نہیں ملی اور خود ہندوؤں کی اکثریت نے یہ محسوس کیا کہ ٹیپو کی طرف سے یہ سب اصلاحات خود ان کی اصلاح وترقی کے لئے کی جارہی ہیں۔

ہندو رعایا کی سلطان سے عقیدت ومحبت

مجموعی طور پر سلطان کی ہندو رعایا نے اس کے ساتھ محبت وعقیدت کا جو سلوک کیا، اس کی مثال ملک کے کسی دوسرے مسلم حکمران کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، ہندوؤں کی اکثریت نے

آخری وقت تک اس کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا، ۴ رمئی ۱۷۹۹ء میں شہادت کے دن سلطان کی لاش کے آس پاس سینکڑوں ہندو خواتین کی لاشیں ملیں، جس میں بعض نوجوان لڑکیاں بھی پائی گئیں، خود انگریز افسران نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ہندو رعایا کے دلوں میں بھی اپنے مسلم حکمران کے لئے عقیدت کے یہ جذبات دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی، جب سلطان کا جنازہ اُٹھا تو راستے میں ہندو عورتیں ماتم کرتی ہوئی اپنے سروں پر مٹی ڈال رہی تھیں، محاصرہ دارالسلطنت پر کئی برہمنوں نے سلطان کی فتح کے لئے اپنی مذہبی رسومات کے مطابق دن بھر کا روزہ رکھا تھا، اگر سلطان کا سلوک ان ہندوؤں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں ہندو ایک مسلم حکمران کے لئے اپنی جانیں تک قربان کرتے، اگر اس کے خلاف عام ہندوؤں میں ناراضگی پائی جاتی تو انگریزوں یا مرہٹوں کے لئے اپنے مقاصد کے خاطر ہندو مذہب کے حوالے سے ان سب کو سلطان کے خلاف اجتماعی بغاوت کے لئے اُکسانا بہت آسان تھا؛ لیکن پوری سلطنتِ خداداد کی تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ کسی متعصب انگریز مؤرخ کی کتاب میں بھی نہیں پایا جاتا، یہی وجہ ہے کہ سلطان کے غداروں کی فہرست میں ہندوؤں کی تعداد سلطنت میں اکثریت میں ہونے کے باوجود ان کی آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

عیسائی رعایا کے ساتھ برتاؤ

عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹیپو نے اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ ظلم کیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرح ان کے ساتھ بھی اس نے فیاضانہ سلوک کیا، اگر ان میں سے کسی سے اس نے انتقام بھی لیا تو ان کے مذہب کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ ان کی باغیانہ روش کی وجہ سے جس کا بارہا ان کی طرف سے اس کو سامنا کرنا پڑتا تھا، ۱۷۸۲ء میسور کی دوسری جنگ میں جنوبی کنارہ (مینگلور) کے عیسائیوں نے انگریزوں کی خفیہ حمایت کی، بدنور پر قبضے کے لئے جنرل میتھیوز کا ساتھ دیا اور اس کی اس سلسلے میں مالی مدد بھی کی، بڑی تعداد میں عیسائی مغربی ساحل سے فرار ہو کر انگریزوں سے جا ملے، جنرل کیمبل نے جب مینگلور کا محاصرہ کیا تو ان ہی

عیسائیوں کی طرف سے انگریزوں کو چاول کے ایک ہزار بورے دیئے گئے، اس پر ٹیپو نے ان کو سخت سزائیں دیں، سازش میں ملوث اکثر لوگوں کو کوچین اور بعض کو گوا جلاوطن کیا گیا، کچھ کو قیدی بنا کر سری رنگا پٹنم اور چتل درگ میں رکھا گیا اور ان میں جو سرغنہ تھے، ان کو قتل کر دیا گیا، قیدی عیسائیوں کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی اس نے نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کچھ پادریوں کو بھیجنے کے لئے گوا کے وائسرائے کو خط لکھا، بعض عیسائیوں نے اس دوران سلطان کے حسن سلوک اور اخلاق کو دیکھ کر اسلام بھی قبول کیا، اس جنگ میں جن گرجا گھروں کو نقصان پہنچا تھا سرکاری اخراجات پر اس کی مرمت کروائی اور جن قیدیوں نے معافی مانگی ان کو رہا بھی کر دیا؛ لیکن سلطان کا بحیثیت ایک عالم دین ذاتی خیال تھا کہ اس وقت کے عیسائی خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر بھی عمل پیرا نہیں ہیں اسی لئے ان سب کو وہ بے دین نصرانی کہتا تھا؛ چنانچہ جب انگریز ایڈمرل بریگیڈ جنرل مکلوڈ نے مینگلور پر حملہ کیا اور سلطان ٹیپو کو مقابلے کے لئے میدان میں آنے کی دعوت دی تو سلطان نے اس کو جو خط لکھا وہ کچھ اس طرح تھا :

> مستند کتابوں سے ظاہر ہے کہ آپ جو اپنے کو مسیح علیہ السلام کا پیرو کہتے ہیں، صحیح نہیں ہے، یہ دعویٰ آپ کا غلط ہے؛ کیوں کہ اصلی انجیل میں تثلیث کی پرستش کی ہدایت نہیں ہے، یہ صرف مشرکین کا رویہ ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا تھا، تم لوگوں نے انجیل کی تعلیم کے خلاف شراب پینا، خنزیر کا گوشت کھانا اور سود کھانا شروع کر دیا ہے اور ہر وہ کام جو نہ صرف مذہبی؛ بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی ممنوع ہے، آپ نے اختیار کیا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام برگزیدہ لوگ تم سے نفرت و کراہت کرتے ہیں؛ اس لئے تم سے لڑنا ہم پر واجب ہے، اگر میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق تم کو شک ہو تو خشکی پر

آؤ اور مجاہدین اسلام کی شمشیر زنی کا مزہ چکھو، اس طرح کہ سپاہی
سے سپاہی اور افسر سے افسر اپنے پسندیدہ ہتھیار لے کر لڑے،
فیصلہ ہوجائے گا کہ خدا کے نزدیک کون بہتر ہے۔(۱)

ان سب کے باوجود اس کی وسعتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ اس نے آمینیہ کے عیسائی تاجروں کو اپنی سلطنت میں آکر کاروبار کرنے کی نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ ان کی مالی پشت پناہی بھی کی، خود اپنی فوج میں بھی فرانسیسی عیسائیوں کو ملازم رکھا، ۱۷۹۲ء میں آدھی سلطنت کھونے کے بعد گو اسے تارکین وطن عیسائیوں کو واپس بلا کر اپنی سلطنت میں دوبارہ بسایا؛ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس نے غیر ملکی عیسائی مشنریوں کو سلطنتِ خداداد میں تبلیغ سے منع کیا تھا اور سختی سے تاکید کرتے ہوئے ہندوؤں کے نام پوری سلطنت میں یہ فرمان جاری کردیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کی ذات پات کی تفریق سے تنگ آکر اپنا آبائی مذہب ترک نہ کریں، اگر ان کو اس پر اصرار ہی ہو تو اپنے آقا کے مذہب یعنی اسلام کو اختیار کریں، اس کا مقصد ان کو تبلیغ کی آڑ میں رعایا کو اس کے خلاف اُکسانے اور دولت کا لالچ دے کر جبراً عیسائی بنانے سے روکنا تھا۔



(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان، از: محمود خان۔

اس کتاب سے!

ان مضامین کی تفصیل یہ ہے کہ جن موضوعات پر کوئی مناسب تحریر نہیں ملی، یا از سرِ نو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ان پر راقم الحروف نے خود قلم اٹھایا، کتاب کے بیشتر مضامین اسی نوع کے ہیں، جن موضوعات پر کوئی مفید تحریر کسی صاحبِ علم کی مل گئی، جو کافی ووافی تھی، ان کو بعینہٖ شامل کر لیا گیا، جس موضوع پر کسی صاحب علم کی کوئی مفید تحریر تو ملی، مگر اس کو مختصر کرنے یا حذف واضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کو حذف واضافہ کے ساتھ شامل کیا گیا، تاہم دیگر اہل علم کی جو بھی تحریر شامل کی گئی، اس کے ساتھ ان کے نام کی صراحت کر دی گئی ہے اور اگر کوئی پیراگراف راقم الحروف نے بڑھایا ہے تو اس کا بھی ذکر کر دیا ہے، اس طرح اب یہ مجموعہ قارئین کے سامنے ہے!

یوں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چھوٹے بڑے بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں؛ لیکن اس حقیر نے ان سوالات کا انتخاب کیا ہے، جو میڈیا میں زیادہ زیر بحث رہتے ہیں، اور خاص کر ہندوستان میں جن کو نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلا باب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نسبت سے اُٹھائے جانے والے سوالات سے متعلق ہے، دوسرا باب رسول اقدس ﷺ کی حیات طیبہ کی نسبت سے اُٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات ہیں، تیسرا باب ان اعتراضات کے جوابات پر ہے، جو شرعی قوانین سے متعلق کئے جاتے ہیں، اور چوتھا باب ہندوستان کے مسلم سلاطین اور مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق ہے، اعتراضات کا جواب دینے میں مناظرانہ لب ولہجہ کے بجائے داعیانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور خاص طور پر کوشش کی گئی ہے کہ خود ان کی مذہبی تعلیمات اور تاریخی حقائق کو بھی سامنے لایا جائے؛ تاکہ وہ اس کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔



KUTUB KHANA NAIMIA
Jama Masjid, Deoband U.P. India
Whatsapp No. 9756202118, 9897949325, 9557895550
Email: naimiabookdepot@yahoo.com
700/-